
THE
KHIYAL

نیرنگ خیال

نیرنگ خیال ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

چندہ مع سالنامہ (للعہ) سرپرست۔ میاں بدرالدین حسن
سالانہ چندہ (سے) چیف ایڈیٹر۔ حکیم محمد یوسف حسن
ممالک خارجہ سے۔ اٹھ شلنگ ایڈیٹر ملک رام ایم اے۔ ایل ایل بی
قیمت فی پرچہ (۵ر) مدیر اعزازی۔ سید فرید جعفری مدیر لیلےٰ دہلی

جلد ۲۴ | فہرست بابت مئی سنہ ۱۹۴۳ء | نمبر ۴

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں حکیم محمد یوسف حسن ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے چھپوا کر دفتر نیرنگ خیال سے شائع کیا

شذرات

نیرنگ خیال کا طالب نمبر

نیرنگ خیال کا سالنامہ ۱۹۳۶ء دسمبر کا پرچہ تھا اور اسپر مہینے کا نام نمایاں حروف میں لکھا ہوا ہے۔ جنوری فروری کا پرچہ دوگنا ضخامت سے علیحدہ شائع ہوا۔ مارچ کے پرچہ کو بوجہ دیر ہو جانے کے ہم نے اپریل میں تبدیل کر دیا جو آپ کو مل چکا ہے۔ اب مئی کا پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہے ؛

گویا ہمارے ذمہ مارچ کا پرچہ باقی ہے۔ اس لئے ہم آئندہ ماہ میں یعنی جون میں آپ کی خدمت میں نیرنگ خیال کا طالب نمبر پیش کریں گے۔ جس کی قیمت دو روپے (۲؎) محصول ۷؍ ۔ ۲؎۷؍ ہوگی:

مارچ کے پرچہ کی قیمت چار آنہ ہمارے ذمہ واجب الادا ہے اس لئے طالب نمبر (۲؎۷؍) کی جگہ آپ کو ۲؎۷؍ میں بھجوانا چاہئے تھا۔ مگر ہم آپ کو صرف ۱؍ قیمت اور ۷؍ محصول ۱؎۲؍ میں پیش کریں گے۔ اس طرح سے دفتر کو محصول ڈاک کے علاوہ صرف ۱۱؍ نقد قیمت ۔ ۴؍ قیمت مارچ کی اور پندرہ آنے میں آپ کو ہم طالب نمبر پیش کریں گے۔ طالب نمبر میں کیا ہوگا؟ اس کا جواب ہم گذشتہ نمبر میں دے چکے ہیں لیکن اب پھر زیادہ وضاحت سے لکھدیتے ہیں۔ تاکہ ناظرین نیرنگ خیال اندازہ کر سکیں کہ دفتر نے انہیں کتنی بڑی رعایت دی ہے

طالب نمبر میں ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار سید طالب علی صاحب عابد ایم۔ اے الہ آبادی کے ۳۲۔ افسانے ہیں جو انسانی زندگی کی ہر قسم کی دلچسپیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ طالب صاحب کے افسانے ملک میں بڑی قدر سے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ افسانے کتابی سائز پر شائع ہونگے۔ جسطرح سے نیرنگ خیال کا اقبال نمبر کتابی سائز پر شائع ہوا تھا۔ اسی طرح سے طالب کے افسانوں کا مجموعہ بھی کتابی سائز پر شائع ۔ اور آپ کو گھر بیٹھے ایک شاندار تصنیف مل جائے گی ؛

طالب نمبر کا حجم چھ سو صفحات ہے۔ کتابت اتنی پاکیزہ ہے کہ ہندوستان بھر میں شاید ہی کوئی کتاب اس کا مقابلہ کر سکے۔ ٹائٹل نہایت دیدہ زیب ہوگا۔ بازار میں یہ کتاب اڑھائی روپے میں فروخت ہوگی اور یقیناً اس قیمت میں بھی یہ بہت ارزاں ہے ؛

نیرنگ خیال کے معاونین آئندہ ماہ میں اس کتاب کا وی پی وصول کرنیکے لئے تیار رہیں۔ اور کوئی صاحب بکسی وجہ سے وی پی واپس نہ فرماویں ورنہ ہر وی پی کی واپسی سے دفتر کو آٹھ آنے کا نقصان ہوگا۔ جو کسی طرح بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ جو صاحب یہ کتاب اس قلیل قیمت پر لینا نہ چاہتے ہوں وہ ہمیں ایک کارڈ لکھدیں تاکہ ان کے چندہ میں ایک ماہ کا اضافہ کر کے ان کے حساب کو درست کر لیا جائے۔ ورنہ خاموشی کی صورت میں ہم یہ کتاب رعایتی قیمت پر وی پی کے ذریعہ سے بھیجدیں گے۔ اور آپ کو ایک روپیہ بارہ آنے کی بچت رہیگی۔ جو اصحاب طالب نمبر کا وی پی وصول کر لیں گے ہم ان کے ممنون ہوں گے کہ انہوں نے ہمیں افسانوں کا لاجواب مجموعہ شائع کرنے میں امداد دی۔ وی پی وصول کرنے کے بعد جو صاحب ہمیں یہ لکھدیں گے کہ کتاب پسند نہیں یا کسی طرح سے بھی گراں ہے تو ہم انکی قیمت واپس کر دینگے اور یہ اعلان ہم محض اس لئے کر رہے ہیں کہ شاہکار افسانوں کا یہ مجموعہ رعایتی قیمت پر نہایت ارزاں ہے ناظرین انتظار کریں۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ ہمیں توفیق دے اور ہم ان دو مہینوں میں چھ سو صفحہ کا طالب نمبر کتابی سائز پر اور ۴۰ صفحات کا رسالہ رسالے کے سائز پر شائع کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کا فخر حاصل کریں ؛

نیرنگ خیال کے دشمن

ہندوستان ہی ایک ایسا خطہ ہے جہاں نفاق اور بلا ضرورت دشمنی جمہور کا طرز عمل ہے۔ لوگ تعمیری خصوصیات سے معرا البتہ تخریب و نقصان رسانی میں بالخصوص دلچسپی لیتے ہیں۔ نیرنگ خیال ہندوستان کا اولین علمی ادبی مجلہ ہے۔ جس نے ان تھک محنت اور ہزاروں روپے کے نقصان کے بعد ہندوستان کی جرنلزم میں زندگی اور بیداری کے آثار پیدا کئے۔ علم و ادب کی وہ فراوانی ہوئی کہ آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس پر بعض نومولود رسائل جن کی زندگی جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئی ہو گی۔ وہ نیرنگِ خیال پر حملہ کرنا اپنے لئے موجب حیات و ترقی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ انھوں نے میدان میں ابھی قدم ہی رکھا ہے اور منزل سے کوسوں دور ہیں۔ ایسے رسائل کی طفلانہ مذبوحی حرکات کا جواب دینا ہم پسند نہیں کرتے انکی مخالفانہ چوٹیں خود ان کے حق میں سم قاتل ثابت ہونگی لیکن بعض تجربہ کار بزرگ بھی نیرنگ خیال کو نقصان پہنچانے کے لئے غلط بیانیوں سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ نیرنگ خیال نے دسمبر میں کوئی پرچہ ہی شائع نہیں کیا۔ حالانکہ نیرنگ خیال کے سالنامہ پر دسمبر ۱۹۳۵ء صاف لکھا ہوا ہے ۔ ۔ ۔ دسمبر کا پرچہ ہے جو ۔ روپے سالانہ چندہ دینے والوں کو مفت ملتا ہے۔ نیرنگِ خیال کا دسمبر کا یہ پرچہ معترضین کے سال بھر کے پورے بارہ پرچوں کے مساوی ہے۔ نہ صرف وزن کے لحاظ سے بلکہ ہر لحاظ سے۔ اور یہ سالنامہ دو بار چھپ چکا ہے۔ اب تیسری بار اس کو چھاپنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ مگر دشمن برابر غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔ پریس کی مشکلات اور بعض اقتصادی مجبوریوں سے نیرنگ خیال چند ماہ سے بے ترتیب شائع ہو رہا ہے۔ پس اس پر دشمنوں کے حلقہ میں بغلیں بجائی جا رہی ہیں اور اردو کے اس سب سے بڑے خادم کو نقصان پہنچانے کے لئے جھوٹ بولنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ نیرنگِ خیال زندہ ہے اور انشاء اللہ زندہ رہے گا۔ اس کی اشاعت کی تاریخ میں جو نقص پیدا ہو چکا تھا وہ ہم بہت حد تک دور کر چکے ہیں۔ اور توقع ہے کہ دو چار مہینوں میں یہ شکایت ہمیشہ کے لئے رفع ہو جائے گی۔ اسوقت دو شاندار نمبر تیار ہو رہے ہیں۔ طالب کا افسانہ نمبر اور ایڈیٹر نمبر جو انشاء اللہ مقررہ تاریخوں پر ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گے۔

معاصرین سے التجا ہے کہ وہ تعاون اور اشتراک سے کام لیں۔ مشکلات سب کے راستے میں حائل ہوا کرتی ہیں۔ لیکن اس سے قومی اور لسانی مقاصد عالیہ کو نقصان پہنچانا اردو کی شہ رگ کو کاٹنے کے برابر ہے۔ نیرنگِ خیال کی تاریخ اشاعت تو دو چار ماہ میں بالکل درست ہو جائے گی۔ لیکن معاصرین کی یہ سرگرمیاں ہمیشہ یاد رہیں گی ؛

طالب نمبر کا وی پی

طالب کا افسانہ نمبر جو بیس شاہکار افسانوں کا مجموعہ ہے اور قریباً چھ سو صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ بڑی شان سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کا وی پی ہم ہر خریدار کی خدمت میں بھیجدیں گے لیکن جو صاحب اسے نہیں لینا چاہتے اور وہ عظیم رعایت حاصل کرنے کے متمنی نہیں ہیں جو ہم خریداروں کو دے رہے ہیں تو وہ کارڈ لکھ کر اطلاع دیدیں تاکہ اُن کے چندہ میں ایک ماہ کا اضافہ کر دیا جائے اور انہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔ گو وی پی کے وصول کرنے میں ہی خریداروں کا فائدہ ہے۔ لیکن حق انتخاب میں وہ آزاد ہیں ؛

(سب ایڈیٹر)

زندگی مستعار

(از جناب محمود صاحب اسرائیلی)

کرتا ہے گیتی پہ رقص ابلقِ لیل و نہار
تکتا ہے رہ رہ کے وہ دہر کا روئے نگار
چال نہیں استوار رنگ نہیں پائیدار
اس ہی کے قدموں سے ہے عمر کا اپنی شمار
زندگیٔ مستعار کو نہیں کچھ بھی نہیں قرار!

علم و ہنر حسن و عشق کس پہ کریں التفات
ان کو ہے درکار وقت ان کو ہے لازم ثبات
لمحوں کی موجوں سے پُر چشمۂ ایامِ زیست
پھر وہ رواں مثلِ برق کیا کرے ناکامِ زیست
زندگیٔ مستعار کو نہیں کچھ بھی قرار!

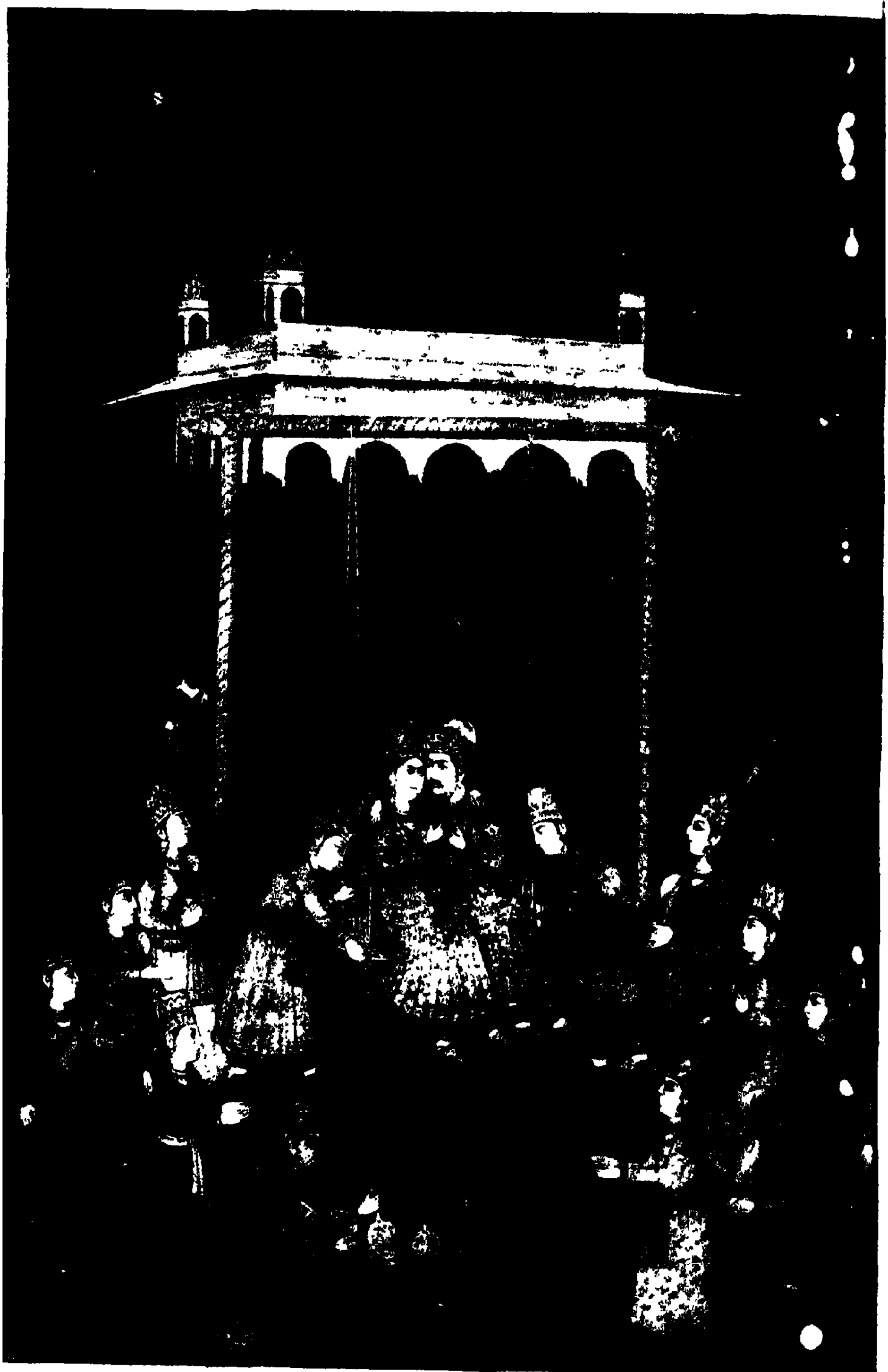
باغِ عمل میں اگر پھول شگفتہ ہوا
دامنِ نسیاں میں وہ جا کے نہفتہ ہوا
دیکھتے ہی دیکھتے اُڑ گیا رنگِ چمن
جلتے رہے برگ و بار رہ گئے سنگِ چمن
زندگیٔ مستعار کو نہیں کچھ بھی قرار!

کیا نہ کریں کیا کریں عذر کی مہلت کہاں
بہہ رہے ہیں دہر میں صورتِ موجِ رواں
زیست کا ہر واقعہ قلب کو برماتا ہے
اُٹھ کے وہ مثلِ حباب ماضی میں ملجاتا ہے
زندگیٔ مستعار کو نہیں کچھ بھی قرار!

قومیں اُبھرتی ہیں اور رہ کے فنا ہوتی ہیں
سنگِ حوادث کی ضربہ کے فنا ہوتی ہیں
ذرّوں سے گیتی کے چُن آئینہ ہائے زوال
ان میں نظر آئیں گے مدفنِ جاہ و جلال
زندگیٔ مستعار کو نہیں کچھ بھی قرار!

نغمۂ شیریں کی روح شعر کے قالب کو دے
جامِ جستجو زیست کے طالب کو دے
تیشۂ ہمت اٹھا سنگِ تساہل پہ مار
کر لے جو کرتا ہے آج کل کا کسے اعتبار
زندگیٔ مستعار کو نہیں کچھ بھی قرار!

(محمود اسرائیلی)



شاہان اودھ کی ایک پرانی تصویر

ارشاداتِ عالیہ

(از جناب دل شاہجہاں پوری)

پھر اعتبارِ عشق کے قابل نہیں رہا　　جو دل تری نظر سے گرا دل نہیں رہا

تسکین و ضبط کا متحمل نہیں رہا　　ناصح ترے فریب میں اب دل نہیں رہا

معراجِ چشمِ شوق ہے اے قیس وہ مقام　　حائل جہاں سے پردۂ محمل نہیں رہا

نشتر چبھوئے اب نہ پشیمانیٔ نگاہ　　مجھ کو تو شکوۂ خلشِ دل نہیں رہا

ٹکرائے سر کہاں کوئی مایوسِ آرزو　　مشقِ ستم تو شیوۂ قاتل نہیں رہا

آئی صدا کہ اب تری منزل قریب ہے　　جب امتیازِ جادۂ منزل نہیں رہا

وارفتگی نے مجھ کو پھرایا جہاں جہاں　　ان مرحلوں میں ساتھ کہیں دل نہیں رہا

ہر سجدۂ نیاز ہے محرومِ آستاں　　اپنی جبیں کا اب کوئی حاصل نہیں رہا

موجیں ابھار کر مجھے جس سمت لے چلیں　　حدِ نگاہ تک کوئی ساحل نہیں رہا

کیا کہئے اب مآلِ محبت کی داستاں　　یاد اس کی رہ گئی ہے مگر دل نہیں رہا

اے دل بہارِ حسنِ حقیقی نظر میں ہے
ہو محوِ رنگ و بو وہ مرا دل نہیں رہا

(دل شاہجہانپوری)

غزل

(از جناب ماسٹر باسط صاحب بسوانی)

خواب آزادی کی یہ تعبیر ہے — جاگنے پر پاؤں میں زنجیر ہے
کیا بتائیں کون شے تقدیر ہے — یہ مآلِ پرتوِ تدبیر ہے
میری آہ دل میں کیوں تاثیر ہے — یہ بھی کیا ان کی نگہ کا تیر ہے
خط پہنچ جائے کسی تدبیر سے — نامہ بر آگے مری تقدیر ہے
اُٹھ چکا ہے فرق حسن و عشق کا — میری صورت یار کی تصویر ہے
اپنے میں ذوقِ تصور کے نثار — سامنے گویا تری تصویر ہے
شکوہ پائمالئ دل پر کہا — جان لینے کی یہی تدبیر ہے
منع کرتا ہے کوئی فریاد سے — یہ ہماری آہ کی تاثیر ہے
پھر نہ چھوٹا جو ہوا پابندِ عشق — کس قدر مضبوط یہ زنجیر ہے
خاک پروانہ ہے پائے شمع پر — یہ نیازِ عشق کی تصویر ہے

مجرمِ اُلفت ہوں میں باسط ضرور
اور دل بھی قابلِ تعزیر ہے

(باسط بسوانی)

اندیشۂ سود و زیاں کب تک

از
(جناب منظر صدیقی اکبرآبادی)

یہ پروانوں کے پیراہن ہیں انساں سوزیاں کب تک
رہیں صرفِ فغاں کب تک جئیں آتش بجاں کب تک

کئے جائیں یونہی عمرِ محبت رائگاں کب تک
دیئے جائیں وفائے عاشقی کا امتحاں کب تک

نہ ہوں گے ضبط کی مجبوریوں سے نالہ خواں کب تک
ترے وحشی کریں گے پاسِ آدابِ فغاں کب تک

نہیں کوئی نظر جسکی نوازش ہو نہیں سکتی
مگر اے بدگماں میری نظر سے بدگماں کب تک

الٰہی منزلِ مقصود کے آثار پیدا کر
چلے جائیں یوں ہی ہم کاروان در کارواں کب تک

مثالِ اشک اک لمحہ ٹھہرنے ہی نہیں دیتی
تجھے روتے رہیں اے فطرتِ عمرِ رواں کب تک

فریبِ زیست کی تکمیل ہے ہر صبحِ شامِ غم
دیئے جائے گی دھوکے اور مرگِ ناگہاں کب تک

خزاں بجلی۔ گھٹا۔ صیاد۔ گلچیں۔ زلزلہ۔ آندھی
بچائیں اتنے مہلک حادثوں سے آشیاں کب تک

زبانِ حسن میں چھیڑیں گے ہم سازِ غزل اپنا
نہ ہوگی عادت دیکھیں تو محبت کی زباں کب تک

میں آخر حسن کے رومان کا عنوانِ رنگیں تھا
زبانِ حسن پر آتی نہ میری داستاں کب تک

نشیمن میرا کعبہ تو نہیں ہے اہلِ عالم کا
طوافِ گلستاں کرتی رہینگی بجلیاں کب تک

تنوع چاہتی ہے شوق کی نظارہ سامانی
رہے گا ایک حالت میں نظامِ دو جہاں کب تک

قریب و دور دونوں راستے جب تجھ سے ملتے ہیں
تو یہ قربِ مکاں کیسا۔ یہ بعدِ لامکاں کب تک

کوئی ان ضبط کی تاکید والوں سے یہ پوچھ آئے
کریں بیٹھے رہیں خاموش مجبورِ فغاں کب تک

غمِ ہستی بہ صورت فیضِ زیست ہے منظرؔ
اٹھا بھی لے یہ غمِ اندیشۂ سود و زیاں کب تک

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدر اعظم سے کہا۔ دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کر سکوں۔ تعمیل حکم کیلئے فردوس مثال کشمیر جنت نظیر سوئزرلینڈ شباب انگیز تسمانیہ اور گل پاش مرغزاروں میں گل چینی کی گئی.... جب سب پھول دور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے اور باقی اسقدر مرجھائے ہوئے تھے کہ مہارانی کی حسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی۔ مہارانی اس خواہش کے پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی۔ کھانا پینا ترک کر دیا مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا اور وزراسے مشورہ طلب کیا۔ مہتمم توشہ خانہ نے "اصغر علی محمد علی" سے عطر منگوانے کو کہا۔ رائے معقول تھی۔ فوراً عمل کیا گیا۔ جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا۔

منگانے کا پتہ

اصغر علی محمد علی تاجران عطر۔ لکھنؤ و دہلی

دورِ حاضرہ میں انفرادیت!

(از۔ جناب محمد موسےٰ خاں کلیم۔ ایم اے)

کپلنگ کا نظریہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب......"

گونتا ہر اہرمعنی نظر آئے لیکن اہلِ نظر کے سامنے اس کی چنداں وقعت نہیں۔ کیونکہ مشرق و مغرب ہمیشہ ایک دوسرے کے خیالات اور تحریکات سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ اور در اصل یہی خیالات اور تحریکات ہی انسانی زندگی کا نچوڑ ہوتے ہیں۔ انہی سے کشتِ تمدن کی آبیاری ہوتی ہے قرون وسطیٰ میں بلکہ اُس سے قرنوں پہلے بھی مشرق مغرب کا معلم رہا ہے اور اگر آج مغربی تہذیب کو بغور دیکھئے اس کے تعمیری اجزا کا جائزہ لیجئے تو اس میں مشرقی مذہب اور تمدن کا بیشتر حصہ نظر آئے گا۔ یہی خیالات کی رویں جیسا کہ مشرق سے مغرب کو کبھی جاتی تھیں اور وہاں ویران خطوں کو آباد کرتی تھیں۔ آج مغرب سے مشرق کو آ رہی ہیں اور کون انکار کرسکتا ہے کہ ان کا جائز استعمال ہمیشہ سود مند رہے گا۔ انہی میں سے ایک روشِ خیال یا تحریک انفرادیت کی ہے جس کا اثر آج کل مشرق قبول کر رہا ہے۔

بیشتر ازیں کہ ہم اس کے حسن و قبح پر بحث کریں مناسب ہے کہ انفرادیت کے معنی وضاحت سے بیان کردیں۔ مغربی اصطلاح میں یہ لفظ "خود اعتمادی" "اپنے آپ پر انحصار" اور "سب کچھ اپنے لئے" کے مفہوم کا حامل ہے۔ سرسری نگاہ میں یہ تینوں معنی نہایت دلپذیر ہیں۔ اور اپنے اندر اسقدر جاذبیت رکھتے ہیں۔ کہ آج کل مغرب میں لفظِ انفرادیت نے ایک جذبہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے جونہی یہ منہ سے نکلا۔ مذکورہ بالا مفہوم سماعت کے ساتھ ہی دل تک اُتر گیا۔ ہر پیر و جوان اس بات کا متمنی نہیں بلکہ شیدائی ہے کہ اُسے (Self-made man) یعنی از خود ایستادہ انسان کہا جائے اور یہی نہیں اکثر لوگوں کو اس بات کا یقین ہے کہ وہ اپنے زورِ بازو یا قابلیت سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ خیال کب اور کیونکر پیدا ہوا؟

اس کا سنگِ بنیاد یونان میں ابیقورس کے فلسفے نے رکھا۔ جس کا مقصد صرف فرد کو اپنی خوشحالی اور اطمینان حاصل کرنے کی تعلیم دینا تھا۔ مگر چونکہ یونانی تہذیب اس کے بالکل مخالف تھی (جس کا مدعا فرد کو سوسائٹی کا اعلیٰ رکن بنانا تھا) اس لئے یہ فلسفہ اپنے موجد کے بعد بہت دیر تک زندہ نہ رہ سکا اور اس کے بنیادی خیال دیگر تحریکات فلاسفہ میں جذب ہوگئے۔

مسیحی اور بالخصوص ... تہذیب صرف اتحادِ نسلی پر زور دیتی رہی اور یہ دونوں قومیں اسی کو اپنا مائہ ناز سمجھتی رہیں۔ بعد ازاں عیسائی ... انسانی زندگی کا مقصد دلیں ریاضت اور مجاہدے سے نروان حاصل کرنا ...

انفرادیت کا عنصر موجود تو تھا۔ لیکن کمزور صورت میں۔

اسلامی تمدن ان سب سے جدا ہے اس کے نزدیک خود کا ملت میں گم ہو جانا ہی اعلےٰ ترین نیکی ہے اس لئے جب تک اسے غلبہ رہا انفرادیت کا وجود معدوم تھا مگر جب سے ایرانی تصوف جس میں اپنشدوں کے فلسفہ کا رنگ غالب ہے داخل اسلام کر لیا گیا۔ تب سے انفرادیت کی نشوونما دوبارہ شروع ہو گئی۔

یوں تو کئی ایک عناصر اس کی ترکیب میں کار فرما ہے لیکن بنتھم کا نظریۂ افادیت (Utilitarianism) ہی موجودہ دور میں اس کا سنگ بنیاد ٹھیرا۔ اور اسے جسقدر تقویت پہنچی کارخانہ سازی ہی سے پہنچی گویا انگلستان کا صنعتی انقلاب (انڈسٹریل ریولیوشن) اس جذبہ کے نشوونما کا سب سے بڑا سبب تھا۔ "افادیت" کی تعلیم فرد کی آزادی۔ اس کا اپنی مسرت کے اسباب خود پیدا کرنا دولت کمانے کے لئے ہر شعبہ میں مقابلہ کی اجازت اور ایک پیہم جد وجہد تھی۔ اس نے فرد کی حیثیت کو زیادہ نمایاں کر دیا۔ کارخانہ سازی اور مقابلۂ صنعت وحرفت نے اُسے ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ معاملہ یہانتک پہنچا کہ مرد تو مرد عورتیں اور بچے بھی کارخانوں میں کام کر کے خود اپنا پیٹ پالنے لگے۔ اب سوائے بیمار ولاچار کے کوئی شخص دوسرے پر منحصر نہ رہتا۔ اور بقول مشہور انگریزی مفکر برٹرینڈ رسل "خانگی زندگی میں اسقدر انقلاب آیا کہ باپ کی جگہ حکومت نے لے لی"۔ یہی نہیں بلکہ جرمنی میں ایک نئی روشنی خیال نمودار ہوئی جسے نظریۂ "برتر انسان" (Superman Theory) کہا جاتا ہے اور جس کا موجد مشہور مفکر نٹشے تھا۔ اس نے انفرادیت کو اُس حد تک پہنچایا کہ جہاں سے آگے بڑھنے کی گنجائش تک نہیں۔ اس کا اصول ہے کہ ہر فرد کو حق حاصل ہے کہ جو بھی اس کی راہ میں حائل ہو اُسے اپنی بہبود کے لئے پائمال کر دے۔ یہاں تک کہ کمزوروں کا دنیا میں نام نہ رہے اور نسل انسانی قوی سے قوی تر ہو کر اپنی معراج کمال یعنی "برتر انسان" (Superman) کا درجہ حاصل کرے۔ یہ اس سلسلۂ خیال کی آخری کڑی تھی جو دو ہزار برس قبل ابیقور کے فلسفے سے پیدا ہوا تھا اور جس نے بنتھم کے نظریۂ "افادیت" اور انگلستان کے صنعتی انقلاب پر وہ ترقی پائی تھی۔

اب ذرا اس خیال کا نفسیاتی پہلو لیجئے یعنی اس امر کا پتہ لگائیں کہ یہ کیوں کر مرغوب ہوا۔ ماہرین نفسیات جانتے ہیں۔ کہ انسان میں دو جذبات بڑے نمایاں ہیں۔ اول اسے ماحول میں اپنی برتری۔ دوم خود پسندی۔ اور یہی دو جذبات اکثر ناشکری کا باعث ہوتے ہیں۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی کا ممنون نہیں دیکھنا چاہتا اور یہ ممکن نہیں کہ بغیر کسی کی امداد یا معاونت کے انسان جس منصب پر چاہے پہنچ جائے۔ بلکہ ایک حد تک وہ ہر کام میں دوسروں کا محتاج ہے۔ اور جب تک اسے غرض [illegible] حصول مدعا سے قاصر رہتا ہے۔ لیکن ادھر فطرت کا تقاضا ہے کہ ممنون کسی کا نہو۔ گویا احسان کے بعد اس کے دل میں [illegible] جاتی ہے وہ اسے کسی نہ کسی تاویل سے محو کرنا چاہتا ہے اور یہی ناشکری آہستہ آہستہ احسان کی قدر و منزلت [illegible] کر دیتی ہے۔ بلکہ احسان کو وہ بے جا حمایت سمجھ کر نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اسی لئے والدین کی پرورش [illegible] کو ان کا فرض سمجھتا ہے اور اس کا معاوضہ لازم الفت کا اختیاری جذبہ اس کے نزدیک محتاج

اور دستور سے بڑھ کر نہیں ہوتا اور یہی ناشکری ہی وہ تیر ہے جس سے خانگی زندگی کی بیخ و بُن کٹ جاتی ہے۔ جس سے رشتہ داری کی تمام ذمہ داریاں زائل ہو جاتی ہیں اور جس سے خانگی مسرتیں عنقا ہو جاتی ہیں۔ یہی بیج ہے۔ جس سے انفرادیت کی شاخ پھوٹتی ہے اسی کی بدولت آج یورپ میں "گھر" نہیں رہا وہ صرف ایک مکان ہوتا ہے جہاں چند افراد رہتے ہیں۔ وہ چند افراد جنہیں اپنی مسرت کیلئے اپنی خوش وقتی کے لئے سینما تھیٹر یا کلب جانا لازمی ہے۔ انہی ایک مکان میں رہنے والے افراد کی طبائع میں اسقدر اختلاف ہوتا ہے کہ الاماں۔ قیاس میں نہیں آسکتا۔ بھائی نہیں جانتا کہ بہن کا کیا مذاق ہے۔ وہ کن لوگوں سے میل جول رکھتی ہے۔ بہن کو اس سے غرض نہیں کہ بھائی کس مزاج کا ہے۔ اپنی گذران کیونکر کرتا ہے وغیرہ اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ دونوں کو اپنے اپنے مفاد سے غرض ہے۔ دونوں میں انفرادیت کا زہر اثر کر چکا ہے۔ گھر چھوڑ کر ہوٹل اور کلب دوڑ جانے کا ایک اور بھی سبب ہے مغربیوں کی خود پسندی اسقدر بڑھ چکی ہے کہ وہ ہر ایک معاملے میں خود کو دوسرے پر برتر سمجھتے ہیں۔ اُدھر مادہ پرستی نے ان کی تمام روحانی مسرتوں کا قلع قمع کر دیا ہے جب کبھی ایک شخص دوسرے کے گھر جاتا ہے۔ تو وہ اس کی عمدہ اشیا کو دیکھ کر بے حد پریشان ہوتا ہے اور اس پریشانی کا دفعیہ اس کے نزدیک یہی ہے کہ اپنی اشیا کی تعریف کرے اپنی پسند کو برتر قرار دے اور چونکہ میزبان کو رسماً واجب ہے کہ وہ خاموش رہے اور اختلاف نہ کرے لہذا وہ اندر ہی اندر کڑھتا ہے اور یہی چاہتا ہے کہ کہیں اور ہو تو اس کو خوب جواب دوں۔ اسی لئے ہوٹل یا کلب ان کے لئے گھر کی جگہ کا کام دیتے ہیں۔ جہاں ان کے حربے بآسانی اور بلا تکلف استعمال ہو سکتے ہیں اور وہ اپنی انفرادیت کا مظاہرہ دل کھول کر کر سکتے ہیں

اسی طرح نفسیاتی تجزیہ سے ایک اور دلچسپ انکشاف ہوتا ہے۔ اس دنیا میں ہر شخص اپنے لئے ایک "مقام تسکین" پیدا کر لیتا ہے یعنی اپنے اندر کسی خاص خوبی کو استوار سمجھ کر اُسے اپنا مایۂ ناز قرار دے دیتا ہے اور ہر خفت و تذلیل میں اُسی مقام کی طرف رجوع کرتا ہے کیونکہ اس مقام پر اسے اپنا مدِمقابل کوئی نظر نہیں آتا اور اسی مقام پر پہنچکر اس کی انانیت کی کما حقہ پرورش ہوتی ہے۔ یہ مقام مختلف بنا پر قائم ہوتا ہے۔ لیکن اکثر اس کی بنیاد تجربہ۔ علم۔ پرہیزگاری یا دولتمندی میں سے کسی ایک پر رکھی جاتی ہے۔ نیز اکثر لوگوں کی انانیت پروری اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنے "قیام تسکین" سے باہر نکلنا پسند ہی نہیں کرتے اور جب کبھی مجلس میں گفتگو کا سلسلہ ان کے مذاق سے بدلے تو وہ فوراً بیقراری کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی انانیت پروری جو ہم سے "مقام تسکین" پیدا کراتی ہے۔ جذبۂ انفرادیت کو بے حد قوت بخشتی ہے۔ چنانچہ مذاق کے فطری اختلافات کو مٹانے۔ ان کے باہمی دماغی تعلق پیدا کرنے۔ اور اس کی بنا پر سوسائٹی کو ایک ہی نکتہ نگاہ پر لانے کے لئے قدیم الایام سے قدرت کی خدمات حاصل کی جا رہی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ یورپ کے لوگ دن اپنی انفرادیت کے ہاتھوں تنگ ہو کر نئے نئے کلٹ (cult) اور نئی نئی تحریکات کی بنیاد رکھتا ہے۔ ہاں یہاں ایک اور نکتہ یاد آیا۔ اکثر لوگوں کا خاصہ ہوتا ہے کہ اپنی برائی کو کسی کے ذریعے دوسری برائیوں سے کم قابلِ ملامت کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک سود خوار کبھی اپنے ہم پیشہ کی [illegible] نہ کرے گا۔ جتنا کہ ایک زانی کی۔ ایک شراب خوار کی۔ ایک قمار باز کی اور یہی انفرادیت کا سیاہ ترین [illegible]

فات کو الزام سے بچانے کے لئے برائی کے وجود میں کیفیت لا کھڑی کرتے ہیں۔

ہمارے خیال میں قومیت کا جذبہ جو آج کل مغربی سیاسیات کا اصول اساسی بن رہا ہے۔ اس انفرادیت کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور جیسا کہ موجودہ زمانے میں انفرادیت کا سنگِ بنیاد افادیت ہے ویسے ہی قومیت کے اصول بھی اسی پر قائم ہیں۔ چونکہ انفرادیت کی یہ صورت یعنی نیشنلزم چند ایک اور جذبات کی ملاوٹ سے زیادہ رنگین بن جاتا ہے۔ اس لئے مشرق اس کا اثر نہایت سرعت سے قبول کر رہا ہے اور آج ترکی اور جاپان کا تو کیا ذکر ایران و افغانستان تک اس رنگ میں رنگے جا رہے ہیں۔ دنیا اسی ترقی کو سب سے بڑی کامیابی سمجھتی ہے اور دردمندانِ جہان کی تمام بین الاقوامی اتحاد کی کوششیں اس کی چیرہ دستیوں سے پامال ہو رہی ہیں۔ اور اسی کے ہاتھوں تہذیب عالم اسلام کے تیرہ صدی پیشتر پیش کردہ اصول سے کہ جس میں عالمگیر اخوت کا پیغام تھا۔ بھی فروتر ہے۔

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ انفرادیت کا اصول ایک حد تک مشرق کی سست رو اقوام کے لئے تازیانہ ہے۔ جو ان کی انفرادی قوتِ عمل کو تیز کرتا ہے۔ اور جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں اس کا جائز استعمال قومی بیداری کے لئے ضرور سودمند ہوگا ✦

(محمد موسیٰ خاں۔ کلیم)

ہندوستانی لسانیات

{از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد) کتابت طباعت کاغذ عمدہ۔ حجم ۲۰۶ صفحات۔ قیمت (عمر)

شکر ہے کہ اب اردو میں بھی اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ اس میں دقیق سے دقیق موضوعوں پر لکھا جا سکتا ہے۔ لسانیات اپنی باقاعدہ اور منظم شکل میں انیسویں صدی کے نصف آخر کی پیداوار ہے۔ سب سے پہلے اردو میں اسے مولانا آزاد مرحوم نے اپنی مشہور کتاب "سخندانِ پارس" کے ذریعہ روشناس کرایا۔ لیکن اس میں صرف زبان پارسی پر ہی بحث کی گئی ہے اس کے بعد کسی حد تک اعجازِ سخن اور پھر نہایت عمدگی اور کامیابی کے ساتھ پنجاب میں اردو میں حافظ محمود شیرانی نے اس پر روشنی ڈالی۔ لیکن کتاب زیرِ نظر پہلی اردو تحریر ہے۔ جس میں اس فن کی تاریخ اور اصول و قواعد سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں ان اسباب کا ذکر ہے۔ جو زبانوں کی تشکیل اور ترقی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی حصہ میں دنیائے عالم کی زبانوں کی خاندانی تقسیم کا بھی ذکر ہے۔ دوسرے حصہ میں اردو کے ماخذ اور اس کی عہد بہ عہد ترقیوں کا بیان کر کے کتاب کو موجودہ اردو [illegible] پر ختم کیا گیا ہے۔ کتاب میں ہندوستان کا ایک لسانی نقشہ اور آخر میں ایک مفصل اشاریہ (انڈکس) ہے۔ جابجا شائستہ [illegible] پیش کردہ [illegible] ہے۔ غرضیکہ پہلی کوشش ہونے کے باوجود کتاب بہت کامیاب ہے۔ ہم فاضل مصنف کو مبارکباد دیتے اور اس فن سے [illegible] کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں ✦

ایک یادگار خط

(پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ صاحب مرحوم کا غیر مطبوعہ خط)

(بہ عنایت و اجازت صفوۃ اللہ بیگ صوفی)

۲- فروری کا خط پہونچا۔ زندگی کے مدوجذر اور تعلقات کی کشمکش کے حالات معلوم ہوئے۔ اس خیال سے کہ ایک عزیز اور البیلے دوست کو ان کا تجربہ کرنا پڑا۔ افسوس ہوا تم باغِ آفرینش کے آزاد بلبل ہو فقط گلہائے رنگین کی سیر اور نغمہ خوانی پسند کرتے ہو۔ مگر پیارے اس کا نام دنیا نہیں ہے۔ دنیا ایک ایسا میدان ہے۔ جس کی زمین میں جال بچھا ہوا ہے۔ اس کی جھاڑیوں میں خوش رنگ اور نظر فریب پھول کھل رہے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ان میں ایسے پوشیدہ خار ہیں۔ کہ گل چینوں کے دامن میں اُلجھ جاتے ہیں۔ زندگی کی سڑک جو اس میدان میں سے گذرتی ہے بڑی ناہموار ہے۔ کہیں تو پہاڑ جیسے بلند ٹیلے ہیں اور کہیں چاہ و خندق جیسے گڑھے۔ ناسمجھ انسان نے اس نشیب و فراز کا نام ترقی و تنزل رکھا ہے۔ وہ کسی نشیب سے بہ ہزار دقت جب کسی بلند مقام پر آتا ہے تو دور سے جھاڑیوں کے سبزے اور پھولوں کی بہار اور ہوا کی لطافت سے اس کو خوشی ہوتی ہے۔ وہ اس سے زیادہ بلند ٹیلے پر اس امید میں پہونچنے کی کوشش کرتا ہے۔ کہ وہاں اس سے زیادہ لطف ہوگا۔ لیکن وہاں تک پہونچنے میں کہیں وہ کسی جال میں گرفتار ہوتا ہے کہیں کانٹوں الجھتا ہے کہیں ٹھوکریں کھاتا ہے اور ان سب تکلیفوں کو اپنی اُس دُھن میں جسکو امید کہتے ہیں سہتا ہے۔ اور ہمت کے بازوؤں میں جسقدر قوت ہے اسی قدر رفعت تک پہونچ جاتا ہے۔ جو لوگ راستہ کی حقیقت سے آگاہ ہیں اور اسی میدان کے مرد ہیں وہ "سالک" کہلاتے ہیں۔ یہ دوسروں کی نسبت بسہولت اور جلدی منازل طے کرتے اور مقامِ مقصود پر پہونچ جاتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے ایک صراطِ مستقیم معلوم کرلی ہے۔ میرے دوست اس راستہ کی پیروی کرو۔ واقعات کی حقیقت میں . . . . غور کرو۔ ان کی علت و معلول کا ایسا پتہ چلاؤ کہ تغیراتِ عالم کا راز کھل جائے اور پھر تم تکلیف و راحت کی کنہ معلوم کرلوگے اور اس کا نتیجہ ہوگا حقیقی راحت۔ حقیقی خوشی۔ حقیقی تسکین اور حقیقی اطمینان اور خداوند تعالےٰ اپنے فضل و کرم سے یہ حالت تمہیں نصیب فرمائے۔

برخوردار . . . . . . کے تولد کی مبارکباد کا شکریہ۔ انسان کا خاصہ ہے کہ اسپر سوسائٹی کے خیالات رسم و رواج عادات و خصائل کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے اور جو اعتبار ملک میں قائم ہو جاتے عقل اس کو نہیں توڑ سکتے حتی کہ انسان انعاماتِ خداوندی کو بھی اُسی اعتبار کی میزان میں تولتا ہے اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں [illegible]

حکمت بالغہ الٰہی نے اولاد کی پرورش ماں باپ کے ذمہ فرض کی ہے اور محبت کی خوشی اس کی اجرت ہے۔ اس لحاظ سے کسی ودیعت ربانی کا عطا ہونا ہی قابل شکریہ ہے۔ اور پرورش و تربیت کی حق قدرہ سعی کرنا اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ جملہ چیزیں کے ہم مالک نہیں بلکہ خادم ہیں اس میں ہمیں اپنے اظہار پسندیدگی اور انتخاب کا حق بھی نہیں ہے۔ میں اپنے متعلقین کی خبرگیری صرف عباد اللہ کی خدمت انجام دہی کے طور پر کرتا ہوں۔ اور جب اس میں ایک معصوم چھوٹے شخص کا اضافہ ہوا تو میں نے بلا تردد اس کو اپنے دامن مراد میں لیا۔ اگرچہ بلحاظ دختر ہونے کے اس کی پرورش وغیرہ کے کاموں کی انجام دہی قدر مشکل ہو۔ لیکن جب انسان اپنی استطاعت اور قوت کے بموجب ادائے حق میں کوتاہی نہ کرے تو وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گیا۔ جس حصہ کی تکمیل خود قدرت و مشیت ایزدی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے لئے فکر و تشویش کی ضرورت نہیں۔

بعض احباب یہ خبر سنکر خاموش ہو رہے تھے۔ تم چونکہ انعامات خداوندی کے قدردان ہو۔ بغیر اظہار مسرت نہ رہ سکے۔

میرا ارادہ آئندہ جون میں دہلی آنے کا ہے۔ امید ہے کہ آپ کی ملاقات کی مسرت صعوبت سفر کا اچھا معاوضہ ہوگی۔

خوشا وقتے و خرم روزگارے　　　کہ یا بے برخورد از وصل یارے

(حقوق محفوظ)　　　(سجاد)

کیف سخن انتخاب کلام سید رضی الدین حسن کیفی مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین زور۔ قیمت بارہ آنے۔ ۱۲/

ڈاکٹر صاحب کی یہ تیسری کتاب ہے۔ جس میں دکن کے مشہور صوفی شاعر کیفی کا کلام درج ہے۔ اول اول صوفی سجاد علی سے کلام دکھایا۔ ان کی وفات کے بعد داغ سے بھی استفادہ کیا۔ اس لئے ان کے کلام میں ہر رنگ ... لیکن ان کا اصل کارنامہ ان کی وہ نظمیں ہیں جو انہوں نے مختلف تقریبوں پر قلمبند فرمائیں جن میں سے بعض کا انتخاب اس مجموعہ میں بھی شامل ہے۔ شاعر ہونے کے علاوہ وہ بہت اعلیٰ نثار بھی تھے۔ دکن کا روزانہ اخبار صحیفہ انہوں نے ہی اول اول ... رسالہ کی صورت میں شائع کیا تھا۔ غرضیکہ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ دو رندانہ شعر سنئے۔

تم بھی تو روز دیکھتے رہتے ہو آئینہ　　　سچ بولو کیا پسند یہ صورت کسی کی ہے

تم مجھ کو دیکھو جو محبت کی نظر سے　　　تڑپے کہ نہ تڑپے کوئی تم سے کہ نہ ترسے

اس میں ... صاحب کا فوٹو بھی شامل ہے۔ شروع میں ڈاکٹر زور کا ایک مختصر تاریخی تبصرہ دکن کی ... صاحب کی اس سلسلے کی قدر کرنا چاہئے۔

وت انغ امون فرعون مصر کی بد دعا

(از ۔ اگسٹس سومرول)

~~~~~~ (ترجمہ ۔ مالک رام ۔ ایم اے ۔ ایل ایل بی ۔ لاہور)

مصر قدیم ۔ وہ رازوں کی سرزمین ۔ اور تمام علوم روحانی کا گھر جانتا تھا ۔ کہ مردوں کو کیسے محفوظ کیا جا سکتا ہے ۔ جان
ار اور فرمانبردار غلاموں کی وہاں کمی نہ تھی ۔ جو خوشی اور شوق سے اپنے محبوب آقا کے ساتھ قبر میں دفن ہو جانے کو تیار
ے ۔ لیکن روح کو کیسے باندھا جائے ؟ اسے کس طرح مجبور کیا جائے ۔ کہ ہمیشہ مستعد اور چوکنی رہے ۔ اور مادی اور روحانی
بیات کی نگہبانی کر سکے ؟ یہ سوال تھا جس کا حل سوچنا اصل مقصود تھا ۔ صحیح طریقہ ہپناٹزم کا تھا ۔ اور ایسا ہپناٹزم جو
رونی سطح سے گذر کر روح کے عمق تک پہنچ جائے ۔ اور اسے حکم دے ۔ "ٹھیری رہو یہاں ۔ اور اپنے آقا کی نگہبانی کرو یہی
یا تک ۔ اس کو خراب کرنے والے پر وبا اور موت نازل کرو ۔ اور اس کی عزت کرنے والے کو سکون و راحت عطا کرو"۔
ومیں اپنے تصور میں ہزارہا غلاموں کی روحوں کو ۔ ان کے دل پر اس حکم کو منقوش ۔ اپنے شاہی آقا کی لاش کی حفاظت
تے دیکھتا ہوں ۔

یہ نظریہ کچھ عجیب و غریب سا معلوم ہوگا ۔ لیکن میں اسی موضوع پر ایک اور مصنف کا حوالہ دیتا ہوں ۔ توت
ع امون کے مقبرے کی کھدائی کے بعد جو پر راز موتیں ہوئی تھیں ۔ ان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے
نارڈ آئلز نے "سنڈے ایکسپریس" میں لکھا تھا :۔

"اس بیسویں صدی میں جبکہ ہر طرف مادیت کا دور دورہ ہے ۔ مصر کے جادو کا ذکر بے محل تو ہوگا ۔ لیکن اس طرح کے حادثات انسان کو حیران کرنے کے لئے کافی ہیں ۔ کہ واقعی لوگ جو بد دعاؤں میں یقین رکھتے ہیں ۔ ان میں کچھ صداقت بھی ہے ۔

بہت لوگوں نے برٹش میوزیم کی "منحوس ممی" کے متعلق سنا ہوگا ۔ جس کی وجہ سے ان لوگوں پر غیر معمولی تکالیف آئیں جن کا کسی طرح اس سے واسطہ پڑا ۔ اور ہم میں سے بعض نے ممی کے کیس کی جہاز "ٹائٹانک" پر کے ساتھ غرق ہونے کی خبر بھی سنا ہے ۔ جب یہ سمندر میں غرقاب ہو گیا"۔

اس امر کے مصدقہ ثبوت ہیں کہ جن لوگوں نے کلیو پیٹرا کی سوئی کو انگلستان میں پہنچایا ۔ ان پر کیا کیا مصائب نازل
ہوئے ۔ ممیوں پر جو کتبے ہیں ۔ وہ بھی اسی طرح کی تکلیفوں کی شہادت دیتے ہیں ۔
~~~~~~

ماہرین ان باتوں میں کہاں تک اعتقاد رکھتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا۔ لیکن یہ واقعہ ہے۔ کہ برٹش میوزیم کی جو گیلری میں ممیاں پڑی ہیں۔ وہاں لوگوں کی نشست کے لئے بنچوں کا کوئی انتظام نہیں۔ کیا منتظمین کا یہ خیال ہے۔ کہ ان چیزوں کے درمیان پھرنا درست نہیں؟

میں ان باتوں پر اعتقاد رکھتا ہوں۔ میں نے مصریات کا تھوڑا بہت اور روحانیات کا غالباً بہت کافی مطالعہ کیا ہے۔ آپ انہیں نہ مانیں۔ لیکن غالباً یہ آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ کہ یہ چیزیں کس طرح معرض وجود میں آتی ہیں۔

تاریخ مصر قدیم کے مختلف زمانوں میں مُردوں کی حفاظت کے لئے مختلف ذرائع استعمال کئے گئے اور امرا اپنے جسموں کے لئے عظیم الشان قبریں بنوانے کے لئے خاص اہتمام کرتے تھے۔

مذہب کے انحطاط کے زمانہ میں یہ لاشیں کئی مذہبی تقریبوں میں استعمال کی جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر بچے کا گوشت خصوصاً جب کہ اس نے کبھی علیحدگی کی زندگی بسر نہ کی ہو۔ نہایت باریک قیمہ کی صورت میں کاہن کے جسم پر ملا جاتا تھا۔ اس سے وہ اچھے "واسطہ" کا فرض انجام دے سکتے تھے۔ اور مخصوص رسوم کے دوران میں ان کی روح اس جسم کو چھوڑ سکتی۔ اور پھر واپس آ جاتی تھی۔

ایک وقت یہ خیال تھا۔ کہ روح برسوں بعد اپنے جسد خاکی میں رجوع کرتی ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہوا کہ جسم محفوظ رکھا جائے۔ تاکہ روح واپس آنے پر گھر نہ ملنے کی وجہ سے آوارہ نہ پھرتی رہے۔ ایک دوسری جماعت کا خیال تھا۔ کہ روح اس وقت تک زمین پر پھر نہیں آئے گی۔ جب تک اس کا جسم بعینہ محفوظ ہے۔

یہی وجہ تھی کہ لوگ اپنے رہائشی مکان کی فکر سے پہلے اپنے مقبرہ کا انتظام کرتے تھے۔ وہ اس میں متعدد چھوٹے چھوٹے بت رکھ دیتے تھے۔ جنہیں "اشابٹ" کہتے تھے۔ ایسے بے شمار اشابٹ برٹش میوزیم میں رکھے ہیں۔ یہ عموماً نیلی یا سبز مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ گویا جیسی شکل بالکل زندہ انسان کی طرح۔ مردہ شخص کے پاس ان اشابٹ کا ہونا اس امر کا ثبوت تھا۔ کہ وہ عالم ارواح میں ان لوگوں کو بطور غلام رکھ سکتا تھا۔ جن کی تمثیل ان اشابٹ میں تھی۔

کاہنوں اور امیروں کی خاص حفاظت کا مقام خیال کیا جاتا تھا۔ اور فرعون کے جسم کی تو ہمیشہ بہت حفاظت ہوتی تھی کیونکہ وہ سب سے بڑا کاہن تھا۔ وہ تمام رموز کا منبع تھا۔ وہ رموز جن کے متعلق کتاب خروج کا بیان ہے۔ کہ حضرت موسےٰ بھی ان کے ماہر تھے۔

دنیا کی تاریخ میں یہ کاہن غالباً سب سے بڑے روحانی اور ساحر ہوئے ہیں۔ بظاہر وہ جب چاہتے تھے اپنا جسم چھوڑ دیتے تھے۔ اور دیگر علوم کے علاوہ ایک خاص قسم کا ہپناٹزم بھی جانتے تھے۔ جو عالیہ انسان کے علم سے باہر ہے۔ جب کسی شخص کو [illegible] ایک ہوتا تھا۔ یہ کاہن غلاموں کو ایسی ایسی اذیتیں دیتے تھے۔ کہ آج ان کا ذکر بھی درد سے خالی نہیں [illegible] کے بعد یہ غلام موت کے کنارے پر ہوتا تھا۔ اور خوف کے مارے اس کی یہ حالت ہوتی تھی۔ کہ وہ اپنا

اذیت دہندہ کے رحم وکرم پر ہونے کی وجہ سے اس کا "بندہ" ہوتا تھا۔ اسے ایک مضبوط ہپناٹزم کا تصور دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ لیکن اس کی روح کو کسی جگہ یا شے سے وابستہ کر دیا جاتا ۔ اور اس میں وہی ایک خیال جاری و ساری ہوتا تھا جو اذیت کے دوران میں اس پر حاوی کیا جاتا تھا۔

اسی طرح کئی روحیں توت اخنع امون ایسے عظیم الشان شخص کے مقبرے سے وابستہ ہوں گی ۔ اور انہیں سوائے ایک بات کے اور کسی چیز کا علم نہیں ہوگا جو ان پر ٹھونسی گئی ہے۔ تباہ کرو۔ تباہ کرو۔ تباہ کرو۔

اگر کبھی مقبرہ یا ممی کا خول یا کوئی جواہر جو ایسی "شے" کی حفاظت میں ہو۔ چھیڑا جائے۔ تو یہ "شے" مخل ہونے والے کو چمٹ جاتی ہے۔ اور اپنے ساتھ گویا جہنم کی فضا لے آتی ہے۔ توحش۔ اداسی اور تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ بارہا اس کا نتیجہ خودکشی ہوتا ہے۔ طاقت ضبط محو ہو جاتی ہے۔ اور بظاہر کوئی معمولی حادثہ ہوتا ہے۔ مثلاً موٹر کا تصادم وغیرہ۔ بعض دفعہ اچانک اس کے ہاتھ تلے بندوق چل جاتی ہے یا موٹر کے پہیئے پر ضبط نہیں رہتا۔ ان متواتر خیالات سے صحت بھی خراب ہو جاتی ہے اور معمولی سی علالت کا بھی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔

بدقسمت غلام کی روح اپنے قدیم احکام کی تعمیل کرنے کے بعد بعض اوقات آزاد بھی ہو جاتی ہے۔ پھر یہ عالم رفتگان میں داخل ہوتی ہے۔ جیسے ابھی اس نے جسد خاکی کو چھوڑا ہو۔ ورنہ یہ بدستور تباہ کرتی رہتی ہے۔ تاوقتیکہ کوئی نجات دہندہ اسے رہا نہ کرے

اگر مصر کے قدیم مقامات کی کھدائی جاری رکھنی ہے تو پھر ان روحانیوں کو جو ان بے جسم "اشیاء" کو دیکھ سکتے ہیں اور نجات دہندوں کو جو انہیں رہا کر سکتے ہیں۔ ہمارے سائنسدانوں کے ساتھ جا کر پہلے ان مقامات کو ان سے کلیتہً پاک کر دینا چاہیئے۔

موجودہ دنیا میں سائنس کا وہی مقام ہے جو ازمنہ قدیم میں جادو کا تھا۔ آج سائنس کی طاقت سے ہم وہ بھاری بھرکم پتھر لڑھکا سکتے ہیں جو اس سے پہلے جادو غلا پیدا کر کے کرتا تھا۔ جوں جوں مادی تہذیب ترقی کرتی جاتی ہے جادو غائب ہو رہا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیئے۔ کیونکہ سائنس کئی آدمی حاصل کر سکتے ہیں ۔ حالانکہ جادو پر محض چند ایک کو وہ بھی بے شمار جسمانی و روحانی تکالیف کے بعد دسترس حاصل ہوتی ہے ۔

اس تمہید کے بعد میں ان اموات کا ذکر کروں گا ۔ جو توت اخنع امون کے مقبرے کے افتتاح کے بعد واقع ہوئیں میں "رینالڈ" کے مضمون کا حوالہ دیتا ہوں۔

ہزار ہا سال گذرے جب توت اخنع امون کی میت سنہرے کفن میں لپٹی اپنی آخری آرام گاہ میں عجیب وغریب رسوم کی ادائیگی کے بعد اتاری گئی۔ تو کاہنوں نے یہ بددعا پڑھی۔

"موت تیز پروازی سے اس شخص پر آئے گی۔ جو فرعون کے مقبرے کو ہاتھ لگائے گا"

مصر کے لوگ آج بھی اس بددعا میں پورا ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن آج کل کے سائنسدان اور ماہرین مصریات اسے محض وہم سمجھ کر درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ وہ کسی کاہن کے تین ہزار برس پہلے کے الفاظ کو آج کسی انسان پر اثر انداز ہوتا نہیں مان سکتے

... سمجھتے ہیں وہ یوں استدلال کرتے ہیں کہ یہ بددعا دھمکی نہیں تھی۔ بلکہ کفن دزدوں کو ڈرانے کا ذریعہ تھا کیونکہ کفن چوری مصر قدیم کی بہت مشہور حرفت ہے۔ اور خصوصاً جب بے شمار زر و مال بھی میت کے ساتھ دفن کئے گئے تھے۔ تو کاہنوں نے ایک مافوق العادت ہستی کی مدد سے ان خزائن کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔

ممکن ہے ماہرین نظریات ٹھیک ہی ہوں۔ اور توت اخنع امون کے جیش بہا مقبرہ کی کھدائی کے بعد چند سالوں میں جو اموات کا سلسلہ ہوا ہے۔ محض اتفاق ہی ہو۔ لیکن مسٹر ہاورڈ کارٹر نے جب اپنی زندگی کی آرزو پوری کی۔ اور ایک ایسی قبر کا سراغ لگا لیا جسے صدیوں سے کسی نے چھوا نہیں تھا۔ اس دن سے عجیب و غریب واقعات ظہور میں آئے ہیں۔

جب اس کے عجائبات دنیا پر منکشف ہوئے۔ تو اس کے چند ہفتے بعد لارڈ کارنرفان کو ایک مچھر نے کاٹا اور تمام ڈاکٹروں کی کوششوں کے باوجود وہ لقمۂ اجل ہو گئے۔ مصری کاہنوں نے کہا کہ اس نے مقبرہ میں داخل ہونے کی جرأت کی تھی۔ یہ اس کی قیمت ہے۔

خود مسٹر ہاورڈ کارٹر چند دن بعد صاحب فراش ہو گئے۔ بعض اوقات تو یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ موت قریب ہے لیکن وہ بچ گئے اور اس طرح معترضین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ان کے نزدیک فرعون کی بددعا ایک "دلچسپ اثری دریافت" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

لیکن سرگوشیاں بلند آوازیں میں تبدیل ہو گئیں۔ اور یہ خوف ظاہر کیا گیا کہ ماضی کا کوئی عتاب باہر آ گیا ہے۔ جو تہذیب و تمدن کا گلا گھونٹنا چاہتا ہے۔

جب لیڈی کارنرفان نے مصر سے روانہ ہونے والے جہاز پر اپنی نشست مخصوص کرائی۔ تو متعدد دیگر مسافروں نے جن کو اسی جہاز سے جانا تھا۔ یہ اطلاع ملنے پر کہ لیڈی کارنرفان اپنے مرحوم شوہر کی لاش انگلستان لے جا رہی ہیں۔ اپنا ارادہ سفر منسوخ کر دیا۔

چند ماہ بعد لارڈ کارنرفان کے سوتیلے بھائی کرنل آبری ہربرٹ لنڈن میں فوت ہو گئے۔ وہ بھی مقبرے میں داخل ہوئے تھے۔ اور کون جانتا ہے انہوں نے اسوقت کہا تھا "کوئی ہولناک حادثہ ہمارے خاندان کو پیش آنے والا ہے"

لنڈن میں کتنے ہی شخص چونکنے ہو گئے جنہوں نے فرعون کے مقبرے کو دیکھا تھا۔ جب انہیں معلوم ہوا۔ کہ اس "بددعا" کا تیسرا شکار جارج جے گولڈ ہے۔ مسٹر گولڈ لارڈ کارنرفان کے ایک دوست تھے۔ اور کھدائی کے ابتدائی ایام میں اس مقبرے کے اندر بھی گئے تھے۔ ان کی موت جتنی اچانک تھی اتنی ہی پر راز بھی تھی۔

چند ماہ بعد ۱۹۲۴ء میں مسٹر کارٹر نے سر آرچیبالڈ ڈگلس ایڈ کو جو ایکس ریز کے ماہر تھے۔ توت اخنع امون کی ممی کو ایکس ریز کرنے کے لئے مقرر کیا۔ جس وقت آپ ایسا کرنے والے تھے۔ انہوں نے عذر کیا۔ کہ میری طبیعت نادرست ہے۔ وہ بستر پر ... انہیں کوئی ایسی تکلیف تھی جس کی تشخیص ڈاکٹروں سے نہ ہو سکی۔ چند دن بعد وہ بھی مر گئے۔

اس کے ایک ماہ بعد ایک اور مشہور سائنسدان شکار ہوئے۔ پروفیسر پال کسنو وا توت اخنع آمون کے مقبرہ میں کام کر رہے تھے۔ جب ان کی موت ہوئی۔ ڈاکٹروں نے کہا "دل کی بیماری" وہمی نے کہا۔ "فرعون کی بددعا"

اس کے بعد مسٹر آویلین وائٹ ماہر مصریات کی خودکشی کا واقعہ ہوا۔ انہوں نے اپنے پیچھے ایک خط چھوڑا جس میں لکھا تھا۔

"مجھے معلوم تھا۔ میرے تعاقب میں ایک بددعا ہے"۔

دوسرا شکار نوجوان شہزادہ علی فہمی بے تعلاعہ مصر کا متمول رئیس تھا۔ وہ اپنے ملک کے دوسرے باشندوں کی طرح توت کے مقبرہ کے متعلق زیادہ وہمی نہیں تھا۔

اس نے مسٹر کارٹر کی دعوت پر مقبرہ کا معائنہ کیا تھا۔ بلکہ کھدائی کے اخراجات میں بھی مدد دی تھی۔

شہزادہ غالباً مقبرہ کے متعلق سب کچھ بھول چکا تھا۔ زیادہ رنگین و دلکش چیزیں اس کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں وہ ایک حسین فرانسیسی لڑکی میگی میلر کو ڈیول میں ملا۔ اس نے اس سے اظہار محبت کیا۔ اور دونوں کی شادی ہوگئی۔ وہ مصر واپس گئے۔ اس کے بعد سفر پر روانہ ہوگئے۔ اور جیسا کہ اس کی بیگم نے اپنے خاوند کو قتل کرنے کے الزام کے مقدمہ کے دوران میں بتایا۔ اس کے بعد اس نے اپنی بیوی کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ شہزادی کی جان اجیرن ہوگئی۔ ایک حبشی نوکر اس کی ہر ایک نقل و حرکت کی نگرانی کرتا تھا۔ لنڈن میں حالات انتہا تک پہنچ گئے۔ شہزادہ نے قرآن پر ہاتھ رکھ کے قسم کھائی تھی کہ تمہاری موت میرے ہاتھوں لکھی ہے۔ کم از کم شہزادی نے ایسا بیان دیا۔ اس رات کے بعد دونوں اپنا ریوالور ایسی جگہ رکھ کے سوتے تھے۔ جہاں سے وہ فوراً پکڑا جا سکے۔

انجام بہت جلد آ پہنچا۔ ایک رات لنڈن کے ایک ہوٹل میں شہزادہ نے اپنی بیوی کو غصہ کی حالت میں پکڑ لیا۔ دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ اور شہزادی نے حفاظت خود اختیاری میں فائر کر دیا۔ جس سے اس کے خاوند کی موت ہوگئی۔

اس کے مقدمہ کی سماعت اور اس کی بریت سر ایڈورڈ مارشل ہال کی زبردست فتوحات میں سے ہے۔ مقدمہ حیرتناک تھا۔ اور اس میں مصر کی شاہی زندگی کی جزئیات۔ پیرس کی رنگین صحبتوں اور رپورٹر کے کانوں پر محبت کے کھیلوں کے قصے عجیب و غریب طرز سے منظر عام پر آئے۔

شہزادہ کی افسوسناک موت کے تھوڑے عرصہ بعد شہزادہ کا سکرٹری حامی بے بھی کسی مخفی مرض سے مر گیا۔ اس کی موت کا سبب ٹھیک طور پر معلوم نہیں ہو سکا۔ ماہرین مصریات کو صرف اس ایک بات سے دلچسپی تھی کہ وہ بھی توت کے مقبرہ میں گیا تھا۔

پورے دو برس گذر گئے۔ بددعا کا خوف بہت حد تک دلوں سے محو ہو چکا تھا۔ جب پروفیسر [illegible] مشہور ماہر مصریات اور لوور کے مصری اثریات کے شعبہ کے صدر پر حملہ ہوا۔ وہ بھی توت اخنع امون والی مہم کے رکن تھے۔ وہ [illegible]

مارچ ۱۹۲۶ء میں لقمۂ اجل ہو گئے۔

غرضیکہ اس طرح متعدد حضرات شاہ توت کی بد دعا کا شکار ہو چکے تھے کہ ۱۹۲۹ء آن پہنچا۔ اور لوگ بہت حد تک توت اخنع امون کو بھول بیٹھے تھے۔

ایک دن شکاگو میں مسز الین ویڈنگٹن گریلی پہنچی۔ وہ امریکہ کی مجلسی خاتون تھیں۔ اور انہوں نے بھی مہم کے دوران میں توت کے مقبرہ کو دیکھا تھا۔ وہ لارڈ کارنرفان کی دوست تھیں۔ وہ بازار کی ایک طرف سے دوسری طرف گذر رہی تھیں۔ کہ انکی ملاقات ایک پولیس مین جان ہیبرے سے ہوئی۔ انہوں نے اس سے ایک آدھ بات چیت کی۔ اور اسی لحظہ اسپر عاشق ہو گئیں۔ اس سے اگلے دن انہوں نے اسے ڈنر پر مدعو کیا۔

ہیبر کو ان سے قطعی کوئی محبت نہیں تھی۔ وہ ان کا مداح تھا اور بس۔ لیکن وہ دل و جان سے اس پر فدا تھیں۔ وہ تنہا تھیں۔ بالکل تنہا۔ ان کا خاوند کپتان گریلی جنگ عظیم میں کام آیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں۔ کہ کانسٹیبل جان ہیبر مجھ سے شادی کر لے۔ یہ وہ کر نہیں سکتا تھا۔ اس کے بیوی تھی۔ دو بچے تھے۔ وہ اس کی عجیب و غریب باتیں تک سمجھنے سے قاصر تھا۔ بعض اوقات اسے شبہ ہونے لگتا۔ کہ اس کا دماغ خراب ہے۔ کیونکہ ایک امیر کبیر عورت یوں ایک پولیس مین سے اظہار عشق کرے۔ جسے وہ محض اتفاق سے مل گئی تھی۔

آخر ایک رات مسز گریلی شکاگو کے راجرز پارک سیکشن کے اپنے کمرہ میں بیٹھی تھیں۔ ان کا دماغ چکرا رہا تھا۔ انہوں نے دو خط لکھے۔ ایک میں ہیبرے سے اپنے عشق کا اقرار تھا اور دوسرا جسے پولیس سمجھ نہ سکی اور نہ ہی کبھی سمجھ سکے گی۔ یہ تھا۔

"میں نے گناہ کیا ہے۔ خدا جانتا ہے میں نے کیسی روحانی اذیت برداشت کی ہے۔ جب میں ان تمام برسوں میں موت کا انتظار کرتی رہی ہوں۔"

آہ۔ ان لفظوں کے پردے میں کتنی اذیت اور تکلیف پنہاں ہے۔ یہ راز کبھی معلوم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اتنا لکھ کر اس نے ریوالور اٹھایا اور اپنی کنپٹی میں گولی مار لی۔ ڈاکٹروں اور پولیس والوں نے فیصلہ کیا۔ کہ اس پر پاگل پن کا عارضی دورہ پڑا تھا۔ شکاگو وادی شاہان سے بہت دور ہے۔ لیکن اس کے بھی ایک پر آرائش کمرے میں آخر توت کی بد دعا کا ایک شکار تو فرش پر مردہ پڑا تھا۔

اس کے بعد حیرت انگیز سرعت سے اس ہولناک ڈرامہ کا سین لنڈن میں تبدیل ہو گیا۔ جہاں ایک صبح لارڈ ویسٹبری کا دانشمند بیٹا رچرڈ بیتھل اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا۔ انہوں نے مسٹر ہاورڈ کارٹر کے سکریٹری کے فرائض سرانجام دئے تھے۔ ان کی موت کے گرد عجیب سا تاریک پردہ لٹک رہا ہے۔ ان کی عمر [illegible] تھی۔ وہ بستر میں مردہ پائے گئے۔ جیسے خواب کے دوران میں [illegible] ہو۔

[illegible] حضرات اب پوچھ رہے ہیں کہ اس کے بعد فرعون کے اس ڈرامہ کا سین کیا ہو گا۔

صرف مسٹر ہاورڈ کارٹر اس بد دعا سے لاپروا ہیں۔ انہوں نے ایک ملاقات کنندہ سے کہا "تمام معقول اشخاص کو ایسی باتیں نظر انداز کر دینا چاہئیں"۔ ایک مقبرہ تو دنیا کے محفوظ ترین اور انتہائی تنہا مقامات میں سے ہے۔ بہرحال میں مصر میں قیام کر رہا ہوں۔ اتنا بڑا دلچسپ کام کرنے کو پڑا ہے"

اور اس کے خلاف ڈاکٹر مارڈرس مشہور مستشرق کا نقطۂ خیال ملاحظہ فرمائیں۔

"مجھے یقین ہے۔ کہ مصری سات ہزار برس تک اس راز سے واقف تھے کہ ممیوں کو کیسے ایسی طاقت سے محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ جس کے متعلق ہمارا علم بہت دھندلا ہے۔"

لارڈ ویسٹبری سینٹ جیمز کورٹ میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے گر پڑے۔ جب سے گذشتہ نومبر میں ان کے جانشین آنریبل رچرڈ بتھل کی موت ہوئی تھی۔ وہ بہت غمگین اور اداس رہتے تھے۔

کیا یہ کچھ کم تعجب ناک سلسلہ واقعات کا ہے کہ توت اغنع امون کی بد دعا کا اثر اس بیسویں شکار پر اتنا سخت تھا۔ کہ جب لارڈ ویسٹبری کے جنازہ کی گاڑی گولڈن گرین کے قبرستان کی طرف جا رہی تھی۔ تو ایک ۸ برس کا بچہ اس کی لپیٹ میں آ کر کچلا گیا۔ اور یہ اس بد دعا کا غریب اکیسواں شکار تھا۔ ان میں چند فرانسیسی مصنف اور جرنلسٹ بھی شامل ہیں۔ جنہیں مقبرہ اور اس کے خزائن دیکھنے اور دنیا پر ظاہر کرنے کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔

تازہ ترین حادثہ ۔ میں یہ مضمون تحریر کر چکا تھا۔ کہ ۴ دسمبر ۱۹۳۵ء کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کی اشاعت میں یہ حیرتناک خبر چھپی

توت اغنع امون کی بد دعا

مشہور مقبرہ کے دریافت کنندہ کی بحری سفر کے دوران میں موت

"توت اغنع امون کی بد دعا کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر جیمز ہنری بریسٹیڈ جو اس مشہور زمان مقبرہ کے دریافت کرنے والوں میں سے ایک تھے۔ کسی مخفی مرض کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ جہاز "کانٹی ڈی سیوویا" پر ممالک متحدہ امریکہ کو جا رہے تھے۔ تختۂ جہاز پر ہی وہ بیمار ہوئے اور آخر جاں بحق ہو گئے۔ بیماری کی پہلی تشخیص مسلطہ ملیریا کی گئی۔ لیکن بعد میں کہا گیا۔ کہ مرض کے متعلق کچھ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا"

انا للہ و انا الیہ راجعون ط یہ بائیسواں ہے۔

مالک رام ایم۔ اے

فرشتہ

(اثر۔ سعد منیر الدین۔ کانپوری)

"ہر بار جب کوئی نیک بچہ مرتا ہے تو خدا کا فرشتہ آسمان سے زمین پر آتا ہے۔ وہ بچہ کے بے جان جسم کو اپنے ہاتھوں میں لیتا ہے اور اپنے دودھ جیسے سفید بازوؤں کو ہوا میں پھیلا کر اُڑ جاتا ہے۔ اور بچہ کو اُن جگہوں کی سیر کراتا ہے جو اُسے زندگی میں بہت زیادہ پسند ہوتی ہیں۔ جب ہر جگہ کی سیر ختم ہو جاتی ہے۔ تو وہ فرشتہ مٹھی بھر پھول توڑ کر بچے کو لئے ہوئے خدا کے دربار میں واپس جاتا ہے وہ پھول باغِ فردوس میں لگائے جاتے ہیں۔ جہاں وہ زمین سے زیادہ شگفتہ و شاداب معلوم ہوتے ہیں۔ خدائے رحیم تمام پھولوں کو اپنے سینے سے لگاتا ہے۔ لیکن ان پھولوں کو جو اُسے بہت مرغوب ہوتے ہیں وہ چومتا ہے اور چومتے وقت اُنہیں قوت گویائی بخش دیتا ہے تاکہ وہ ازلی حمد و ثنا کے گیتوں میں شامل ہو جائیں"۔ یہ ساری باتیں ایک فرشتہ نے ایک بچے سے کہیں جسے وہ قصرِ خداوندی میں لئے جا رہا تھا۔ بچہ نے یہ ساری باتیں اس طرح سنیں گویا وہ خواب میں سن رہا ہے۔ جب فرشتہ بچہ کو اس کی پسندیدہ جگہیں جہاں وہ کھیلا کرتا تھا دکھا چکا تو اُسے باغ میں لے گیا۔ یہاں طرح طرح کے رنگین پھول کھلے ہوئے تھے۔ ساری فضا اُنکی بُو باس سے مہک رہی تھی فرشتے نے بچہ سے دریافت کیا۔

"باغِ فردوس میں لگانے کے لئے کون سے پھول توڑیں"

پاس ہی ایک گلاب کی چھوٹی سی جھاڑی تھی۔ کسی شریر شخص نے اُسے توڑ ڈالا تھا۔ اُس کی شاخیں نیم شگفتہ مرجھائی ہوئی کلیوں سے لدی ہوئی تھیں۔ بچہ نے اسی کی طرف اشارہ کیا اور کہا:۔

"اسی میں سے ایک پھولوں کی ڈالی لے لو۔ تاکہ وہ باغِ فردوس میں اُگے اور کھلے۔"

فرشتہ نے ایک ڈالی اُٹھالی اور بچہ کو اُس کے اچھوتے خیال پر بوسہ دیا۔ اس سے بچہ کی بند آنکھیں نیم وا ہو گئیں۔ انہوں نے کچھ اور خوبصورت پھول بھی توڑ لئے۔ کچھ گیندے کے اور کچھ بنفشے کے پھول بھی۔

بچہ نے کہا۔ "اب تو ہمارے پاس کافی پھول ہو گئے ہیں"۔ فرشتہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ صرف اپنے سر کو خم کر دیا۔ لیکن پھر بھی وہ آسمان کی طرف نہ اُڑا۔ رات ہو گئی تھی۔ اور ہر طرف تاریکی اور خاموشی کا تسلط تھا۔ دونوں نے ایک بڑے شہر میں شب گذاری اور اس کی سب سے تنگ گلی کے اوپر جہاں کوڑے کرکٹ کے انبار لگے ہوئے تھے۔ دونوں منڈلاتے رہے ÷

جب صبح ہو گئی اور ایک پہر دن گذر گیا تو گلی میں ہر طرف بے کار ٹوٹی پھوٹی بہت سی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ فرشتہ نے انہیں بکھری ہوئی چیزوں کے درمیان ایک شکستہ گملہ اور چند مٹی کے ڈھیلوں کی طرف اشارہ کیا جو جنگلی پھول کی خشک جڑ دی

باہم جڑے ہوئے تھے۔ فرشتہ نے بچے سے کہا ہم اسے بھی اپنے ہمراہ لیں گے اور میں تمہیں اس کا قصہ بھی سناؤں گا۔ جب وہ آسمان کی طرف اُڑنے لگے تو فرشتہ نے کہنا شروع کیا۔

"اسی تنگ گلی میں ایک چھوٹی سی تاریک کوٹھڑی تھی۔ اس میں ایک غریب بیمار لڑکا رہا کرتا تھا۔ وہ بچپنے ہی میں بیمار ہو کر اپاہج ہو گیا تھا۔ جب اس کی حالت ذرا سدھرتی تو وہ بیساکھیوں کی مدد سے لنگڑاتا ہوا ایک یا دو بار کوٹھڑی سے باہر بھی نکلا کرتا مگر گرمی کے دنوں میں چند روز کے لئے کوٹھڑی کے سامنے والے کمرے میں کچھ دھوپ آجایا کرتی تھی۔ صرف ایک دو ساعت کے لئے وہ ننھا لڑکا یہاں اکثر آکر بیٹھتا۔ دھوپ کھاتا۔ اور اپنی پتلی پتلی زرد انگلیوں کو دیکھا کرتا۔ پھر لوگ کہتے۔ "آج وہ باہر نکلا ہے" موسم بہار میں جب گلزار کے سارے درخت سرسبز و شاداب ہوتے اور پورا گلزار رنگ برنگ کے پھولوں سے آراستہ ہوتا تو اسے کچھ خبر نہ ہوتی اگر کبھی اسے کچھ علم بھی ہوتا تو اس وقت جب پڑوسی کا لڑکا ہری بھری ٹہنیاں لاکر اسے دیتا۔ وہ انہیں اپنے سر پر رکھتا اور پھر ایک سہانے خواب میں غرق ہو جاتا۔ وہ اپنے دل میں خیال کرتا گویا وہ ایک ہرے درخت کے نیچے بیٹھا ہے۔ آفتاب کی زریں کرنیں اس پر رقصاں ہیں اور اس کی خوبصورت شاخوں پر ننھی چڑیاں نغمہ سرائی کر رہی ہیں۔ ایکدن پڑوسی کے لڑکے نے اسے کچھ جنگلی پھول لاکر دیئے۔ اتفاقاً انہیں سے ایک میں کچھ جڑیں بھی لگی ہوئی تھیں اسے ایک گملے میں لگا کر بچے کے بستر کے قریب والی کھڑکی پر رکھدیا گیا۔ کیونکہ وہ محبت سے لگایا گیا تھا۔ اس لئے بڑھنے لگا۔ اس میں نئی شاخیں نکل آئیں اور پھول کھلنے لگے غریب لڑکے کیلئے وہ ایک خوشنما باغ تھا۔ اس کے لئے وہ بیش بہا خزانہ تھا۔ وہ اس کی نگہداشت کرتا۔ اسے اچھی طرح سینچتا پودا اس کے خوابوں میں بڑھنے لگا۔ اس میں پھول کھلنے لگے۔ اور اس کی خوشبو سے تمام کوٹھڑی مہکنے لگی۔ اسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مسرت کا نور چمکنے لگتا تھا۔ جب آسمانی دربار سے اس کی طلبی ہوئی تو وہ اسی گملے کے قریب فوت ہو گیا۔ ایک سال سے وہ دربار خداوندی میں ہے۔ اور ایک ہی سال کے عرصہ سے یہ پھول فراموشی کی حالت میں پڑے پڑے خشک ہو گئے۔ اور کھڑکی کے باہر پھینکدیئے گئے۔ کیا تم جانتے ہو وہ کون سے پھول ہیں؟ وہ یہی پھول ہیں جو ابھی میں نے گچھے میں شامل کر لئے ہیں۔ ان پھولوں نے ملکہ کے باغ میں کھلے ہوئے پھولوں سے زیادہ مسرت بخشی ہے"

بچے نے دریافت کیا۔ "لیکن تمہیں یہ سب معلوم کیسے ہوا۔"

فرشتے نے جواب دیا۔ "میں ہی تو وہ بیمار لڑکا تھا جو بیساکھیوں پر چلا کرتا تھا۔ میں اپنے پھول خوب پہچانتا ہوں" تم یقین کرو۔

اب بچہ کی پوری آنکھیں وا ہو چکی تھیں۔ وہ فرشتہ کے حسین اور مسرور چہرہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس بعد وہ باغ جناں پہونچے جہاں ہر طرف مسرت و انبساط کے شیریں نغمے بلند ہو رہے تھے۔ ہر چیز خوشی اور سرور سے متبسم تھی۔ خدا نے بے جان بچے کو اپنے سینہ سے لگا لیا۔ دوسرے فرشتے کے مانند اس کے بھی بازو نکل آئے اور وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوا میں پرواز کر گئے۔ پھر خدا نے ان سب پھولوں کو اپنے سینے سے لگایا لیکن اس غریب خشک پھول کو اس نے بوسہ دیا۔ اس میں قوت گویائی آگئی۔ اور وہ بھی فرشتوں کے حلقوں میں مل گیا جو خدا کے قدوس کے گرد رقص کر رہے تھے اور اسکی حمد کے گیت گا رہے تھے۔ ایوان خداوندی دھیمے سروں سے گونج رہا تھا۔

(ترجمہ - از ایچ۔ اینڈرسن)

افسانہ

یارجہاں تاتاری

(از جناب صوفی محمد حسین صاحب - بی اے)

جب سے روسیوں نے وسط ایشیا کو سمرقند سے چین کی سرحد تک فتح کر کے اپنے زیرنگیں کر لیا تھا۔ علاقہ میں امن قائم ہو چکا تھا۔ اور لوگ خاموش زندگی کے عادی ہو گئے تھے۔ دن مویشی چرانے ہل جوتنے اور معمولی تجارتی کاروبار میں صرف ہوتا تھا اور راتیں پرسکون نیند کی آغوش میں بسر ہو رہی تھیں۔ جو بھیانک وحشت انگیز خوابوں کے اثر سے محفوظ تھی۔ یہ جمود اور سکون کے ایام حوادث کی ہولناک اور مضطرب گھڑیوں سے ناآشنا تھے مگر تاتاری قبائل کے نوجوان جنگ کی رستخیز اور غارتگری کے زمانے کی واپسی کے لئے بے قرار ہو رہے تھے۔ ان کے کان طبلِ جنگ کی کرخت گرولولہ انگیز آواز کے بیتابی سے منتظر تھے۔ اور ان کے دل مدت کے بعد اپنے بہادر اسلاف کے نقشِ قدم پر گامزن ہونے کے لئے مضطرب اور بے قرار تھے۔

بالآخر ان کی تمنا بر آئی اور وہ دن جن کا انتظار تھا۔ واپس لوٹ آئے۔ روس میں جرمنی سے شکست کھانے کے بعد بغاوت پھیل گئی تھی۔ اور سطح مرتفع کے رہنے والے تاتاری دوبارہ کشت و خون پر آمادہ ہو رہے تھے۔ ہر طرف "چلے آؤ چلے آؤ" کی مجتمع کرنے والی صدائیں سنائی دیتی تھیں۔ خاوند بیویوں سے رخصت ہو رہے تھے اور یہ کہتے ہوئے سنے جاتے تھے "مجھے میری آبدار شمشیر اور سیاہ خنجر لا دو۔ میں اب گلہ بانی اور سست گھریلو زندگی سے تنگ آ گیا ہوں"

گھوڑوں پر زینیں کسی جا رہی تھیں۔ ہتھیار سج رہے تھے اور مرد خوشی میں ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ ان کے دل امنگوں کے جوش سے اچھل رہے تھے۔ اور آنے والی جنگ کے متعلق دل خوش کن خیالات اور گوناگوں مصروفیتوں کا تصور ان کے جذبات میں ہیجان بپا کئے ہوئے تھا۔ سواروں کے بڑے بڑے دستے اور مختصر جماعتیں شاہراہوں پر گامزن تھیں۔ اور کہیں کہیں بعض من چلے نوجوان تنہا سوار جا رہے تھے۔ انہی میں یارجہاں نامی قراتاش قبیلے کا ایک نوجوان بھی تھا۔

یارجہاں ایک خوشحال زمیندار تھا۔ جس کے کھیتوں میں سرسبز فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ اور جس کی وسیع چراگاہیں مویشیوں کے گلوں اور بھیڑوں کے ریوڑوں سے آباد تھیں۔ وہ ایک طاقتور انسان تھا۔ اور اس کی تمنا تھی کہ ایک دن وطن سے دور عازمِ سفر ہو اور دشت و جبل کی کٹھن منزلوں کو کاٹتا ہوا شمشیر بکف صفِ اعدا میں مردانگی کے جوہر دکھا سکے۔ اس کی تلوار جو ترکی ساخت کی تھی اس کے دادا کی ملکیت تھی۔ جو کچھ زمانہ پہلے ستر بہادر ہمراہیوں کے ساتھ شمالی [illegible] کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا۔ اور جس کا خوبصورت سر بالآخر ایک منگولی شاہزادہ کے محل کے سامنے نصب

دہ دار ہوا تھا۔ اس کے لبوں پر مرنے کے بعد بھی ایک حقارت آمیز تبسم ویسے ہی کھیل رہا تھا۔ جس طرح کہ اس کی زندگی پر تھا۔ یار جہاں نے عہد کر رکھا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنے دادا کے کارناموں کو تازہ کرے گا۔ اس کی گفتگو کا موضوع ہمیشہ لوٹ مار ہوتا۔ اور اسے ہر وقت دوسروں کی دولت پر قابض ہونے کی خواہش رہتی۔ وہ دراز قد چھریرے بدن کا تھا۔ سرخ گلابی رنگ سر سے پاؤں تک چمڑے کے لباس میں ملبوس اس کی بھاری سمور دار ٹوپی میں عقاب کا پر لگا ہوا تھا جس کا سایہ اس کی ستواں ناک پر پڑتا تھا۔

بالآخر ایک شام وادیٔ قراتاش بھی "چلے آؤ چلے آؤ" کی صداؤں سے گونجنے لگی۔ منادی کرنے والوں کی اس پکار پر کہ "آرام طلبو۔ اب کس وقت کا انتظار کر رہے ہو" ہر طرف سے لبیک کے نعرے بلند ہوئے اور علاقے کے جوان اپنے اپنے ہتھیار سنبھالے، اپنے امیر سردار نصر اللہ خاں کے گرد جمع ہو گئے۔ سردار نے یار جہاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایسے جوانوں کی ضرورت ہے۔ اِدھر آؤ بہادر نوجوان اور میرا دل کی کمان سنبھالو" یار جہاں نے سر ہلا کر جواب دیا۔

"نہیں۔ نہیں میں تنہا جاؤں گا"۔ "معلوم ہوتا ہے تم مالِ غنیمت میں کسی دوسرے کو شریک کرنے میں بخل کرتے ہو" سردار نے کہا۔ یار جہاں نے جواب دیا۔ "نہیں بلکہ میں اپنے اقبال اور کامرانی میں کسی کی شرکت پسند نہیں کرتا"۔ نصر اللہ خاں نے ہنس کر کہا۔ "اچھا جاؤ۔ خدا حافظ" تمام رات یار جہاں اپنے ابلق گھوڑے پر شمال کی جانب تنہا سفر کرتا رہا۔ اثنائے راہ میں اس نے جنگ اور اس کے لوازمات پر غور کیا۔ درحقیقت اس کا دل ان باتوں سے نفور تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اپنے اوصافِ شجاعت کے باوجود جس کی ڈینگیں وہ اکثر مارتا تھا۔ وہ دل میں خائف تھا۔ موت یا تکالیف سے نہیں بلکہ دوسروں کی جان لینے اور کسی کو ایذا دینے سے۔ اسی لئے اس نے تنہا سفر کرنا گوارا کیا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دوسرے اس کی نرم دلی سے آگاہ ہوں۔ وہ اس حقیقت سے شرم محسوس کرتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔

"میرا نام یار جہاں ہے اور میری شمشیر میرے توام بھائی کی مانند ہے۔ جسے آج تک میں نے کبھی جنگ کے لئے نیام سے باہر نہیں نکالا"۔

وہ چلتا رہا حتیٰ کہ وہ وادیٔ قزلبات میں داخل ہو گیا۔ جو کہ سرسبز اور شاداب سرزمین ہونے کے لحاظ سے خوبصورتی کا مرقع ہے۔ اس کے ہر گھر کے ساتھ باغیچے۔ چمن اور خوش رنگ پھولوں کے کنج بہار دکھا رہے تھے۔ شام ہو گئی تھی۔ اور وہ بھوکا اور تھکا ہوا تھا۔ جب وہ پہلے مکان کے قریب پہونچا تو آفتاب سیاہ پہاڑیوں کے عقب میں چھپ چکا تھا۔ مکان کے دروازے کے سوراخ سے روشنی کی ایک باریک شعاع تاریکی میں تھراتی ہوئی رقص کناں تھی۔ اندر سے ترنم آمیز سیٹی کے ساتھ قہقہے اور پاؤں کی آواز آ رہی تھی۔ جو سیٹی کی تال پر پڑ رہے تھے۔ یار جہاں نے نیچے اتر کر گھوڑے کو ایک ستون سے باندھ دیا اور جھک کر ایک سوراخ سے اندر جھانکا۔ دو سیاہ بالوں والی خوبصورت لڑکیاں کچے فرش پر مصروفِ رقص تھیں۔ ان کی زرد نیلی دھاری دار جاکٹیں اِدھر اُدھر حرکت کر رہی تھیں۔ اور ایک سنہرے بالوں والی

دوشیزہ جوان دونوں سے زیادہ حسین تھی۔ ہونٹوں پہ انگلیاں رکھے ایک میٹھے دلکش انداز میں سیٹی بجا رہی تھی۔ یارجہاں نے پہلے دروازہ کھٹکھٹانے کا ارادہ کیا۔ مگر تھوڑے تامل کے بعد اس نے کندھے کے زور سے دروازہ کھول دیا۔ ناچ رک گیا۔ اور سیٹی کی آواز بند ہوگئی۔ سنہرے بالوں والی لڑکی نے چلا کر کہا۔ "تم کیسے ناشائستہ ہو"۔ "اور تم ایک حسین تیتری ہو"۔ یارجہاں نے جواب دیا۔ تمہاری سیٹی کی شیریں آواز چنڈول کے لئے بھی باعث رشک ہے۔ اور ایسا اچھا ناچ تو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

"ناچ"۔ لڑکی نے کہا۔ "مگر اس کی تکمیل کے لئے مرد کی ضرورت ہے آؤ اور اپنے لئے ایک ساتھی کا انتخاب کر لو۔"

"میرے پیر تو آمادہ ہیں مگر افسوس میرا پیٹ رضامند نہیں" یارجہاں نے جواب میں کہا۔ "کیا تم بھوکے ہو"۔ "ہاں صبح ناشتہ کے بعد کچھ نہیں کھایا۔ اور وہ بھی بہت معمولی" "او غریب آدمی! کیا باسی گوشت شہد اور زردالو کافی ہوں گے"۔

"ہاں ان کے ساتھ اگر کچھ پینے کو مل جائے تو میں تمہیں فرشتہ کہوں گا" یارجہاں نے لڑکی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا اور دل میں خیال کرنے لگا۔

"میں کس بے تکلفی سے پیش آ رہا ہوں۔ کیا ہی عجیب اور خوش گوار رات ہے۔ اس حسینہ کو دیکھ کر تو میں محسوس کر رہا ہوں کہ اب اسے چھوڑ کر نہیں جا سکوں گا"۔

وہ اسے تکتا رہا۔ اور وہ پھر مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں شوخی تھی مگر وہ خاموش تھی۔ اس کا نام دلیلہ تھا۔ اور اس کی دو بہنیں قمریہ اور زمرّہ تھیں۔ دلیلہ نے کھانا لا کر نو وارد کے سامنے رکھ دیا اور کہا۔ "اب ہاتھ بڑھاؤ اور خوب سیر ہو کر کھاؤ"۔ یارجہاں نے کھانا شروع کیا اور اپنی سرگذشت بھی سناتا گیا کہ وہ ایک مشہور اور شریف خاندان کا فرد ہے اور بے پناہ محبت کرنے والا دل رکھنے کے باوجود ایک بے خوف جنگجو سپاہی بھی ہے۔ پھر میز پر ہاتھ مارتے ہوئے اس نے کہا۔

"میرا نام یارجہاں ہے اور میری تلوار میرا ہم بھائی ہے۔ اب تمہیں میری نسبت سب کچھ معلوم ہو گیا ہے"۔ سنہرے بالوں والی دلیلہ نے محجوبانہ انداز سے جواب دیا۔ "بلکہ ہم کو ضرورت سے زیادہ واقفیت ہو گئی ہے"۔ یارجہاں نے کہا۔ "یہ بہتر ہے کہ ایک مرد کی نسبت زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کر لی جائے۔ مگر او مسرت کی تتلی اب اپنے متعلق کچھ بتاؤ"

"میں کیا بتا سکتی ہوں؟"

"سب کچھ"

"نہیں نہیں ایک عورت کے متعلق کم از کم حالات دریافت کرنا ہی بہتر ہے"

"تم ایک عقلمند دوشیزہ ہو اور اپنے قبیلے کے مردوں سے زیادہ دانا ہو"

"تم کس طرح اس نتیجے پر پہونچے ہو"

"کیونکہ تمہارے بال غروب آفتاب کے وقت کے بادلوں کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ تمہاری آنکھوں میں نرالی چمک ہے

اور تمہارا بدن مچھلی کی پشت کی مانند ملائم ہے۔ تمہاری بہنیں بھی کچھ کم خوبصورت نہیں ہیں۔ مگر تم تنہا کیوں ناچ رہی تھیں تمہارے قبیلے کے مرد کہاں ہیں؟"

زمزم نے چلا کر کہا: "وہ سادہ لوح ہیں جو جنگ میں شمولیت کے لئے چلے گئے ہیں۔ اور اب صرف بچے اور بوڑھے پیچھے رہ گئے ہیں"۔

"کیا وہ شمال مشرقی علاقہ میں مصروف پیکار ہیں"۔ یار جہاں نے سوال کیا۔

"ہاں وہ ادھر کہیں دشت نوردی کر رہے ہیں۔ اور ہم غریب عورتیں تنہائی اور بے کسی میں بسر کر رہی ہیں"۔

"مگر وہ واپس آجائیں گے ان کے کیسے لوٹ مار کے زر و سیم سے بھرے ہوئے ہوں گے اور اس وقت تم مسرت اور گرمجوشی سے ان کا استقبال کرو گی"۔

"ہم کس طرح ان کا استقبال کریں گے جب وہ کمبل میں لپٹے ٹھٹھرے ہوئے واپس آئیں گے"۔ ایک کرخت آواز اندر سے آئی۔ یہ لڑکیوں کی ماں مُرّہ تھی۔ "میرا خاوند اور چار لڑکے جنگ میں مرنے مارنے کے لئے گئے ہیں۔ اور میں ان لڑکیوں کے ساتھ تنہا ہوں۔ میری فصل کسی مضبوط ہاتھ کے انتظار میں مرجھا رہی ہے۔ مگر مجھے تمہارے جیسا جوان کہاں مل سکتا ہے۔ جبکہ سب جنگ پہ چلے گئے ہیں"۔

اچانک یار جہاں نے دل میں فیصلہ کر لیا۔ اس نے دلیلہ کی طرف نظر اٹھائی اور خیال کیا۔ "دنیا بھر کی وادیوں اور کہستانوں میں حسین ترین دوشیزہ۔ اسے کھو دینا موت کے مترادف ہے" گو جنگ کا موقعہ جس کے متعلق وہ لاف زنی کیا کرتا تھا اب پیش نظر تھا مگر اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ جنگ کے خیال کو ملتوی کرنا ہی مناسب ہے۔ اس سکون آمیز فیصلے پر اس نے دل میں ندامت محسوس کی۔ مگر اس حسینہ کی سحر آگیں آنکھوں میں ایک جادو تھا جس کے اثر سے بچنا محال تھا۔ بالآخر اس نے لڑکیوں کی ماں سے کہا "اور اب آپ کو وہ طاقتور جوان مل گیا ہے"۔ عورت کے منہ سے بے ساختہ خوشی کی چیخ نکل گئی۔ جب یار جہاں نے کہا "اور وہ میں ہوں۔ میرے اور تمہارے درمیان یہ عہد ہے۔ میں جیسا بہادر سپاہی ہوں ویسا اچھا کسان بھی ہوں"

"خدا کا شکر ہے"۔ مُرّہ نے خوشی سے اچھل کر کہا۔

دلیلہ نے آہستہ سے کہا۔ "مگر ابھی ایک لمحہ پہلے تم تلواروں کا تذکرہ کر رہے تھے"۔

"ہاں میں بیشک ذکر کر رہا تھا اور اس تذکرہ کو میں پسند کرتا ہوں۔ جنگ کے گیت بہت شاندار ہوتے ہیں۔ مگر ہل کھیت مویشیوں اور صبح کی خوشگوار ہوا کے گیت بھی جبکہ وہ ہرے ہرے کھیتوں میں سرسراتی ہو کچھ کم کیف انگیز نہیں ہیں"

"تم جلدی ہی اپنا ارادہ بدل لیتے ہو"

"ہاں مگر اتنا جلدی نہیں جتنا کہ تمہیں دیکھنے کے بعد"

ایک لمحہ کے لئے خاموشی چھا گئی۔ یار جہاں نے خیال کیا کہ گو اس جگہ مردانگی کے جوہر دکھلانے کا موقعہ نہیں ہے مگر اپنی دوسری

تمنا پوری ہونے کی توقع ہو سکتی ہے۔ شاید وہ اس حسینہ کی محبت خرید سکے۔ پھر اس نے کہا۔ "دلیلا آؤ ذرا باہر چلیں اور چاند میں بسنے والی بڑھیا کا نظارہ کریں"

"مگر وہ تو سیاہ بادلوں میں چھپا ہوا ہے" دلیلا نے جواب دیا۔

"تو پھر یہ اور خوشی کی بات ہے ورنہ وہ ہمیں باہم دیکھ کر حسد کرنے لگے گی۔"

وہ باہر چلے گئے۔ ثمرہ مسکرائی اور ثمریہ نے زمزم سے خطاب کر کے کہا۔ "اب ہم سیٹی بجانے والے کے بغیر کیسے ناچ سکیں گی" ثمریہ خاموش تھی۔ باہر سے درختوں کی سائیں سائیں کے سوائے کوئی آواز نہیں آتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی قہقہہ کی آواز سنائی دیتی۔

دلیلا نے یارجہاں سے کہا۔ "تم نے ابھی کہا تھا کہ تم ایک محبت کرنے والا دل رکھتے ہو"

"ہاں لوگ اکثر ایسا ہی کہتے ہیں"۔ یارجہاں نے جواب دیا۔ "اور ساتھ ہی یہ بھی کہ میری آنکھوں میں ایک خاص کشش ہے جو عورتوں کو اس طرح کھینچ لیتی ہے۔ جس طرح شمع پروانے کو"۔ دلیلا ہنس پڑی۔ ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد یارجہاں نے کہا۔

"آؤ اس حقیقت کا امتحان کریں۔ کیا تم ایک بہادر کی بیوی بننا پسند کرو گی"

"ایک بہادر کی بیوی"۔ دلیلا نے حیرت سے سوال کیا۔

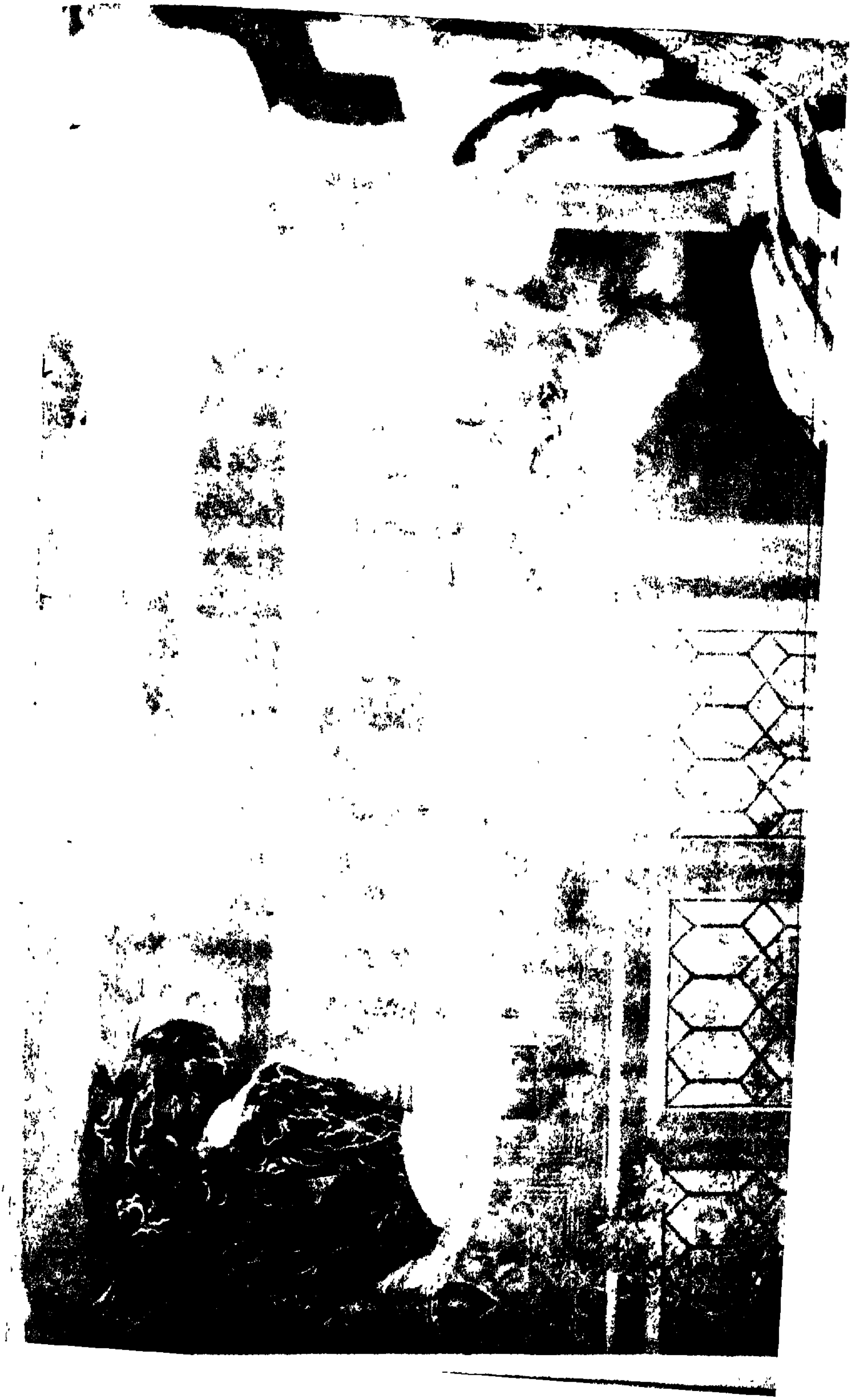
"دوسرے لفظوں میں میری بیوی"

"نہیں ہرگز نہیں۔ ایک لڑکی تمہارے جیسے آدمی پر کس طرح بھروسہ کر سکتی ہے۔ جو کسی وقت اپنا ارادہ تبدیل کر کے قتل و غارت کے لئے سوار ہو جائے یا کسی مغربی سنہرے بالوں والی حسینہ کی محبت میں گرفتار ہو کر مجھے دل شکستہ چھوڑ جائے۔ چلو اب چل کر سو رہیں کیونکہ صبح تم کو سویرے ہی کھیتوں پر کام کرنے جانا ہو گا"

ان حالات کے ماتحت جبکہ تمام تاتاری جنگ پر جا چکے تھے یارجہاں کھیتوں میں ہل چلانے اور فصل کاٹنے میں مصروف تھا یہ مشقت کا کام صبح مرغ کی اذان کے ساتھ ہی شروع ہوتا تھا۔ اور جڑیں اکھاڑنے چٹانوں کو توڑنے زمین کو ہموار کرنے کے باعث رات کو اس کا بدن تکان سے درد کرنے لگتا تھا۔ مگر ساتھ ہی دلیلا کی رفاقت میں اسے ایک راحت بھی محسوس ہوتی تھی جبکہ اس کی محنت کے لئے جو وہ اس کی ماں اور بہنوں کے لئے کرتا تھا محبت بھری نگاہوں سے مسکراتے ہوئے دوستانہ الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کرتی تھی۔ یہ لمحے اس کے لئے حقیقی مسرت کے لمحے تھے۔ وادی قزلیات کے لوگ بھی اسے پسند کرتے تھے اور عورتیں اس کے شریفانہ اطوار کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ کیونکہ ان کے چولھے سرد تھے ان کے خاوند میدان جنگ میں تھے اور وہ تنہا حیران تھیں کہ ان کے کھیتوں کی کون خبرگیری کرے۔ یارجہاں جو مضبوط اور ان تھک محنتی تھا۔ کبھی کبھی وقت نکال کر ان کی امداد بھی کر دیتا تھا۔ عزیزہ قبیلے کے سردار کی بڑھیا ماں ان الفاظ میں ان سب کے احساسات قلبی کا اظہار کیا کرتی تھی "کیا ہی نیک دل جوان ہے خدا اسے دنیوی حوادث سے ہمیشہ محفوظ رکھے"۔ مردوں کے نزدیک بھی اس کی عزت کچھ کم نہیں تھی بوڑھے اور بچے بھی قبیلے کے آدمیوں کی طرح اس کی تعریف کرتے تھے اور اس کی تعلیوں پر اعتبار کر لیا کرتے تھے کیونکہ گفتگو میں



رفیق تنہائی



اغریبدا کرنے کا ڈھنگ اسے خوب یاد تھا۔ اکثر رات کو گاؤں کے حجرہ میں جو سب کا مشترکہ ہال تھا وہ لاف زنی کیا کرتا کہ وہ کس قدر جفاکش اور دلیر ہے اور تمام تاتار اس کے نام سے خائف تھا۔ اس کی ہڈیاں مضبوط تھیں اور اس کے خون میں جوش تھا۔ قدوقامت کی مناسبت سے اس کا دل بھی بڑا تھا۔ اور بہت سے بہادر جن کو اس نے موت کی ابدی نیند سلا دیا تھا۔ اس کی شجاعت کی داستان دُہرا سکتے اگر انہیں قبر سے اُٹھنے کا موقعہ مل جاتا اور جہاں کہیں وہ جاتا تھا اپنی تلوار کے زور سے اپنے نام کی دھاک بٹھا دیتا تھا۔ یہ کہتے ہوئے تلوار نکالنے کے لئے وہ ہاتھ بڑھاتا۔ مگر وہ اس کی کمر میں نہیں تھی۔ کیونکہ دلیلہ نے اسے کہیں چھپا دیا تھا۔ اور جب اس نے کہا۔ "دلیلہ مجھے تلوار واپس دیدو" تو جواب ملا۔ "نہیں نہیں میں اس کی چمک اور تیزی سے خائف ہوں نیز ڈرتی ہوں کہ تم کسی دن اسے لے کر چلے نہ جاؤ"۔ "کیا تم میری غیر حاضری محسوس کرو گی"۔ یار جہاں نے استفسار کیا۔

دلیلہ نے جواب دیا۔ "کم از کم کھیت مویشی اور درخت تو ضرور محسوس کریں گے"۔

"مگر کیا تم نہیں کرو گی۔ کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں۔ تھوڑی سی محبت بھی نہیں"۔

"مجھے معلوم نہیں" یار جہاں نے پھر وہی الفاظ دُہرائے۔ "دلیلہ کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو"

مگر دلیلہ نے وہی جواب دیا۔ "مجھے معلوم نہیں"

اس طرح بہار کا موسم گذر گیا اور خزاں آگئی۔ کہر شدت سے وادی پر چھا گیا۔ کانپتے ہوئے حیوان اصطبلوں میں پناہ لینے کیلئے بے قرار ہو رہے تھے۔ اور موسمی پرندے نقل مکانی کے لئے آمادہ پرواز ہو رہے تھے۔ صبح کے وقت لوگ کمبلوں اور رضائیوں میں دبکے ہوئے انگڑائیاں لیتے تھے۔ کیونکہ ناخوشگوار موسم میں جلدی اُٹھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پہاڑی درخت سائبیریا کی خشک اور سرد ہوا میں جو آنے والی طوفانی راتوں اور تکلیف دہ موسم کی پیش خیمہ تھی۔ اسی سے سرسرا رہے تھے۔ یار جہاں کی محنت میں زیادتی کے ساتھ ساتھ اس کی قلبی اذیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی محبت اشتیاق اور والہانہ وارفتگی کے بظاہر بے اثر رہنے سے اس کی خوشی رنج میں بدل گئی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے ایک روز جی کڑا کر کے دلیلہ سے کہا۔ "یا الٰہی تاتار میں سینکڑوں خوبصورت جوان ہوں گے اور بہادر بھی۔ مگر بخدا میرے جیسا محبت کرنے والا تمہیں کوئی نہیں ملے گا"۔ دلیلہ نے اپنی گردن کو اس کی طرف انداز سے جھکا کر کہا۔ "اور مجھے بھی اس کا اعتراف ہے"

"پھر تم کیوں........" فقرہ ابھی نامکمل ہی تھا کہ دلیلہ نے بات کاٹ کر کہا۔ "اس کا جواب تمہیں ایکدن اپنی لوحِ دلبر لکھا مل جائے گا" اور اس میں بہت زیادہ دن نہ لگے کہ اسے اس کا جواب مل گیا۔ پہلے شمال مغرب کی طرف سے خبر آئی کہ روسیوں نے اپنے ملک کا انتظام کر لیا۔ اور ایک دفعہ پھر ان کے سپاہی شاہراہوں پر گشت کر رہے ہیں۔ سرحدِ چین سے پولینڈ کی حدود تک اور ترکستان سے شمالی منجمد سمندروں کے ساحل تک انہوں نے بغاوت کو طاقت سے دبا لیا ہے۔ لوٹ مار کا خاتمہ ہو گیا ہے اور قبائلی لشکر جو بدامنی میں بھیڑیوں کی طرح شکار کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اب ہرنوں کی مانند گھروں کو واپس لوٹ رہے ہیں۔ بعض مالِ غنیمت سے لدے ہوئے اور بعض تہی دست خالی

قسمت خالی ہاتھ تھے۔ کیونکہ یا تو ان کے پہونچنے سے پہلے گاؤں لُٹ چکتے تھے۔ یا روسی سپاہیوں کی موجودگی کی وجہ سے وہ ناکام رہ جاتے تھے۔ دامنِ حرص کے خالی رہنے کی وجہ سے انہوں نے واپسی پر اپنے ان پڑوسی تاتاریوں کے گھروں پر دستِ تظلم دراز کرنے سے دریغ نہ کیا۔ جن کے مرد ابھی جنگ سے واپس نہیں آئے تھے۔ ان کی دست برد کے بعد ان آباد بستیوں کے اناج کے ذخیروں سے دھواں اٹھتا دکھائی دیتا تھا اور یہی کچھ قزلیات کی وادی میں بھی پیش آیا۔ خانہ بدوشوں کی ایک جماعت نے ایک دن دوپہر کے وقت ان پر حملہ کردیا جبکہ یارجہاں دور ایک پہاڑی پر گم شدہ مویشیوں کی تلاش میں مصروف تھا۔ واپسی پر اس نے گاؤں میں تباہی اور بے کسی کا نظارہ دیکھا۔ بوڑھے اور بچے جنہوں نے ناکام مدافعت کی تھی۔ زخمی پڑے تھے۔ اور مرّہ مع اپنی دو لڑکیوں قمریہ اور زمزم کے مکان کے برباد شدہ کھنڈروں میں بیٹھی رو رہی تھی یارجہاں نے کانپتی ہوئی آواز سے دریافت کیا۔

"دلیلہ کہاں" اس کے جواب میں اسے بتایا گیا کہ تاتاری جلدی میں لوٹ مار کرکے سوار ہونے کو تھے اور ان کا ارادہ کسی کو قیدی بنا کر ہمراہ لے جانے کا نہیں تھا۔ مگر دلیلہ جس کے گلے کا ہار نوچ لیا گیا تھا۔ غصے سے کانپتی ہوئی اسی جماعت کے سردار پر برس پڑی اور اسے ڈاکو اور خونی کے نام سے پکارتے ہوئے اس پر لعنت کی کہ انہوں نے بزدل چوروں کی مانند عورتوں پر دست درازی کی تھی۔ سردار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے اپنی عزت کی قسم۔ تو ایک جرأت والی اور دلیر لڑکی ہے اور آتشیں حسن کی دولت سے بھی مالامال ہے۔ یقیناً تیری خوبصورتی میری پہلی بیوی کے دل میں حسد کی آگ بھڑکا دیگی"

یہ کہکر اس نے جھپٹ کر دلیلہ کو اپنے مضبوط بازوؤں سے اٹھایا اور اپنے آگے گھوڑے پر بٹھا کر اسے ایڑ لگادی

"اور اب ان کے پیچھے سوار ہوجاؤ میرے دراز قد بہادر" مرّہ نے چلّا کر کہا۔

"سوار ہوجاؤ میرے دراز قد بہادر" یہ الفاظ یارجہاں کے دماغ میں گونجنے لگے۔ اور بغیر کسی ہتھیار کے اسنے سوار ہوکر گھوڑے کو مہمیز لگادی۔ اور رات کی پھیلتی ہوئی تاریکی میں غائب ہوگیا۔

مگر اس نے خیال کیا کہ وہ خائف ہو رہا ہے۔ اس کے دل میں خوف ضرور تھا۔ جس نے اس کے قلب کو منجمد کردیا تھا۔ اور تصور میں خوفناک آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ تاہم اس خوف میں بھی اسے ایک راحت محسوس ہو رہی تھی۔ کیونکہ اسکی تہ میں ایک سنہرے بالوں والی لڑکی کی محبت کام کر رہی تھی۔ اس خوف کے احساس سے وہ نادم نہیں تھا۔ اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ یہ کام میں نے ضرور کرنا ہے۔ خطرہ ہو یا نہ ہو اس کا مضائقہ نہیں۔ وہ چلتا رہا اور جب وہ خانہ بدوشوں کے کیمپ کے پاس پہونچا تو بہت دیر ہوگئی تھی۔ وہاں کوئی پہرہ نہیں تھا کیونکہ انہیں دشمن کا خوف نہیں تھا۔ اور وادی قزلیات کے لوگوں کی جانب سے وہ بالکل بے فکر تھے۔ کیونکہ وہاں صرف بچے اور بوڑھے اپنے گاؤں کی تباہی کا ماتم کر رہے تھے۔ تاروں بھرے آسمان کے دھندلے سائے میں چند ہلکے خیمے نصب تھے۔ جو تہ کرکے ہر تاتاری اپنے گھوڑوں پر ہی لاد لیتے ہیں۔ درمیان میں ایک بڑا خیمہ نصب تھا۔ جو سردار کا معلوم ہوتا تھا۔ یارجہاں گھوڑے سے اتر کر دبے پاؤں

اس بڑے خیمے کی طرف گیا۔ اندر سے ایک عورت کی آواز سنائی دی" میں تم سے نفرت کرتی ہوں" جواب میں ایک مرد نے کہا "نفرت بھی ایک خوشگوار انداز ہے۔ جس میں محبت کا راز پوشیدہ ہے"۔ یار جہاں اندر گھس گیا۔ خیمہ میں بالکل اندھیرا تھا۔ اور اسے وہ شخص جس پر وہ حملہ آور ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر اس نے ہاتھوں سے اس کی موٹی گردن مضبوط پٹھوں اور اس کے خون کے جوش کو محسوس کیا۔ اس کی انگلیاں مضبوطی سے اس کے کانپتے ہوئے گوشت میں پیوست ہو رہی تھیں اور وہ غصے سے اندھا اور دیوانہ ہو رہا تھا۔ یار جہاں کو اس کے دل کی حرکت کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی جس سے جوش انتقام میں "مار دو مار دو" کی آواز آ رہی تھی۔ حریف مدافعت کر رہا تھا۔ اور بالآخر وہ اپنے آپ کو یار جہاں کی گرفت سے چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اپنی تلوار کو تلاش کیا اور یار جہاں پر جھپٹا۔ جو بغیر کسی ہتھیار کے اس کا مقابلہ کر رہا تھا۔ شور سنکر دوسرے خیموں سے لوگ ہتھیار اور مشعلیں لے کر اندر گھس آئے۔ روشنی حملہ آور اور اس کے حریف پر پڑی۔ یار جہاں نے نصر اللہ اپنے قبیلے کے سردار کو شناخت کیا۔ اس نے بھی یار جہاں کو پہچان لیا۔ اور چلا کر کہا۔ "بخدا یہ تو ہمارا بہادر دوست دور دراز مقامات سے واپس آ گیا ہے اور اپنے آقا اور سردار کو قتل کرنے کی کوشش کر رہا ہے"۔ ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد اس نے پھر کہا۔ "پیشتر اس کے کہ میں تمہاری موت کا حکم دوں۔ سچ سچ بتاؤ۔ کہ اس جرم کے ارتکاب کا کیا باعث ہے"۔

دلیلہ نے آگے بڑھ کر کہا۔ "اس کا باعث میں ہوں"

"تم" سردار نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔ صرف میں۔ کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں اس سے محبت کرتی ہوں"۔ کیا یہ وجہ کافی نہیں ہے۔ "کافی ہے" اور یار جہاں اور دلیلہ پر نگاہ ڈالتے ہوئے سردار نے کہا" ہاں محبت نفرت کرنے اور قتل کرنے کے لئے کافی عذر ہے اور خدا کی قسم معافی کے لئے بھی"۔ پھر اس نے یار جہاں کے کندھے پر تھپکی دی۔ "ادھر آؤ اور اس عورت کو لے لو کیونکہ وہ تمہیں اسقدر محبوب ہے۔ اور ہمارے ساتھ گھر کو واپس لوٹ چلو"

یار جہاں نے اکڑ کر جواب دیا۔ "نہیں گھر کو نہیں۔ کیونکہ جو گاؤں تم نے تباہ کیا ہے۔ جبکہ تمہاری خوش قسمتی سے میں موجود نہیں تھا۔ میرا ہے اور میں وادئ قزلیات کا ویسا ہی سردار ہوں۔ جیسا کہ نصر اللہ خاں تم قزآناش کے سردار ہو"۔

اس کے بعد اس نے جھک کر سلام کیا اور دلیلہ کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ اس نے دلیلہ کو گھوڑے پر سوار کیا اور خود اس کے ہمرکاب چلنے لگا۔ وہ خاموش تھا۔ دلیلہ نے پوچھا "تم کیا سوچ رہے ہو"

"میں سوچ رہا ہوں" کہ مجھے کل سوار ہو کر جانا ہوگا"۔

"کہاں اور کیوں؟"

"کہیں بھی اور محض اس لئے کہ میرے تمام دعوے اور متکبرانہ الفاظ..................

ابھی فقرہ ناتمام تھا کہ دلیلہ نے بات کاٹ کر کہا "محبت کے متعلق یا جنگ کے"

"ہاں" یارجہاں نے۔ آہستہ سے جواب دیا۔

دلیلہ نے ہنس کر کہا "یہ میرے لئے نئی بات نہیں ہے۔ تمہیں یاد ہے جس رات تم ہمارے گاؤں میں آئے تھے اور میرے ساتھ محبت کا اظہار کیا تھا۔ میں نے اسوقت اندازہ کر لیا تھا کہ تم ابھی نو آموز ہو۔ اسے دانائی سے تعبیر کرو۔ یا عورت کی فطرتی ذہانت سے۔ رہا تمہاری تلوار کا معاملہ۔ سو میں نے اسے میان سے نکال لیا تھا جبکہ تم سو رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ شکستہ زنگ خوردہ اور ناکارہ تھی"۔

یارجہاں نے کہا "اور تم کہتی ہو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے"۔

"ہاں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تم سے محبت نہ کروں" دلیلہ نے جواب دیا "جبکہ میں نے آج تمہاری محبت کی صداقت آزمالی ہے۔ اور بہادر نوجوان جبکہ تم نے اپنی شجاعت اور دلاوری کا ثبوت دے دیا ہے۔ چلو ہم جلدی واپس چلیں۔ کیونکہ میری بوڑھی ماں اور بہنیں ہماری منتظر ہوں گی۔ اور نیکدل قاضی بھی ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔ تاکہ طلوع سحر سے پہلے ہمیں دائمی محبت کے نہ ٹوٹنے والے سلسلہ میں منسلک کر دے"۔

(ترجمہ: محمد حسین بی اے)

دیکھی پیتم تیری پریت

(از جناب سلطان احمد وجودی، ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن))

(۱)

چاندنی رات میں جب تارے آسمان کی کھڑکیوں سے جھانکتے ہیں۔ جب چاند بادل کی اوٹ سے گھورتا ہے۔ اور رات کو دن بنا دیتا ہے تو پیارے! میں آسمان کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتی ہوں۔ شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک نظر دوڑاتی ہوں — مگر آہ! مجھے میرا چاند کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

پیارے! تم کہاں چھپ گئے ہو؟

بادل کے نیچے؟

اس ٹیلے کے اس طرف؟

اس پہاڑی کے پیچھے؟

ہائیں تم آتے کیوں نہیں!

آنا نہ ہو۔

تو بلا بھیجو اپنے پاس۔

آتے بھی نہیں۔

بلاتے بھی نہیں۔

پیتم! پیتم!!

آہ! پیتم!!

دیکھی تیری پریت۔

(۲)

جب آسمان پر بادل چھا جاتے ہیں۔ بجلی چمکتی ہے بادل گرجتا ہے۔ بوندا بوندی ہوتی ہے۔ اور موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی ہے۔

پیارے! میں کام کاج سے فارغ ہو کر اس آراستہ کمرہ میں بیٹھ جاتی ہوں۔ جس کی دیوار پر تمہاری تصویر لٹک رہی ہے۔

پیارے پیارے۔

من موہن

میں دروازہ کی طرف دیکھتی ہوں۔

چاہتی ہوں۔

تم آؤ اور میں دیکھوں۔

تم زیادہ سندر ہو

تم زیادہ پیارے ہو۔

تمہاری تصویر۔

پیارے! دنیا کہتی ہے۔

بارش شروع ہو گئی۔

مگر میں اس برسات کو کیا کروں؟

جب تم پاس نہ ہو۔

تم نہیں آتے۔

نہیں آتے۔

کیا تم کو بارش میں بھیگنے کا خطرہ ہے؟

پیتم! پیتم!!

آہ پیتم!

دیکھی تیری پریت۔

(۳)

اندھیری رات میں جب آندھی آتی ہے۔ ہوا سے بڑے بڑے درخت گر جاتے ہیں۔ شاں شاں کی آواز سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ دروازوں سے دستک سی۔ کھڑکیوں سے کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دیتی ہے

پیارے جب بجلی چمکتی ہے۔

جب سینہ دہلتا ہے۔

جب اکیلے میں ڈر معلوم ہوتا ہے۔

پیارے! میں تم کو یاد کرتی ہوں۔

چاہتی ہوں کہ تم آؤ۔

اور مجھ سے چمٹ جاؤ۔

مجھ کو اپنے سینہ سے لگا لو۔

بھینچ لو۔

پیار کرو۔

پیارے! تم نہیں آتے۔

کیا تم اندھیرے سے ڈرتے ہو؟

کیا اندھیرے سے تمہیں خوف معلوم ہوتا ہے؟

پیتم! پیتم!!

آہ پیتم!

دیکھی تیری پریت۔

(۴)

ان سکھیوں کے جھرمٹ میں جو اچھے اچھے خوبصورت کپڑے پہنے۔ تیتریاں بنی ہوئی دلھن کی صورت بنائے تال کے کنارے۔ بڑ کے نیچے۔ مل جل کر بیٹھتی ہیں۔ سیر کو جاتی ہیں۔ باتیں کرتی ہیں۔ میں اداس صورت بنائے میلے کچیلے کپڑے پہنے جاتی ہوں۔

تو پیارے!

میرا دل چاہتا ہے۔

تم آؤ۔

اور مجھ سے اداس رہنے۔

سسکیاں لینے۔

میلے میلے کپڑے پہننے کا

سبب پوچھو۔

پیارے!

تم نہیں آتے۔

نہیں آتے۔

کیا تم خیال کرتے ہو۔

خط نہ لکھنے کا۔

دیر بعد آنے کا۔

میں تم کو طعنہ دوں گی؟

پیتم! پیتم!!

دیکھی تیری پریت۔

(۵)

پیارے!

دیکھنے والوں کو!

تم مجھ سے دور دکھائی دیتے ہو۔
گو تم میرے دل میں بستے ہو۔
میں تم کو رات دن یاد کرتی ہوں۔
ذرا سی آہٹ پر چونک اٹھتی ہوں۔
مگر تم نہیں آتے۔
خط بھی تو نہیں لکھتے۔
خیریت کی خبر بھی تو نہیں بھجواتے۔
یہ دور کا بسنا بھی۔
کیا لطف ہے جینے کا۔
آنکھوں میں سمائے ہو۔
دل میں تم آئے ہو۔
پر پاس نہیں آتے۔

کیوں مجھ سے ہو شرماتے ؟
میں تیری ہی داسی ہوں۔
میں تیری ہی پیاسی ہوں۔
آؤ تو چرن چھو لوں۔
تیری دید سے سیر ہو لوں۔
اور تجھ سے ذرا پوچھوں۔
سبب خط بھی نہ لکھنے کا
اور اس دیر سے آنے کا۔
آہستہ سے پھر کہدوں۔
پیتم! پیتم!!
آہ پیتم!
دیکھی تیری پریت۔

(سلطان احمد۔ وجودی)

تجلیاتِ حشر

(از شیکسپیر ہند آغا حشر کاشمیری مرحوم)

ہوئی ہیں یوں حسن کے افق پر تجلیاتِ شباب پیدا
کہ جس طرح ہو غبارِ زرّیں سے صبح کا آفتاب پیدا

چھلک رہے ہیں بصد تجمل شرابِ نکہت سے ساغرِ گل
کہ بطنِ دوشیزۂ چمن سے ہوئے ہیں حسن و شباب پیدا

بنا ہے دیوانہ عقل و دیں کو پھر آج اسی چشمِ سرمگیں سے
ہے جس کی ہر گردشِ حسیں سے خرامِ موجِ شراب پیدا

(عطیہ جناب مظفر حسین صاحب شمیم)

ایک ہزار ڈالر

(از جناب محمد خالد اختر۔ بھاولپور)

"ایک ہزار ڈالر" ٹالمین وکیل نے سنجیدگی اور کچھ نہ کچھ درشتی سے دہراتے ہوئے کہا۔ "اور رقم یہ ہے"

نوجوان گلین نے نوٹوں کو ہاتھوں میں لیتے ہوئے ایک عجیب حسین مسکراہٹ سے ٹالمین کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یہ کسقدر بے ربط اور فضول رقم ہے اگر یہ دس ہزار ڈالر ہوتے تو ان سے آتشبازی کا کام لے کر شہرت پا جاتا۔ اگر صرف پچاس ڈالر ہوتے۔ تو اس روح فرسا فکر اور تردد میں نمایاں کمی ہو جاتی"

"تم نے اپنے مرحوم چچا کی وصیت پڑھی ہوگی" ٹالمین وکیلوں کی سی سخت خشک اور کھردری آواز میں بولا۔ "میرے خیال میں تم نے اس پر پورا پورا غور نہیں کیا۔ میں تمہیں ایک بات یاد دلادوں۔ جب تم یہ ایک ہزار ڈالر خرچ کر لوگے۔ تو اپنے جملہ اخراجات کی کیفیت ہمارے سامنے پیش کرنا ہوگی۔ وصیت میں یہی لکھا ہے۔ میرے خیال میں آپ مرحوم گلین کی آخری آرزو کی ہمنوائی کریں گے۔"

"آپ اطمینان رکھیں۔ نوجوان نے رکتے ہوئے کہا" گو اس طرح میرا خرچ زیادہ ہو جائے گا۔ میں دراصل حساب کتاب میں بہت کمزور واقع ہوا ہوں۔ اس لئے مجھے ایک سیکرٹری رکھنے کی حاجت ضرور ہوگی"۔

گلین اپنے کلب کی طرف گیا۔ وہاں اس نے بوڑھے براٹسن کو ڈھونڈ نکالا۔

براٹسن چالیس سال کا خاموش اور خلوت پسند بوڑھا تھا۔ وہ ایک کونے میں بیٹھا کسی کتاب کے مطالعہ میں مشغول تھا گلین کو آتا دیکھ کر اس نے ایک لمبی سرد آہ بھری۔ کتاب کو سامنے میز پر رکھ دیا۔ اور اپنی عینک اتار لی۔

"بوڑھے براٹسن۔ ہشیار باش" گلین نے کہا۔ "میں تمہیں ایک عجیب مزیدار کہانی سنانے آیا ہوں"

"میرے خیال میں تم یہ کہانی بلیرڈ ہال میں جا کر سناؤ" بوڑھے نے جواب دیا۔ "تم جانتے ہو مجھے تمہاری کہانیوں سے کسقدر نفرت ہے؟"

"یہ کہانی اوروں سے زیادہ لطیف ہوگی" گلین نے اپنا سگرٹ انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا۔ "اور خاصکر تمہیں یہ کہانی سنانے میں مجھے گونہ مسرت حاصل ہوگی۔ بلیرڈ کی گیندوں کی مسلسل کرخت آواز اس حزن انگیز۔ دردناک مگر میٹھی کہانی کے قابل نہیں۔ میں ابھی ابھی اپنے مرحوم چچا کے قانونی قزاق خانے" سے آرہا ہوں۔ اس نے میرے لئے ایک ہزار ڈالر چھوڑے ہیں۔ اب بتاؤ۔ ان ایک ہزار ڈالروں سے کیا کام لیا جا سکتا ہے؟"

"میرا خیال تھا" بوڑھے براٹسن نے اس معاملہ میں ایک نمایاں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ کہ مرحوم گلین کم از کم نصف لاکھ کا مالک تو ضرور ہوگا۔"

"ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو" گلین نے ایک خاص مسرت سے جواب دیا۔ "اور یہی تو تعجب انگیز بات ہے۔ اس نے اپنی تمام دولت چھوٹے چھوٹے ذلیل حصوں میں تقسیم کر دی ہے۔ کچھ حصہ اس شخص کے لئے وقف ہے۔ جو کوئی مفید دوا ایجاد کرے اور جس ہسپتال میں اس دوا سے کام لیا جائے اس کے لئے ایک علیحدہ رقم وقف ہے۔ مکان کے چوکیدار اور نوکروں کو بھی فراموش نہیں کیا گیا۔ ہر ایک کو ایک انگوٹھی اور دس ڈالر دیئے گئے ہیں۔ اور مرحوم کے بھتیجے کو ایک ہزار ڈالر!"

"تمہارے اخراجات کے لئے تمہارے پاس ہمیشہ کافی رقم رہتی ہے" بوڑھے براٹسن نے کہا۔

"ہاں" گلین نے جواب دیا۔ "جہاں تک اس بات کا تعلق ہے۔ مرحوم چچا کافی فیاض واقع ہوا تھا"۔

"کوئی اور وارث بھی ہے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"نہیں" گلین نے جواب دیا۔ مگر اچانک اس کی آنکھوں میں تعجب اور برافروختگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے صفحہ کو زور سے ٹھکراتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ ایک مس ہیڈن ہے۔ میرا چچا اس کا سرپرست تھا۔ بدقسمتی سے لڑکی کے باپ اور میرے چچا میں کافی گہرے تعلقات تھے۔ لڑکی حد درجہ خاموش حسینہ ہے۔ اس کی رگ رگ میں ترنم ہے۔ وہ سراپا موسیقی ہے۔ دس ڈالر اور ایک انگوٹھی کے "مذاق" میں وہ بھی شامل ہے۔ کاش میں بھی اسی گروہ میں ہوتا۔ شراب کی دو بوتلیں خرید لیتا۔ انگوٹھی ہوٹل کے کسی ملازم کو "انعام" کے طور پر دے دیتا۔ اور اس طرح تمام معاملہ پل بھر میں صاف کر دیتا" بوڑھے براٹسن! تم حد درجہ خلوت پسند اور بے نیاز شخص ہو۔ میاں سب کچھ بھول جاؤ۔ مجھے بتاؤ۔ کہ ایک شخص ایک ہزار ڈالر وں سے کیا کیا کر سکتا ہے؟"

بوڑھے براٹسن نے اپنا چشمہ صاف کیا اور مسکرایا۔ گلین نے اس کی مسکراہٹ سے یہی نتیجہ نکالا کہ وہ اور زیادہ گستاخ ہو رہا ہے۔ مگر اس نے کہا۔ "ایک ہزار ڈالر کچھ بھی ہوں۔ ہمیں ان سے کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال ان سے ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی جا سکتی ہے۔ جس میں بیٹھ کر مشہور سے مشہور عمارت پر پھبتیاں اڑائی جا سکیں۔ اپنی بیمار بیوی کو اٹلی کی صحت بخش ہوا میں بھیجا جا سکتا ہے۔ جہاں وہ اپنی زندگی کو ان سرد شمالی ممالک کی کثیف ہوا سے محفوظ رکھ سکے۔ جون۔ جولائی اور اگست کے مہینوں میں ایک ہزار بچوں کے لئے خالص دودھ خریدا جا سکتا ہے۔ جو اکھیل کر تقریباً آدھ گھنٹہ کے لئے محزوں طبیعت کو مسرور کیا جا سکتا ہے۔ کسی شوقین مزاج اور رنگین طبیعت لڑکے کی تعلیم کا انتظام ہو سکتا ہے۔ مزید براں میں نے سنا ہے کہ کل مشہور مصور کوروٹ کا ایک زبردست شاہکار اسی رقم پر نیلام ہوا۔ نیو ہمپشائر میں جا کر تم دو سال تک باعزت زندگی بسر کر سکتے ہو۔ ایک شام کے لئے میڈیسن سکیر گارڈن کرایہ پر لیا جا سکتا ہے۔ جہاں تم لوگوں کو (اگر لوگ مل سکیں) وراثت کے بے بنیاد اور خطرناک اصولوں سے آگاہ کر سکتے ہو"۔

"عوام الناس شاید تمہارے خیالات کو پسند کریں" گلین نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "اگر تم اپنی باتوں میں وعظ و

نصیحت سے اجتناب کرو۔ میں نے تم سے پوچھا تھا۔ کہ میں ایک ہزار ڈالروں سے کیا کر سکتا ہوں!"

"تم!" بوڑھے براٹسن کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "بابی گلین ایک نہایت دانشمندانہ پہلو رہ گیا ہے تم مشہور ایکٹرس مس لاٹا لاریر کے لئے ایک نہایت قیمتی ہار خرید لو اور اس رقم سے ہاتھ دھو کر گلہ بانی شروع کر دو ——— بھیڑوں کے گلّے"۔

"شکریہ" گلین نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ تم ہی میری مدد کر سکو گے۔ تم نے خوب مشورہ دیا۔ میں اس رقم کو یکمشت اڑا دینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں نے اس کی کیفیت پیش کرنا ہے اور مجھے ان باتوں سے نفرت ہے"

گلین نے ایک یکّے والے کو بلایا۔ اور کولمبائن تھیٹر کی طرف چلنے کو کہا۔

مس لاٹا لاریر غازے سے قدرت کی مدد کر رہی تھی اور سٹیج پر جانے کے لئے بالکل تیار تھی۔ کہ معًا اس کے ملازم نے مسٹر گلین کی آمد کی خبر دی۔

"آنے دو" مس لاریر نے کہا ——— "بابی۔ کیا بات ہے۔ کہو۔ میں نے دو منٹوں تک سٹیج پر جانا ہے"۔

"بس ایک پل کے لئے مجھے کچھ کہنے دو" گلین نے آہستہ سے کہا۔ "بس ٹھیک ہے۔ کیا تم ایک قیمتی ہار چاہتی ہو۔ میں ایک ایسی رقم تو حاضر کر سکتا ہوں۔ جس میں تین صفر ہوتے ہیں اور سامنے ایک کا ہندسہ"

"ہاں ٹھیک ہے" مس لاریر نے حیرت سے کہا ——— "آڈمنز (ملازم کا نام) میرا دہنا دستانہ دینا ——— کہو بابی! کیا تم نے وہ ہار دیکھا جو ڈیلا سٹیسی نے کل رات پہنا تھا۔ بائیس سو ڈالر کا تھا لیکن ——— آڈمنز میرے چغے کو بائیں جانب کھینچو"

"مس لاریر تمہیدی گانے کے لئے" باہر سے آواز آئی۔ اور لاریر چلی گئی۔

گلین اپنے یکّے کی طرف روانہ ہوا۔

"اگر تمہارے پاس ایک ہزار ڈالر ہوں۔ تو تم کیا کرو گے؟" اس نے یکّے والے سے پوچھا۔

"میرے پاس ایک ہزار ڈالر آ ہی نہیں سکتے جناب"۔ یکّے والے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں" گلین نے کہا۔ "میں نے تو ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔ اچھا۔ تو تم ایک گھنٹہ کے لئے میرے پاس ہو۔ چلتے جاؤ۔ جہاں میں کہوں وہاں ٹھہر جانا"۔

ایک جگہ گلین نے یکّہ ٹھیرایا۔ ایک اندھا آدمی اسٹول پر بیٹھا پنسلیں بیچ رہا تھا۔ گلین اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"گستاخی معاف" اس نے کہا۔ "لیکن کیا تم مجھے یہ بتانے کی تکلیف کرو گے۔ کہ اگر تمہارے پاس ایک ہزار ڈالر ہوں۔ تو تم ان کا کیا کرو گے؟"

"تم اس یکے سے اُتر رہے ہو جو ابھی ابھی یہاں سے گزرا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟" اندھے نے پوچھا۔

"ہاں" گلین نے جواب دیا۔

"کیوں۔ آپ کی صحت کیسی ہے۔ دن کے وقت یکے میں سوار ہونے کے کیا معنی؟۔ اچھا ——— دیکھئے" اندھے نے کہا اُس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک کتاب نکالی۔ اور آگے بڑھائی۔ گلین نے اُسے کھولا۔ اور دیکھا کہ وہ ایک بنک کی پاس بک ہے۔ اندھے کے نام پر ۱۷۸۵ ڈالر جمع تھے۔

گلین نے کتاب واپس کر دی اور یکے میں سوار ہو گیا۔ "میں کچھ بھول آیا ہوں۔ تم ٹالین اینڈ شارپ کے دفاتر کی سمت جاؤ۔"

ٹالین نے اس کی طرف دیکھا۔ سنہری عینکوں میں غصہ اور تحیر سے بھری ہوئی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"گستاخی معاف" گلین نے مسرت سے کہا۔ "لیکن کیا میں آپ سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں۔ یہ کوئی سخت یا بیہودہ سوال نہیں۔ مس ہیڈن کے لئے میرے مرحوم چچا نے انگوٹھی اور دس ڈالروں کے سوا کچھ اور بھی چھوڑا؟"

"نہیں" ٹالین نے کہا۔

"شکریہ ـــ بہت شکریہ" گلین نے کہا۔ اور یکہ میں بیٹھ گیا۔ یکے والے کو اپنے مرحوم چچا کے مکان کا پتہ بتایا۔

مس ہیڈن اپنے مطالعہ کے کمرے میں خطوط لکھ رہی تھی۔ وہ حد درجہ نازک۔ ہلکی پھلکی اور پتلی سی لڑکی تھی۔ سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ گلین اس کے کمرے میں اس انداز سے داخل ہوا۔ گویا یہ دنیا اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

"میں ٹالین کی طرف سے آرہا ہوں" اُس نے کہا۔ "اُنہوں نے تمام کاغذات دیکھے ہیں اور ——— گلین نے کوئی قانونی اصطلاح ڈھونڈھنے کی ناکام کوشش کی ——— "اور وصیت میں ایک ضمیمہ یا نوٹ یا کچھ چیز نکلی ہوئی پائی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھے کو بعد میں تمہارا خیال آیا۔ اور تمہارے لئے ایک ہزار ڈالروں کی وصیت کی۔ ٹالین نے مجھے یہ رقم آپ تک پہنچانے کے لئے کہا۔ رقم حاضر ہے۔ تم اسے گن لو۔" گلین نے تمام نوٹ ہیڈن کے ہاتھ کے نزدیک رکھ دیئے۔

مس ہیڈن کا چہرہ فق ہو گیا۔ اُس نے دو تحیر آمیز آہیں بھریں۔ گلین نے گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر نظر ڈالی اور پھر دھیمی آواز میں کہنے لگا۔ "شاید ——— میرے خیال میں ——— تم جانتی ہو ——— میں تم سے محبت کرتا ہوں!"

"نہیں" مس ہیڈن نے نوٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ سب کچھ بےسود ہے؟" گلین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں" اس نے دوبارہ کہا۔

"میں ایک تحریر لکھنا چاہتا ہوں" گلین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ایک بڑی سی میز پر بیٹھ گیا۔ مس ہیڈن اس کے لئے کاغذ اور قلم لے آئی اور اپنی جگہ بیٹھ گئی۔

گلین نے ایک ہزار ڈالروں کے خرچ کی کیفیت یوں لکھی۔

"بدقسمت رابرٹ گلین نے ایک ہزار ڈالر کرۂ زمین کی سب سے زیادہ اچھی اور پیاری عورت کی بارگاہِ ناز میں غیرفانی مسرت کے لئے قربان کر دیئے"۔

تحریر کو ایک سفید لفافہ میں بند کیا۔ جھکا۔ اور اپنی راہ لی۔

یکہ دوبارہ ٹالمین اور شارپ کے دفاتر کے سامنے ٹھہرا۔

"میں نے ایک ہزار ڈالر خرچ کر دیئے ہیں"۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور آپ کے ارشاد کے مطابق تمام خرچ کی کیفیت پیش کرنے آیا ہوں"۔ مجھے تو فضا میں ایک نہایت لطیف سی گرمی محسوس ہو رہی ہے۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے؟"

اس نے وکیل کی میز پر ایک سفید لفافہ پھینک دیا۔ "آپ اس میں ڈالروں کے غائب ہو جانے کی داستان پڑھ سکیں گے"

لفافہ اٹھائے بغیر ٹالمین اٹھا اور دروازے پر جا کر اپنے ساتھی شارپ کو بلایا۔ انہوں نے ایک بہت مضبوط آہنی کیش بکس کی تلاشی لینی شروع کی۔ ایک سربمہر لفافہ نکالا۔ نہایت تیزی سے اسے پھاڑا۔ اور اپنے دو مقدس تجربہ کار سر اس پر جھکا دیئے۔ اس کے بعد ٹالمین بولا۔

"مسٹر گلین تمہارے چچا کی وصیت کے ساتھ ایک اور قانونی پہلو بھی تھا۔ اور اس کی تشریح اس لفافہ میں بند کر کے ہمیں دیدی گئی تھی۔ تاکہ جب تم ایک ہزار ڈالروں کے خرچ کی کیفیت پیش کرو۔ تو اسے کھول کر دیکھا جائے۔ سو اب میرے ساتھی اور میں نے اسے کھولا۔ میں تمہارے دماغ پر اس کی قانونی اصطلاحات کا بار نہیں ڈالنا چاہتا۔ لیکن مختصر طور پر اس کا خلاصہ سامنے پیش کرتا ہوں۔

اگر اس کیفیت سے یہ ظاہر ہو کہ تم نے کوئی حد درجہ دانشمندانہ اقدام کیا ہے تو تمہیں کافی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ مسٹر شارپ اور میں اس معاملہ میں منصف مقرر ہوئے ہیں۔ یقین مانو۔ ہم نہایت آزادی اور انصاف سے اپنا فرض پورا کریں گے۔ مسٹر گلین ہمارے تمہارے درمیان کسی قسم کی مخالفت نہیں۔ اب ہمیں اس قانونی معاملے پر غور کرنا چاہئے۔ اگر تم نے عقلمندی۔ بےغرضی اور دور اندیشی سے رقم خرچ کی ہے۔ تو ہماری طاقت میں ہے کہ تمہیں پچاس ہزار ڈالر دے دیئے جائیں۔ جو صرف اسی مطلب کے لئے ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ لیکن مرحوم گلین کی تحریر کے مطابق اگر وہ رقم اس طرح خرچ کی گئی ہے۔ جس طرح آپ پہلے خرچ کرتے آئے ہیں —— میں مرحوم کے الفاظ دہرا رہا ہوں —— بدمعاش سفلوں کے ساتھ انتہائی مخربِ اخلاق باتوں میں —— تو پچاس ہزار ڈالر مس میریم ہیڈن کو دیئے جائیں گے۔ اب ہم مسٹر شارپ تمہارے حساب کو دیکھتے ہیں۔ امید ہے تم ہمارے فیصلے سے مطمئن ہو جاؤ گے"۔

مسٹر ٹالمین لفافے کی طرف جھکا۔ لیکن گلین کافی تیزی سے لفافے پر جھپٹا۔ اور اسے پھاڑ کر [illegible]

اپنی جیب میں ڈال دیا۔

"کوئی بات نہیں" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "فکر نہ کیجئے۔ میرے خیال میں آپ اس تحریر کا مطلب ہی نہ سمجھ سکتے۔ میں ایک ہزار ڈالر گھوڑ دوڑ میں ہار آیا ہوں ـــ اچھا۔ خدا حافظ"

دونوں مبہوت ہوگئے۔ کیونکہ انہوں نے گلین کو نہایت تسلی و طمانیت قلب سے گیلری میں منہ سے سیٹی بجاتے ہوئے دیکھا۔

(ترجمہ) (او ہنری) (محمد خالد اختر)

اسرار و رموز

(از جناب خواجہ حمید صاحب عرفانی ایم اے)

کوئی تدبیر کارگر ہوتی زندگی موت سے بتر ہوتی
میرے نالوں کی جلوہ داں دنیا ہم کہاں تھے؟ اگر سحر ہوتی

آج ہوتا ہے انتظار کہاں پھر جوانی کہاں بہار کہاں
اس کے وعدے؟ فریب عرفانی ایسے لوگوں کا اعتبار کہاں

گر ہمیں کچھ بھی آسرا ہوتا کیا خبر ہم نے کیا کیا ہوتا
ہم تو پھر اعتبار کر لیتے کچھ تو تم نے مگر کہا ہوتا

خواجہ حمید عرفانی

شعلۂ طور

اور

مولانا سید سلیمان ندوی کا دیباچہ

(جناب محمود نظامی کے قلم سے)

حضرت جگر مراد آبادی۔ یوپی کے بہت بڑے شعرا میں سے ہیں یہ اس صف کے ایک ممتاز فرد ہیں جس میں حسرت فانی، ریاض، اور اصغر جیسے باکمال شامل ہیں۔

جگر کو بامِ شہرت تک پہنچے بہت عرصہ گذر چکا ہے مگر ان کے نام سے پہلے پہل میرے کان اس وقت آشنا ہوئے جبکہ آج سے کئی سال پیشتر ایک نامعلوم بزرگوار سبزی منڈی جالندھر میں جگر مراد آبادی کے نام سے اقامت پذیر ہوئے اور کچھ عرصہ مشاعروں میں شرکت فرما کر افشائے راز پر رفوچکر ہو گئے۔ ابتک پتہ نہ چل سکا کہ یہ ذاتِ شریف کون تھے اور اس حرکت کے مرتکب کیوں ہوئے۔ بہرحال جب تک انکا راز نہ کھلا۔ انہوں نے بحیثیت جگر جالندھر کے غریب سخن گو اور سخن فہم حضرات کے سر پر خوب گلچھرے اُڑائے دعوتیں کھائیں مزے لوٹے۔ مشاعرے میں جس شان سے ان کی آؤ بھگت کی جاتی تھی وہ مجھے خوب یاد ہے۔ سامعین گھنٹوں ان کی آمد کا انتظار کرتے اور ہمارے شہر کے سادہ لوح شعرا ہر مصرع پر اُچھل اُچھل پڑتے اور بڑھ بڑھ کر اس "نقلی" جگر کو داد دیتے۔ عاشق جالندھری کا یہ شعر اس واقعہ کے بعد لکھا گیا تھا:۔

مرادآباد کا ہے نام روشن الٰہی خیر منڈی کے جگر کی

بہرحال جگر کا نام تو عرصہ سے سن رکھا تھا مگر ان کے کلام کو کتابی صورت میں دیکھنے کا موقع مجھے حال ہی میں ملا۔ اس کو دیکھنے کے بعد میرے لئے یہ ضروری نہ تھا کہ میں اس مقالہ کو لکھنے کی کوشش کرتا۔ لیکن مولانا سلیمان ندوی کا وہ دیباچہ جو کلام جگر کے ساتھ شامل ہے اس مضمون کو لکھوانے کا محرک ہوا۔ مولانا نے تصویر کا جو رخ پیش کیا ہے وہ مطابق اصل نہیں یا یوں سمجھئے کہ اس کا دوسرا رخ ان کی نظروں سے مخفی رہ گیا ہے۔

جگر کے کلام کے اس مجموعے کا نام "شعلۂ طور" ہے۔ اس میں انہوں نے ابتدا سے لے کر اس وقت تک لکھی ہوئی تمام غزلیات یکجا کر دی ہیں۔ ان کے علاوہ اردو کی چند نظمیں بھی ہیں اور فارسی کا کچھ کلام بھی۔ غزلیات کو مصنف نے خود چار ادوار پر تقسیم کیا ہے۔ مگر ادوار نہایت بے قاعدگی سے قائم کئے گئے ہیں۔ اس کا پرتو ان میں نظر نہیں آتا یعنی ان ادوار کے کلام میں کوئی ایسا امتیازی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ جس کی وجہ سے ایک دور کے شعر کو دوسرے دور کے شعر سے بیک نظر ممتاز کیا جا سکے۔ کلام کو ادوار میں تقسیم کرنے سے شاعر کی ذہنی قوتوں کے ارتقا اور ماحول کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن جگر کے ہاں ان کے حقیقی رجحانات اور نقطۂ نظر کے تغیر و تبدل کا پتہ آسانی سے نہیں چل سکتا

کتاب کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے "تعارف" کے علاوہ مصنف نے خود بھی کچھ اپنے کلام کی نسبت اپنے قلم سے لکھا ہے۔ مگر انکی عبارت کئی مقامات پر بے حد پیچیدہ ہے۔ مثلاً یہ فقرہ بآسانی سمجھ میں نہیں آتا۔

"تلک کی موت پر جو نظم ہے اس میں سے بعض تخیل کے متعلق محض اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو کہ مورخ ادبی میرے عقائد مذہبی کو بھی ویسا ہی سمجھنے لگے اس لئے یہ ظاہر کئے دیتا ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم پورے شباب کے عالم میں کہی گئی۔ جبکہ نہ مجھے مذہب کی خبر تھی نہ اپنی.........."

ایک جگہ پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ آج کل کے شعرا کا "رونا" کامیاب نہیں۔ فرماتے ہیں:-

"مشاقی کی بدولت الفاظ پر قدرت حاصل ہے۔ یا جو چاہا جس طرح چاہا کہہ دیا۔ زندگی کو شعر سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو لیکن اگر سچے رونے والے ہوں تاہم اس قسم کا شعر و ادب اولاً توجیاتِ قومی کے لئے سمِ قاتل کا حکم رکھتا ہے دوسرے کامیاب رونا وہ رونا نہیں جس میں نسائیت و عمومیت پائی جاتی ہے۔"

خدا جانے یہ طرزِ انشا کیا کہلانے کی مستحق ہے۔ آگے جا کر رقمطراز ہیں:-

"میرے نظریۂ شعری کے اعتبار پر مشاعرے کی غزلوں میں سے بہت کم ایسی غزلیں ہو سکتی ہیں جن پر صحیح معنوں میں غزل کا اطلاق کیا جا سکے تاہم ہر جگہ آپ میری انفرادیت محسوس کئے نہیں گذر سکتے۔"

اس فقرے کو پڑھنے کے بعد میرا خیال تھا کہ آپ نے کہیں نہ کہیں اپنے نظریۂ شعری کی وضاحت ضرور کی ہوگی۔ مگر وہ تلاش کے باوجود نظر نہ آیا نہ ہی یہ پتہ چلا کہ مشاعرے کی غزلیں کونسی ہیں۔ اسی طرح "صحیح معنوں میں غزل" کے الفاظ بھی وضاحت طلب اور مبہم ہیں۔ نہ معلوم جناب جگر کے نزدیک صحیح معنورت کیا چیز مراد ہے۔ بہتر ہوتا کہ صحیح غزل اور عام غزل میں جو شے مابہ الامتیاز ہے اسے واضح کر دیا جاتا تاکہ پڑھنے والا جگر کے نظریہ کو سمجھ سکتا۔ مجموعی طور پر یہ تمہید جگہ جگہ پر الجھی ہوئی ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے یوں معلوم ہوتا ہے۔ جگر اپنے مافی الضمیر کو واضح نہیں کر سکے۔

اس تمہید کے بعد مولانا سلیمان ندوی کا دیباچہ ہے جو اپنی گوناگونی کے لحاظ سے قابل دید شے ہے۔ اس دیباچہ کے دو عنوان ہیں۔ "تعارف" اور "نو وارد شاعر" تعارف کا لفظ کلام جگر کے دیباچہ کے لئے بے محل اور بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ شعرو شاعری کی مشق کرتے جگر کی عمر کا اکثر حصہ کٹ گیا ہے۔ اور پیشہ ور شاعر ہونے کی حیثیت سے وہ کسی قسم کے رسمی تعارف کے محتاج نہیں خواہ تعارف کرانے والا ادبی دنیا میں کتنی بڑی شخصیت کا مالک کیوں نہ ہو۔ اسی طرح نو وارد کا لفظ بھی جگر کے نام کے لئے زیب نہیں دیتا۔ یہ دیباچہ گو ۳۲ء کا تحریر شدہ ہے مگر اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ اس زمانے میں بھی جگر دنیائے شعر و ادب میں نو وارد کی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ اس صورت میں جگر کو نو وارد شاعر کہنا بے حد حیرت خیز ہے۔ ہر چند سید صاحب نے اپنی اور جگر کی ملاقات ایک کہانی کے پیرایہ میں بیان فرمائی جو بذاتِ خود بہت دلچسپ اور رنگین ہے مگر ان کے دیباچے کا عنوان وہ نہ ہونا چاہئے تھا جو ہے کیونکہ نہ تو ان کا دیباچہ بطور تعارف شامل کتاب کیا گیا ہے اور نہ جگر کسی لحاظ سے نو وارد شاعر سمجھا جا سکتا ہے۔ ورنہ یوں تو ہو

فی نفسہ تعارف ہی ہوتا ہے اور ہر شاعر کسی نہ کسی عہد میں نووارد ہی کی حیثیت میں عوام کے سامنے آتا ہے۔ بہرکیف اس "تعارف" میں مولانا ندوی نے تحسین و ستائش کے پھول جس انداز سے جگر پر برسائے ہیں وہ ضرورت سے زیادہ فراخدلی کا نتیجہ ہیں ورنہ سمجھ میں نہیں آتا مولانا کی مخصوص احتیاط نے انہیں ان الفاظ کی تحریر کی اجازت کیونکر دی کہ

"جگر کی شاعری میں نہ زلف و شانہ ہے نہ سرمہ و آئینہ ۔ نہ ہوسِ بالائے بام نہ شکایتِ منظرِ عام......

... نہ اس کے محبوب کے ہاتھوں میں قصاب کی چھری ہے نہ جلاد کی تلوار........"

کیونکہ یہ سب فروعات جگر کے ہاں موجود ہیں ۔ جگر کی شاعری جیساکہ جگر خود فرماتے ہیں محض غزل تک محدود ہے۔ اور غزل میں انکا رنگ سراسر متقدمین سے ملتا ہے۔ لہذا ان کے ہاں معشوق کے حسن کے ظاہری لوازمات یعنی زلف و شانہ اور سرمۂ آئینہ کی تعریف ان کے رنگ کا فطری نتیجہ ہے ۔ چنانچہ اس قسم کے اشعار کا وجود اسی رسم پرستی کی وجہ سے جگر کے ہاں خلافِ توقع نہیں

مژدہ اے شوقِ شہادت اوج پر تقدیر ہے | آج دستِ ناز میں نازک سی اک شمشیر ہے

سرد ادگانِ عشق و محبت کی کیا کمی | قاتل کی تیغ تیز خدا کی زمیں رہے

خود حسن و شباب انکا کیا کم ہے رقیب اپنا | جب دیکھئے اب وہ ہیں آئینہ ہے شانہ ہے

اللہ شرم رکھ لے تو میرے جنگ جو کی | آئینہ روبرو ہے چوٹیں ہیں دو بدو کی

یہ چشمِ مست یہ ابرو یہ زلف یہ خد و خال | یہ لب یہ رخ یہ جبیں یہ عذار کیا کہنا

بوس و کنار کا تذکرہ موجودہ معیارِ ذوق کے منافی ہے مگر جگر کے ایسے اشعار کے متعلق مولانا سلیمان ندوی نہ جانے کیا ارشاد فرمائیں گے ۔ ؎

ایک بوسہ اس لبِ جاں بخش کا | عمر بھر کے واسطے انعام ہے

ظاہر ہے مولانا نے کلامِ جگر کا مطالعہ کرتے وقت غور و امعان سے کام نہیں لیا۔ ورنہ وہ دیکھ لیتے کہ جن "معائب" کے فقدان پر انہوں نے جگر کے کلام کو سراہا ہے ۔ بدقسمتی سے اس میں وہ سب موجود ہیں اور اس بنا پر ان کے بھاری بھرکم الفاظ اور بلند آہنگ تحسین مضحکہ خیز ہو کر رہ گئی ہے۔ حقیقت محض اتنی ہے کہ کنگھی چوٹی کے مضامین آج کل صحیح ذوق کے منافی سمجھے جاتے ہیں چنانچہ ہر اچھے شاعر کے متعلق نقاد گھر بیٹھے یہ فرض کر لیتا ہے کہ اس کے ہاں یہ چیز موجود نہ ہو گی ۔ یہی حال مولانا کا ہے۔ آپ نے خواہ مخواہ یہ فرض کر لیا ہے کہ جگر کا تغزل ان مضامین سے پاک ہے ورنہ جگر کے ہاں یہ چیز موجود ہے ۔ اور چونکہ ان کے بیان میں ان کا اسلوب نہایت شگفتہ ہے۔ اس لئے یہ حرف گیری کی زد میں بھی نہیں آتے ۔ مگر یہ منطق میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔ کہ ان مضامین کی موجودگی یا عدم موجودگی سے کسی شاعر کے کمال میں کیا فرق آ سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کا طرزِ بیان سلجھا ہوا اور پاکیزہ ہو ۔ اور اس کی طبیعت میں انفرادیت اور اپج ہو زلف و شانہ، سرمہ و آئینہ کے مضامین بجائے خود کوئی حقیر شے نہیں۔ اگر کوئی شے حقیر ہو سکتی ہے تو وہ شاعر کا مذاق ہے جو ان کے بیان میں ان کے اصلی جوہر اور خوبی کو کھو بیٹھتا ہے ۔ اسی طرح اگر شاعر کو ہوسِ بالائے بام نہیں تو اس کا عشق کبھی جنسِ مجہول سے زیادہ وقیع نہیں سمجھا جا سکتا۔ یعنی اگر جگر کا دل بالکل مردہ نہیں ہو گیا اور

اس کے خون میں جوش و حرارت کا شمہ بھی موجود ہے تو اس کو ہوسِ بالائے بام ضرور ہوگی اور اگر اس کے عشق میں رمقِ غیرت باقی ہے تو اس کو اپنے محبوب سے شکایت منظر عام بھی ہونا چاہئیے کہ یہ دونوں جذبے فطری ہیں اور حساس فرد بشر ہونے کی حیثیت سے جگر کو ان سے عاری نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ جذبات رسمی نہیں بلکہ حقیقی ہیں اور کوئی عاشق انکی گرفت سے محفوظ نہیں رہ سکتا جگر کی شاعری میں بھی ان کا ذکر فطری ہے۔ مولانا کا خیال ہے کہ:-

"جگر شاعر ہے مگر کیسا شاعر؟ تنہا شاعر بلکہ ہمہ شاعر ان کا طرز ابنائے زمانہ کی طرز سے الگ۔ لکھنؤ اور دہلی کی حکومتوں سے آزاد موزوں الفاظ اور دلکش ترکیبوں کے باوجود بے ساختگی اور آمد سے معمور ہر تکلف تعمق اور آورد سے پاک طلسم الفاظ سے خیالات کی ایک دنیا بنا کر کھڑی کر دینے والا موجودہ شعرا میں اس کے اس وصف میں اگر کوئی شریک ہے تو وہ فانی ہے"۔

میرے نزدیک مولانا کا یہ فقرہ شروع سے لے کر آخر تک حقیقت سے عاری ہے۔ کیونکہ آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا ایک لفظ بھی کلام جگر کے متعلق ٹھیک نہیں اترتا نہ آپکی مبینہ خصوصیات جگر کے ہاں دکھائی دیتی ہیں۔

اول تو یہ کہنے کے بعد کہ موجودہ شعرا میں اس کے ساتھ (خواہ وہ محض ایک وصف کی یکسانیت کی وجہ سے سہی) اگر کوئی شریک ہے تو وہ فانی ہے۔ جگر کو تنہا شاعر قرار نہیں دیا جاسکتا نہ ہی اس شرکت کی وجہ سے (خواہ یہ شرکت کتنی ہی خفیف کیوں نہ ہو) اس کا طرز ابنائے زمانہ کی طرز سے علیحدہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہنے کے بعد کہ جگر کا کلام ہر تعمق سے پاک ہے۔ فانی کو ان کے ساتھ لا شامل کرنا صد درجہ حیرت خیز ہے۔ کیونکہ فانی میں اگر کوئی خوبی ہے تو وہ ان کے خیالات کا تعمق ہے۔ فانی کا ہر شعر ان کے سنگین غور و فکر اور ان کی نکتہ رس طبیعت کا شاہد ہے۔ جگر اور فانی کے اسلوب میں بعد المشرقین ہے۔ حیرت ہے مولانا ان کے مراتب کو کیونکر نظر انداز کر گئے۔

اسی طرح جگر کا کلام لکھنؤ اور دہلی دونوں حکومتوں سے نہ تو قطعاً آزاد ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ دونوں کا اصلی رنگ نہ سہی پھر بھی جھلک سے کسی طرح خالی نہیں اور اس جھلک کی وجہ سے جگر کی شاعری کو بالکل آزاد نہیں کہا جا سکتا۔ جب ہم جگر کے کلام کا متقدمین سے موازنہ کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ انکی ہوبہو تقلید ہے۔ یہ خصوصیت کچھ جگر تک ہی محدود نہیں ان کے اکثر معاصرین کے کلام کا بیشتر حصہ متقدمین کی نقالی کے سوا کچھ نہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ جگر اپنی بعض مخصوص خصوصیتوں کی وجہ سے ان سب سے بازی لے گیا ہے۔ یعنی جگر کی غزل گوئی قدیم اساتذہ کے اصولوں سے سر مو تجاوز نہیں کرتی مگر معنوی اعتبار سے وہ ان سے ایک انفرادی شان رکھتی ہے۔ یعنی وہ غزل کے ان تمام معائب سے پاک ہے جو لایعنی تکلف اور بیہودہ تصنع کی وجہ سے غزل کا جزو لاینفک ہو چکے ہیں۔ ورنہ اس کی طبیعت میں جدت یا خیال میں کوئی انفرادی وسعت بالکل نظر نہیں آتی۔

مولانا کا یہ خیال بھی قابلِ قبول نہیں کہ جگر کا کلام بے ساختگی اور آمد سے معمور ہے اور ہر طرح کے تکلف اور آورد سے پاک ہے۔ جگر نے اکثر نہایت سیر حاصل غزلیں لکھی ہیں۔ جنکی انتہا بسا اوقات دوغزلہ اور سہ غزلہ پر ہوتی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ

ہوتا ہے کہ تمام قافیوں کو خواہ مخواہ باندھنا پڑا ہے اور اس طرح بعض اوقات تکلف اور آورد کے ساتھ ساتھ پست مضامین پیدا ہو جاتے ہیں۔ "ہم سے جو ہو سکا وہ کر گذرے۔ اب ترا امتحان ہے پیارے"۔ وغیرہ اسی قبیل کی قافیہ پیمائی کا نتیجہ ہیں۔ شعرائے لکھنؤ کے ہاں بے اثر و بے کیف اشعار کا جو انبار نظر آتا ہے اس کا سبب یہی مسلسل گوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جگر کی کثرت نگاری ان خامیوں کی ذمہ دار ہے۔ جن کی وجہ سے ان کے کلام میں کہیں کہیں سستی آگئی ہے۔ اس لئے بعض اشعار میں شعر گوئی کی بجائے شعر سازی کی کیفیت نظر آتی ہے۔ جگر کی کسی غزل کو اٹھا لیجئے مصرعہ ثانی ہمیشہ چست اور دلکش ہوگا مگر اس کے مقابلہ میں مصرعہ اولے عام طور پر پھسپھسا اور بے کیف نظر آئے گا۔ معلوم ہوتا ہے جگر غزل لکھنے سے پیشتر جسقدر مصرعہ ہائے ثانی تیار ہو سکتے ہیں وہ تیار کر کے رکھ لیتے ہیں اور مصرعہ ثانی کہہ لینے کے بعد جب اس کے جوڑ کے لئے کوئی موزوں خیال نہیں ملتا تو ایک قسم کا "چلنت" سا کام بنا لیا جاتا ہے۔ یہ کمزوری جگر کی ہر غزل میں نظر آتی ہے۔ "فال" کے طور پر شعلۂ طور کو کہیں سے کھول لیجئے ساری حقیقت خود بخود کھل جائے گی۔ شاعر کو چاہئے کہ شعر کہنے کی طرف اسی وقت متوجہ ہو جبکہ بساطِ فکر میں پیش کرنے کے قابل کوئی چیز ہو۔ اور جب وہ چیز ختم ہو جائے تو قلم کو روک لے نہ یہ کہ جب تک دوات میں سیاہی ہے لکھتا چلا جائے۔ جگر کی یہ غزل ملاحظہ فرمائیے:۔

ہم سے رندوں کا زمانے سے جدا میخانہ ہے		آسماں خم ہے فضائے آسماں پیمانہ ہے

کھینچکر اک آہ اس نے رکھدیا جامِ شراب		دیدنی آج اضطرابِ ساقی و پیمانہ ہے

ان دو اشعار میں پیمانہ کے قافیہ پر دو مرتبہ طبع آزمائی کرنے کے بعد شاعر کو جب کوئی اچھوتا خیال نہیں سوجھتا تھا تو بہتر یہی تھا کہ اسے ترک کر دیا جاتا۔ اور کسی قافئے کی طرف متوجہ ہونے کی سعی کی جاتی مگر کون سنتا ہے ایک دو شعر کہنے کے بعد پھر تڑاق سے ایک شعر کہہ ڈالا ہے۔

میں ہوں رندِ لم یزل اک ساقیٔ بے نام کا		شش جہت میرے لئے ٹوٹا سا اک پیمانہ ہے

خود ہی انصاف فرمائیے اس شعر میں ایسی کون سی وارداتِ قلبی کا اظہار مدنظر ہے جس کو بیان کرنا شاعر نے اپنے لئے فریضۂ حیات تصور کیا۔ اس کے بعد پیمانہ کے قافیہ سے ہٹ کر دیوانہ کا قافیہ جو سوجھا ہے تو ایک دو نہیں اکٹھے پانچ چھ سات شعر رقم فرما دئے ہیں

اس تبسم کے تصدق اس تجاہل کے نثار		خود مجھی سے پوچھتے ہیں "کون یہ دیوانہ ہے؟"

ہر قدم پر ناصح مشفق کی دلسوزی نہ پوچھ		آدمی اچھا ہے لیکن اک ذرا دیوانہ ہے

یہ دونوں شعر کوئی بہت اچھوتے نہیں مگر غزل کی مجموعی حالت دیکھتے ہوئے گوارا ہیں۔ چاہئے تھا کہ ان پر اکتفا کیا جاتا مگر چلتے چلتے یہ شعر بھی کہہ ڈالا ہے۔

یہ بہار آئی ہوئی ایسی گھٹا چھائی ہوئی		ہجو کرتا ہے زاہد کیا کوئی دیوانہ ہے

کس قدر بھونڈا اور کسقدر پھسپھسا شعر ہے اور کسقدر پست خیال نہ جانے اس میں ایسا کون سا بے ساختہ پن اور آمد ہے۔ پیمانہ سڑا ہوا خیال ہے

جسے بے جان لفظوں کے ساتھ بے کیف انداز میں پیش کر دیا ہے۔ پھر کہنا پڑتا ہے کہ اگر حضرتِ جگر دیوانہ کے قافیہ پر بھی کوئی معقول مضمون پیدا نہ کر سکتے تھے۔ تو مناسب یہی تھا کہ اس گھٹیا شعر کو یا تو سرے سے نہ کہتے اور اگر کہہ لیا تھا تو غزل سے حذف فرما دیتے مگر اس کی عدم موجودگی میں غزل کے اشعار سترہ کیسے ہوتے۔

مولانا سلیمان ندوی کا یہ خیال کہ جگر طلسم الفاظ سے خیالات کی ایک دنیا بنا کر کھڑی کر دیتا ہے۔ انکی "غلط بخشیوں" کا ثبوت مزید اور جگر پر بہت بڑا اتہام ہے۔ کلام جگر کے معمولی مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جگر کے ہاں خیالات کی دنیا موجود نہیں مولانا کو اس امر کا احساس خود بھی ہے۔ چنانچہ آگے چل کر خود ہی فرماتے ہیں۔

"جگر کی شاعری کے معنوی خیالات بہت مختصر ہیں وہ انہیں الٹ پلٹ کر دہراتے رہتے ہیں۔ مگر وہ جب کہتے ہیں۔ سننے والوں کو وہ بات نئی معلوم ہوتی ہے"۔ جگر کے کلام میں فکر عمیق کہیں نظر نہیں آتا کیونکہ جگر کی طبیعت کو فلسفیانہ کاوش اور جستجو سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس کے ہاں وہ خیالات نہیں۔ جن سے دماغ میں جودت و تازگی اور تخیل میں رفعت و پرواز کی قوت پیدا ہو۔ وجہ محض اتنی ہے کہ گو جگر کے ہاں برجستگی اور شگفتگی بہت ہے اور رنگین بیانی میں کسی سخن شناس کو کلام نہیں ہو سکتا مگر اپنی فطری ذہانت ادبی استعداد قادر الکلامی اور کہنہ مشقی کے باوجود وہ اسی رسمی تغزل کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں جس نے پچھلی اڑھائی صدی سے ہماری شاعری کو محض ایرانی غزل نویسوں کی نقالی بنا رکھا ہے۔ چنانچہ جگر کی شاعری کو مضامین اور خیالات کی ممتاز خصوصیت کے لحاظ سے جانچنا یا ان کے خاص نقطہ نظر اور پیغام کا پتہ چلانے کی کوشش کرنا سراسر بے سود ہے شعلہ طور کے ورق الٹتے جائیے ایسی حالت بہت کم ہوگی کہ کوئی شعر اپنی نزاکت خیال کی وجہ سے آپ کے دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں اتر جائے۔ مثال کے طور پر کوئی اٹھا لیجئے۔ چلئے یہی غزل دیکھ لیجئے۔ آپ خود ہی اندازہ فرمالیں گے کہ اس میں کون سا اچھوتا خیال ہے جسے شاعر نے بیان کرنا چاہا ہے یا کون سا پرانا خیال ہے جسے مولانا سلیمان ندوی کے وہم کے مطابق یوں دہرایا ہے کہ وہ نئی بات معلوم ہو۔

احساس عاشقی سے بیگانہ کر دیا ہے ۔۔۔ یوں بھی کسی نے اکثر دیوانہ کر دیا ہے
اب کیا امید رکھوں اے حسنِ یار تجھ سے ۔۔۔ تو نے تو مسکرا کر دیوانہ کر دیا ہے
تجھ سے خدا ہی سمجھے تو نے کسی کا اے دل ۔۔۔ مجھ سے بھی کچھ زیادہ دیوانہ کر دیا ہے
پھر اس کے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں ۔۔۔ یاد کش بخیر جس نے دیوانہ کر دیا ہے
مجھ کو جنوں سے اپنے شکوہ جو ہے تو یہ ہے ۔۔۔ میری محبتوں کو افسانہ کر دیا ہے
اے حسن روز افزوں عزت دراز بادا ۔۔۔ دونوں جہاں سے مجھ کو بیگانہ کر دیا ہے
جب دل میں آگیا ہے اک جنبشِ نظر نے ۔۔۔ دیوانہ کہہ دیا ہے دیوانہ کر دیا ہے
مجھ سے ہی پوچھتے ہیں یہ شوخیاں تو دیکھو ۔۔۔ میرے جگر کو کس نے دیوانہ کر دیا ہے

وہی پرانے پیش پا افتادہ مضامین اور پامال و فرسودہ خیالات ہیں۔ جنہیں ہم قدما، متوسطین اور متاخرین کے دیوانوں میں دیکھ دیکھ تنگ آچکے ہیں۔ اور جن کی سمع خراشی سے ہمارے کان تک پک چکے ہیں۔ اس قسم کے غزل کو دیکھ کر یہ اندازہ بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ سودا و انشا کے وقت میں غزل کی جو کیفیت تھی۔ اتنا عرصہ گزر جانے پر بھی اس میں ذرہ برابر ترقی نہیں ہوئی اور ہمارے غزل گو جوں کے توں اسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں وہ آج سے سو سال قبل تھے۔ اس کاروان کے افراد دس بیس نہیں سو پچاس نہیں ہزار ہیں۔ سانپ نکل گیا ہے۔ یہ برابر لکیر پیٹے چلے جا رہے ہیں۔ اسی کاروان میں جگر بھی شامل ہیں گو ان کا مقام اپنے معاصرین میں ضرور ارفع ہے مگر چونکہ انکی شاعری میں ان کے داخلی جذبات اور قلبی واردات کا بہت زیادہ پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے یہ کہنا کہ شعر کی وہ اصل روح جو اسے انسان کے دل کی گہرائیوں تک پہنچا دے۔ جگر کے ہاں بہت کم نظر آتی ہے۔ کسی بہت غلط اندازے پر مبنی نہیں۔ آخر اس غزل میں کون سے غور و فکر کو برتا گیا ہے اور کسی داخلی جذبے کا اظہار مدِ نظر ہے۔

کیا بتائیں عشق ظالم کیا قیامت ڈھائے ہے　　یہ سمجھ لیجیے دل سینے سے نکلا جائے ہے
جب نہیں تم تو تصور بھی تمہارا کیا ضرور　　اس سے بھی کہہ دو کہ یہ تکلیف کیوں فرمائے ہے
ہائے وہ عالم نہ پوچھو اضطرابِ شوق کا　　یک بیک جب وقت کچھ کچھ ہوش سا آجائے ہے
کس طرف جاؤں کدھر دیکھوں کسے آواز دوں　　اے ہجومِ نامرادی جی بہت گھبرائے ہے

ان اشعار کو دیکھتے ہوئے یہ اعتراض کیونکر غلط ہے کہ جگر کی شاعری بھی اپنے دوسرے معاصرین کی طرح تقلیدی اور غیر فطری ہے یعنی وہ اپنے دل کا حال نہیں کہتے اور اپنی زندگی کی سرگذشت نہیں سناتے۔ انہیں ہوسِ بالائے بام بھی ہے اور شکایت منظرِ عام مگر ان کے افسانے میں خلوص نظر نہیں آتا اور ان کے بیان میں فطرت کی موافقت دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اپنے قلبی تجربات کو رسمی انداز میں یوں پیش کرتے ہیں کہ بجا طور پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے ذاتی خیالات نظم نہیں کئے۔ ہاں شراب کا مضمون ایک ایسی چیز ہے کہ جگر کی شاعری میں جہاں کہیں اس کا ذکر آیا ہے۔ اصلیت آشکارا ہے اور علانیہ شراب کی بو آتی ہے۔ ورنہ باقی شاعری رسمیات کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔

میں جگر کا مخالف نہیں بلکہ ایک لحاظ سے مولانا سید سلیمان ندوی سے بھی زیادہ ان کے کمال کا معترف ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ وہ عام غزل گو شعراء کے لفظاً و معناً ہمنوا ہونے کے باوجود اپنے معاصرین میں ایک انفرادی شان رکھتے ہیں۔ ان کا انداز سادہ ہوتے ہوئے بھی شگفتہ ہے اور سب سے قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ ان کی شاعری کا اخلاقی معیار بہت بلند ہے۔ گو ان کے ہاں معاملہ بندی کے اشعار بے حد کم ہیں پھر بھی جو کچھ ملتا ہے وہ رکیک اور بازاری خیالات سے خالی ہے۔ اور مبتذل مضامین ان میں نام کو نہیں۔ ان کی زبان بھی بے حد پاکیزہ اور سادہ ہے اور انہوں نے اپنے کلام کو اکثر بعید از فہم ترکیبوں اور غیر ضروری لغات و محاورات سے پاک رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مگر اس کے آگے کچھ نہیں۔ بلندیٔ فکر اور رفعتِ خیال جس کے بغیر

غزل کبھی نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتے ہیں۔ کیونکہ غور و تعمق اور فکر و کاوش انکا رنگ نہیں۔ ڈھونڈھئے شاید چند شعر اس طرز میں مل جائیں وہ بھی بادلِ ناخواستہ کہے ہوئے ان کے رنگ میں جو فرسودگی ہے اور اجتہادِ فکر سے وہ جس طرح عاری ہے۔ اس کی موجودگی میں جگر کے شعر اس کی زندگی کے ترجمان تصور نہیں ہو سکتے۔ جگر یہ کہنے کے بعد کہ انکی زندگی اور شاعری میں بالکل مطابقت ہے اپنے جذبات کو اگر اس طرح پیش کریں کہ وہ غیر فطری نظر نہ آئیں تو بہت بہتر ہو موجودہ صورت میں ان کی شاعری میں بدقسمتی سے نقالی اور استادانہ مشاقی کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ حالانکہ وہ اس نقص سے خود کو بہت بلند سمجھتے ہیں۔

شعلۂ طور میں جگر کا رنگ ان کے معاصرین سے مقابلتاً اچھا ہے لیکن جگر کا یہ آرٹ کوئی اتنا رفیع الشان اور عالی مرتبہ نہیں کہ مولانا سلیمان ندوی جیسا محتاط انشا پرداز و نقاد فرقِ مراتب کو یوں بھول جائے کہ اس کی تنقید کسی نوجوان کی طبعی ابتذال کا نمونہ نظر آئے۔ آخر یہ سطور مولانا کی مخصوص انشا پردازی کے حسین و دلکش نمونے کے سوا کیا معنی رکھتی ہیں:۔

"جگر مستِ ازل ہے اس کا دل سرشارِ الست ہے وہ محبت کا متوالا ہے اور عشقِ حقیقی کا جویا وہ مجازی کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بتخانے کی گلی سے کعبے کی شاہراہ کو اور خم خانے کے بادۂ کیف سے خود فراموش ہو کر بزم ساقی کوثر تک پہنچنا چاہتا ہے...... جگر بظاہر سرشار مگر درحقیقت بیدار ہے اس کی آنکھیں پرخمار مگر اس کا دل ہوشیار ہے اور کیا عجب کہ خود جگر کو بھی اپنے دل کی خبر نہ ہو اگر ایسا نہ ہو تو اس کے کلام میں اثر ہو؟"

کم از کم مجھے اپنی کج فہمی کا ہر طرح اعتراف ہے کہ یہ لاہوتی ارشادات اور سرمدی نکات اس احقر کی سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔ واللہ اعلم۔ مولانا کیا فرمانے کی سعی کر رہے ہیں اور ان کی زبان سے کیا الفاظ نکل رہے ہیں۔ اگر اسی ملکوتی زبان کا اور مزا لینا ہو تو ذرا یہ بھی سن لیجئے:۔

"جگر مست ہے اور اسی مستی میں کسی نادیدہ کا سراپا مشتاق نظر ہے وہ اس کے حجابات کو اپنے رعشہ دار ہاتھوں سے بار بار اٹھا دینا چاہتا ہے مگر نہیں اٹھا سکتا وہ جھانک کر دیکھنا چاہتا ہے مگر نہیں دیکھ سکتا اس کی تمنا کی آنکھیں اس کو بھی بے حجاب دکھا دیتی ہیں تو وہ ہاتھ بڑھا کر چھونا چاہتا ہے مگر وہ تصویر نگاہوں سے غائب ہو جاتی ہے۔"

لیجئے صفحات کہیں کا کہیں پہنچ گیا مگر معنی نہ نکلے وہی دیرو والی کیفیت ہے یعنی الفاظ زیادہ مطلب ندارد۔ مجھے تو یہ تحریر کسی دیسی فلم کا "سینریو" معلوم ہوتی ہے۔ وہی اوٹ پٹانگ "منظر کشی" ہے۔ وہی اناپ شناپ "حرکات" دکھائی گئی ہیں۔ مگر فی الواقع ان کے ذہن میں جگر کی شاعری کے متعلق کوئی خاص زاویہ نگاہ تھا تو سیدھے سادے قابلِ فہم الفاظ میں پیش کیا ہوتا یوں ہی بیٹھے بٹھائے سلاست کو چھوڑ کر اغلاق و دقت میں خدا جانے کس مصلحت سے جا گھسے۔ مگر اس قسم کی نانک ... خیال [illegible]
[illegible]

مضمون اتنا مبہم ہے کہ اس کے حل کرنے کے لئے قدم قدم پر کشتی لڑنا پڑتی ہے اور خدا مولانا کو خوش رکھے۔ عین ان کی خواہش کے مطابق یہ کشتی ہر موقع پر برابر چھوٹتی ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جگرؔ خدانخواستہ صوفی شاعر ہے اگر سچ مچ مولانا کے ذہن میں جگر کے متعلق یہی رائے مخفی ہے تو پھر افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا سے یہاں بھی لغزشِ عظیم ہو گئی ہے۔ کلامِ جگر کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں۔ کہ ان کو تصوف و فلسفہ سے دور کا بھی علاقہ نہیں۔ ان کا عشق سراسر شخصی اور جنسی ہے بلکہ ان کی تو یہ حالت ہے کہ اگر وہ نعت بھی لکھتے ہیں تو اس میں ایسے شعر کہنے سے نہیں رہ سکتے جن سے صنفیت کی بو آتی ہے۔ مثال کے طور پر شعلہ طور کی ابتدائی غزل کو لیجئے۔ یہ نعتیہ کلام ہے۔ مگر اس شعر میں شاعر کے پیشِ نظر صنفیت نہیں تو کیا ہے۔

نگاہِ قہر پر بھی ——— نگاہِ مہر عاشق پر اگر ہو گی تو کیا ہو گا

ہمارے نقادوں کی حالت اب تو یہ ہو گئی ہے کہ جس شاعر کا شہرہ ذرا دور دور پہنچا اور یہ اس کے کلام پر دیباچہ یا تنقید لکھنے کیلئے مامور ہوئے تو آپ سب سے پہلا کام یہ کریں گے کہ اور کچھ نہیں تو اس کی شاعری کو کم از کم متصوفانہ ضرور ثابت کر دیا جائے سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر تنگ بند کے لئے یہ کیوں فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ ضرور صوفی ہے یا یہ کہ کسی شاعر کے کلام کو جب تک عارفانہ اور نکات تصوف سے لبریز ثابت نہ کیا جائے گا لوگ اس کو قدر کی نگاہوں سے نہ جانچیں گے۔ تصوف کوئی اتنا آسان کھیل نہیں کہ جو شخص چاہے اس میں قلابازیاں لگاتا پھرے اور "صوفی" کا سوانگ بھر کے باہر نکل آئے۔ انسان کا دل و دماغ جب تک ایک خاص سطح پر نہ پہنچے وہ تصوف کے نکات خود سمجھ سکتا ہے نہ ان پر قلم اٹھانے کی جرأت کر سکتا ہے۔ ہاں تاویل کی رو سے آپ جو چاہیں کہہ لیں مگر تاویل تو وہ بلائے بد ہے کہ اس کی مدد سے دیوانِ جرکین میں بھی معرفت و تصوف کا ایک ایسا بحرِ ناپیدا کنار نظر آ سکتا ہے جس کی رو سے اس پر بھی ان مبہم الفاظ کا اطلاق ہو سکتا ہے جو مولانا سید سلیمان ندوی نے جگر کے لئے لکھے ہیں۔ سچ پوچھئے تو اس سارے فساد کی تہ میں محض غالب کا یہ شعر ہے۔ ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو   بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس رعایت سے آپ ہر شاعر کے کلام کو نہ صرف صوفیانہ سمجھ سکتے ہیں بلکہ اگر بحث و تمحیص کی گنجائش ہو تو بآسانی ایسا ثابت بھی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان حالات کے ماتحت اگر مولانا سید سلیمان ندوی کو جگر کی غزلیات میں مضامینِ تصوف یا ان کے الفاظ سے عارفانہ جذبات آبلتے ہوئے نظر آئیں تو کیا تعجب اور اگر مولانا کو وہ مستِ ازل سرشارِ الست اور نہ جانے کیا کیا دکھائی دیں تو کیا [illegible] یہ قصہ اس لحاظ سے ضرور دلچسپ ہے کہ ایک طرف تو ابھی تک حافظ جیسے شاعر کا روحانی کلام بھی متنازعہ فیہ ہے۔ [illegible] قطعی طور پر نہیں ہو سکا کہ آیا حافظ فی الحقیقت صوفی شاعر تھا بھی یا نہیں۔ دوسری طرف مولانا نے بیک جنبشِ قلم [illegible] حقیقت کی منزل۔ بتخانے کی گلی۔ کعبے کی شاہراہ اور اسی قبیل کے دوسرے مبہم الفاظ کے ساتھ جگر کی سیدھی سادھی [illegible] کر کے دھڑا "بنا کر" رکھ دیا ہے۔

[illegible] اسی ضمن میں "تعارف" میں ایک اور خطرہ کھٹکتا ہے۔ فرماتے ہیں "جگر وہی کہتا ہے جو محسوس کرتا ہے وہ نہیں

کہتا جو دوسرے محسوس کرتے ہیں" ممکن ہے جگر جو کچھ کہتا ہے وہ اس کے ذاتی محسوسات ہوں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ وہ جس شے کو محسوس کرتا ہے اس کو عین اسی طرح محسوس کرتا ہے جیسے دوسرے کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس میں کوئی اپج اور انفرادیت نظر نہیں آتی۔ ایک غزل سن لیجئے۔

درد کو قید کیا شوق کو آزاد کیا ہم سے جسطرح بنا ہم نے تجھے یاد کیا
دل نے سینے میں تڑپ کر انہیں جب یاد کیا درد دیوار کو آمادۂ فریاد کیا
وصل سے شاد کیا ہجر سے ناشاد کیا اس نے جس طرح سے چاہا مجھے برباد کیا

یہ تین شعر سن لینے کے بعد انصاف فرمایئے کہ ان میں اور کسی دوسرے غزل گو شاعر کے اسی مضمون پر لکھے ہوئے اشعار میں کیا فرق ہے وہی فرسودگی۔ وہی انداز وہی رونا۔

تم میرے رونے پہ روئے ستم ایجاد کیا عشق کی روح کو آمادۂ فریاد کیا
لاکھ جانیں ہوں تو پھر ان پہ تصدق کر دوں وہ یہ فرمائیں کہ ہم نے اسے برباد کیا

(یہاں "تو پھر" کا لفظ قابلِ غور ہے۔ "جب بھی" کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے مگر کسقدر ناگوار گذرتا ہے۔ تاہم یہ کہنا کہ اگر لاکھ جانیں ہوں جب بھی وہ انہیں اپنے محبوب پر فدا کرنے سے دریغ نہ کرے۔ فرسودہ خیال نہیں تو کیا ہے۔ ظاہر ہے جگر نے قربانی کی خواہش کو عین اسی طرح محسوس کیا ہے جیسے ہر معمولی ذہن کا آدمی کرتا ہے۔ جس شخص کے پاس لاکھ جانیں ہوں ظاہر ہے وہ ان کی افراط کی وجہ سے ان کی صحیح قدر نہیں پہچان سکتا اور بہت ممکن ہے۔ انہیں قربان کرنے سے دریغ نہ کرے۔ اس لئے اس کی قربانی کوئی بہت بڑی قربانی نہیں کہلا سکتی۔ بات جب بنتی کہ جگر اس جذبے کو یوں محسوس کرتے کہ "میرے پاس صرف ایک جان تھی میں نے اسے بھی نذر کر ڈالا" اس میں خلوص بھی نظر آتا ہے اور انفرادیت بھی موجودہ صورت میں اپنی بناوٹ اور تصنع کی وجہ سے یہ بات یوں معلوم ہوتی ہے گویا جگر نے ادھر ادھر سے سن کر کہدی ہے)

کیا طریقہ ہے یہ صیاد کا اللہ اللہ ایک کو قید کیا۔ ایک کو آزاد کیا

(کسقدر فرسودہ خیال ہے اور کتنا پھیکا شعر۔ مولانا سید سلیمان اس میں تصوف و معرفت کے نکات ڈھونڈھ نکالیں تو دوسری بات ہے۔ ورنہ یہ وہی بے کیف مضمون ہے جسے ولی سے لے کر استاد امام دین تک سب باندھتے چلے آئے ہیں۔ جگر نے اس میں اپنی مفروضہ انفرادیت کہیں نہ دکھائی)

پردۂ شوق سے اک برق تڑپ کر نکلی یاد کرنے کی طرح سے انہیں جب یاد کیا

(واللہ علم یہ "یاد کرنے کی طرح سے" یاد کرنا کیا شے ہے۔ جگر کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

یاد یکھ کر نہ دیکھئے کچھ ماسوائے دوست یا دیکھنے کی طرح سے دیکھا نہ کیجئے

("دیکھنے کی طرح سے" دیکھنے کی بھی ایک ہی رہی۔ جگر کے ہاں یہ چیز عام ملتی ہے مگر خدا جانے اس سے انکی مراد کیا ہوتی ہے)

جگر کی کسی غزل کو دیکھ لیجیے۔ بہت کم شعر ایسے ہوں گے جن میں کوئی اُپج نظر آئے یعنی جگر کے محسوسات کوئی انفرادی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہی عام باتیں ہیں جن کو عام انداز میں نظم کر دیا ہے۔ بلکہ بعض اوقات اسی عمومیت کی وجہ سے ان کے کلام میں کئی ایسے نقائص جگہ لے لیتے ہیں جن سے وہ مخلصی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً لکھنؤ کے تمدن و معاشرت میں عام طور پر جو زنانہ پن پایا جاتا ہے اس کا اثر جگر کی شاعری میں بھی کہیں کہیں مل جاتا ہے اور وہ عورتوں کی طرح دہائی دینے۔ صدقے واری اور قربان ہونے سے نہیں رہ سکتے۔

دہائی ہے میرے اللہ کی دہائی ہے — کسی نے مجھ سے بھی مجھ کو چھپا کے لوٹ لیا

ستم یار کی دہائی ہے — نگہِ التفات نے مارا

نگاہوں کا مرکز بنا جا رہا ہوں — دہائی ہے یارب اٹھا جا رہا ہوں

ہاں اے [illegible] دہائی ہے دہائی — انکار سے بڑھ کر ترے اقرار نے مارا

یہ تو تھیں دہائی کی چند مثالیں۔ اب صدقے واری کے چند نمونے بھی ملاحظہ ہوں۔

لے میں قربان ہو گیا عرض محبت کا صلہ — ہاں اسی انداز سے کہہ دو "تو پھر ہم کیا کریں"

لے میں قربان وہ کیا اکسا ترا اعجازِ عشق — اک سکونِ مستقل بھی اضطراب دل میں ہے

وہ [illegible] تیرے صدقے ترے قربان نہ جانے پائے

لے عشق [illegible] ترنی غیرت کو کیا ہوا — ہے ہے عرق عرق وہ تنِ نازنیں ہے ہے

"ہے ہے" ذرا ملاحظہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے کوئی عورت بین کر رہی ہے۔ کم از کم پچھلے مصرعہ پر ریختی کا شبہ ضرور ہوتا ہے۔ یہ لکھنوی انداز بعض مقامات پر عجب بد صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً یہ شعر سنئے:۔

مرنے والے تجھ مرنے کا غم کیا ہو تیرا — ماں کا آغوش ہے یہ موت کا آغوش نہیں

دوسرا مصرعہ سراسر گالی کی صورت اختیار کر کے رہ گیا ہے۔ حالانکہ شاعر نے جو مفہوم ادا کرنا چاہا ہے وہ اتنا برا نہیں۔ یعنی وہ آغوشِ موت کو آغوشِ مادر سے تشبیہ دے رہا ہے مگر بیان کے لئے جو انداز انہوں نے اختیار کیا ہے وہ نہایت بھونڈا ہے۔

[illegible] موت کا بن کر نہ کیوں آ گئے — ارے غضب کہ یوں پا برہنہ تم آ گئے

یہاں "ارے" کا لفظ سراسر ذوقِ سلیم کے منافی ہے۔ اور جگر جیسے شستہ گو شاعر کی زبان پر زیب نہیں دیتا۔ مگر "ارے" کا استعمال جگر نے کئی مقامات پر کیا ہے اور ہر موقع پر اس کا استعمال کانوں کو ناگوار گزرتا ہے۔

شروعِ راہِ محبت [illegible] — [illegible]

[illegible] کافی تھا مگر اس کے ساتھ بھی "ارے" کا لفظ جڑ دیا ہے۔ اس شعر میں "شروعِ راہِ محبت" کی ترکیب [illegible] جگر کے ہاں [illegible] کی ایسی عجیب تر ترکیب کا وجود ملتا ہے۔ جیسے

شوخیٔ طرزِ تپاکِ حسن۔ باخبرِ جلوۂ بتاں۔ وفورِ بیخودیٔ ضبطِ غم۔ خالی زادِ ہائے پریشان۔ تعین کدۂ ہستی۔ دمازِ وادیٔ راز وغیرہ وغیرہ اس قسم کی مجتہدانہ اختراعات اردو کی توسیع کی طرف کتنا ہی مبارک قدم کیوں نہ ہوں، انکو قبول کرنے میں تامل ضرور ہوتا ہے لیکن ان حیرت خیز تراکیب کو وضع کرنا شاید اتنا برا نہیں جتنا اہلِ زبان ہونے کے باوجود لاپروائی سے بعض الفاظ کا غلط استعمال یا انہیں خلافِ محاورہ باندھنا۔

اس چشمِ خشک سے تم چھیڑیں تو کر رہے ہو — تڑپے نہ موج کوئی دریائے آستیں سے

یوں تو سارا شعر بےمعنی ہے۔ لیکن "چھیڑیں کرنا" خدا جانے کہاں کا محاورہ ہے۔

عالم جب ایک حال پہ قائم نہیں رہے — کیا خاک اعتبارِ نگاہ ویقین رہے

پہلے مصرعہ میں "رہے" کا استعمال سمجھ میں نہیں آیا۔

سانس لیتا ہوں دم الجھتا ہے — بات کرتا ہوں آہ ہوتی ہے

آہ بھرنا۔ آہ کھینچنا یا آہ کرنا محاورہ ہے۔ اسی طرح آہ کی جاتی ہے یا نکلتی۔ ہوا نہیں کرتی۔ اسی غلطی کو پھر دہرایا گیا ہے

آہ یہ ہم پہ تھا مدارِ حیات — وہ کبھی اب کا وگاہ ہوتی ہو

کاش وہ عمرِ خضر بن جاتے — جن خیالاتِ خام نے مارا

خیال عمرِ خضر کیسے بن سکتا ہے۔ ہاں اگر یہ کہا جاتا کہ انہے عمرِ خضر مل جائے تو ایک بات بھی تھی۔ یعنی کسی چیز کو عمرِ دراز مل سکتی ہے لیکن وہ بجائے خود عمر نہیں بن سکتی۔ جگر کے ہاں اس قسم کے بےمعنی اشعار کی تعداد کافی ہے۔ جنہیں طوالت کے خوف سے الترا[illegible] چھوڑ دیا گیا ہے مگر ان مثالوں کے علاوہ جگر کا سب سے بڑا عیب دیکھنا ہو تو ان کے ہاں تعقید کی فراوانی کو دیکھئے

اس کی نظروں میں انتخاب ہوا — دل عجب حسن سے خراب ہوا

خاص جو تجھ سے فیضیاب ہوا — اس کا سایہ بھی آفتاب ہوا

ہم انکا عشق کیسا ان کے غم کے بھی نہیں قابل — یہ انکی مہربانی ہے کہ وہ ایسا سمجھتے ہیں

اس قسم کے اشعار ایک دو نہیں متعدد ہیں۔ ان خامیوں کے علاوہ جگر کے ہاں کئی ایسی مزید کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں جو نہایت دلچسپ ہیں۔ مثلاً تصویر کشی میں جگر جن تشبیہات کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ وہ بذاتِ خود ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا تصور ذہن میں نہیں آتا۔ مثلاً

عجب عالم سا دل پر چھا رہا ہے — حسین جیسے کوئی شرما رہا ہے

یہ نازک خیالی سراسر بےمعنی ہے۔ دل کی کسی کیفیت کو کسی حسین کے شرمانے سے کیونکر تشبیہ دی جا سکتی ہے خواہ آپ لاکھ مغز ماریں یہ تشبیہ آپ کی سمجھ میں کبھی نہ آئے گی۔

کسی کی مست خرامی کا واہ کیا کہنا — کہ جیسے حافظ شیراز جھوم کر آئے

[illegible] کے ذوقِ سلیم اور سلامتی طبع نے حافظِ شیراز پر ہاتھ صاف کرنے کی کیونکر اجازت دی۔ یوں بھی
[illegible] کو کیا نسبت ہے۔ اور یہ امر شاعر نے کس طرح مسلمات میں داخل کر لیا کہ حافظ چور چور رکھی ہوا
[illegible] مسل تشبیہ ہے۔ اور حد درجہ افسوسناک بھی! جگر کی تشبیہ کی معراج دیکھنی ہو تو اس کی وہ نظم ملاحظہ فرمائیے
جس کا عنوان ہے "ہلالِ عید" ہلال کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

پائی جاتی ہے مگر یرقان تجھ میں آب و گل ہو گیا ہے یا کسی کے ہجر میں بیمارِ سل
کچھ بتا تو کس کی تو اتری ہوئی پاپوش ہے کیوں سکوت اس درجہ ہے کس واسطے خاموش ہے

پہلا مصرعہ معنی کے اعتبار سے مہمل ہے۔ دوسرے مصرعہ میں بیمارِ سل کا لفظ حد درجہ غیر شاعرانہ ہے۔ تیسرے میں پاپوش کی تشبیہ مضحکہ خیز ہے
مجموعی طور پر چاروں مصرعے لغو ہیں۔ جگر کو چاہئے تھا کہ اس نظم کو حذف کر دیتے۔ بلکہ بہتر تو یہ ہوتا کہ شعلۂ طور کو طبع کروانے سے پیشتر
وہ اپنے سارے کلام کا انتخاب کر لیتے۔ یہ چیز انکی شان کے منافی نہیں نہ اس سے انکی ہتک ہی ہوتی۔ رسمی جذبات سے بھرے ہوئے
[illegible] اور [illegible] غزلوں کی بجائے گنتی کے ایسے چند اچھے شعر جن میں شاعر کی شخصیت کا نقش منجلی ہو اور جن میں اس کے رجحاناتِ ذاتی
اور جذباتِ امتیازی کا سراغ ملے۔ شعلۂ طور نظرِ ثانی کا مستحق ہے اور جگر کی شہرت اس امر کی مقتضی ہے کہ اس کے نام سے وہی شعر
شائع ہوں جو اس کے اصلی رنگ کے مظہر ہیں ورنہ سینکڑوں شعر اور متعدد غزلیں (مثال کے طور پر مشاعرے والی غزلیں جن پر
[illegible] قول کے مطابق صحیح معنوں میں غزل کا اطلاق نہیں ہو سکتا) اس کتاب میں ایسی ہیں جن کی موجودگی سے جگر کا
[illegible] اپنے اصلی رنگ میں نظر نہیں آتا۔ اگر وہ کتاب سے علیحدہ ہو جائیں تو ممکن ہے مولانا سید سلیمان ندوی کا "تعارف"
بھی کسی کی سمجھ میں آ جائے۔ موجودہ صورت میں وہ طلسم ہوشربا کا تتمہ معلوم دیتا ہے۔ یا ممکن ہے میں ہی غلطی پر ہوں!

(محمود نظامی)

فنِ انشاپردازی از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور حجم ۱۱۶ صفحات قیمت [illegible] پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

[illegible] ان لوگوں کے لئے جو انشاپردازی اپنا پیشہ بنانا یا اسے تفریحاً اختیار کرنا
چاہتے ہیں بے شمار مسائل جمع کر دئیے ہیں۔ افسانہ یا مضمون کے لئے موضوع اور پلاٹ کا انتخاب تحریر میں ضروری
[illegible] نہایت سلاست اور فصاحت سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ آخر میں ۴۰۰ ایسے عنوانات
[illegible] ہیں۔ کتاب بے حد دلچسپ ہے۔ اور جن لوگوں کو اس میدان میں ترقی کا
[illegible] ضرور کرنا چاہئے۔ "م"

افسانہ

میری عمر کا سب سے بُرا وقت

ایک کلکٹر کی زبانی

(از جناب محمد حیات اللہ صاحب انصاری۔ بی اے (علیگ)

ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں دور کے درختوں سے چھن چھن کر کھڑکیوں کے شیشوں سے گذرتی ہوئی میز پہ چنے ہوئے بلور اور چینی کے برتنوں پر پڑ رہی تھیں۔ اور پھر وردی پوش ملازموں پر جو ہاتھوں میں جگ لئے کھڑے تھے۔ اور پیتل کے گملوں پر جو اونچی تپائیوں پہ رکھے تھے۔ اور دیوار پر لٹکی تصویروں پر قوس و قزحی رنگوں میں منعکس ہو رہی تھیں۔

احمد موسےٰ کلکٹر ضلع کے چاروں مہمان مسٹر ماتھر سول انجنیر۔ مسٹر قریشی ہیلتھ افسر۔ مسٹر نقوی گورنمنٹ پلیڈر اور بیتاب صاحب ایڈیٹر اخبار انڈین اوپین ین۔ سامنے رکھی ہوئی پُرتکلف چیزیں مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔

ماتھر۔ "یار موسےٰ تم اپنی پارٹیوں میں اتنی چیزیں منگوا لیتے ہو کہ انتخاب میں سخت دشواری ہوتی ہے۔ کیا کھائیں اور کیا نہ کھائیں"

مسٹر نقوی۔ "ہاں! اور خاصکر جب کھانے والے کا معدہ کمزور رہو۔ اور طبیعت حریص۔"

اسپر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ کیونکہ ماتھر کو اکثر معدہ کی شکایت رہا کرتی تھی۔

مسٹر قریشی۔ "کیا بات ہے آج لیڈیاں نظر نہیں آئیں؟"

مسٹر ماتھر۔ "مسز ماتھر کو اپنے نہ بلائے جانے کی بہت شکایت تھی۔ مگر انکو اس بات کا علم نہیں تھا کہ آج مسٹر موسےٰ نے ان کی جنس ہی سے بائیکاٹ کیا ہے۔"

احمد موسیٰ۔ "میں نے قصداً انہیں بلایا۔ وجہ تم لوگ خود بوجھو۔"

مسٹر نقوی۔ "چائے کی پیالیاں کم پڑتی ہوں گی۔"

اس پر ایک قہقہہ اٹھا۔

بیتاب۔ "میں بوجھ گیا۔ مگر پہلے آپ حضرات طبع آزمائی کرلیں۔"

مسٹر قریشی۔ "مسز موسیٰ کی غیر موجودگی میں یہ لیڈیوں کو بلاتے ڈرتے ہیں۔"

مسٹر نقوی نے چھوٹتے ہی کہا۔

"مگر یہ سمجھنا انکی غلطی ہے۔ کیونکہ مسز موسےٰ انکی غیر موجودگی میں مردوں کو بلانا نہیں ترک کر سکتیں۔"

پھر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

احمد موسیٰ۔ "مذاق میں اڑا دینے کی سند نہیں۔ وجہ پوچھو وجہ!"

مسٹر نقوی۔ "میں ہار گیا"

مسٹر قریشی۔ "اور میں بھی"

بیتاب۔ کل ڈنر پر جب زندگی کی مصیبتوں کا تذکرہ نکلا تو مسٹر موسیٰ کچھ کہتے کہتے رہ گئے۔ میرے اصرار پر کہنے لگے۔ "پھر کسی موقع پر" آج شاید وہی موقع ہے۔

احمد موسیٰ۔ بات یہ ہے کہ قصہ ذرا عریاں ہے۔ لیڈیوں کی موجودگی میں کہنے والا نہیں۔ علاوہ ازیں اس کو صرف بے تکلف دوستوں ہی تک محدود رہنا چاہئے۔

مسٹر نقوی۔ "کہو! کہو! مگر ناممکن ہے جو میری اُلٹی گواہیاں گذرانے والے قصہ سے بڑھ جائے۔"

احمد موسیٰ۔ ان دنوں کا قصہ ہے جب مجھے ولایت سے آئے دو برس ہوئے تھے۔ اور جوائنٹ مجسٹریٹی سے ترقی پا کر ضلع ——— کا کلکٹر ہو گیا تھا۔ مجھے ایک ضرورت سے دلی جانا پڑا۔ اس وقت میرے پاس والد صاحب کی پرانی کار تھی۔ خوب کام دیتی تھی۔ اور اس واقعہ سے پہلے اس نے کبھی دھوکا نہیں دیا تھا۔ چنانچہ میں سات بجے صبح اٹھا۔ جلدی جلدی کپڑے پہن تیار رہو۔ کار پر دلی روانہ ہو گیا۔ دس بجے تک دلی پہونچ گیا۔ اور ساڑھے دس تک کام سے فراغت ہو گئی۔ میری شامت جو آئی تو میں نے شوفر سے کہا۔ قطب مینار اور لال قلعہ گھومتے ہوئے چلو۔ خیال تھا اس طرح بارہ بج جائیں گے۔ پھر کسی ہوٹل میں کھانا کھاؤں گا۔ اور ایک بجے تک روانہ ہو جاؤں گا چار بجتے بجتے گھر پہونچ جاؤں گا۔ موسم خوشگوار تھا۔ یہی زمانہ ہوگا۔ ہلکی ہلکی سردی پڑ رہی تھی اور دھوپ ناگوار نہیں ہوتی تھی اتفاق سے میں صبح ضروریات سے فارغ نہیں ہو سکا تھا۔ قطب مینار پہونچتے پہونچتے مجھے رفع احتیاج کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ میں وقت اس کی اہمیت نہیں سمجھی۔ قطب مینار پہونچ کر تکلیف بڑھ گئی۔ اب میں گھبرایا اور ادھر اُدھر خیال دوڑانے لگا کہ کوئی دوست شناسا ذہن میں آئے تو اس کے یہاں پہونچ کر اس اذیت سے نجات حاصل کروں۔ اس وقت مجھے فاروقی کا خیال آیا۔ میں نے شوفر کو فاروقی کے مکان کا پتہ بتایا اور کہا۔

"ذرا تیز چلو۔ مجھے ہاتھ لینا ہے"

میرا شوفر ان دنوں بیمار تھا۔ میں نے ایک ڈپٹی کے شوفر کو بلوا لیا تھا۔ وہ تھا پورا دیہاتی۔ اس اشارے کو نہ سمجھا۔ اور نہ معلوم کس راستے شہر کے باہر باہر ہوتا ہوا چلا۔ موٹر بہت تیز جا رہی تھی۔ اس لئے آس بندھی ہوئی تھی۔ اور ابھی تک معاملہ بھی حد سے [illegible] ہوتا تھا۔ موٹر ویرانوں سے گذر رہی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ لوگ جنگلوں میں کیونکر رفع احتیاج کر لیتے ہیں۔ یہ بندہ ستائے مہذب ہونے کی علامت ہے۔ مگر یقین مانو جس وقت اذیت زیادہ ہوتی تھی۔ میرا بھی جی چاہتا تھا کہ موٹر رکوا کر وہیں کسی ... کی آڑ میں ... پھر یہ سوچتا تھا کہ شوفر بھی کہے گا کہ کیا غیر مہذب انسان ہیں۔ اور یہ عیب نہیں جو ڈپٹی سے کہہ دے تو

ضلع بھر میں ہنسی اڑے۔

میری بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ اور میں ہر گڑھے اور ہر بڑے درخت کو اس نظر سے دیکھتا تھا کہ ان میں استعمال میں آنے کے کیا کیا امکانات ہیں چلا جا رہا تھا۔ اور دل میں کہہ رہا تھا کہ اتنی جلد ہمت ہار دینا ایک حاکم اعلیٰ اور آئی۔ سی ایس کا کام نہیں۔ خدا خدا کر کے موٹر شہر میں داخل ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ جسم بغاوت پر آمادہ ہوا۔ مگر میں نے بدن کو لکڑی کی طرح سخت کر لیا۔ اور دل میں دہرانے لگا۔ ع کام ہمت سے جوانمرد اگر لیتا ہے ———— کہاں ہے دوسرا مصرع؟

مسٹر قریشی۔ ع "سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے۔"

احمد موسیٰ۔ ہاں! "سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے۔" مجھے ایسا نظر آرہا تھا کہ میری طبع لطیف اور نفس امارہ میں جنگ ہو رہی ہے اس میں شکست کھانے کے معنی یہ ہیں کہ مجھے اعلےٰ تعلیم سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ میں استقلال سے کام لوں۔ پھر طبع لطیف ہی کی فتح ہے اور یادگار فتح ہے۔ میں نے شوفر سے پوچھا۔ "کتنی دور اور ہے؟"

"صاحب! بیس منٹ کا راستہ اور ہے۔"

بیس منٹ! اوہ! یہاں جسم میں سخت تشنج ہو رہا تھا۔ میری جوان رگوں ہی کا کام تھا جو قابو حاصل کئے ہوئے تھیں اس وقت میں کسی ایسے خطے سے گذر رہا تھا جہاں پولیس یا سکرٹریٹ یا کسی اور ڈپارٹمنٹ کی بارکیں ہی بنی ہوئی تھیں۔ میرا کئی بار ارادہ ہوا کہ اتر جاؤں اور کسی سے امداد کی خواہش کروں۔ امداد ہی کیا؟ ایک لوٹا پانی۔ اور ایک کنج تنہائی وہاں پاٹ کا مطالبہ ہی بے سود ہوتا۔ اور اگر میں اتر جاتا تو کام آسانی سے بن جاتا۔ اس لئے کہ میرا تجربہ ہے ایسے موقعوں پر لوگ اس خوشی میں کر بڑے آدمی سے ملاقات ہو گئی۔ شاید اس سے کبھی سابقہ پڑ جائے۔ بہت جوش و خروش سے خدمت کرتے ہیں۔ مگر پھر ادنےٰ درجے افسروں سے ایسی گندی خواہش کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ کار ابھی رفتار سے چل رہی تھی۔ اور میں اپنی ہمت کو زندہ کرتا چلا جارہا تھا۔ مگر ہر دو منٹ کے بعد مجھے حبس دم کی سخت ریاضت کرنا پڑتی۔ اور بڑی جدوجہد کے بعد کامیابی ہوتی۔

شومئی قسمت دیکھئے کہ ایک چوراہے پر بیل گاڑیاں گذر رہی تھیں۔ پولیس مین نے وہاں میری موٹر رکوا دی۔ اور وہ کمبخت فیل ہو گئی۔

قریشی وبیتاب۔ فیل ہو گئی؟

احمد موسیٰ۔ ہاں فیل ہو گئی۔ اب میری پریشانی کا خیال فرمایئے۔ اس وقت زندگی سے عاجز ہو رہا تھا۔ شوفر اتر کر خود کار کی مشین دیکھنے لگا۔ میں نے جھلا کر کہا۔

"جلدی سے کوئی ٹیکسی لانا۔ مجھے ہاتھ لینے کی جلدی ہو رہی ہے۔"

شوفر۔ "صاحب! ابھی دس منٹ میں کار درست ہوئی جاتی ہے۔ یہاں ٹیکسی کہاں ملے گی؟"

میں۔ "مجھے بہت۔ بے انتہا جلدی ہے۔"

[illegible] ٹھنڈا کر ڈالیں۔ آدھ گھنٹہ میں پہونچ جائے گا۔"

مجھے اس کی چالاکی اور بدتمیزی پر غصہ آ رہا تھا۔ آخر ذرا واضح کر کے کہا۔ "استنجا کرنا ہے"

[illegible] ادھر اُدھر دیکھا۔ سامنے ایک استنجا گھر بنا ہوا تھا۔ جیسا کہ اکثر سڑکوں کے کنارے بنا ہوتا ہے اس نے پھر میری طرف دیکھا۔ مگر چہرے پر اظہار ناراضمندی دیکھ کر بولا۔

"صاحب ایک بوتل خرید لوں۔ آپ موٹر ہی میں فارغ ہو لیں میں پھینک دوں گا۔"

اس کی بدعقلی کسی حد پر ختم ہی نہیں ہوئی۔ کسی طرح صورت معاملہ سمجھتا ہی نہیں۔ آخر میں نے ڈپلومیسی سے کام لیا اور اس کمبخت کو دوست بنانے کی کوشش کی۔ میں اپنے چہرے کے پٹھوں اور رگوں پر جو مصلحتاً اسوقت بہت کس دیئے گئے تھے۔ ذرا قابو حاصل کر کے مسکرایا اور پھر کہا۔

"بوتل کی نہیں بیوقوف۔ مرتبان کی ضرورت ہو گی۔"

اب شوفر صاحب معاملہ کی تہ کو پہونچے۔ اور ذرا مسکرائے۔ جی میں آیا تھا کہ اسی منہ پر ایک گھونسا رسید کروں یہ مسکرانے کا کونسا موقع تھا؟ مگر صبر کیا۔ اور پوچھا۔ "کوئی ہوٹل قریب ہے؟"

"حضور ایسی خراب جگہ موٹر نے دغا دی! کوئی ہوٹل ووٹل قریب نہیں" "پھر کیا کروں؟"

"دیکھئے صاحب کوئی فکر کرتا ہوں۔"

وہ ادھر فکر کرنے دوڑ گیا۔ ادھر میں سانس سمیٹے جسم بھر کی رگوں کو ستار کے تاروں کی طرح کسے ہوئے بیٹھا تھا لیکن نازک وقت دور ہوتا جاتا تھا۔ اتنی تکلیف ہوتی تھی۔ کہ مجھ ایسے انسان کو بھی خدا یاد آگیا۔ عین اسی وقت میونسپلٹی کی گاڑی لبالب بھری جاتی دکھائی دی۔ [illegible] میں نے کس حسرت سے اس کی طرف دیکھا ہے۔ جہاں اتنا لادے تھی۔ میرا بھی ذرا سا بوجھ بٹا لیتی۔

اتنے میں شوفر بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔ "صاحب چلئے"

میں تو یہ سمجھا تھا کہ تریاق آنے میں دیر ہو گئی۔ مگر جیسا کہ قاعدہ ہے۔ کامیابی کا چہرہ دیکھتے ہی میری جرأت بڑھ گئی۔ میں نے اپنے [illegible] سے اپنے مرتبہ اور اپنی خاندانی عزت کا خیال کیا اور دانت بھینچ کر مٹھیاں کس کر نیچے اترا۔ شوفر میرے خیال سے تیز بھاگا [illegible] کہ اب میرے قویٰ اس قابل نہیں رہے تھے جو تیزی رفتار کا متحمل ہو سکوں۔ مگر کسی نہ کسی طرح دو گلیاں [illegible] طے [illegible] گیا۔ مگر اس کو دیکھ کر جی چاہا کہ ملعون شوفر کو مارے ٹھوکروں کے ٹکڑے کر دوں۔ مجھے لیجا کر ایک [illegible] کے سامنے [illegible] کا موقع دیکھ کر غصہ بڑی مشکل سے ضبط کیا اور کہا۔

"دوست کسی بھلے مانس سے باتیں کرو۔ اور اسی کے یہاں رفع ضرورت کا سامان کرا دو۔"

[illegible] کا منہ لٹک کر رہ گیا۔ اور مجھے اس جگہ سے ہٹا لایا۔ گلی میں پہونچ کر ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی کچھ دور پر [illegible] کے سامنے [illegible] ٹہل رہے تھے۔ موٹی سی داڑھی تھی۔ عینک لگائے تھے۔ کمرے کے سامنے

ایک بڑا سا سائن بورڈ لگا تھا جس پر لکھا تھا "مطب حکیم ———— " نہ معلوم کیا نام تھا۔ اس بدحواسی میں کیا پڑھ سکتا تھا۔ شوفر دوڑا ہوا ان کے پاس گیا۔ اور میں بھی بہزار دقت و اضطراب پھونک پھونک کر قدم دھرتا اس کے پیچھے چلا گیا۔

شوفر۔ "جناب حکیم صاحب! یہ ہمارے صاحب ہیں ———— ضلع .... میں کلکٹر ہیں۔ ان کی موٹر سڑک پر کھڑی ہے۔ اس وقت بہت پریشان ہیں۔ کیونکہ "رفع ضرورت" کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔"

حکیم صاحب نے میری طرف غور سے دیکھا۔ اور میرے سوٹ اور ہیٹ سے رعب کھا گئے۔ اب مجھے کامیابی کی امید بندھی۔ وہ بصد ادب شوفر سے کہنے لگے۔

"معلوم تو ہو کیا ضرورت ہے؟ کیا شکایت ہے؟"

شوفر نے ان کی نافہمی کو دیکھ کر میری طرف یاس سے دیکھا۔ گویا اجازت مانگ رہا تھا کہ صاف صاف کہدوں؟ مگر میرے چہرے کے پٹھے اتنے کسے ہوئے تھے کہ ان پر رضامندی۔ نارضامندی کسی قسم کے جذبات پیدا کرنا ناممکن ہو چکا تھا۔ مگر وہ میری حالت زار دیکھ کر سمجھ گیا۔ اور حکیم صاحب سے کہنے لگا۔

"آپ کے یہاں ذرا ———— بیت الخلا جانا چاہتے ہیں۔"

اے صاحب ان کے تو تن بدن میں چنگاریاں لگ گئیں۔ گویا کہ ڈرائیور نے کہدیا۔ "آپ کی لڑکی کو بھگا لیجانا چاہتے ہیں"

حکیم صاحب۔ بدمعاشو۔ غنڈو۔ میرے ساتھ یہ حرکتیں ————

ان کی زبان مشین کی طرح چلنے لگی۔ میرے پاس اتنا وقت کہاں تھا جو انکی طلاقت لسانی کی داد دیتا۔ یا انھوں نے جو فرد جرم لگائی تھی اس کی صفائی پیش کرتا۔ حالانکہ چلنے کی مقدرت نہ تھی۔ قدم قدم پر ناموس کا خطرہ تھا۔ مگر اسی حالت میں جیوں تیوں بھاگا۔ حکیم صاحب گالیاں دیتے ہوئے گلی کے نکڑ تک آ گئے۔ اس کے بعد جتنی دور ہم لوگ ہوتے جاتے اتنا ہی وہ اپنی آواز بلند کرتے جاتے۔ اور یہ تناسب اتنی دیر تک قایم رہا کہ میں تو سمجھا تھا کہ شاید ہم لوگوں کے بھاگنے کا کچھ فائدہ نہ ہو۔ قیامت یہ تھی کہ وہ کہہ رہے تھے۔

"بڑا کلکٹر بن کر آیا تھا۔ بم پلس ہے میرا گھر گویا کہ ——— کمینہ"

راہ گیر و دوکاندار میری طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وائے برحال ما۔ سچ کہتا ہوں مجھے رونا آرہا تھا۔ اور جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں سما جاؤں۔ حکیم صاحب پر ہزاروں لعنتیں بھیج رہا تھا۔ یہی [illegible] کا نام ہے اسلامی اخوت؟ جب اتنی سی مصیبت میں ایک بھائی کے شریک نہ ہو سکے تو اور کیا امید کی جا سکتی ہے۔ آخر جب ہم لوگ گرتے پڑتے حکیم صاحب کی [illegible] کی زد سے نکل آئے تو میں نے شوفر سے لجاجت سے کہا۔

"میاں ایک دفعہ اور کوشش کر دیکھو۔ خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اگر کسی غریب مسلمان [illegible] کرو تاکہ یہ [illegible] کا ذرا [illegible] کرو [illegible] گر پڑے [illegible] کہ [illegible]"

[illegible] میری حالت بد تر ہی دیکھا گیا تھا۔ فوراً نوٹ لے کر ایک تنبولی کی طرف دوڑا ہوا ایک چھوٹی سی دوکان پر سامنے بیٹھا تھا۔ اس وقت مجھے حسرت سے اپنے گھر کا صاف ستھرا "باتھ روم" اور اس کا چمکدار پاٹ یاد کر رہا تھا۔ کبھی کبھی والد صاحب کے گھر کا ہندوستانی وضع کا بیت الخلا یاد آتا۔ اور نہ معلوم کون کون بیت الخلا۔ جن سے زندگی میں کبھی سابقہ پڑا تھا۔ یاد آ رہے تھے۔ مگر یہ کہاں۔ وہ کہاں!! شوفر نے تنبولی سے کہا۔

"مسلمان ہو؟"

"جی حضور!"

"ایک کام کرو۔ پانچ روپیہ ملیں گے۔ صاحب کو اپنے گھر میں رفع ضرورت کرا دو۔"

تنبولی۔ "کیا؟" اور میری طرف دیکھنے لگا۔

شوفر۔ ارے بیت الخلا۔ صاحب تمہارے یہاں بیت الخلا جانا چاہتے ہیں۔

تنبولی کمبخت حکیم صاحب سے بھی بڑھ کر کمینہ نکلا۔ مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر ہو گیا۔ ہم لوگ جواب کے منتظر کھڑے تھے مگر اس کے منہ سے مارے ہنسی کے آواز ہی نہیں نکلتی تھی۔ گویا ہم لوگ اس کے سامنے بھانڈوں کی نقل کر رہے ہیں۔ دو چار راہ گیر بھی تھے ان میں سے دو ایک تو بڑی زور سے قہقہہ مار کر ہنسے۔ اور بقیہ پوچھنے لگے "کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟" یہ اور رسوائی! اب میں کہاں جاؤں زمین تنگ [illegible] آسمان دور۔ یہاں یہ کیفیت کہ دماغ کی رگیں پھٹی جا رہی تھیں۔ آنکھیں نکلی پڑتی تھیں۔ میں تو اتنا مایوس ہو گیا کہ بار بار یہی جی میں آتا کہ جتنا انسان کر سکتا تھا کر لیا۔ اب جو ہو سو ہو مقابلہ میں ہار مان لو مگر ہمارے قسمت اچھی تھی اسی وقت ایک شخص [illegible] میرے برابر کھڑا تھا۔ مگر میں نے اس کی طرف مطلق خیال نہیں کیا تھا۔ بولا۔

"حجور۔ ادھر۔ کچھ دور پر بڑا صاف بم پلس ہے۔ میں ابھی حجور ہی کی خاطر دو گھڑے پانی سے دھو کر آ رہا ہوں۔ حجور! ان [illegible] لوگوں سے کام [illegible]۔ یہ دوکانوں میں رہتے ہیں ان کے یہاں بیت الکھلا کہاں؟"

اس وقت اس بھنگی کی ہمدردی نے میری طبیعت بہت متاثر ہوئی۔ یہ لوگ بھی کتنے اچھے ہوتے ہیں! ایک حکیم صاحب کو دیکھو۔ ملعون تنبولی کو دیکھو! اور اس غریب بھائی کو دیکھو!! پھر بھنگی ہماری کتنی خدمت کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ کام نہ کریں۔ تو ہم لوگوں کے پاٹ کبھی صاف ہی نہ ہوں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ مگر کن مشکلوں سے چلا ہوں۔ میرے [illegible] اور گھوم گھوم کر پڑ رہے تھے۔ گویا میں کوئی "ڈانس" ایجاد کر رہا ہوں۔ یا کسی کبھی کی اطلائی چال کی نقل اتار رہا ہوں [illegible] اسی پہلو پر بم پلس کے پاس پہنچ گیا۔

چھوٹی لائن کے پھاٹک کے برابر ایک کا ایک کمرہ سا بنا ہوا تھا جس میں بارہ خانے تھے۔ اور ہر خانے میں چھوٹے چھوٹے [illegible] [illegible] کالے ڈبے دکھائی دے رہے تھے۔

[illegible] معلوم ہوا کہ حقیقت یہ جگہ اتنی [illegible] گندی نہ تھی جتنی پہلی نظر میں معلوم ہوتی تھی بھنگی نے پٹ کھول کر

دکھایا۔ تو اندر بھی کافی صاف تھا۔ میں نے جی میں کہا کہ آخر اسکو لوگ استعمال ہی کرتے ہیں۔ انسان انسان سب برابر ہیں میں کیوں نہیں استعمال کر سکتا۔ پھر بھنگی بولا۔

"حجور! بڑے بڑے لوگ جب ضرورت بڑھ جاتی ہے یہیں آتے ہیں۔ ہم لوگ کیا کتنے پھرتے ہیں"

میں نے پتلون کی پیٹی پر ہاتھ ڈالا۔ اور بیچارہ بھنگی دوڑ کر ایک بدھنی میں پانی لایا۔ اتنے میں تانگہ کی آواز آئی اور شوفر صاحب کارگزاری دکھانے کو اس پر بیٹھے ہوئے آپہونچے اور جلدی جلدی بولنے لگے۔

"صاحب! قریب ایک سرائے ہے۔ پانچ منٹ کا تانگہ پر راستہ ہے۔ تانگہ والا کہتا ہے وہاں کا پاخانہ بہت صاف ہے زمین پکی ہے۔ دیواروں پر تارکول پھرا ہے۔ بھٹیاری قلعی دار لوٹے میں پانی دیتی ہے۔ گرم پانی بھی مل سکتا ہے۔"

جنت کی تصویر کیا اتنی دلفریب ہوگی جتنی اس وقت میرے لئے اس پاخانہ کی تصویر تھی۔ مگر وقت تنگ تھا۔ حالت بگڑ چکی تھی نہ معلوم کس کس طرح بدن گھما گھما کر شوفر صاحب کی خطابت سنی۔ منہ سے آواز نکالنے کی تو سکت تھی نہیں۔ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا

ع۔ "بعد مردن دولت قاروں بھی ہاتھ آئی تو کیا؟" اور کیا بتاؤں کس بے بسی سے بلا کریم پلس کے قریب ترین خلانے میں گھس گیا۔ اندر پہونچ کر ایک ہی منٹ کے بعد شوفر سے پکار کر کہا۔

"وہ پانچ روپیہ کا نوٹ بھنگی کو دیدو۔"

(محمد حیات اللہ انصاری)

مُوتُوا قَبلَ اَن تَمُوتُوا

(حکیم الشعرا حضرت .... امجد حیدر آبادی)

ذلت میں پڑے رہو نہ عزت چاہو دولت کی طلب کرو نہ غربت چاہو
ہم جو چاہیں رہو اسی پر راضی امجد صاحب! تم آپ کچھ مت چاہو

اِنَّ رَبَّکَ لَبِالمِرصَاد

کیوں مرے فراق کا تجھے ماتم ہے کیوں مجھ کو نہ دیکھنے کا تجھ کو غم ہے
تو دیکھ کے مجھ کو کیا کرے گا امجد میں دیکھ رہا ہوں تجھ کو یہ کیا کم ہے

(حضرت امجد حیدرآبادی)

ٹیگور کا ایک افسانہ

سنیاسی

(مترجمہ جناب اکبر علی صاحب ایم اے۔ لاہور)

(گذشتہ سے پیوستہ)

پہلا مرد۔ اپنے ساتھیوں کی طرف مخاطب ہو کر۔۔۔ بھائیو اس بات کا فیصلہ میں آپ پر ہی چھوڑتا ہوں۔ میں نے جو کچھ کہا وہ صرف یہ تھا کہ اگر ہم سنگدل ہوتے تو کیوپڈ کے تیر۔۔۔

تیسرا مرد۔ بالکل ٹھیک۔ اس کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔

پہلا مرد۔ اب میں اپنے جواب کو اور واضح کرتا ہوں۔ اس کا کہنا ہے کہ ہم مردوں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر مردوں کے دل پتھر کے ہوتے تو کیوپڈ کے تیر انہیں کیونکر زخمی کر سکتے۔ غالباً آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔

دوسرا مرد۔ بھائی سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کا مطلب خاک بھی نہیں سمجھا۔ بھلا ایک ایسا آدمی جو چوبیس سال سے تمباکو بیچ رہا ہو۔ ایسی لطیف باتوں کو کہاں سمجھ سکتا ہے۔

سنیاسی۔ بچی تم کیا کر رہی ہو؟

وسنتی۔ پتا جی میں اپنی ہتھیلی کو دیکھ رہی ہوں میرا ہاتھ ایک ننھا سا پرندہ ہے جو اپنا نشیمن اس میں تلاش [illegible] کرتا ہے۔ ارض کی سی وسعت رکھتی [illegible] کی جائے پناہ ہے۔ آپ کے ہاتھ کی لکیریں دریا ہیں اور ان کے درمیان کی اونچی جگہ سلسلۂ کوہ

(اپنا رخسار ہتھیلی پر رکھ دیتی ہے)

سنیاسی۔ میری بچی تیرا مس نیند کے مس کی طرح نہایت نرم اور سکون آور ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مس میں اس کی تاریکیٔ عظم کی کوئی صفت پائی جاتی ہے۔ جو ابدیت کے عصا سے ہر روح کو متاثر کر دیتی ہے۔ بچی تو تو دن کی روشنی کا پروانہ ہے۔ یہ پھول۔ یہ پرندے یہ میدان سب تیری ملکیت ہیں۔ بھلا میری ذات سے تجھے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ میرا مرکز تو اس ذات واحد میں ہے اور میرے محیط کا کہیں پتہ ہی نہیں۔

وسنتی۔ مجھے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میرے لئے آپ کی محبت ہی بس ہے۔

سنیاسی (دل میں) لڑکی کہتی ہے کہ اسے محبت کرتا ہوں۔ او نادان دل۔ یہ اسی خیال میں مگن ہے۔ اچھا اسے اسی خیال سے تسکین حاصل کرنے دو۔ آہ نظر فریبیوں ہی میں ہم پروان چڑھتے ہیں۔ اور نظر فریبیاں ہماری راحت کا باعث ہوتی ہیں۔

وسنتی۔ پتا یہ سامنے کی بیل جو گھاس پر بل کھا رہی ہے اور کسی درخت پر منڈلانے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے۔ میری

میں اس وقت سے اس کی نگہداشت اور آبیاری کر رہی ہوں۔ جب اس نے ایک معصوم بچے کی چیخ کے مانند بڑی مشکل سے ابھی زمین سے سر نکالا ہی تھا۔ پتا یہ بیل نہیں بلکہ میں ہوں۔ ذرا دیکھئے تو یہ سر راہ ہی اُگ آئی ہے اور نہایت آسانی سے کچلی جا سکتی ہے۔ کیا آپ ان چھوٹے چھوٹے نیلگوں حسین پھولوں کو دیکھ رہے ہیں جن کے سینے سفید سفید داغوں سے زخمی ہیں۔ یہ سفید سفید داغ گویا ان کے خواب ہیں۔ لائیے آپ کی پیشانی ان پھولوں سے صاف کر دوں۔ دنیا کی تمام حسین اشیا مجھے ان دیکھی اور ان جانی چیزوں کی یاد دلاتی ہیں۔

سنیاسی۔ نہیں نہیں۔ حسن محض ایک دھوکا ہے۔ فریب ہے۔ نمائش ہے۔ کسی عارف کے نزدیک گل و لالہ اور گرد و غبار میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن یہ رنج و کرب کیسا یہ کسالت کیسی جو میرے خون میں پیچ و تاب کھا رہی ہے اور ایک ہفت رنگ غبار آلود باریک پردے کو میری آنکھوں کے سامنے لا رہی ہے۔ کیا یہ خود فطرت ہے جو مسرت بخش خوابوں کا جال میرے گرد ڈال کر میرے حواس کو معطل کرنا چاہتی ہے۔

(یکلخت بیل کو اکھاڑ دیتا ہے اور کھڑا ہو جاتا ہے)

اب اس کا خیال چھوڑ دو۔ اس میں میری موت ہے ننھی بچی! تو مجھ سے کیا کھیل کھیل رہی ہے؟ میں ایک سنیاسی ہوں میں نے تمام بندھنوں کو توڑ ڈالا ہے۔ میں آزاد ہوں۔

بس بس! یہ رونا کیوں! یہ آنسو کیسے۔ میں انہیں دیکھ نہیں سکتا۔ مگر میرے دل میں وہ سانپ کہاں چھپا ہوا تھا۔ جو اپنے گذشتہ تاریکی سے نکل کر یہاں [illegible]

آہ! ابھی میری خواہشات باقی ہیں۔ فاقہ کشی اور ریاضت سے انکی بیخ کنی نہ ہو سکی۔ جب ان کی مالک ——— وہ خوفناک سحرکار اپنا سُریلا نغمہ الاپتا ہے۔ تو یہ جہنم نژاد میرے پردۂ دل پر ناچنے لگتی ہیں۔

بچی روؤ نہیں۔ ذرا میرے پاس آؤ۔ تم مجھے کسی گمشدہ دنیا کی صدا یا کسی جہاں گرد ستارے کا نغمہ معلوم ہوتی ہو۔ تم مجھے کسی ایسی چیز کی یاد دلاتی ہو جو تمام کائنات سے زیادہ وسیع ہے اتنی وسیع جتنی تاریکی۔ میں ابتک اس کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہوا۔ اس لئے اس سے خائف ہوں۔ مجھے تمہیں کو چھوڑ جانا چاہئے۔ اے کسی نامعلوم ہستی کی پیغامبر تو جہاں سے آئی تھی وہیں چلی جا۔

وسنتی۔ پتا مجھے مت چھوڑو۔ دنیا میں اور میرا کوئی نہیں۔

سنیاسی۔ میں ضرور چلا جاؤں گا۔ میں سمجھا تھا کہ میں حقیقت کو پا گیا ہوں۔ لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ اب میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ میں تیری حقیقت معلوم کرنے کی خاطر تجھے چھوڑ رہا ہوں۔

وسنتی۔ پتا اگر آپ مجھے چھوڑ گئے تو میں مر جاؤں گی۔

سنیاسی۔ میرا ہاتھ چھوڑ دو۔ مجھے مت پکڑو۔ میں آزاد ہوں

(بھاگ جاتا ہے)

(۳)

سنیاسی پہاڑ کی وادی میں ایک پتھر پر بیٹھا ہے۔ ایک چرواہا لڑکا گاتا ہوا پاس سے گذر جاتا ہے

چرواہے کا گیت

میری پیاری مجھ سے منہ مت موڑ

[illegible]

گل ولالہ اپنے سربستہ راز تاریکی میں افشا کر رہے ہیں۔ درختوں کے پتوں کی تھرتھراہٹ۔ رات کی آنکھوں کی طرح۔ فلک کا سینہ چیر رہی ہے۔ اے جانِ عزیز آ۔ اور مجھے اپنا رخِ روشن دکھا۔

سنیاسی۔ شام کی زرفشاں سرخی نیلگوں سمندر کے سینے میں روپوش ہو رہی ہے۔ پہاڑ پر کا جنگل دن کی روشنی کا آخری پیالہ نوش کر رہا ہے۔ بائیں طرف گاؤں کی جھونپڑیاں ہیں۔ جہاں چراغ روشن ہیں اور جو درختوں میں سے اس طرح نظر آ رہی ہیں۔ جیسے کوئی برقعہ پوش والدہ اپنے سوئے ہوئے بچوں کے پاس بیٹھی ہوئی اُن کی حفاظت کر رہی ہو۔ اے فطرت تو میری باندی ہے تو نے اس وسیع دنیا میں رنگ برنگ کے غالیچے بچھا رکھے ہیں۔ جہاں میں ایک بادشاہ کی طرح تنہا بیٹھ کر تیرے کیف آور رقص کو دیکھا کرتا ہوں۔

(دیہاتی لڑکیاں گاتی ہوئی گذر جاتی ہیں)

دیہاتی لڑکیوں کا گیت۔

سیاہ پوش صحرا کے پردے نغمہ کی صدا آ رہی ہے جو مجھے اپنی طرف بُلا رہی ہے۔

میں گھر میں نہایت خوش و خرم بیٹھی تھی کہ کسی کی بانسری کی آواز شب کی ساکن فضا میں گونج اٹھی اور میرے سینے میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا۔

کاش! کوئی محرم مجھے رستہ بتا دے۔

خدارا اُس تک پہنچنے کا رستہ بتا دو۔

میں ایک ننھے سے پھول کو ہاتھ میں لئے ہوئے اس تک [illegible] کر

اس کے نغمے اور میری محبت میں کوئی فرق نہیں۔

(چلی جاتی ہیں)

سنیاسی۔ میرے خیال میں میری زندگی میں ایک ایسی رات پہلے بھی آ چکی ہے۔ وہ رات جبکہ میرا جام محبت اور نغمے سے لبریز ہو کر چھلک پڑا تھا اور میں کسی کے پہلو میں بیٹھا ہوا جس کے چہرے کی یاد شام کے اس ڈوبتے ہوئے ستارے میں اب تک پائی جاتی ہے۔ وہ عشرت لے رہا تھا۔ مگر وہ سیاہ غمگین اور پُراشک آنکھوں والی ننھی لڑکی کہاں چلی گئی؟ کیا وہ اپنی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھی ہوئی شام کی خوفناک تنہائی میں اُس روشن ستارے کو تک رہی ہے؟ مگر ستارہ ضرور ڈوب جائیگا رات کی تاریکی اُس کی آنکھیں بند کر دے گی۔ اور جب آنکھیں بند ہونگی تو آنسو ٹھہر جائیں گے اور آہیں خاموش ہو جائینگی۔ میں ہرگز واپس نہیں جاؤں گا۔ عالمگیر خوابوں کو اپنی صورت بدلنے دو۔ میں ان کے رستہ میں رکاوٹ ڈال کر خیالات کی نئی دنیا بسانا نہیں چاہتا۔ میں دیکھوں گا۔ سوچوں گا اور جاننے کی کوشش کروں گا۔

(ایک پھٹے پُرانے کپڑوں والی لڑکی آتی ہے)

لڑکی۔ کیا آپ ہیں پتا؟

سنیاسی۔ آؤ بچی میرے پاس آؤ۔ کاش میں پتا کہلانے کا مستحق ہوتا۔ ایک دفعہ کسی نے مجھے پتا کہہ کر پکارا تھا اور وہ آواز بھی کچھ تم سے ملتی جلتی تھی۔ پتا تو اب بول رہا ہے لیکن وہ پیاری آواز کہاں گئی؟

لڑکی۔ آپ ہیں کون؟

سنیاسی۔ میں ایک سنیاسی ہوں۔ بچی تیرا پتا کیا کام کرتا ہے؟

لڑکی۔ وہ جنگل میں لکڑیاں چنا کرتا ہے۔

سنیاسی۔ کیا تمہاری ماتا ہیں؟

لڑکی۔ نہیں۔ میں چھوٹی سی تھی کہ وہ مر گئیں۔

سنیاسی۔ کیا تمہیں اپنے پتا سے محبت ہے؟

لڑکی۔ مجھے وہ دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر عزیز ہیں ان کے سوا اور میرا کوئی نہیں۔

سنیاسی۔ میں تمہاری بات سمجھتا ہوں۔ مجھے اپنا ننھا سا ہاتھ دکھاؤ۔ لاؤ تو ذرا اسے میں اپنی ہتھیلی پر۔۔۔ اس بڑی ہتھیلی پر رکھوں۔

لڑکی۔ سنیاسی! کیا تم قیافہ لگا سکتے ہو؟ کیا تم میرا ہاتھ دیکھ کر بتا سکتے ہو کہ میں کون ہوں اور کیا ہو جاؤنگی؟

سنیاسی۔ ہاں! میں ہاتھ تو دیکھ سکتا ہوں۔ لیکن لکیروں کا مطلب اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔

لڑکی۔ اب میں اپنے باپ کے پاس جاؤنگی۔

سنیاسی۔ کہاں؟

لڑکی۔ جس جگہ سڑک جنگل میں داخل ہوتی ہے۔ اگر میں وہاں گئی تو میں ان سے نہ مل سکوں گی۔

سنیاسی۔ بچی اپنا سر میرے قریب لاؤ اور جانے سے پیشتر مجھ سے مقدس بوسہ لیتی جاؤ۔

(لڑکی چلی جاتی ہے)

(ایک عورت دو بچوں کے ہمراہ آتی ہے)

ماں۔ لکشمی کے لڑکے کتنے ہٹے کٹے ہیں۔ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ ایک تم ہو کہ جتنی زیادہ تمہیں خوراک ملتی ہے اتنی ہی تم روز بروز کمزور ہوتی جاتی ہو۔

پہلی لڑکی۔ ماتا بھلا اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ آپ خواہ مخواہ ہمیں کوستی رہتی ہیں۔

ماں۔ کیا میں تم سے نہیں کہتی کہ جہاں تک ہو سکے آرام کیا کرو لیکن دن بھر تمہارے پاؤں ہی نہیں تھکتے۔

لڑکی۔ لیکن ماتا ہمیں آپ ہی کے کاموں کے لئے تو دوڑنا پڑتا ہے۔

ماں۔ منہ پھٹ۔ زبان دراز۔ یوں جواب دینے کی تجھے کیسے جرأت ہوئی۔

سنیاسی۔ بچی! تم کہاں جا رہی ہو؟

ماں۔ پتا پرنام۔ ہم گھر جا رہی ہیں۔

سنیاسی۔ آپ کے گھر میں کتنے لوگ ہیں؟

ماں۔ میری ساس۔ میرا شوہر اور ان بچوں کے علاوہ دو اور بچے۔

سنیاسی۔ تم اپنا وقت کس طرح گذارتی ہو؟

ماں۔ یہ بتانا تو ذرا مشکل ہی ہے۔ میرا سوامی کھیتوں کی نگرانی کے لئے باہر چلا جاتا ہے اور میں گھر کی دیکھ بھال کرتی ہوں اور شام کے وقت اپنی بڑی لڑکیوں کے ساتھ کاتنے بیٹھ جاتی ہوں۔

(لڑکیوں سے مخاطب ہو کر) جاؤ اور سنیاسی کو پرنام کرو۔ انہیں اشیرباد دو پتا۔

(دو آدمی آتے ہیں)

پہلا آدمی۔ میرے عزیز دوست۔ یہیں سے واپس چلے جاؤ۔ اب اور آگے چلنے سے کیا فائدہ۔

دوسرا آدمی۔ ہاں۔ میں جانتا ہوں کہ اس دنیا میں اتفاقاً دو دوستوں کی ملاقات ہو جاتی ہے اور اتفاق ہی سے جو کچھ دور تک ہمیں اٹھائے لئے جاتا ہے اور آخر وہ گھڑی پہنچ جاتی ہے جب ہمیں ایک دوسرے کو [illegible]

کہنا پڑتا ہے۔

دوسرا دوست۔ ہمیں امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے آپ وثوق رکھئے کہ ہماری جدائی ملاپ کا پیش خیمہ ہے۔

پہلا دوست۔ ہمارے ملاپ اور فراق کا انحصار دنیا کی تمام حرکات پر ہے۔ ستاروں کی گردش کو اس میں کوئی خاص دخل نہیں۔

دوسرا دوست۔ آؤ ہم ان ستاروں کے حضور عقیدت کے پھول پیش کریں جو ہماری ملاقات کا باعث ہوئے۔ گو ہمارا ملاپ ایک لمحہ سے زیادہ نہیں۔ تاہم اس کی وقعت بہت زیادہ ہے۔

پہلا دوست۔ دوست! الگ ہونے سے پیشتر ذرا پیچھے مڑ کر اپنے گاؤں کو تو دیکھ لو۔ کیا وہ دور اندھیرے میں آپکو پانی کی باریک سی دھاری نظر آ رہی ہے؟ کیا وہ ریتلے میدان میں اُگے ہوئے کھجور کے فلک بوس درخت آپ کو دکھائی دیرہے ہیں۔ ذرا دیکھو تو ہمارا گاؤں تاریک سایوں کا ایک ڈھیر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں سے صرف روشنیاں ہی دکھائی دے رہی ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان میں سے ہماری کونسی روشنی ہے؟

دوسرا دوست۔ ہاں۔ میرا خیال ہے کہ میں بتا سکتا ہوں۔

پہلا دوست۔ یہ روشنی اپنے رخصت ہونے والے مہمان کو الوداع کہہ رہی ہے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو جائے گا۔

(دونوں چلے جاتے ہیں)

[illegible] ایک درخشاں رات ہے۔ یہ کسی برگشتہ [illegible] کی طرح جلتی ہوئی ہے۔ یہ چمکدار

ستارے اُس کے آنسو ہیں جو آگ میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ اے میری ننھی بچی تیرے ننھے سے دل کے غم نے میری زندگی کی تمام راتوں کو ہمیشہ کے لئے رنج والم اور حسرت و یاس سے بھر دیا ہے۔ تیرے شفقت بھرے ہاتھ کا محبت بھرا مس رات کی ہوا میں اپنا نشان باقی چھوڑ گیا ہے۔ میں اس کے اثر کو اپنی پیشانی پر محسوس کر رہا ہوں۔ یہ تیرے آنسوؤں کی نمی سے تر ہو گیا ہے۔ میرے محبوب تیری وہ آہیں جنہوں نے مجھے اس وقت ترغیب دلائی تھی۔ جب میں بھاگ کھڑا ہوا تھا میرے دل میں پیوست ہو گئی تھیں۔ میں موت تک انہیں اُٹھائے پھرونگا۔

(۴)

(سنیاسی گاؤں کے راستہ پر کھڑا ہے)

جاؤ میرے سنیاس کے پیمانو جاؤ۔ میں اپنے عصا اور کاسہ کو توڑ ڈالوں گا۔ اے دریائے وقت کو عبور کرنے والی جہاز نما دلفریب دنیا تو پھر ایک دفعہ مجھے اپنی آغوش میں لے لے کیا ہی نادان ہے وہ شخص جو سورج اور ستاروں کی روشن دنیا چھوڑ کر بیراگی میں اپنی نجات ڈھونڈھ رہا ہے اور اپنے تنگ و تاریک راستہ کو ایک ٹمٹماتے ہوئے دیئے سے معلوم کرنا چاہتا ہے۔ طیور آسمان پر اس خیال سے نہیں اُڑتے کہ کسی خلا میں معدوم ہو جائیں۔ بلکہ انہیں ہر وقت اس ارض مقدس پر پہنچنے کا شوق دامنگیر رہتا ہے۔ میں آزاد ہوں۔ میں نے کے نا محسوس بندھن سے چھوٹ گیا ہوں۔ میں اشیا۔ اشکال اور مقاصد کے دام فریب سے رہا ہو گیا ہوں۔ محدود ہی حقیقت میں لامحدود ہے۔ محبت اپنی صداقت سے ناواقف نہیں۔ میری بچی تو کائنات کی روح ہے۔ میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتا

(گاؤں کا نمبردار آتا ہے)

سنیاسی۔ بھائی کیا تم جانتے ہو رگھو کی لڑکی کہاں ہے؟

نمبردار۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ گاؤں چھوڑ کر چلی گئی۔

سنیاسی۔ وہ کہاں گئی ہے۔

نمبردار۔ کہاں! اُس کے لئے سب جگہ برابر ہے۔

سنیاسی۔ میری پیاری کسی نامعلوم جگہ کے خلائے محض میں پناہ کے لئے کوئی جگہ تلاش کرنے گئی ہے۔ وہ مجھے ضرور پالے گی۔

(دیہاتیوں کا ایک گروہ آتا ہے)

پہلا دیہاتی۔ تو گویا آج ہمارے بادشاہ کے لڑکے کی شادی ہے؟

دوسرا دیہاتی۔ ارے یار شادی کا وقت صرف دولھا اور دولھن کے لئے ہے۔ آپ کو اس سے کیا مطلب

ایک عورت۔ کیا اس خوشی کے موقعہ پر ہمیں کھانا نہیں ملے گا؟

پہلا دیہاتی۔ کھانا۔ تم بھی احمق ہی ہو۔ میرے چچا شہر میں رہتے ہیں۔ وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ ہمیں دہی اور اُبلے ہوئے چاول دئے جائیں گے۔

دوسرا دیہاتی۔ بہت خوب۔

چوتھا آدمی۔ لیکن اس بات کو بھی نہ بھولئے کہ دہی میں آدھے سے زیادہ پانی ہو گا۔

پہلا آدمی۔ موتی تم! بڑے ہی بیوقوف ہو۔ بھلا ایک شہزادے کی شادی پر پانی سے ملا ہوا دہی۔

چوتھا آدمی۔ لیکن ہم خود تو شہزادے نہیں ہیں نا سمجھو ہم غریبوں کیلئے تو دہی بھی پانی میں تبدیل ہو جانے کی تکرار رکھتا ہے

پہلا دیہاتی۔ ذرا سامنے تو دیکھو وہ لوہار کا بچہ ابھی تک کام کر رہا ہے۔ آؤ اسے چل کر روک دیں اگر وہ باہر نہ نکلا تو ہم اسے نذرِ آتش کر دیں گے۔

سنیاسی۔ کیا آپ میں سے کسی کو معلوم ہے کہ رگھو کی لڑکی کہاں ہے؟

عورت۔ وہ کہیں چلی گئی ہے۔

سنیاسی۔ کہاں۔

عورت۔ یہ تو نہیں معلوم۔

پہلا دیہاتی۔ لیکن اس بات کا یقین رکھئے کہ وہ شہزادے کی دولھن بننے نہیں گئی۔

(سب ہنستے ہوئے چلے جاتے ہیں)

(ایک عورت بچے کو گود میں اٹھائے ہوئے آتی ہے)

عورت۔ پتاجی۔ پرنام۔ میرے بچے کو ذرا ماتھا ٹیک لینے دو۔ یہ بیمار ہے۔ اسے آشیرباد دو پتا۔

سنیاسی۔ لیکن بچی میں سنیاسی نہیں رہا۔ بار بار سلام کر کے مجھ کو شرمندہ مت کرو۔

عورت۔ تو پھر آپ ہیں کیا؟ آپ کیا کر رہے ہیں؟

سنیاسی۔ میں تلاش کر رہا ہوں؟

عورت۔ کس کی؟

سنیاسی۔ اپنی گمشدہ دنیا کی۔ کیا تم رگھو کی لڑکی کو جانتی ہو؟ وہ کہاں ہے؟

عورت۔ رگھو اچھوت کی لڑکی نا؟ وہ تو مر گئی۔

سنیاسی۔ ہرگز نہیں۔ وہ نہیں مر سکتی۔ وہ نہیں مر سکتی۔

عورت۔ لیکن اُس کی موت سے تمہیں کیا تعلق؟

سنیاسی۔ آہ اس کی موت صرف میری نہیں بلکہ تمام دنیا کی موت ہے

عورت۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

سنیاسی۔ ہرگز نہیں۔ وہ مری نہیں۔ وہ مری نہیں۔

(ٹیگور) (اکبر علی)

(ختم شد)

نیرنگِ خیال کا فلمی ضمیمہ

(نیرنگِ خیال کے فلمی ایڈیٹر کے قلم سے)

فلموں کے ٹائیٹل اور اردو زبان

ہندوستانیوں کی غلامانہ ذہنیت اور نقالی کی عادت بہت بری طرح ہندوستان کو ذلیل کرا رہی ہے۔ ہمارے "تعلیم یافتہ" اصحاب انگریزی میں سوچتے اور انگریزی میں اظہارِ خیال پر قادر ہیں۔ اپنی مادری زبان جو انہوں نے پنگوڑے میں سنی اور ماں کی گود میں سیکھی تھی انہیں بری معلوم ہوتی ہے۔ آپ کسی "تعلیم یافتہ" بزرگ سے پل میں گفتگو کر کے دیکھئے۔ وہ اپنی مادری زبان کے چند الفاظ کے ساتھ انگریزی زبان کے الفاظ بکثرت استعمال کریں گے اور بار بار اپنی مادری زبان میں الفاظ کا ذخیرہ کم پا کر انگریزی الفاظ استعمال کرتے جائیں گے۔ یہ تو رہا گفتگو میں غیر ملکی زبان کا استعمال۔ ہندوستانی فلموں میں فلم شروع ہونے سے قبل ڈائریکٹر۔ افسانہ نویس۔ صدا بند۔ تصویر کش اور دوسرے کریکٹروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تو وہ تمام تر انگریزی زبان میں ہوتا ہے۔ جس زبان میں فلم تیار کیا جاتا ہے اس زبان میں ان اصحاب کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ کیا یہ شرمناک نہیں؟ کیا ہم فلم کمپنیوں سے توقع کر سکتے ہیں کہ آئندہ وہ اپنے انگریزی کریکٹروں۔ ڈائرکٹروں۔ اور دوسرے کارکنوں کا ذکر ہندوستانی زبان میں کریں گے۔ نیز فلموں کے ٹریلروں (اشتہاری فلمی نمونوں) میں بھی انگریزی زبان کے الفاظ استعمال نہیں کریں گے۔

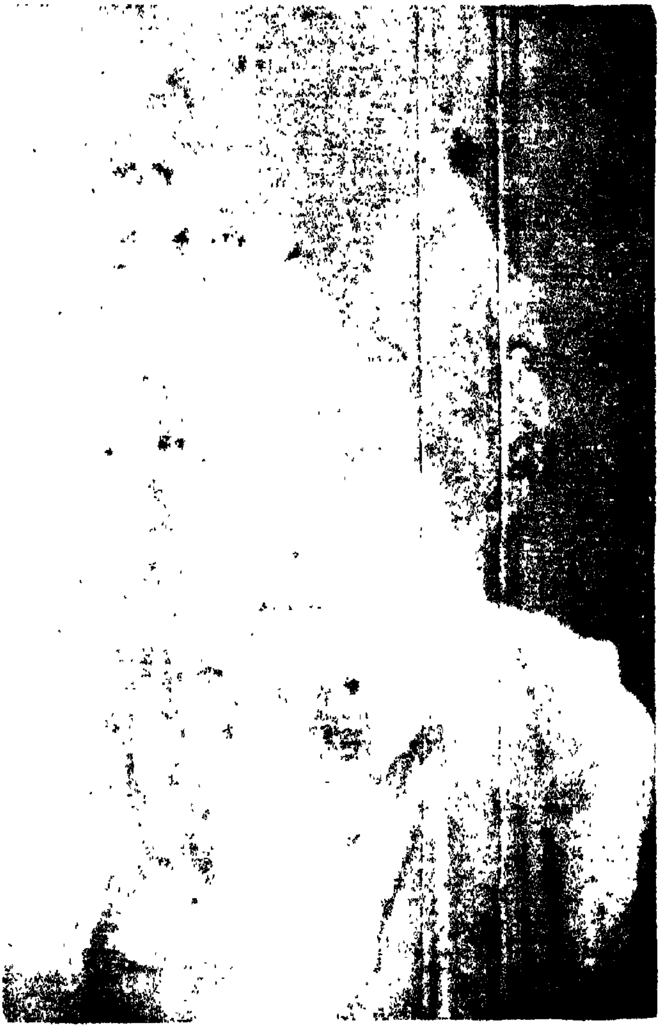
نئی فلموں پر تنقید:۔

خیبر پاس

یہ ایسٹ انڈیا فلم کمپنی کی تازہ تصویر ہے۔ اور بہ لحاظ فن کے ایسٹ انڈیا والوں کو مبارک باد دیتے ہیں کہ ان کا یہ فلم بہت ہی کامیاب ہے۔ بہ لحاظ مناظر۔ صدا بندی۔ فوٹوگرافی اور تسلسل کے لاجواب ہے۔ اس فلم کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہندوستان میں نہیں بلکہ یورپ میں تیار ہوئی ہے۔ اس میں سرحدیوں کو خونخوار ڈاکو۔ فاقہ کش۔ لڑاکو۔ جاہل اور [illegible] کچھ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ افسانہ مسٹر گل حمید نے لکھا ہوگا۔ اور انہوں نے [illegible] کیا ہے۔ اس لئے اس میں سرحدیوں کے مصائب ان کی دین و مذہب کی پابندی ان کی غیرت۔ ان کا حوصلہ [illegible] کی جاں نثاری۔ ان کا پناہ گزینوں کے لئے جانیں دے دینا۔ ان کا زبان اور عہد کی پابندی میں سرفروشی [illegible] رسم و رواج وغیرہ کی نمائش ہوگی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ افسانہ کسی انگریزی کہانی کا چربہ ہے۔ جس میں کسی فرنگی



مسٹر عنایت ایڈیٹر چورنج کلکتہ
و یسٹ انڈیا فلم کارپوریشن



مصنف نے سرحدیوں کے متعلق نفرت وحقارت پھیلانے کے لئے دیدہ و دانستہ یہ کہانی گھڑی ہے ۔

ہمارے خیال میں ایسٹ انڈیا فلم کمپنی اگر اس ڈرامہ خیبر پاس کو یورپ میں انگریزی ٹائیٹلوں کے ساتھ بھجوا دے تو اس سے زیادہ روپیہ کما سکتی ہے۔ جتنی اسے ہندوستان میں توقع ہوگی۔

افسانہ بے ربط اور غلط ہے۔ ڈائریکشن گوارا ہے۔ مظہر خاں اور چھوٹی بچی کا پارٹ قابل تحسین ہے۔ گل حمید اور پہلوان قابلِ ذکر ایکٹر ہیں۔ ہیروین ہر طرح سے ناکام رہی ہے ؛

کروڑپتی

نیو تھیٹرز کا تازہ شاہکار ہے۔ اس ڈرامہ کی جتنی دھوم مچی ہوئی تھی اتنا شاندار نہیں ۔ لیکن پھر بھی ہر طرح سے کامیاب ہے رنجیت فلم کمپنی والے جو عام طور سے مزاحیہ دہلانے والی کہانیاں، تیار کرتے ہیں یا کم از کم ہر فلم میں چار یا پانچ مسخروں کو ٹھونس ٹھانس دیتے ہیں۔ انہیں کروڑپتی سے سبق حاصل کرنا چاہئے ۔ کروڑپتی ایک مزاحیہ فلم ہے۔ لیکن اس میں جتنے ایکٹر ہیں نہ وہ فضول منہ بناتے ہیں نہ اپنے لگاڑتے ہیں۔ نہ اچھلتے ہیں نہ کودتے ہیں ۔ نہ روتے ہیں۔ نہ چیختے ہیں نہ چلاتے ہیں۔ رنجیت فلم کمپنی کے مسخروں یا ان کے ڈائرکٹروں کو اس سے سوا اور کچھ بھی نہیں سوجھتا۔ کروڑپتی مزاحیہ فلموں میں ایک شاندار فلم ہے۔ کہانی معمولی اور پھسپھسی ہے ۔ اور مزاحیہ فلموں کے لئے کہانی کا زیادہ بامعنی ہونا بھی ضروری نہیں اس میں تسلسل اور جگہ جگہ پر ایسے نتائج پیدا کرنا جو لوگوں کے لبوں پر مسکراہٹ پیدا کرسکیں یا ہال کو قہقہوں سے گونجا دیں۔ کافی ہوتا ہے۔ اور اس میں یہ سب کچھ ہے۔ فلم کے چند گانے دلچسپ ہیں۔ فلم کمپنی کے ڈائرکیٹر کا پارٹ بہت زیادہ اور ایکٹنگ کی وجہ سے خراب ہوگیا ہے باقی کریکٹروں میں جو قدرتی مزاح کی آمیزش پائی جاتی تھی۔ وہ بہت پسندیدہ ہے ۔ ڈائرکیٹر کا پارٹ کرنے والے صاحب آئندہ احتیاط سے کام لیں یا کروڑپتی کے ڈائرکٹر صاحب اس نقص کا خیال رکھیں۔ نواب کا پارٹ بہت ہی قابل تعریف ہے اور اس ڈرامہ کی جان ہے ؛

ترکی حور

میڈن کمپنی کا تازہ ترین ڈرامہ ہے ۔ عذرا میر نے ڈائرکیشن کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کہ در کان نمک رفت نمک شد عذرا میر بھی میڈن میں پہونچ کر یا تو اپنا علم وتجربہ کھو بیٹھے یا انہیں فلم بنانے کا ڈھنگ ہی نہ آتا تھا۔ پنجاب کی وہ فلمیں جو ناکامیاب ہوچکی ہیں اور جن کا ہم مضحکہ اڑایا کرتے تھے۔ وہ بھی ترکی حور سے بہتر ہیں۔ آغا حشر کا نام بھی بدنام کیا گیا ہے۔ ان کے سٹیج والے ڈرامہ کی پیروڈی معلوم ہوتی ہے ۔ ترکوں کا اور اسلام کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ ترک ٹوپیوں پر کیپ چاند تارے لگا کرتے [illegible] شراب خانوں میں بھی دیکھے ابروں پر چاند تارے لگائے گئے تھے جو کہ ایک اسلامی نشان کی توہین تھی [illegible]

ظاہر کیا گیا ہے۔ جو قابلِ اعتراض ہے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ترکی حور شراب کی خوبیوں کو نمایاں کر کے اس کی اصلاح کے لئے ایک موثر حربہ ہے۔ لیکن اس میں ہر جگہ شراب خانوں اور شرابیوں کا غیر فطرتی اجتماع طبیعت پر بُرا اثر پیدا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ حرم کی نمائش یا کسی رنڈیوں کے چکلہ کا دکھانا دونوں میں سے جو بھی تھا معیوب تھا۔ جس قسم کے تھرکنے والے ناچ دکھائے گئے ہیں۔ اور جس قسم کی بے حیائی اور عریانی ان میں پائی جاتی ہے۔ وہ قابلِ افسوس ہے۔ ڈرامہ اسقدر سست اور کشمکش سے خالی ہے کہ اس میں کہیں بھی جان پیدا نہیں ہوتی۔ فوٹو گرافی بے حد ناقص صدابندی خراب۔ الغرض یہ ڈرامہ ہر طرح سے ناکامیاب ہے جہاں آرا کجن نے اور ایک دو ایکٹروں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے مگر ان کی تمام کوششیں رائگاں گئی ہیں۔ بلکہ کجن کے کام کو فوٹو گرافی نے کافی نقصان پہونچایا ہے۔ سارے ڈرامے میں جہاں آرا کے دو گانے مرغوب ہیں۔ اور بس معلوم ہوتا ہے کہ میڈن کی اصلاح کے لئے مذ یا میر نہیں کسی اور ڈائریکٹر کی ضرورت ہے جو ہندوستان کی اس سب سے بڑی فلم کمپنی کو کامیاب بنا سکے +

چلتا پتلا

امپریل فلم کمپنی کا تازہ فلم ہے۔ پتلے کا پارٹ مغربی ڈرامے کا چربہ ہے۔ اور زبردستی اصل کہانی میں ٹھونس کر اُسے وزنی بنایا گیا ہے۔ اس کے باوجود کھیل کامیاب ہے۔ گانے بے حد دلکش ہیں۔ کھیل میں دلچسپی اور کشمکش کافی موجود ہے۔ ہیروین کا پارٹ اور گانے دونوں قابلِ تعریف ہیں۔ سیکنڈ کلاس سینما ہالوں میں خوب مقبول ہوگا۔ دلآری ہر طرح سے ایک کامیاب ایکٹرس بننے کی قابلیت رکھتی ہے +

راج رمنی

لاہور میں راجپوت رمنی دیکھنے کے بعد ہی ہمیں راولپنڈی میں راج رمنی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت ہم نے یہ محسوس کیا کہ گویا عرش سے فرش پر پہونچ گئے ہیں۔ رنجیت والوں کی یہ ذلیل ترین تصویر ہے۔ اتنی زیادہ ناکامی کے بعد شاید رنجیت والے سر جوڑ کر بیٹھیں اور اپنے نقائص دور کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ بعض اوقات درد کا حد سے گذر جانا دوا بن جاتا ہے۔ چاروں شعبے بیکار ہیں۔ افسانہ ذلیل نقالی کا نمونہ ہے۔ کھیل اس قدر بیہودہ تھا کہ ہم نصف کھیل کے بعد وہاں سے اٹھ کر چلے آئے کیونکہ طبیعت کسی طرح بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ اس پر مزید وقت ضائع کیا جائے +

دھرم کی دیوی

[illegible] کی تازہ تصویر ہے۔ ہیرو آنا اختر اور علی میر کمار نے نمایاں پارٹ کیا ہے۔ بلکہ تمام ایکٹروں نے اپنے [illegible] بیاد کمت [illegible] نقائص سے خالی نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ کھیل کامیاب اور دلچسپ [illegible]

باوجود تماشائیوں کو اتنا متاثر نہیں کرسکا جتنا اُس کا حق تھا۔

مسٹر رفیق غزنوی کا پارٹ قابلِ تعریف ہے۔ اگر رفیق صاحب صرف پارٹ کرنے لگیں تو اس سلسلہ میں کافی ترقی کرسکتے ہیں سردار اختر نئے رنگ میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ سروج کی سردار اختر فسانۂ عجائب کی پری تھی تو ایسٹرن آرٹ کی سردار اختر ایک تعلیم یافتہ سلجھی ہوئی ترقی پذیر ایکٹرس ہے۔ مسٹر علی میر کمار اس ڈرامہ میں قدرے بہتر ہیں۔ اگر انہوں نے اسی طرح "موقعہ و محل" کے مطابق اپنی عادت کو بدلنا مناسب سمجھا تو وہ جلدی ہی ترقی کرلیں گے۔

افسانہ میں اصل ڈرامہ سے ہٹ کر جو مناظر دلچسپی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں وہ اتنے طویل ہیں کہ اصل کہانی دبجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارا کھیل دیکھنے کے بعد بھی تشنگی باقی رہتی ہے اور سب کچھ بے نتیجہ سا معلوم ہونے لگتا ہے۔

ایسٹرن آرٹ والوں نے دھرم کی دیوی میں فنی نکتہ نظر سے کافی ترقی کی ہے۔ امید ہے کہ اُن کی فلمیں آہستہ آہستہ برابر ترقی کرتی جائیں گی۔

حورِ سمندر

ہندوستانی فلم انڈسٹری میں حورِ سمندر پہلا ڈرامہ ہے جس میں زیرِ آب مناظر کو پیش کیا گیا ہے۔ خواہ یہ فوٹو گرافی کا کمال ہو یا کچھ بہرحال ہندوستانی فلموں میں یہ بات نئی ہے۔ اور کسی بھونڈی یا بھدی طرز پر پیش نہیں کی گئی۔ بلکہ فلم کا یہ حصہ کسی طرح بھی انگریزی فلموں سے کم نہیں ہے۔ فلم میں ہیرو اور ہیروین دونوں نے اپنا اپنا پارٹ بہت اچھا کیا ہے۔ موسیقی اور ناچ ورنگ بھی موثر ہیں۔ ساز و سامان بھی قابلِ تعریف ہے۔ افسانہ گو اسلامی نہیں ہے۔ مگر چاند اور دعا اور بعض چیزوں کی آمیزش سے اسلامی بن گیا ہے۔ اسلام معجزات سے نہیں پھیلا بلکہ اپنے شاندار قانون کے طفیل رائج ہوا ہے۔ اس لئے مسلمان ان ڈراموں کو جن میں خرقِ عادات اور معجزات ہوں۔ مذہبی نکتہ نگاہ سے پسندیدہ نہیں سمجھتے۔

افسانہ میں ہوائے ہیرو کے جو بیک وقت دو تین عورتوں سے محبت کرتا رہتا ہے۔ اور کوئی خرابی نہیں۔ افسانہ دلچسپ ہے۔ پریاں۔ جنوں۔ بھوتوں۔ جادو۔ اور معجزات سے بھرا ہوا ہے۔ اس لئے عورتوں بچوں اور درجہ دوم کے سنیما ہالوں کی زینت کے لئے خوب ہے۔ شاید بعض شہروں میں بہت ہی مقبول ہو۔ اگر جدید پریہ ڈرامہ پیش ہوجاتا تو اپنی قسمت اسی ہفتہ میں کمپنی کو نکال دیتا۔

تبصرہ

جلوۂ سخن [illegible] ڈاکٹر آحمد حسین مائل مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری [illegible]

[illegible]

ہو چکی ہیں۔ اب انہوں نے دکن کے اساتذہ فن کے کلام کے انتخاب مع سوانح حیات شائع کرنا شروع کئے ہیں۔ بادہ سخن اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مائل نواب مرزا داغ کے ہمعصر اور اردو زبان کے ان مسلم الثبوت اساتذہ میں سے تھے جن کے کمال کا اعتراف اہل کمال نے بھی کیا۔ انہوں نے اپنی عمر میں ہر رنگ سخن میں داد کمال دی۔ اس کلام کا بیشتر حصہ شائع ہو چکا ہے۔ لیکن ابھی بہت کچھ غیر مطبوعہ باقی ہے۔ کلام میں اس عہد کا رنگ غالب ہے۔ خصوصاً داغ کے حریف اور ہمعصر کے لئے تو اس روش سے بچ نکلنا محال تھا لیکن صحیح تغزل میں بھی خوب خوب گلفشانیاں کی ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

سمجھا ہے داستاں ہے شکوہ جو ہے بے التفاتی کا — ہمیں تو نہیں فرصت۔ نہیں ملتے ہمیں برسوں
آج تھم تھم کر مزا آتا ہے ان کی یاد میں — کوئی شے رہ رہ کے چبھتی ہے دل ناشاد میں
ہر بات جو کہتے ہو یہ جھوٹ وہ غلط — تم ہی کہو کہ یوں جو کہو تم تو کیسا کہوں
قسم کھائی تھی کل ہی تم نے مائل — وہیں جاتے ہو پھر تم کو ہوا کیا
دل کے ارماں بڑے بڑے ہیں — افسوس کہ عمر مختصر ہے

متاع سخن

انتخاب کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین زور۔ قیمت بارہ آنے (۱۲؍)

یہ بھی اسی سلسلہ کی دوسری کتاب ہے۔ مائل اگر داغ کے ہمعصر اور حریف تھے۔ تو عزیز ان کے شاگرد اور برسوں کے تربیت یافتہ ہیں۔ زمانہ قیام حیدرآباد میں موصوف استاد کے فیض صحبت سے جلد پلتے رہے اس لئے زبان کے متعلق تو کسی قسم کا شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہی استاد کا سا بانکپن۔ معاملہ اور رندانہ جوش و خروش ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

جان بھی لی خون تمنا کیا — ایک نہیں نے تری کیا کیا کیا
دجان جاتی نہ یوں تڑپتے نہ تم کو ہم سے ملال ہوتا — یہ کاش پہلے ہی ہم سمجھتے یہ کاش پہلے خیال ہوتا
جانتے جانتے وہ جانیں گے — رسم الفت رہ وفا کیا ہے
منہ نہ کھلوائیے جانے دیجے — کچھ کہوں گا تو شکایت ہوگی
کیا بتاؤں اپنے دل کا تم کو حال — کیا کہوں کس نے لیا۔ کیا ہو گیا

ٹیگور کی شاعری

از مخدوم محی الدین بی اے (عثمانیہ) حجم ۱۲۰ صفحات۔ قیمت (۸؍) ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنے سرپرست کے زیر سایہ ادب اردو کی جو خدمات کی ہیں وہ رہتی دنیا تک [illegible] نوجوان نے اس چھوٹی سی کتاب میں ٹیگور کی سوانح حیات کے مختصر تذکرہ کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی زندگی پر بھی [illegible] موضوع سے متعارف کرنے کے لئے کتاب مستقل ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ کوئی اولوالعزم اس پر مفصل روشنی [illegible] ہیں۔ [illegible] مصنف [illegible] [illegible]

اورنیٹل

گورنمنٹ سیکیورٹی

لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ

قائم شدہ سنہ ۱۸۷۴ء ------ اورنیٹل بیمہ کمپنی ------ صدر دفتر بمبئی

سنہ ۱۹۳۴ء کی رپورٹوں کا خلاصہ

جدید پالیسیاں جو جاری کی گئیں	۷۴۲۲۲۷۶۱
سالانہ آمدنی	۳۱۴۰۰۱۹۷۰
کل پالیسیاں جو اس وقت تک جاری ہیں	۵۴۲۰۳۸۵۱۸
کل روپیہ جو کلیموں کا ادا کیا جا چکا ہے	۱۶۲۹۸۸۸۱۴
سرمایہ میں اضافہ ہوا ہے	۱۰۵۳۸۸۸۴۳

یہ اعداد و شمار اورنیٹل کی مضبوطی کی بہت بڑی شہادت ہیں

دیر نہ کیجئے

اپنی زندگی کا بیمہ جلد از جلد کرائیے۔ اس کمپنی میں جو مقبول اور ترقی [illegible]

خط و کتابت کا پتہ - لالہ گوپال داس سونی ایف [illegible]

برانچ سیکرٹری - اورنیٹل [illegible]

یا مندرجہ ذیل [illegible]

[illegible]

سالنامۂ اسلامیہ

The ANNUAL of The ISLAM.

دفتر نیرنگ خیال سے ایک جدید کتاب

دنیائے اسلام کے متعلق تازہ ترین مکمل معلومات

۲۰-ایڈیٹروں کے زیر نگرانی اس کے مضامین تیار کئے جا رہے ہیں۔ ۶۰۰ صفحہ حجم ۳۰۰ تصویریں اس نادر کتاب کی زینت ہونگیں

اسلام کی ابتدائی تاریخ۔ تمدنی معاشرت اور مذہبی خصوصیات۔ اسلام کی ابتدا اور ابتدائی حالات۔ اسلام کی ترقی اور اس کی عالمگیر اشاعت ایک نظر۔ اسلام مراکش اور اندلس سے چین کی دیواروں تک۔ اسلام کے نامور مجاہدوں کے لرزہ انگیز حالات جنہوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر اسلام کا علم سربلند کیا۔ دنیا میں اسلام کی موجودہ حالت اور قوت۔ اسلام کس طرح سے پھیل رہا ہے۔ مسلمانوں میں کون سی ایسی کمزوریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ جن سے وہ پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان کمزوریوں کا علاج کیا ہے؟

موجودہ اسلامی ممالک کے حالات۔ جغرافیائی۔ تمدنی۔ معاشرتی۔ فوجی اور سیاسی حقائق و اعداد۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کی موجودہ حالت۔ ہندوستان اسلام کا سب سے بڑا مرکز ہے کیونکہ یہاں آٹھ کروڑ مسلمان ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی قوت اور کمزوری پر ایک محققانہ نظر۔ ہندوستان کے وہ مسلمان امرا جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل۔ الغرض اس مختصر اشتہار میں تفصیلات درج نہیں ہو سکتیں۔

اس سے زیادہ مفید۔ اس سے زیادہ جامع۔ اس سے زیادہ جمیل کتاب ہندوستان میں شائع نہیں ہوئی ہو گی

کتاب کا ہر مضمون رنگین نقشوں اور تصاویر سے مرصع ہے۔

تقریباً ۶۰۰ صفحہ حجم اور ۳۰۰ فوٹو بلاکس کی تصویریں

مجلد کتاب کی قیمت سات روپے ہو گی۔ لیکن نیرنگ خیال کے خریداروں سے جو پیشگی نام درج

رجسٹر کرا دیں۔ صرف پانچ روپے (صہ)

علاوہ محصول ڈاک لئے جائیں گے [illegible]

منیجر نیرنگ خیال

غزل

اصف قدر سید سرو آصف علی میرزا خان بہادر رئیس الدولہ امیر الامرا مہابت جنگ
ر آوف مرشد آباد کے سی ایس آئی کے سی وی او

ر دہر میں لاچار ہے		رنج کا ہے سامنا آنا یہاں بیکار ہے
بھی پھلے میں صف حسن کے		مفت سودائی بنا چند دن کا یہ بازار ہے
کا ہے زمانے کی کسے		نامیوں کا امتحاں اب بر سر دربار ہے
بادی کا رکھ ہر گز خیال		وہ بنانیوالا ہے عالم کا جو معمار ہے
انقلاب چرخ کا		کس ستم کی گردش قسمت تری رفتار ہے
ممکن نہیں ہے سامنا		خواہش تنگی تمنا طالب دیدار ہے
زباں قاصر ثنا و مدح میں		عین رحمت کو بھلا بخشش سے کب انکار ہے
کافی نہیں ہے عمر خضر		درمیان جستجو میں کس قدر تکرار ہے

قلب کو تسکین کیونکر ہے نہ ہو روز جزا
ہمت آصف محبت ... تری ...

صبحِ بہار

(از جناب سراج الحسن صاحب سراج لکھنوی)

چھٹ گئی شب کی سیاہی آ گئی صبحِ بہار
پتی پتی باغِ عالم کی ہے جنت در کنار
غنچہ سربستہ طلسمِ رنگ و بو کا راز دار
ہر گلِ رنگیں ادا آئینہ دارِ روئے یار
زلفِ سنبل کی پریشانی ملالِ شام ہے
پھول کا ڈالی پہ کھلنا صبح کا ہنگام ہے

موسمِ گل ہے نمو کا جوش ہے نامِ خدا
کاش ان دلچسپیوں کا اب نہ ٹوٹے سلسلا
آمد و رفتِ نفس ہے آج ہر موجِ صبا
روح باقی ہے مزا چلتی ہے جب ٹھنڈی ہوا
دل کے عقدے حل کرے گی ہر کلی کھلنے کے بعد
اب جدائی منہ نہ دکھلائے گلے ملنے کے بعد

حسنِ فطرت بن گیا ہنگامۂ دورِ حیات
اس کے پہلے ایک سادہ سا ورق تھی کائنات
بعد مدت گل ہوئے ہیں آشنائے التفات
کاش نقاشِ ازل بخشے انہیں پائے ثبات
غنچہ کہتا ہے چٹک کر داستانِ زندگی
آج تو ہر پھول ہے روحِ روانِ زندگی

صنعتِ فطرت کا وہ رنگیں صحیفہ آفتاب
یوسفِ مشرق ہے یا حدِ پرِ زلیخا کا شباب
ریزشِ شبنم نہیں خود اُس نے چھڑکا ہے گلاب
بانٹتی پھرتی ہیں کرنیں زندگانی کی شراب
طور کے شعلے کا اک یہ بھی علمبردار ہے
آج تو دنیا کو موسیٰ کی نظر درکار ہے

اُٹھ گئے وہ بیدار ہو کر نیم خوابی حُسن کی
سرخ آنکھیں ہیں کہ چھلکی ہے گلابی حُسن کی
ہر قدم ناز و ادا بے ارادہ بیحجابی حُسن کی
کوئی دیکھے تو برافگندہ نقابی حسن کی
نیم باز آنکھوں کے ساغر ناز سے دیتا ہوا
مست خوابیدہ اٹھا انگڑائیاں لیتا ہوا

منہ لب جو دھو رہے ہیں سو کے اُٹھے ہیں حسین   گورے گورے ہاتھ کھولے ہیں چڑھا کر آستیں
ڈوب جائے عشق کی کشتی نہیں ایسا نہیں   آج تو خود ناخدائے حسن ہے ساحل نشیں

آرزو دیر آتی ہے پامالیٔ ارماں کے بعد
سطح خود خاموش ہو جاتی ہے طوفاں کے بعد

چادریں پانی کی ہیں شفاف سطحِ آب پر   ہر حباب اک حسن کی منزل کہاں ٹھہرے نظر
اب دکھائی دیں گے اک عالم کو سب عیب و ہنر   صبح کا آئینہ ہے عکسِ رخِ آئینہ گر

غسل کر کے نور میں ہر چیز جلوا بن گئی
دھوپ اک پگھلے ہوئے سونے کا دریا بن گئی

مچھلیاں پانی پہ ابھریں چونک اُٹھیں خواب سے   وہ دھواں اُٹھنے لگا ہر موج ہر گرداب سے
یہ گلے ملنا تو دیکھو آگ کا سیماب سے   کھیلنے پہلی کرن آئی ہے سطحِ آب سے

ہے یہ نظارہ بھی دلکش رنگ بھی مقبول ہے
جو کھنو ر پانی پہ پڑتا ہے سنہرا پھول ہے

ساقیا! آ جلد آ پینے پلانے کا ہے وقت   چھڑ گیا سازِ سحر یہ گنگنانے کا ہے وقت
شعریت سی چھا گئی عالم پہ گانے کا ہے وقت   غیب سے پیغام پر پیغام آنے کا ہے وقت

سامنے آ کچھ وفا کے عہد و پیماں کر
صبح کے باریک دامن سے پلا دے چھان کر

بول اُٹھنے کی کسر بھی اب نہیں تصویر میں   زمزمے بلبل کے ہیں ڈوبے ہوئے تاثیر میں
کھل گئیں آنکھیں سحر کی ایک ہی تنویر میں   آج تو جلوے ہی جلوے ہیں مری تقدیر میں

گوہرِ شبنم گلوں کی آستیں پر آ گئے
ٹوٹ کر یا عرش کے تارے زمیں پر آ گئے

پتلیاں رنگین ادا نازک سے نازک جن کے پر   خود سراپا حسن رکھتی ہیں مگر ذوقِ نظر
کرتی پھرتی ہیں تلاشِ چارۂ دردِ جگر   اُڑ گئیں ہیں پھول سے بیٹھیں کبھی ہیں پھول پر

نونہال اُن کو پکڑنے کے [illegible]
[illegible]

بھولنے والے سے

(منظر حسین صاحب شمیم مہتمم انجمن ترقی اُردو۔ اورنگ آباد دکن)

...وہ آہ و زاری کے مزے — آہ وہ پچھلے پہر کی اشک باری کے مزے
جو الفت کا سہانا خواب تھیں — آہ وہ باتیں جو غماز دلِ بیتاب تھیں
...جب مے عشق کی پیتے تھے ہم — آہ وہ راتیں وہی کہ جب جیتے تھے ہم
...بتاب بھی وہ راتیں یاد ہیں؟ — کیا ابھی تک خواب کی وہ بستیاں آباد ہیں؟
...کے باسی آج بھی دل شاد ہیں؟ — کیا کنارے آبجو کے آج بھی آباد ہیں؟
...پیچ و خم وہ زلفِ شام کا؟ — کیا وہی نقشہ ہے اب بھی آسماں کے بام کا؟

کیا کبھی بھولے سے تجھ کو اب بھی یاد آتے ہیں ہم
اپنی تجھ سے کیا کہیں دل کیسے بہلاتے ہیں ہم

...ات عالیہ

(از جناب حضرت اصغر گونڈوی)

...یا کہ جو ہر بن مو جلا نہ دے — یاد وہ تیری کیا کہ جو گردشِ خوں بڑھا نہ دے
...سر نیاز کی محویتیں مٹا نہ دے — موت ہو یا حیات ہو کوئی مجھے صدا نہ دے
...وصل میں موج نفس بھی روک لے — ہوش کو بھی خبر نہ ہو کیف کو بھی ہوا نہ دے
...تو دل کہاں اب سعی مشتعل کہاں؟ — اس کی ادائے جانستاں خاک کو اب ہوا نہ دے
...دہ مری تشنگی نفس کی کمال خستگی

جدید شاعری!

سوزِ عشق

(از جناب ڈاکٹر تصدق حسین صاحب خالدؔ ایم اے۔ پی۔ ایچ ڈی

(۱)

رات اندھیری تیرہ و تار
رہرو سے دہلانے والی
بادل کالے کالے۔ اوجِ فضا میں ٹھہرے ہوئے
دیووں نے جیسے ڈیرے ہوں ڈالے
تاریکی سی تاریکی!
ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھے
ایک ستارہ کانپتے کانپتے اُبھرا چمکا
دُور ـــــ اک ایسی دنیا میں
خود میری چشمِ تخیل بھی جس دنیا سے نامحرم تھی
میں نے اس تارے سے پوچھا
کیا تیرے دل کی تمنا ہے
جو دیس سے اپنے نکلا ہے؟
یہ رات، کہ سورج بھی ڈر کر
دامن میں چھپا کر کرنوں کو
مغرب میں پہاڑوں کے پیچھے
غاروں میں کہیں جا دبکا ہے
تو تنہا، وسعت گردوں ... و فضا ...

کیا آگ ہے تیرے ...
تو جس سے پہیم ظلمت ...
تجھ کو کیا رہ و منزل ...
جو دیس سے ...

(۲)

دل کی دنیا میں کچھ شور ...
آشنا یا نہ اس انداز ...
خفتہ جذبات میں طوفان ...
ڈبڈباتی ہوئی آواز ...
"میں چمکتا ہوں جہاں کی ...
ہستیٔ مردہ کی یخ بستہ ...
جس طرح ذرات کی ...
ہو کے سرشار ...
مری تابندہ ...
اک نئی روح ...
عشق کے ...

مجلسِ ادبی اعزازات

نیرنگ خیال کے ۱۹۳۷ء کے اعزازات

علّامہ

آنریبل سر سید سلیمان شاہ صاحب الہ آباد۔
خلیفہ عبدالحکیم صاحب ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔

ادیب اعظم

لطیف الدین احمد۔ اکبر آبادی۔

ادیب العصر

حکیم احمد شجاع صاحب۔ بی۔ اے۔
سید امتیاز علی صاحب تاج۔
بشیر احمد صاحب بی اے۔ آکسن۔

ادیب الملک

اختر حسین صاحب رائے پوری۔
حاجی صادق ایوبی جرنلسٹ
صفوۃ اللہ بیگ صوفی دہلوی
ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی
مالک رام صاحب۔ ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

ملک الشعرا

ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری

لسان العصر

...شاد عارفی ایم اے

امان القوم

حضرت محمود اسرائیلی
مظفر حسین صاحب شمیم

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر سید احمد صاحب بریلوی
حکیم محمد حسن صاحب قرشی۔ ایڈیٹر مشیر الاطبا۔ لاہور
جناب چراغ حسن صاحب حسرت۔ مدیر شیرازہ

بہزاد ہند

ڈاکٹر سر رابندر ناتھ ٹیگور۔ شانتی نکیتن

رئیس الحکما

حکیم محمد احمد خاں صاحب رئیس دہلی
حکیم مقصود علی خاں صاحب۔ نسیم الاطبا۔ حیدرآباد دکن۔

ادیبہ جلیلہ

شمسی عبدالرحمن صاحب (علی گڑھ)
بیگم محمود المظفر خاں۔ رشیدہ جہاں صاحبہ

مصورِ قلم

غازی محمد اشفاق صاحب جرنلسٹ
راجہ غلام احمد صاحب ایڈیٹر صدائے نسواں دہلی
ڈاکٹر پورن سنگھ صاحب ہنر۔ مدیر چمن
مرزا احمد صاحب غلش صدیقی۔ بی اے۔

ہندوستانی مُصوّری

(از جناب ڈاکٹر علامہ تاثیر۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ پرنسپل ایم اے۔ او۔ کالج امرتسر)

{یہ تقریر ریڈیو کے ذریعہ سے ۲ر جنوری ۱۹۳۶ء کو نشر کی گئی تھی}

یورپ کے بڑے بڑے ملکوں میں تین چار سو سال نہیں تو ہزار سال سے مصوری جاری ہوگی۔ یونان وغیرہ میں دو ہزار سال پہلے یہ کام ہوتا تھا۔ مگر ہندوستان میں آریوں کے آنے سے بھی پہلے تصویریں بنائی جاتی تھیں اور اب تک بنائی جا رہی ہیں۔ باہر سے دشمن آئے۔ اندر فساد ہوئے۔ اوپر آسمان سے طوفان اُترے۔ نیچے زمین سے زلزلے پھوٹے۔ مگر ہماری مصوری کی روایات اب تک چلی جا رہی ہیں۔ یہ نہیں کہ مصوری پر ان حادثوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ مصور آخر اسی دنیا کا رہنے والا ہے۔ اپنے ارد گرد کے حالات میں بنتا بگڑتا ہے۔ یہیں کے لوگوں سے یہیں کی باتیں رنگوں خطوں میں سناتا ہے۔ عام لوگوں سے شاید زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اس لئے بھی حالات سے زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے۔ اور ہندوستان کی مختلف دنیاؤں کی مصوری اس اثر پذیری کی صاف گواہی دیتی ہے۔ مگر ہندوستانی مصوری کچھ ایسا سخت جان واقع ہوا ہے کہ وہ ان آفتوں کے باوجود سسک سسک کر رینگ رینگ کر زندہ رہا۔ بقول اقبال سے آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا۔ ہمارے ملک میں مصوری کے اولین نشانات ہڑپا اور موہنجوداڑو کی کھدائیوں میں ملتے ہیں۔ آثار قدیمہ کے ماہروں نے ثابت کر دیا ہے کہ یہاں مصوری آریوں کے آنے سے پہلے بھی موجود تھی۔ سرجان مارشل کے مطابق موہنجوداڑو کی تین بستیاں۔ تین ہزار تین سو سال تین ہزار سال اور دو ہزار سات سال قبل مسیح کی ہیں۔ ان میں دیواروں کی سطح پر اور اندر کھود کھود کر تصویریں بنائی گئی تھیں۔ لیکن یہ تصویریں محض تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ البتہ جنوبی ہندوستان میں جو ان سے بھی پہلے کی تصویریں نربدا کی وادیوں میں کھدائی سے دریافت ہو رہی ہیں۔ وہ واقعی تصویریں ہیں حسین و جمیل زندگی سے بھرپور۔ لیکن یہ پرانی روایتیں کچھ آگے نہ چل سکیں۔ ان دنوں لوگ گروہ گروہ قبیلہ قبیلہ رہتے تھے۔ اور ان کے فنون بھی محدود رہ گئے۔

البتہ بدھ مت کی ترویج سے مصوری کا فن چار طرف پھیل گیا اور ہندوستانی مصوری کی تاریخ بھی اسی عہد سے شروع ہوتی ہے۔

بدھ مت کی تعلیم آپ جانتے ہی ہیں۔ کیا ہے۔ آپ بدھ کی اپنی کہانی بھی جانتے ہیں کس طرح انہوں نے شاہی اور عیش و آرام کو تیاگ دیا اور ساری زندگی بہت لفاظی کیوں کریں۔ سرناتھ میں سنگ سرخ کی بدھ مورتی دیکھئے اصل نہیں تو فوٹو ہی سہی۔ کائنات دانشمندی کی مورت۔ یہ دھرم چکر کا مجسمہ ہے۔ دھیان مدرا کی مورت میں اس سے بھی زیادہ طمانیت کا اظہار ہوتا ہے۔ جو کڑی ہاتھ آغوش میں ہتھیلیاں اوپر کو الٹی۔ ہندوستانی آرٹ میں بیٹھک (آسن) اور انگلیوں کے انداز (مدرا) معنی رکھتے ہیں۔ ابھایا مدرا میں بے خوفی اور اعتماد کے اظہار کیلئے ہاتھ زانو کی سطح پر کھلے ہتھیلیاں اوپر اور انگلیاں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ دھرم چکر جو تبلیغ کا انداز ہے اس میں انگلیاں انگوٹھے سے قوس بنا کر مل جاتی ہیں۔ مگر یہ سب دھرم اور روحانیت کے مجسمے ہیں۔ آہستہ آہستہ دنیا نے بھی دخل دینا شروع کر دیا۔ اور اجنتا کے غاروں کی تصویروں میں دھرم اور روحانیت کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی ضروریات کا بھی عکس نظر آتا ہے۔ روحانیت سے دبے ہوئے جذبات پھوٹ پھوٹ کر نکلتے نظر آتے ہیں۔ سینے کا ابھار مبالغہ آمیز ہو جاتا ہے۔ کمر کی باریکی سے سرین کی گولائی نمایاں تر کر دی جاتی ہے۔ مصور جسم کے ہر حصہ کی ٹھہر ٹھہر کر مزے لے لے کر نگارش کرتا ہے۔

بدھ آرٹ اپنے پورے جوبن پر تیسری صدی قبل از مسیح سے ساتویں صدی بعد از مسیح رہا۔ گپتا عہد میں اسے پورا کمال حاصل تھا۔ چوتھی صدی میں برہمن مت کا زور شروع ہو گیا۔ اور ذہنوں اور دلوں کی تبدیلی سے فنون جمیلہ میں بھی تبدیلی ظاہر ہونے لگی اس عہد کا بہترین نمونہ برنجی کا نٹ راج ہے۔ شوجی کا البیلا ناچ۔ زندگی کا ناچ۔ پانچ قوتوں۔ پنچ کرتی کا اظہار۔ پیدائش تربیت۔ تباہی تجسیم اور نجات یہ ہیں۔ پانچ راہ عمل۔ ٹیگور نے ایک گیت میں اس کا اظہار خوب کیا ہے۔ کہتا ہے۔

ناچ اے خوشی کے متوالے دل۔ ناچ۔ محبت کے گیت دن کے پھیلاؤ میں رات کی یکانت میں گونج رہے ہیں اور دنیا خاموش ہمہ تن گوش ان راگوں کو سن رہی ہے۔ خوشی سے مست زندگی اور موت دونوں اس گیت سے ہم آہنگ ہو کر ناچ رہی ہیں۔ پہاڑ اور سمندر۔ دھرتی اور آکاش۔ سب اسی لے میں ناچ رہے ہیں اور آہوں اور قہقہوں کے جھرمٹوں میں دھرتی کے سارے باسی ناچے جا رہے ہیں۔



شوجی کا ناچ زندگی کو لبیک کہنا ہے
خوشی سے غم و غصہ سے موت سے۔

[illegible] سے بالا ہے۔ یا بدھ مت تو شاید ملک ہی کا اشرافی کار ہا ہے۔ سو بات ہے تو اس زندگی سے بلند و فوق الانسان کہ موت اور تباہی سے ایک عجیب خوشی پیدا ہوتی ہے۔ مادہ کے خوفناک ہونے کی خوشی۔ مر مر کر زندہ ہونے کی خوشی۔ نٹ راج کا چکر زندگی کا چکر ہے۔ ابدیت کا چکر۔ تناسخ کا چکر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم بدھ مت سے بالکل الگ ہے اور یہ فرق محض ہی میں نہیں بلکہ مصوری میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً اجنتا اور باغ کی تصویروں میں اجنتا غاروں کی برہنہ دیواری تصویروں سے نزاکت اور طمانیت برستی ہے۔ یہ بدھ عہد کی تصویریں ہیں۔ رنگ محل کی برہنہ تصویریں طاقت اور سرمستی سے سرشار ہیں۔ دونوں مختلف دنیاؤں کی باسی معلوم ہوتی ہیں۔ ایک بدھ مت ایک برہمن مت۔ آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ یہ آرٹ تمام تر مذہبی تھا۔ رائج الوقت عقیدوں اور توہمات کی تصویر کشی گو مذہبیت کے باوجود اس میں زندگی جو فن زن تھی۔ کیونکہ اس کی بنیاد اپنے وقت کے زندہ عقائد پر تھی۔ عقائد جن پر لوگوں کی زندگی اور موت کا انحصار تھا جن پر ان کا دل و جان سے یقین تھا۔ جنہیں وہ سچا صحیح سچ مچ مانتے تھے۔ روزمرہ کی اقتصادی ضروریات تک ان عقائد سے وابستہ تھیں۔ فصل۔ اولاد۔ دولت۔ دھن سب دیوتاؤں کی دین سمجھی جاتی تھیں مگر آج انہی روایات کو تصویروں کا موضوع بنانا زندگی کا منہ چڑانا ہے۔ آج ہمارے مسائل اور ہیں۔ ہماری ضروریات اور ہیں۔ ہمارے خیالات اور ہیں۔ جو مصور آج اجنتا باغ اور مغل روایات کو زندہ کرنا چاہتے ہیں وہ زندگی سے گھبرا کر زندگی سے دور بھاگ رہے ہیں۔

مغل آرٹ کی روایات بدھ اور برہمن مت کے آرٹ سے مختلف تھیں۔ مغل آرٹ زیادہ تر دربار کا آرٹ تھا اور اس میں ہر طرح کامل تھا۔ شاہجہاں کے عہد تک کسی دیوی دیوتا یا نبی اوتار کی تصویر نہیں ملتی۔ عام طور پر شاہوں شاہزادوں کی تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ یا امرا کی۔ کبھی کبھار کوئی سادھو فقیر بھی ہو گیا تو خیر۔ وہ بھی ہوتا ایسے موقعے پر جب کبھی کوئی امیر کبیر زیارت کے لئے آ نکلا ہو۔ اس عہد کی بہترین تصویروں میں شاہزادہ دارا شکوہ کی تصویر ہے۔ جس میں وہ کسی حرم کی حسینہ کی تصویر دیکھتا دکھایا گیا ہے۔ دنیوی دربار دنیوی معشوق یا دربار کی سرپرستی کا اس سے بہتر نتیجہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ مغل مصوری نے ہندوستانی مصوری کو دنیا میں واپس لا کر ایک نئی زندگی بخشی۔ ہندوستانی آرٹ محض دھارمک اور رسمی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ بارھویں صدی میں اس کے جسم و جان الگ ہو چکے تھے۔ مذہب کی آسمانی فضا دھرتی کے باسیوں کیلئے دیر تک سانس لینے کے قابل نہیں ہوتی۔ ہندوستانی آرٹ کو ان حرائی بلندیوں سے [illegible] انسانیت کی ارضی بنیادوں پر کھڑا کرنا مغل مصوروں کا کام تھا۔ مغل آرٹ کی سب سے بڑی خصوصیت اور ہندوستان کی مصوری پر احسان حقیقت نگاری ہے۔ [illegible] انسانیت ہو نہ ہو اور [illegible] ہے۔ مغلوں نے عظیم الشان نگارخانہ [illegible] [illegible] تصویریں زندہ شبیہیں آباد ہیں۔ جہاں بادشاہ [illegible] حال میں لوگوں کو اسرفی بدوش چلتی

شکارگاہیں۔ میدان کارزار۔ اور جوں جوں مصوری دنیا کی طرف رخ کرنے لگی نئی نئی راہیں کھلنے لگیں۔ پس منظر پیش منظر بن گیا۔ اور مناظر قدرت کی تصویریں کھینچنے لگیں۔ حیوانات کی تصویریں بھی۔ اور اس شعبے میں مغل تصویریں دنیا کی مصوری کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ دارا شکوہ کی بیاض میں استاد منصور کے ہرن اور مور اور بنگلے کمال فن کی انتہا ہیں۔ یہ مغل آرٹ کچھ ایسا بدیسی اور اجنبی بھی نہیں تھا بنیاد ایرانیوں نے رکھی۔ یقیناً۔ مگر جلد ہی ہندوستان کی آب و ہوا نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا اور ہمارے دیس کے مصوروں نے اسے اپنا بنا لیا۔ راجپوت سکول اسی شتر گربہ کا نام ہے۔ مغلوں کا آرٹ زندگی کی لذتوں کا احساس کی زندگی کا، دل و دماغ کی بیداری کا آرٹ ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب مشرق و مغرب ایک ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ریمبرانٹ مغرب اقصیٰ میں ایرانی تصویروں کی نقلیں اتار رہا تھا اور جہانگیر کے مصور ہندوستان میں مغربی تصویروں کے نمونے بنا رہے تھے۔ بہرحال مصوری کی روایات آٹھویں صدی تک مشکل قائم رہیں۔ گو کچھ کچھ اثرات راجپوت اور کانگڑہ اسلوب میں بچے کھچے رہے۔ مغلوں نے ہندوستان میں کاغذ رائج کر کے مصوری کو عام کر دیا اور ایک نئی روانی پیدا کر دی۔ اٹھارھویں صدی میں مغلوں کے زوال کے ساتھ مصوری کی روایات بھی زوال میں آ گئیں۔ اور ان کے وارث بھی وہی راجپوت کانگڑہ سکول کے گمنام عوام مصور ہی رہ گئے۔ نہ دربار رہے۔ نہ درباری مصوری نہ مصور نہ قدردان خریدار۔ اب کے حکومت کا تختہ بدلا نہیں الٹ گیا۔ تبدیلی نہیں انقلاب آ گیا اور ان پچھلے سو سالوں میں انقلاب قیامت کی صورت پکڑ چکا ہے۔ جے رام سے پرتھوی راج پرتھوی راج سے شہاب الدین۔ شہاب الدین سے بابر۔ یہ یقیناً مختلف دربار مختلف بادشاہ۔ مختلف خاندان اور مذاہب کا راج ہے مگر اقتصادی بنیاد تقریباً یکساں ہی رہتی ہے۔ وہی ازمنۂ متوسط کی دستی زراعت اور جاگیرداریاں۔ مرکز میں دہلی میں انقلاب آتا رہا۔ مگر باہر عام لوگ ایک ہی طرح سے زندگی بسر کرتے رہے۔ وہی رسم و رواج۔ وہی لباس وہی بولی ٹھولی۔ بہت زور پڑا تو آمیزش ہو گئی۔ سنسکرت اور عربی فارسی مل ملا کر اردو ہندوستانی بن گئیں۔ اساسی طرز زندگی یکساں تھا۔ انگریزی حکومت کا سا انقلاب تھا۔ میں یہاں سیاسی پہلو کو نظر انداز کر رہا ہوں۔ میرا مدعا انقلاب زندہ باد نہیں میں محض سماجی اور آرٹ کے نقطۂ نظر سے گفتگو کر رہا ہوں۔ انگریز مشین کی تہذیب کا علمبردار تھا اور ہندوستان بیل گاڑی کا ملک تھا۔ ان کا باہم ہونا انقلاب اور قیامت کی حیثیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہماری موجودہ مصوری معجون مرکب بن رہی ہے۔ ذہنیت کا غلط تصور صحیح مقداری احساس ہندوستانی مصوروں کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ ماضی کو بت جگت بنا کر پیش کریں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ہم کچھ نہ سہی۔ ہمارے باپ دادا کے باپ دادا کے باپ دادا [illegible] تھے یہ ماضی پرستی سماجی طور پر بھی مصیبت کا باعث بن رہی ہے۔ یقیناً ماضی کی روایات ہماری وراثت ہیں۔ اگر اجنتا اپنے وقت کے روحانی جوش کا نتیجہ تھا تو مغل مصور شاندار درباری زندگی کے آئینہ دار تھے مگر ہمارے عہد کے مسائل اور ہیں۔ ذہنیت مختلف ہے۔ ماضی کو استعمال کیا جا سکتا۔ نقل ہمارا بے معنی ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے آجکل کے مصور حال سے گھبرا کر ماضی میں پناہ لینا چاہتے ہیں

جاپان کا خموش ڈراما

نو

(ادیبِ سحر نگار حضرت ل۔ احمد اکبرآبادی کے قلم سے)

جاپانی شاعری اور مخصوص اس کی ہکو صنف کا تذکرہ مکمل نہ ہوگا۔ اگر جاپانی ڈرامہ کی صنف نو کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ نو کو ڈراما میں وہی خصوصیت حاصل ہے جو ہکو صنف کو جاپان کی شاعری میں حاصل ہے۔ یا بالفاظ دیگر نو جاپان کے ڈراما کی ہکو صنف ہے۔ اور اس کے تخیئل میں اتنا ہی علو ہے وہ اسی قدر رمزی (SYMBOLIC) ہے جتنی کہ ہکو صنفِ شعر ہے۔

فن ڈرامہ کے ساتھ سب سے پہلی چیز جو بالعموم ضروری سمجھی جاتی ہے وہ ڈراما میں وقر (DIGNITY) کا وجود ہے۔ وقر ڈراما کا لازمی عنصر ہے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ڈرامائی وقر اور قنوطیت مخلوط ہو جاتے ہیں غلطی سے قنوطیت ہی کو وقر باور کر لیا جاتا ہے ــــ حالانکہ ڈرامہ میں قنوطیت کا درجہ ایک نوع کا بہترین اعتذار ہے! جاپان کا نو ڈراما دنیا بھر کے ڈراموں سے جدا اور ایک مخصوص چیز ہے۔ اور اس کا صحیح اندازہ وتصور اس ڈراما کے تماشائیوں کے وجود بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ نو ڈراما نے اپنے تماشائی یا ناظرین صدیوں کے صبر و تحمل سے پیدا کئے ہیں۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو نو اپنے ناظرین کا بھی محتاج نہیں بلکہ موجودہ صورت میں ناظرین ہی اس کے موجد اور تکمیل کرنے والے ہیں۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ نو کے تماشائیوں کی تعداد تین سو سے زیادہ نہیں۔ یعنی ایک تماشے میں اس تعداد سے نہیں بڑھتے انکو تماشائی کہنا شاید ایک غلطی ہو۔ کیونکہ وہ تماشائی سے زیادہ خود تو ایکٹر ہوتے ہیں۔ یہ تماشائی جو اپنے جبلی سکوت سے دادِ تماشہ دیتے ہیں۔ بجائے خود ایک حسین منظر پیش کرتے ہیں ــــ ایک ایسا حسین نظارہ جیسے کسی چشمے کو پورے بہاؤ پر نورِ آفتاب کی برکتیں نازل ہو رہی ہوں! یہ شاید مبالغہ خیال کیا جائے لیکن ایک حقیقت ہے کہ اسٹیج پر اصلی ایکٹر جنکی تعداد کبھی تین سے نہیں بڑھتی شعر کو متحرک بنانے کے لئے کافی ہیں ان ایکٹروں کو اپنے التہاب اور جذبے کا راز اسوقت معلوم ہو جاتا ہے جب تماشائی اپنے آپ کو بھول جائیں!

تھیٹر یعنی مقرِ نو ایک مقدس مقام کی طرح نغمہ و شعر کے نام پر وقف ہوتا ہے جہاں ایکٹر اور تماشائی سخت دھندلا ماحول اور جاپانی صناعت کا نہایت خیال آفریں رنگ پیدا کرکے۔ دعاؤں کی روح کو پالیتے ہیں۔ یہ رنگ و ماحول وہ جھٹ پٹا ہے جو زمان و مکان کی دسترس سے باہر ہے! نو تھیٹر در اصل ایک مقدس عبادت گاہ ہے جس کے اندر دنیا کے تفکرات اور حیاتِ حاضر کی وحشت داخل نہیں ہو سکتی۔ نو کے اسٹیج پر سنگت کے آٹھ نفوس دو صفوں میں اس طرح نمودار ہوتے ہیں۔ کہ تماشائی ان کے چہروں کا صرف ایک رخ دیکھ سکتے ہیں۔ اور باجنتری اسٹیج کی چوبی پشت کی دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں سازوں میں صرف ایک بانسری اور دو طبلے ہوتے ہیں۔ اور پھر تماشا اس طرح شروع ہوتا ہے کہ بانسری کے اندر سے قرنوں پرانی دعا نکل کر تھرتھراہٹ پھیلا دیتی ہے ــــ گویا یہ عرض نغمہ محض آواز ہے جو جاپان کے جدید تمدن کو بد دعا دے رہی ہے!

یہ تماشا گاہ فی الحقیقت "حیاتِ جدید" کے صحرا میں ایک نخلستان ہے۔ تماشا بالعموم نو بجے صبح شروع ہو جاتا ہے۔ تماشا گاہ میں داخل ہو کر محسوس ہونے لگتا ہے کہ صناعتی جاپان بالکل مردہ نہیں ہو گیا ہے۔ وہاں انبساط و الم موسیقیانہ توازن کے ساتھ شیر و شکر ہوتے نظر آتے ہیں اور انسانی حیات لافانیت میں ملتے معلوم ہوتے ہیں! وہاں ماضی کا یہ ہولناک بھوت نظر آتا ہے یا ابدیت کا حال اس طرح محو ہو جاتا ہے جیسے سورج کی روشنی میں چوہے غائب ہو جاتے ہیں!

ملاحظہ نو ڈراما اور جائے تو تماشائی "چلتی ہی بات ہے"

لیکن نو ڈراما کی صحیح قدر کرنے والا پہلے ہی سے قدر دان نہیں بن سکتا اسے اس کام کے لئے دو تین سال صرف کرنے پڑتے ہیں تب کہیں وہ نو کی بھی قدر کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اور اس امتحان میں پاس ہونے کیلئے یہ احساس پہلی چیز ہے کہ نو کی صحیح قدر و قیمت سمجھنے میں کسقدر آدمی ناکام رہے ہیں؟ اور لوگ اس کی قدر دخوبی پہچان لینے کے بعد ایکٹ کرنے سے بھی زیادہ دشوار چیز حاصل کر لیتے اور انکی زندگی زیادہ "ذی حیات" ہو جاتی ہے۔ نو ڈراما کی یکسانی اس کا اصلی حسن ہے جو تنوع اور رنگینی کو قربان کرکے پیدا کی جاتی ہے۔ اور اس کی قدر کرنے میں اس یکسانی کی پسندیدگی پہلا قدم ہے ●

مسٹر نوگوچی جب پہلی مرتبہ ایک دوست کے ساتھ نو ڈراما دیکھنے گیا تو اس وقت تک اس کے ذہن و دماغ کو وہی معمولی ڈراما کے دیکھنے کی عادت تھی جسکو مغربی وضع زندگی نے سخت و درشت بنا دیا ہے۔ اس ڈراما کو دیکھنے کے بعد اس کے تاثرات خود اسی کے لفظوں میں سنئے:۔

جب میں پہلی مرتبہ ہوشو کے نو تھیٹر میں داخل ہوا تو اکتوبر کا مہینہ تھا جب پھول اور پتیاں جھڑتی ہوتی ہیں۔ جب چڑیاں اور محبت کے جذبات غائب ہوتے ہیں۔ جب موسم کا دھندلا قلب نو تماشے کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے۔ لیکن میں نے نشستوں پر اکثر نہایت معزز و عمائد کے نام چٹھیاں لگی دیکھیں تو میں اپنے دوست کی طرف دیکھ کر مسکرایا جو نو کا بڑا قدرشناس و مداح تھا۔ کیونکہ ایسے مجمع کے اندر ہونا جہاں ایسے عالی مرتبہ لوگ موجود ہوں درحقیقت مذاق سا تھا اور مجھے گونہ بے آرامی سی محسوس ہونے لگی میرا ذوق عامیانہ اور اشتہاری ڈراما کا بگاڑا ہوا تھا۔ اور میری اس نوع کی طبیعت کے لئے یہ بات کم تعجب خیز نہ تھی کہ تماشائیوں میں نہ صرف عورت و مرد بلکہ نوجوان عورتیں بھی ایسے لباسوں میں تھیں جن کے رنگ نہایت خوش اور جو نو ڈراما کے ساکت ماحول سے مطابقت رکھتے تھے۔ مجمع کا سکوت اس قسم کا تھا جو صناعی قلب سے نکلتا محسوس ہوتا تھا۔ یہ سکوت اور ان تماشائیوں کو دیکھ کر مجھے "سکیا" یعنی چائے خانے کا خموش منظر اور ساکت "شعرائے چائے نوش" یاد آگئے۔ تھیٹر کے تین سو تماشائیوں اور چائے خانے کے خموش شاعروں میں کوئی فرق نہ تھا کیونکہ "عدم مکان" کا نظریہ روشن [illegible] سکتے تھے

تو دیکھا مگر زبانیں سب کی گونگی تھیں۔ اور وغم مرکا بس ایک حسین اشارہ گفتگو کرتا دکھائی دیتا تھا! ان کی یہ آمد و رفت اس قدر خموش تھی کہ اسے تار عنکبوت کے گذر جانے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ میرے دل میں معاً "روجی" یا روش باغ کا خیال تازہ ہو گیا جہاں چائے پر دعو جہان "چائے خانے میں جانے کے لئے انتظار کرتے ہیں اور جس کے اندر پہنچکر یہ "چائے نوش" (دلی ماسٹر) شعرا دنیائے واقعی کی خاک اپنے قدموں سے جھاڑ دیتے اور اسے فراموش کرکے "چائے نوشی" کی جمالیاتی لذت کے لئے تیار ہو جاتے ہیں! مجھے تسلیم ہے کہ یہ تقابل مبالغے سے خالی معلوم نہ ہوگا۔ لیکن مجھے جو بات کہنی ہے وہ یہ ہے کہ نو تھیٹر کی یہ خموش آمد و رفت اس سے زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ جتنی کہ عام تھیٹروں میں "چوتنی والے درجے" کی گذرگاہ! اس لئے اگر آپ کو "روجی" سے متعلق نہیں کر سکتے تو میں ایک "چائے نوش" (دلی ماسٹر) شاعر کی طرح مشورہ دوں گا کہ آپ ایک "روجی" پر جب کسی کائی چڑھی ہوئی پتھر کی لالٹین تک پہنچنے کے لئے دھندلکے میں سے گزریں تو ایک لمحے کیلئے برگ زار ما۔ یا کسی سمندری شاخ۔ یا سر شام چاند کے آہستہ غروب ہونے کا دھیان اسوقت بھی کیجئے جب آپ اپنی نشست پر جا بیٹھیں اور اس دنیائے صناعت میں داخل ہونے کو ہوں۔ جسکو آپ ہی کے خنک اور اندھیروں نے پیدا کیا ہے۔ اور آپ اپنے گھٹنوں پر رکھے ہوئے ڈراما کی کتاب کھولیں اور آپ کے سامنے سنگت (کورس) والے اسٹیج پر اپنی جگہ لے رہے ہوں!

نو اسٹیج سے چھوٹا دنیا بھر میں کوئی اسٹیج نہیں ہے۔ اس کے بڑے سے بڑے اسٹیج کا ناپ ۵۰ فٹ مربع سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اور ہر طرف سے کھلا ہوتا ہے۔ البتہ پشت پر ایک چوبی دیوار ہوتی ہے جسپر صنوبر کا ایک پرانا درخت منقوش ہوتا ہے۔ اتنا پرانا جتنی کہ دنیا پرانی ہے۔ اتنا دھندلا جتنی شاعری دھندلی ہوتی ہے۔ اور اس طرح جھومتا معلوم ہوتا ہے جیسے کُہرے میں کوئی ابدیت کی علامت! اسٹیج کی سطح سے ملی ہوئی اس کے داہنی طرف ایک قدرے طویل گیلری ہوتی ہے۔ جسپر نو ایکٹر چلتے پھرتے نظر آتے اور تماشے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اور جو ایک گذرگاہ معلوم ہوتی ہے — ایک آغاز و انجام یا بالفاظ دیگر حیات و مسرت کی گذرگاہ! آپ کو وہاں اگر کوئی چھت دکھائی دے گی تو وہ ایسی ہوگی کہ آپ خود ہستی باد جود کے وقار سے متاثر ہو جائیں گے۔ اور یہ بات مغربی وضع کے اسٹیج میں کبھی محسوس

نہیں ہوتی۔ نو اسٹیج ایک ایسی سادہ چیز ہے کہ آپ اپنے جاپانی گھر میں پردوں کے ہٹانے لگانے سے بھی تیار کر سکتے ہیں۔ رہ گئی اس کی آرائش تو وہ کچھ دشوار نہیں۔ کیونکہ اس کی آرائش تمام تر تخئیلی ہوتی ہے۔ اور اگر کچھ واقعی آرائش ہوتی بھی ہے تو از حد سادہ! اس کی آرائش کیلئے صرف نازک اور شاعرانہ تخئیل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ نو ڈراما کیلئے بس یہی ایک عنصر ضروری ہے جو سبزی اور فرنیچر کی کمی کو پورا کر دیتا ہے۔ نو اسٹیج کی طیاری میں ایسے موقعے بھی آجائیں گے۔ کہ آپ کو اپنی بلند و نازک تخئیل پر بھی اعتبار نہ رہ جائے گا۔ جب آپ اور اشیائی تشبیہی وادی اور اس کے شاہ دانے کے درختوں کی شاخوں اور ایک اونچے گھنڈ گھر کا تصور قائم کریں گے جس کے چوبی ڈھانچے میں کاغذ کی گھنٹیاں لگی ہونگی اور جو ہلتا ہوگا تو آپ مشکل محسوس کریں گے۔ اور اس سے زیادہ مشکل اسوقت محسوس ہوگی آپ کسی جہاز۔ ایک سمندر، اور پتواروں کا تخئیل کریں گے۔ جو سب کے سب بانس کے بنے ہوں گے!

یہی مسٹر نوگوچی آگے چل کر کہتا ہے کہ:۔

مجھے یقین نہیں کہ میری طرح آپ بھی متاثر ہوسکیں گے اور رنگے ہوئے چوبی ماسک (مصنوعی چہرہ) والے ایکٹروں کے ساتھ کبھی مسکرا دینگے اور کبھی آنسو بہانے لگیں گے! بہرحال آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ نو در حقیقت ماسک ڈراما ہے۔ اگرچہ لفظ ماسک جاپانی مفہوم کا سچا حامل نہیں ہوسکتا نو ڈراما کے ماسک حیرت انگیز طریق پر انسانی محسوسات کے نازک ترین اثرات کو ظاہر کر سکتا ہے۔ لیکن اس کا اظہار حیات ہماری تخئیل کا اثر ہوتا ہے جو چوبی ماسک کے اندر مجھے اور آپ سے زیادہ "ذی حیات" روح پیدا کر دیتی ہے۔ ماسک کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ اس کا تاثر قائم رہے اور ایکٹر بعد کمال اپنے آپ کو "واقعیت" (REALISM) سے محفوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور انکی یہ کوشش شعرا و بدوملکے اثر سے کامیاب ہوتی ہے۔

نو ڈراما انسانی ذہن کے جن رازوں کا انکشاف کرتا ہے وہ صرف اس احساس سے بیان ہو سکتے ہیں کہ آنسو اور مسکراہٹ جو خون کے رشتے سے بھائی بہن ہیں۔ اسی پرانے انسان میں سے نمودار ہوتے ہیں۔ تو یہ حقیقت بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں کے اثرات میں ایک نہایت نازک اور ہلکے رنگ کا فرق ہے۔

جن لوگوں کے حواس میں درشتی و ناتراشیدگی قوی ہے وہ اس مقر تخئیل تو تھیٹر میں داخل ہونے کے مجاز نہیں۔ یہاں تو صرف وہی لوگ باریاب ہوسکتے ہیں جو "غیر مکمل" کے خموش پرستار ہیں اور اپنے تخئیل کی مقدس مراسم پرستاری ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ گو آپ اسے تسلیم نہ کرنے کا ارادہ کر چکے ہوں۔ لیکن اس کے باوجود جو شخص آپ نو ڈراما کی حقیقت منوالے گی۔ وہ اس کا جادوگر ہوتا ہے۔ تو یہ ایک ضخیم غلط بیانی ہوگی۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ نو ڈراما کا نسائی کردار جس کی آواز اور حرکات و سکنات مرد کے کردار سے کچھ مختلف نہیں ہیں۔ اگر معمولی اسٹیج پر آپ کے سامنے آجائے تو آپ کو اس منظر سے تنفر واکراہ پیدا ہوگا۔ لیکن نو ڈراما کے اسٹیج پر خود آپ کے تخئیل شعری اسی سطحی واقعیت کو دیکھنے سے انکار کر دے گی ۔۔۔ اس کی قدر کر سکنے کے لئے ہر قسم کی تنقید سے درگزر رے گی! اس لئے کہ نو ڈراما کا اظہار (EXPRESSION) اس درجہ نازک اور اس حد تک خفیف ہوتا ہے! اور اس سادگی کی اس کی "عظیم الشان" نزاکت کو انسانی قوت و توانائی یا بالفاظ دیگر اس کی ناتراشیدگی کی عظیم الشان قیمت دے کر حاصل کیا جا سکتا ہے!

یہ نو ڈراما بجائے خود ایک نہایت مختصر چیز ہے۔ اور اس کے آغاز سے آج تک درمیان میں پردہ ڈالنے اور اٹھانے کی زحمت شامل نہیں کی گئی ہے۔ نو تھیٹر میں ناظرین خود اپنے تخئیل میں پردہ گراتا اٹھاتا رہتا ہے۔ کیونکہ نو کا مقصد حاصل کرنے کے لئے اسے اپنی جگہ ایسا کرتے رہنا بھی ناگزیر ہے! ہرچند تماشائی کو یہ پردہ معمولی اسٹیج کی طرح بار بار گرانا اٹھانا نہ پڑے گا۔ لیکن بہرحال بعض وقت ختم تمثیل سے پہلے ہی پردہ گرا دینا پڑتا ہے۔

نو ڈراما کا ماحول آپ کو اسی عالم میں پہنچا دیتا ہے جس طرح آپ "چائے خانے" (ٹی ہاؤس) کے اندر چائے کی مہک۔ جوش کھاتی ہوئی کیتلی کی میٹھی راگنی اور بخور کے بل کھاتے ہوئے دھوئیں کے ماحول میں پہنچ کر لیکن یقینی طور پر ایک سمجھ میں نہ آسکنے والے دھندلکے یا بہشت میں پہنچ جاتے ہیں۔

نو ڈراما اور "چائے نوشی" شعرا کی [illegible]

[illegible] آپ کو [illegible] ہے کہ یا دی النظر میں محض تخیلی یا صرف ظن و تخمین نظر آئے [illegible] آپ یہ معلوم کر کے ان کو خیال آرائی محض نہ سمجھیں گے کہ ان دونوں نے [illegible] عمل ایک ہی عہد میں وجود اختیار کیا۔ ایک ہی زمانے میں ان کی بہت افزائی ہوئی اور ایک ہی دور میں انکا پرورش (DEVELOPEMENT) ہوا اور وہ دور جاپان میں اوشیکاگا کی حکمرانی کا دور تھا۔ یعنی ان دونوں نے چودھویں سے سولھویں صدی عیسوی میں ساتھ ساتھ نشو و نما پائی ہے۔ اور ان دونوں نے جاپان کے لوگوں کو سادگی کا سادہ سبق دے کر انکی زندگی میں توانائی پیدا کر دی ہے!

اس عہد میں جبکہ سادگی مفقود ہے اور پیچیدگی نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ زندگی کے ہر پہلو میں سادگی کا سبق زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ تنوع اور تمول نے ہمیں آخر وہ کونسی چیز دے دی ہے۔ جسپر ہمنے اپنی تمام سادگی کو قربان کر دیا؟

نوڈراما کا سب سے بڑا سرپرست اور پالن ہار اوشیکاگا حکومت کا تیسرا فرمانروا یوشی متسو گزرا ہے۔ جس نے نوڈراما کی جتنی سرپرستی کی اتنی "چائے نوشی" ادارے کی شاعری کو بھی سرافراز کیا۔ اس فرمانروا کے علاوہ یوشیماسا اس لئے ہمیشہ زندہ رہے گا کہ اس نے نوڈراما کی تکمیل کی اور اسے موجودہ صورت تک پہنچا دیا۔ ان دونوں ہستیوں کے بعد ٹویوسی ٹیوٹومی فوجی سپہ سالار کا نام یادگار ہے جس نے نہ صرف "چائے نوش" (ٹی ماسٹر) شعرا کی قدر افزائیاں کیں بلکہ نوایکٹروں۔ سوئیکی اور ایکیو کو بھی نوازا بودھ مذہب کے راہب خانوں میں رسم "چائے نوشی" اور نوڈراما یکساں طور پر مقبول تھے۔ نو قسم کے اس وقت جتنے ڈرامے عالم وجود میں ہیں ان کی تعداد بھی تین سو کے قریب ہے۔ ان تمام ڈراموں میں ایک بھی ایسا نہیں جس میں ایک پجاری کا کردار سامنے نہ آتا ہو۔ اور اسکی روحانی طاقت کسی سپاہی۔ یا کسی خاتون یا کسی پھول یا کسی درخت کی روح کو بابرکت نروان میں نہ پہنچا دیتی ہو۔

ڈراما کی اس صنف کو اگر ہم اس بات کا لحاظ کر کے روحانی [illegible] دیں گے تو اتنا ہی غیر صحیح ہوگا۔ جتنا اس کو پجاری ڈراما [illegible] کہ نو اصل مقصود حیات انسانی کی حزنیہ کو بیان کرنا ہے اور [illegible] ہے ــــ جو بودھ مت کی پیدا کردہ ہے۔ نو کا مدعا قدیم افسانوں اور اساطیر کی طربیہ کو پیش کرنا ہرگز نہیں کیونکہ بیشتر ڈرامے خود پجاریوں کے تصنیف کئے ہوئے ہیں یا بعض ایسے لوگوں کے نتیجۂ فکر و تراوش قلم ہیں۔ جو بودھ مت سے متاثر تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان ڈراموں کے مصنفین کے نام فراموش کر دئے گئے یا خود ان مصنفین نے اپنے ناموں کو گمنامی میں رکھنا پسند کیا۔ بعض نام۔ مثلاً سیآمی اور اوتوآمی وغیرہ جو معلوم بھی ہیں۔ ایک محقق کا دعوےٰ ہے کہ وہ مصنف نہ تھے بلکہ ڈراما کی موسیقی۔ رقص اور اسٹیج کے معمولی منتظمین میں سے تھے۔ اس زمانے میں لوگ اس کا مطلق خیال نہ کرتے تھے کہ "قول کس کا ہے؟" بلکہ صرف یہ دیکھتے تھے "قول کیا ہے؟" ان کو مصنف کی ذات سے مطلق بحث نہ ہوتی تھی۔ بلکہ وہ صرف ڈراما کی اہمیت کو دیکھتے تھے! عہد حاضر کی اشتہار بازی اور پروپگنڈے سے کسقدر مخالف ہے! اس لئے یہ کہنا بالکل مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ ڈرامے قومی تاثر اور ادبی شغف کے باعث ایک راز کی شکل میں وجود پذیر ہوئے۔ یعنی وہ کسی ایک عہد یا زمانے کی پیداوار نہیں ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ غلط نہ ہوگا کہ وہ از خود تصنیف ہو گئے ــــ اس طرح جیسے بودھ مت کی روایات کی زمین میں کوئی پودا یا پھول اُگ آئے!

ادبی حیثیت کے اعتبار سے نوڈراما عہد قدیم کے کیوٹو کے دربار کی ہمت افزائیوں سے جو ادب پیدا ہوا اور جسے ان کو "اشرافی" ( ) کہنا چاہئے قطعاً مختلف چیز ہے اور اپنی انعطافی صورت میں یکسر جمہوری شے ہے۔ طرز انشا اور ترکیب لفظی کے لحاظ سے ہر چند کوئی بین فرق نہیں۔ اور وہ انشا و ادب حقیقتاً شاعری کا اشرف ترین اظہار (EXPRESSION) ہے ــــ ایک ایسا اظہار جو زرلبفت پوش ایکٹروں کی موسیقیانہ حرکات رقص سے مشابہ ہے!

جاپانی ادب میں نوڈراما کے مقابلے کی کسی افسانوی نظم کا نمونہ موجود نہیں ہے اور نو کے متعلق دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے اندر کوئی فقرہ کوئی تخئیل اور کوئی واقعہ ایسا نہ ملے گا جسکو کسی طرح غیر موزوں یا نامناسب کہا جا سکے! فضا و ماحول یا تخئیل و حیات میں خفیف کی کمی بیشی بھی ممکن نہ ہوگی۔ یہ ڈرامے غیر فانی اور عجیب و غریب ہیں۔ مفتخر ترین ہیں۔ انتہائی ذی حیات ہیں۔ اور خود انسانیت کے نغموں اور نالوں کے محفوظ ترین سرپا شعبے ہیں!

(۲)

اس صنف کے پرانے ڈرامے۔ بدلوشی کی سرپرستی میں نہ صرف باقی رہ گئے بلکہ ان میں ترمیمیں اور اضافے بھی ہوئے۔ اور نئے ڈرامے بھی لکھے گئے۔ اور ٹوکوگاوا کی جاگیرداری عہد میں جاپان کی حیات قومی کا اہم عنصر بن گئے تھے۔ کسی نوڈرامے کے فقرے دُہرانا یا اسٹیج پر انکو ایکٹ کرنا شرفا کے لئے لازمۂ شرافت سمجھا جانے لگا تھا۔ اور آج تک معمولی تھیٹر کے مقابلے میں نو ذی وقعت رہا۔ اور شریفانہ تفریح بہم پہنچاتا رہا ہے! اس میں نہ صرف تقدس کی شان پیدا ہوگئی اور شادی کی تقریبوں کا ایک ضروری جزو بن گیا۔ بلکہ ایک مخصوص ڈرامے کی جس کا عنوان "ٹکاساگو" تھا۔ چند سطریں عقد نکاح کے وقت گائی جانا شادی کو دوام اور یقین بخشنے کے لئے لازمی ہوگیا تھا۔

"ٹکاساگو" ڈراما استقلال۔ تحمل۔ صحت اور درازئی عمر کے پہلو کو پیش کرتا ہے۔ اور اس طرح شروع ہوتا ہے کہ مرد و عورت کا ایک معمر جوڑا صنوبر کے درخت کے نیچے پتیاں جمع کر رہا اور گاتا جاتا ہے۔

"یہ سچ ہے کہ صنوبر کے درخت اپنی تمام پتیاں نہیں جھاڑ دیتے
اور انکی سبزی طویل مدت تک تازہ رہتی ہے۔ سدا
بہار پودوں کے مقابلے میں بھی جو غیر متبدل ہونے کی
خصوصیت سے متصف ہیں۔ صنوبر کی عزت و وقعت
زیادہ ہے ــــ ان دو صنوبروں کی عزت و وقعت
جو ساتھ ساتھ بوڑھے ہوئے ہیں!"

یہ صنوبر کے دو درخت کیا ہیں؟ یہ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت کون ہیں؟ درختوں کی روحیں اگر کوئی سے ہیں تو یہ بوڑھے میاں بیوی ہی ہیں۔ جو زریں و مسرور زندگی کے بعد کا نغمہ گا رہے ہیں!

نو صنف کے تقریباً تین سو ڈراموں میں اعلے ترین ڈراما حسن "جامۂ بال و پر" ہے۔ یہ ڈراما حسن عبارت اور الفاظ کی نازک اضافی بس کا حامل ہے۔ اس میں ایک پری کا قصہ بیان ہوتا ہے جس کا "جامۂ بال و پر" ایک مچھیرے نے متھو کے صنوبری کنارے پر سے اس وقت چرا لیا جب وہ غسل کر رہی تھی۔ اور انجام کار اپنا رقص دکھانے کا وعدہ کرکے اسے اپنا لباس واپس ملا تھا۔ جاپان کی تہذیب و تربیت کا بہترین و اعلے ترین کارنامہ اعتدال کی تعلیم ہے! چنانچہ اس ڈرامے میں مشرق کی تمام خوبیاں اور الم خوئی اس پری کے گیتوں میں ظاہر ہوتی ہیں جو اپنے بلند مقام کی جانب پرواز کرنے سے قاصر ہے۔

"میری نگاہیں۔ اُن سماوی فضاؤں کی تلاش بیکار کر رہی
ہیں جہاں بلند ہوتے ہوئے بخارات ساری فضا پر چھا جاتے
اور بادلوں کی جانی پہچانی پگڈنڈیوں کو چھپا لیتے ہیں!"

اس نے مچھیرے سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اس کو اپنا رقص دکھائیگی جو قصر قمر کو بھی وجد میں لے آتا ہے اور اس رقص کو انسان کے لئے ایک یادگار کے طور پر اس دنیا ہی میں چھوڑ جائے گی۔ بشرطیکہ مچھیرا اس کا لباس واپس دیدے لیکن اس مچھیرے کو اندیشہ ہوگیا کہ لباس پاکر کہیں وہ رقص دکھائے بغیر ہی نہ اڑ جائے۔ تو پری نے اس سے کہا۔

"تف ہے تجھ پر! انسان کے عہد و اقرار میں شک ہو سکتا ہے
لیکن ملائے اعلے کے مکین وعدہ خلافی نہیں کرتے!"

اوپر کہیں اشارہ کیا گیا ہے کہ نو ڈراما ایسے عہد کی تخلیق ہے جب گوتم بودھ کے مقدس نام کی برکت سے برزخ کی آوارہ روحیں بھی نروان پالیتی تھیں اور اسی لئے اکثر ڈراموں میں بودھ مت کی روحوں کا ذکر ضرور ہوا ہے۔ آج کے عہد مادہ پرستی میں بھی روحانیت کے اذکار شاعرانہ خیالات کے لئے قابل قبول شے ہیں۔ بودھ مت کے عقیدے کو کیسا ہی متعصبانہ کیوں نہ کہا جائے۔ لیکن اس عقیدے کی جان یہ ہے کہ شعری تخلیات ہمیشہ باقی ہیں!

ہر چند نو ڈراما کی بساط مایہ کم و بیش نہیں ہوتی۔ لیکن ہماری تفسیر اور تصور میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے نو کی تازگی میں فرق نہیں آتا! ایک ڈراما جس کا نام "روح کوہستان" ہے اور جس کا مصنف بے شبہ کوئی پجاری تھا۔ اس میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسانی روحیں تناسخ کے جھنجھٹ میں اسی طرح پریشان ہوتی رہتی ہیں۔ جیسے کوہستان کی روح ساری رات پہاڑ کا چکر کاٹتی رہتی ہے۔ اس ڈراما میں پہاڑ سے خود زندگی عبارت ہے۔ اس فسانے کا پلاٹ اُس پر شدید ترین ہو جاتا ہے۔ جب تہیا گما یعنی کوہستانی روح داخل ہوتی ہے۔ اس تہیا گما کا نام اپنے رقص کی بدولت حاصل کیا ہے۔ کہ:

کرتی ہے۔ وہ سایوں کی پہاڑی پر اسوقت وابستہ ہو لیجاتی ہے جب زنگوجی کیطرف یاترا کو جاتی ہوتی ہے —— زنگوجی بدھ مت کا ایک مقدس مندر ہے۔ اس مندر میں ہیاکما کی ملاقات پہاڑ کی اصلی روح سے ہوتی ہے جس کی ستارہ سی آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔ اور برف کی طرح سفید ڈراؤنے بال ہیں۔ یہ روح اس عورت کو پہاڑ کے گرد رقص کرنا بتاتی ہے —— یعنی کوہ حیات کے گرد! ڈراما کا خاتمہ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ رقاصہ کوہستانی روح کے حضور دعا کرتی ہے اور ان پہاڑوں میں غائب ہو جاتی ہے کیونکہ اس کی زندگی پیچیدہ زندگی کے بادل چھٹ جاتے ہیں —— آواگون کی خاک جھڑنے لگتی ہے!

ایک اور دلچسپ ڈراما "شانِ سحر" ہے۔ اس قصے میں یہ پھول جس کا نام شانِ سحر ہے اور جو صرف ایک صبح کی مختصر زندگی پاتا ہے دوسرے طویل العمر پھولوں پر رشک کرنے کے مواخذے میں نروان حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ مگر پجاری کی مناجات سننے کے بعد اس پھول کی روح تسکین پا کر غائب ہو جاتی ہے۔

مسٹر یون نوگوچی نے اس قدیم ڈراما کو جدید لباس سے آراستہ کیا ہے۔ ہم اس ڈرامے کا مکمل ترجمہ درج ذیل کرتے ہیں:-

شانِ سحر[1]

پجاری — زندگی کے بے راہ و نشان صحرا میں راہبر کون ہے؟
پجاری کی سیاہ چادر کو دیکھ جو اس نے اپنے آقا کی محبت میں
کبھی نہ بدلنے والی محبت میں پہنی ہے۔ ایسی سیاہ چادر جیسے
کالی رات! اور وہ کالی ہے رحم کی شدت سے! میں اپنی
سمرن جپتا ہوں۔ میں دنیا اور زندگی کے گناہوں کا شمار کرتا
ہوں۔
میری دعا ہے کہ شام کے وقت بجنے والے گھنٹے چپ ہو جائیں۔ میں
ہر وقت خوشی کو اور سورج کے ڈوبنے کو دیکھتا رہتا ہوں ——
اس مقام کی طرف دیکھتا رہتا ہوں جہاں جنت ہے۔ جہاں حقیقی
مقام ہے!
میرا فرض ہے کہ مصیبت زدہ روحوں کو قانون اور صداقت کا
مطیع بنا دوں۔ اور انتشارِ عناصر اور راحت کا گیت پورا حاصل
ہو جائے۔ یہ کون سا پھول دکھائی دے رہا ہے؟
کیا یہ شانِ سحر نہیں ہے۔ وہ پھول جو بہاروں کا خواب اور شبنم کا
تصور ہے؟
لیکن خزاں کے سناٹے نے جب دلوں کی حرارت اور فطرت اور
گیتوں کو خموش کر دیا ہے۔ اس پھول کا نظر آنا تعجب ہے۔ وہ
ایک ایسا گیت معلوم ہوتا ہے جو بغیر گائے فراموش کیا جا چکا ہے!
دہقانی مجھے بتا کہ یہ کیا پھول ہے؟

دہقانی - باوا یہ پھول شانِ سحر ہی ہے۔

پجاری - کیا یہاں یہ پھول اکتوبر کے ہلکے بادلوں ہی میں دکھائی دیتا ہے؟

دہقانی - نہیں باوا۔ میں نے بھی اسے پہلی ہی دفعہ دیکھا ہے!

پجاری - اس پھول کی کٹوری کی کپکپاہٹ تو دیکھو۔ جیسے وہ اپنی ہستی سے
ڈر رہا ہے۔ اوہ اس حسن کی ناکارگی جو زندگی کو ترک کر کے آسمانوں
میں اُڑ جائے!
کیا یہ اصلی شانِ سحر ہے؟
کیا یہ کوئی وہم و خیال یا خود رنج و الم نہیں؟
مجھے اس کی کپکپاہٹ میں ایک ایسی انسانی بولی سنائی دیتی ہے
جو بے صدا ہے!
کیسا عجیب راز ہے۔ کیسی ماتم زدگی ہے۔ کیسی حزن آفریں تھرتھراہٹ
ہے! میں ایک پجاری ہوں۔ کنکر پتھر اور گھاس جس کا بچھونا ہے
جو پانی کا۔ درختوں کا۔ ستاروں کا اور رات کا رفیق ہے۔
میں اسی جگہ سو جاؤں گا اور اپنی پرارتھنا کی شکتی سے اس پھول کے بھید کو
پا لوں گا۔
اے پھول تیرا جو نام بھی ہو۔ آج کی رات مجھے اپنا مہمان بنا لے!
(دہقانی چلا جاتا ہے۔ اندھیرا ہو جاتا ہے۔ رات کا پہلا گھنٹہ بجتا
ہے۔ پجاری منتر پڑھنے لگتا ہے۔ ایک نازنین اس طرح داخل
ہوتی ہے جیسے خزاں کے موسم میں ہوا کا کوئی لطیف جھونکا)

عورت - آہ۔ میرا دل رنج اور دیوانگی سے پھنکا جا رہا ہے!
اُف! جلن اور بےچینی کا شکار ہو جانے کی بلا!

[1] ...

میں عالم برزخ کی ایک آوارہ روح ہوں جس کا اطمینان چھن گیا ہے!

اس زندگی کے بعد جو اوپر کی سمت چلی جاتی ہے۔ جو نورانی اور سورج کی زندگی ہے!

آہ۔ مجھے اس انتشار عناصر موت سے کتنی نفرت ہے!

پجاری ۔اے عورت تو کون ہے؟ تو کسی مرے ہوئے کی روح معلوم ہوتی ہے جو مری نہیں ہے۔ جو نروان کو پُرا کرتی اور جو اطمینان کی آوارہ روح ہے!

عورت ۔ باوا۔ میں شانِ سحر کی روح ہوں!

پجاری ۔ آرزوے بہار اور تمنائے شبنم کی پیاری بچی!

تو پھر تو کینہ و بدی کی روح کی طرح ماری ماری کیوں پھرتی ہے؟

عورت ۔ میں دوسرے پھولوں کی زندگی کی طرح عمر میں درازی کی طلبگار رہوں۔ ان پھولوں کی طرح جو آفتاب اور دن کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور زندہ رہتے ہیں۔

آہ۔ میری مختصر زندگی! جو اپنا پہلا دن شروع ہونے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے! مجھے زندگی کی خوشیوں اور اس سورج کو محسوس کرنے کی کسقدر خواہش ہے!

پجاری ۔ غریب بچی! اگر موت نہیں تو زندگی بھی نہیں۔

موت کچھ بھی نہیں۔ مگر ستار کے ایک پردے سے دوسرے پردے تک تبدیلی! مختصر تر زندگی شیریں نہ رہے — جیسے کہ مختصر گیت ہوتا ہے۔

اچھی طرح مرنا ہی اچھی طرح جینا ہے!

زندگی عمر و سال کی درازی کا نام ہے۔

وہ پھول کہاں ہیں جو سو سال پہلے کھلے تھے؟

او ہو — موت اور نروان زندہ باد! انتشار عناصر اور راحت میں زندہ رہو! ظلمت اور موت کے اندر ایک زندگی جینا چاہیئے۔

اے عورت یا پھول! قانع ہو جا اور ایک گائے ہوئے گیت کی طرح ختم!

عورت ۔ میں تمہارے شبدوں سنکر خوش ہوں۔ میرے مقدس باوا۔ میری غمگین روح کو اشیرباد دو کہ وہ برزخ کو پلٹ جائے!۔

پجاری ۔ نمو اُمید ابتسو ——————

(نازنین مغا شانِ سحر کے اندر غائب ہو جاتی ہے۔ چاند نمودار ہوتا ہے۔ پھول مرجھا جاتا ہے۔ نیم شبی گھنٹے بجنے لگتے ہیں۔)

(ل۔ احمد)

خیالِ خام

ایک ہندوستانی میاں اور فرانسیسی بیوی کے دوست آشنا!؟

(از جناب بصیر احمد صاحب الہ آباد)

میڈم سے ملے ہفتہ بھر ہوا تھا۔ لیکن اس ایک ہی ہفتہ میں ہم دونوں میں ایک خاص قسم کی دوستی ہوگئی۔ دوسروں کے سامنے خیریت لیکن تنہائی میں یا اپنے شوہر کے سامنے میڈم خاصی بے تکلف ہوجاتیں خانگی معاملات نے مجھے دیوانہ سا بنا رکھا تھا۔ بیوی سے لڑائی۔ قرضہ سر پر۔ دماغ یکسو نہ تھا۔ چھٹی لے کر یہاں اس لئے آیا تھا کہ طبیعت کو سکون ہو۔ دل و دماغ ایک عورت کی ہمدردی ڈھونڈتے تھے شاید اسی وجہ سے میڈم کے یہاں اتنا آنا جانا ہوگیا ؛

ہر موضوع پر گفتگو ہوتی۔ خاص طور سے ہندوستانی مردوں کے رویہ پر کہ وہ عورتوں سے کیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ میڈم مزے لے لے کر اُن کا مذاق بناتیں۔ حالانکہ وہ ایک ہندوستانی سے باتیں کرتی تھیں اور اُن کا شوہر بھی ہندوستانی تھا۔ میں انکی ہاں میں ہاں ملاتا۔ میڈم اس شہر کی اور وہاں کے لوگوں کی بُرائی کرتیں اور میں اکثر اُن کی رائے سے اپنے کو متفق پاتا ؛

ایک روز میں اور یہ دونوں میاں بیوی میرے ایک دوست۔ حامد کی موٹر میں بیٹھ کر شام کو ہوا خوری کے لئے باہر گئے۔ مسٹر نیاز (میڈم کے شوہر) اور حامد آگے بیٹھے اور مجھے میڈم نے پیچھے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ میڈم اس شام کو بہت کو بہت مزے اور آزادی سے باتیں کر رہی تھیں۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور موٹر کھلی ہوئی اور تیز جارہی تھی۔ میڈم نے آہستہ آہستہ عورت کی آزادی پر گفتگو شروع کی۔ [illegible] کا اظہار کیا۔ لیکن جب میں نے میڈم سے یہ کہا کہ ہر عورت اور مرد آزاد ہے۔ جسم اس کا ہے۔ دماغ اور دل اس کا ہے جسے چاہے دے اور جسے چاہے نہ دے۔ لیکن زیادہ لوگ ایسا نہیں کرسکتے۔ وہ اپنا دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ اور اس جبر کے بعد لوگ ان کے منہ سے عصمت وعفت اور دوسروں کی بدکاری کے متعلق لکچر اور افواہ سنتے ہیں۔ کیوں میڈم کیا آپ کو میری رائے سے اتفاق نہیں؟"

میرے اس فقرہ کے بعد میں نے اُن میں ایک تغیر محسوس کیا۔ انہوں نے خاموشی سے سر ہلا کر میری رائے سے اتفاق کیا۔ وہ اب خاموش ہوگئیں۔ اُن کے تمام جسم میں بے چینی سی تھی۔ دماغ میں شاید کوئی خیال آگیا۔ اِدھر اُدھر موٹر کی نشست پر پھدکتی رہیں۔ آخر کار بالکل میرے پاس مجھ سے مل کر بیٹھ گئیں۔ اور خاموشی سے میرا داہنا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ مجھے یہ بھلا معلوم ہوا۔ میرا ہاتھ ٹھنڈا تھا۔ لیکن میڈم کا نرم ہاتھ گرم ہو رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ میری تکلیفوں اور مصیبتوں میں میرا ساتھ دے رہی ہیں۔ ایک ہاتھ گرم ہوگیا تو میں نے مذاقاً دوسرا ہاتھ بھی میڈم کے ہاتھ میں یہ کہکر دیا۔ کہ اسے بھی گرم کر دیجئے۔ ورنہ شکایت رہے گی۔ میڈم نے آہستہ سے میرا ہاتھ اپنے پہلو سے الگ کر دیا۔ ان کی آنکھوں میں شرارت کی جھلک تھی۔ اپنی انگلی سے خاموشی کا اشارہ کیا اور پھر وہی انگلی اپنے شوہر کی پشت کی طرف اُٹھائی۔ جلدی سے نیچے جھک کر پہیوں میں ہوا بھرنے کا پمپ اُٹھا لیا۔ مجھے اشارہ کیا کہ میں اسے چلاؤں اور خود اُس کی نہنال

بیچارے نیاز کے کان کے پاس لگادی۔ وہ اس بلائے ناگہانی سے بے خبر حامد سے بہت زور شور سے کسی خشک موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ پورے پورے زور سے میں نے پمپ چلایا۔ نیاز اچھل پڑے۔ میڈم کا قہقہہ ایک فرلانگ تک موٹر کے پیچھے ایک مسلسل آواز میں غائب ہوتا رہا۔ نیاز نے پلٹ کر کوئی بات فرانسیسی میں اپنی بیوی سے کہی۔ انہوں نے ہنس کر پمپ کی نال الگ کر لی اور نرمی سے میرے ہاتھ سے پمپ لے کر نیچے رکھدیا۔ مگر میرے ہاتھ نیاز کو ہوا دینے کے لئے سختی سے تیار تھے۔

میں سوچنے لگا کہ میڈم نے یہ حرکت کیوں کی؟ اپنے شوہر کو متوجہ کرنے کے لئے؟ یا اُسے میری نگاہ میں حقیر کرنے کے لئے؟ میں کسی نتیجہ پر نہیں پہونچ سکا تھا کہ میڈم نے میرے کان کے پاس منہ لاکر آہستہ سے کہا۔ "مجھے سردی لگ رہی ہے"۔ میں نے اپنا کوٹ اُتار کر اُن کے زانو پر ڈال دیا نیاز پھر اپنی بحث میں منہمک تھے۔ گویا انہیں بیوی کی ہستی سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم دونوں موٹر میں اکیلے بیٹھے جارہے ہیں۔ میڈم کا ہاتھ کوٹ کے نیچے سے آہستہ آہستہ آیا اور میرے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ اُسی آہستگی سے میرے ہاتھ کو میڈم نے اٹھایا اور اپنے گالوں سے لگالیا۔ اُن کے گال تمتمارہے تھے۔

"میری خبرلو" میڈم نے دھیمی آواز میں کہا۔

مجھے شبہ ہونے لگا کہ یہ عورت مجھ سے کھیل رہی ہے اور مجھے بیوقوف بنانا چاہتی ہے۔ "اور بڑے میاں (نیاز کی طرف اشارہ کرکے) کی کون خبر لے گا؟" میں نے جواب دیا۔ میڈم نے مسکرا کر اپنے شوہر کی جانب دیکھا۔ اُن کے جسم میں ایک فوری کپکپی کی لہر دوڑ گئی۔ میرے ہاتھ کو جلدی سے چھوڑ دیا اور پھر میرے مُنہ کے پاس اپنا مُنہ لاکر کہنے لگیں۔ "آپ بہت سنگدل آدمی ہیں۔ ہر چیز کا آپ کو خیال ہے"۔ اُن کی آواز میں طنز اور ترشی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ خفا ہو گئی ہیں۔ میں خاموش رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد واپسی کے لئے حامد نے موٹر پھیر دی واپس پہنچ کر حامد نے کہا۔ کہ اُسے جلدی گھر جانا ہے۔ اور یہ کہکر وہ اُٹھ کھڑا ہوا میڈم نے گراموفون پر ایک ریکارڈ رکھتے ہوئے حامد کو شب بخیر کہا۔ میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور جانے کی اجازت چاہی۔ میڈم نے بغیر میری طرف دیکھے مجھ سے کہا۔ "آپ جو نئے ریکارڈ لائے ہیں وہ میں نے نہیں سنے ہیں۔ کیا آپ اس وقت لاسکتے ہیں؟"

جس دوست کے یہاں میں ٹھہرا ہوا تھا اُن کا [illegible] بمشکل سو گز پر تھا۔

میں نے جواب دیا۔ "اچھا میں ابھی لاتا ہوں"

حامد اس عرصہ میں جاچکا تھا۔ باہر برآمدہ میں اندھیرا [illegible] میرے ساتھ آیا اور بجلی کی روشنی جلائی۔

میں سیڑھیوں سے اُتر کر اپنے مکان کی طرف جانے لگا [illegible] میڈم کی آواز آئی۔ "ٹھہرئیے میں بھی آرہی ہوں"۔ وہ بھاگتی ہوئی [illegible] پاس آگئیں۔ مکان کے بازو میں روشنی نہیں پہنچی تھی۔ نیاز اب [illegible] تھے۔ میں اور میڈم برابر والے مکان کی طرف جارہے [illegible] نیچی تھی۔ اور اندھیرا تھا۔ یکایک میڈم کے ٹھوکر لگی اور وہ جلدی [illegible] میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سنبھل گئیں۔ "کیا تم اب بھی مجھے [illegible]" انہوں نے بہت ناز سے کہا۔ اور ان کے ہاتھ میری کمر میں حمائل [illegible]

میرے جسم میں خون تیزی سے دوڑنے لگا اور میں نے بھی [illegible] دونوں ہاتھ میڈم کی کمر میں ڈالدیئے۔ انہیں پیار کرنے کے لئے [illegible] کھینچا۔ میرا رُخ سامنے کی دیوار کی طرف تھا جس میں سے ایک [illegible] دونوں مکانوں میں آمدورفت تھی۔ بہت خفیف روشنی [illegible] چوکھٹ پر پڑ رہی تھی۔ لیکن اس سایہ کو ظاہر کرنے کے لئے [illegible] اسوقت چوکھٹ پر پڑا۔

میں نے میڈم کو چھوڑ دیا اور وہ بھی مجھ سے الگ [illegible] سامنے سے ایک شخص نکل آیا۔ میں نے مسعود کو پہچان لیا۔

"اوہو مسعود۔ کہاں جارہے ہو؟ کیا میرے یہاں [illegible]" سوال بے معنی اور فضول تھا۔ میں گھبرا سا گیا تھا۔ مسعود [illegible] دونوں کو پہچان لیا۔ "ہاں میں تمہارے یہاں سے آ [illegible] شب بخیر اچھا کل ملیں گے۔ خدا حافظ!"

اُس کی آواز میں [illegible]

میں نے کسی [illegible]

[illegible]

...اور
...نیاز نے
...کر دیکھنے لگا۔
...دوست احمد صاحب
...ان کا برتاؤ مجھ سے بڑے بھائی کا
...ایک انداز پیدا ہو گیا تھا۔
...لوگوں کو اُن کے متعلق عجیب
...تھا۔ وہ خاص قسم کی بہت اچھی
...در اصل وہ اچھے آدمی تھے نہیں
...تھا اور وہ اس سے بہت خوش
...اور وہ ہر طرح سے ایک عورت
...احمد بہت اچھا آدمی ہے۔ دل
...صرف مذاق کی خاطر یہ سب
...کے ساتھ بھی ان کا یہی
...کبھی پکڑ کر گرا دیتے اور
...میں یہ سب تماشے بیٹھا دیکھا

...میڈم کرسی پر سے اُٹھ کر زمین پر بیٹھ...

"آپ مطمئن ہو کر باتیں کریں۔" انہوں نے کہا۔ میں...

"میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آج احمد ضرور آپ سے ملنے..."

میں نے کہا۔ میڈم نے انکار میں سر ہلا دیا۔ اور پھر کہا "مجھے یہاں آئے ہوئے دو سال ہو گئے۔ لیکن احمد کبھی میرے یہاں اتنی رات گئے نہیں آئے۔" "میرا دل کہتا ہے کہ وہ آج ضرور یہاں آئیں گے تاکہ ہم ...کی لطفِ صحبت کو برباد کریں۔" میں نے جواب دیا۔ میڈم نے چھت کو منہ چڑھایا۔ ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ نیاز کے قلم کی چر چر ...برابر چلی آ رہی تھی۔ وہ ہم کو اپنی کرسی پر سے دیکھ سکتا تھا۔

"اگر میں بھی احمد کی طرح آپ سے مذاق کروں تو آپ میرا کہا کریں گی؟"

"میں سمجھونگی کہ تم نے میری توہین کی ہے اور تمہیں مکان سے باہر نکال دونگی۔ اور پھر کبھی تم سے نہیں ملوں گی۔" میڈم مسکرا مسکرا کر گن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں اور یہ کہہ رہی تھیں۔

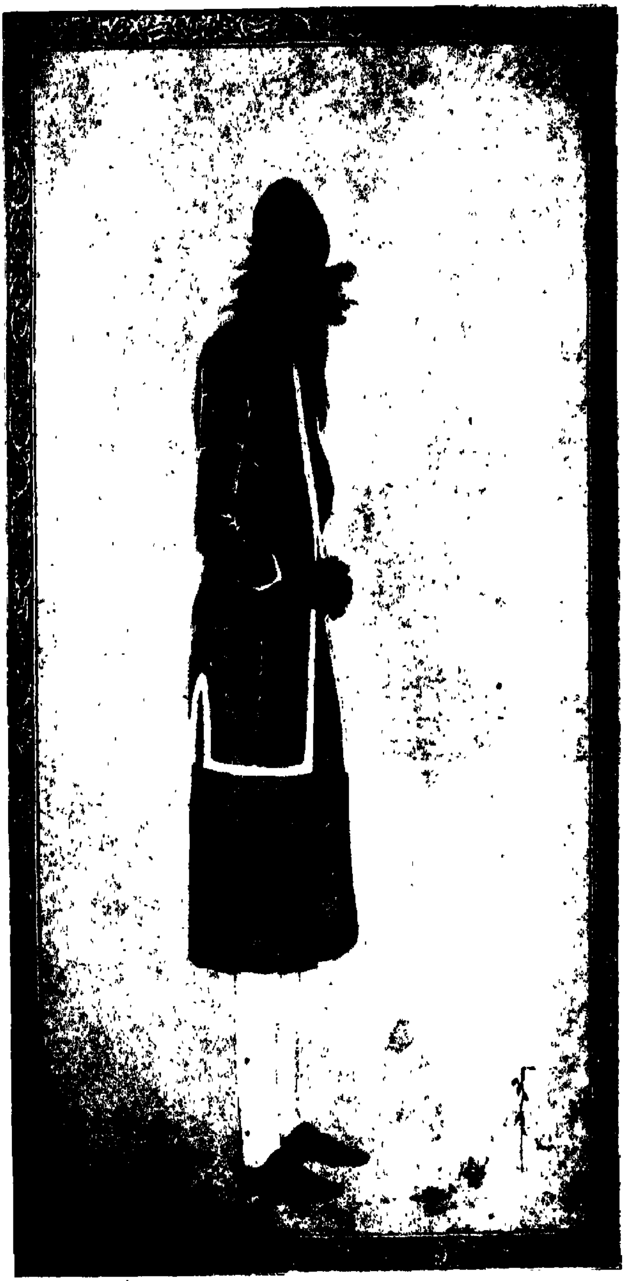
دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔

میڈم لوٹ مار کر اوندھی ہو گئیں۔ اور اپنی کہنیاں زمین پر ٹیک کر اپنے شوہر کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "نیاز ذرا دیکھو تو کون ہے۔ اگر کوئی تم سے ملنے آیا ہے تو برائے مہربانی گول کمرہ میں بٹھا کر اس سے باتیں کرنا" نیاز دروازے کی طرف گیا اور میڈم لوٹ کر پھر چھت تکنے لگیں۔

"میں شرط کرتا ہوں کہ آپ کے دوست احمد آئے ہیں" میں نے کہا ...خاموش رہیں۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ باہر سے باتوں کی آواز آئی۔ ...پیچھے نیاز داخل ہوئے۔

...کے دروازے میں آ کر کھڑے ہوئے۔ اُن کی ...ٹیک کر بیٹھ گئی تھیں۔ لیکن اب ان کے ...کو پکڑے ہوئے تھے۔ ...نیچے کو جھکا ...

...ایک لمحے میں سکوت



ایک راجپوت سردار ۔ فیض رحمان کے قلم کا رنگین نمونہ ۔

[illegible]
مذاق ہوتا تھا۔ اس لئے ظاہرداری میں کوئی فرق نہ آیا۔ احمد نے میڈم کا مذاق اُڑانا شروع کیا۔ کوشش کی کہ وہ کچھ بولیں۔ انہیں پکڑ کر اُن کا سر زبردستی اُٹھانا چاہا۔ میڈم نے جھٹکا دے کر اپنے کو چھڑا لیا۔ اب احمد میری طرف مڑے۔ اُن کے چہرے پر مسکراہٹ اب بھی تھی۔ لیکن ماتھے پر گنڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن اپنے کو روک لیا۔ میرے چہرے پر بھی اب ایک بامعنی مسکراہٹ تھی۔ نیاز کچھ نہ سمجھ سکا۔ وہ سب میں پیچھے کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔ گو نگاہ ہم سب پر تھی۔

احمد میری طرف سے پلٹے اور نیاز سے مخاطب ہوئے۔ "ذرا مسعود کے یہاں جا کر کل کے کھیل کی ہار جیت کا نتیجہ تو لے آؤ۔" پالتو کتے کی طرح نیاز پلٹا اور مسعود کے گھر روانہ ہوگیا۔ مسعود یہاں سے بہت قریب رہتا تھا۔

اب پھر احمد میری طرف مخاطب ہوئے۔

"تاش کھیلو گے؟"

"نہیں"

"میرے ساتھ ٹہلنے چلو گے؟"

"جی نہیں۔ میں یا تو یہاں میڈم کے پاس بیٹھوں گا یا گھر جا کر سو جاؤں گا۔ اور کچھ نہ کروں گا"

احمد کو میری صاف گوئی پر حیرت ہوگئی اور وہ کھسیانے ہوگئے مجھ سے تو کچھ نہ کہہ سکے۔ لیکن بے چاری میڈم پر برس پڑے۔

"آپ کا مزاج تو آسمان پر ہے۔ آپ سے ملنے کے لئے کوئی آئے اور آپ منہ پھیلا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ آخر کوئی وجہ بھی ہو۔"

میڈم بالکل خاموش رہیں۔ احمد نے اب ہاتھ [illegible] دق کرنا چاہا اور کرتے رہے۔ لیکن میڈم کو [illegible]

ایک [illegible]
لے لیا تھا [illegible]
تھے کہ اپنے آپ کو [illegible]
محسوس نہ ہو کہ احمد بھی [illegible]
میں طنز تھا۔ گویا [illegible]
جہاں کہ وہ جوانی [illegible]
مذاق اُڑا کر اس جگہ سے [illegible]
نیاز سے انہوں نے مخاطب ہو کر
کہا۔ "آج میڈم کا [illegible]
نیاز [illegible]
احمد کے [illegible]
گئی تھی۔ احمد اپنے چہرے [illegible]
دروازے کی طرف [illegible]

...فعل پر مجبور کیا۔ جلدی سے دروازہ...

...کو اس فعل سے ناممکن بنا دیا۔

...اور تسلی دے لی۔ ہم دونوں...

...ہاتھ نے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ جگہ

...گھنٹے قبل میری کمر میں ہاتھ ڈالے تھے۔

...تھا کہ وہ میرے ناصح بننے پر تیار ہیں۔ اور اس

...انہیں کی تلخی کو فراموش کرانا چاہتے ہیں۔ میں

...پہنچ کر میں نے انہیں شب بخیر کہا۔ آنکھ

...تھا۔ نرمی تھی اور بربادی! مجھے نصیحت تھی۔ میری

...رحم کھا رہی تھی!

...ہوئے بیٹھے تھے۔ میرے دوست بہت کتب بینی

...جا رہی تھا۔" واپس آ گئے کیوں؟ انہوں نے

...سیدھا جواب دے کر میں نے کپڑے اتارنے

...میڈم کا خالی مجسمہ میرے سامنے ان کے قول و

...بند ہونے لگیں۔ آخری ارادہ

...کے پاس جاؤں۔ اور معلوم کروں

...کہ ان کی طرف سے

...کی طرف سے نکل جائیں

بیتابی سے میڈم کی...

پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔ ... معلوم تھا کہ وہ اس وقت گھر پر نہیں ہوتے ہیں۔ لڑکے نے کہا کہ "میم صاحب ہیں" میں نے بہت روا روی کے لہجے میں کہا کہ "اچھا ان ہی اطلاع کر دو۔"

دس منٹ کے بیتاب کن انتظار کے بعد میڈم آئیں۔ شب خواب کے کپڑے پہنے ہوئے اور آنکھیں ایسی گویا ابھی سو رہی تھیں چہرے سے صابن پوڈر اور تولئے کی خوشبو آ رہی تھی۔ بال میں کنگھی بھی کئے ہوئے تھیں۔ ہاں کپڑے البتہ شب خوابی کے تھے۔ رات کے واقعہ کا تخیل غائب ہو گیا اور اب میڈم ہی میڈم میرے پیش نظر تھیں۔ آکر کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ذرا مجھ سے آگے دونوں کے بیچ میں ایک چھوٹی میز تھی۔ میں ان کا نیم رخ دیکھ سکتا تھا۔ اور وہ بغیر مڑے مجھے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں۔ میڈم بہت اطمینان سے گفتگو کر رہی تھیں۔ گویا میں ان کے لئے اجنبی تھا اور صرف ان کے شوہر کا دوست تھا۔ آخر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔

میڈم! کیا آپ ایک بات مجھے سچ سچ بتا دیں گی؟

"پوچھ کے دیکھئے"

کیا گزشتہ شب آپ کی خواہش نہیں تھی کہ صرف میں ہی آپ کے پاس رہوں اور احمد اور نیاز دونوں دفان ہو جائیں؟ کیا آپ ایسا نہیں چاہتی تھیں؟

"شاید۔ کیا معلوم۔"

نہیں میڈم میں صاف جواب چاہتا ہوں۔ کیونکہ رات یہاں میں نے محسوس کیا کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی خواہش ہے۔ میں اب بھی یہی محسوس کرتا ہوں۔ اگر یہ سب کچھ میرا تخیل تھا تو میں آپ سے معافی مانگتا ہوں اور جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔

(دھم دھری سے) "آپ جب چاہیں جا سکتے ہیں۔ (نرمی سے) لیکن اگر میں آپ سے ایک بات کہنے کو کہوں تو کیا تم مجھے "سہل الحصول"

اور "اراں عورت" تو نہیں خیال کرو گے ؟"

میڈم کی گردن سرخ ہو گئی تھی۔ اور کان اور گال تمتما اٹھا تھا معلوم نہیں آپ کیا پوچھیں گی ؟

اب منہ بالکل دوسری طرف کو پھیر لیا گیا۔ اگر میں تم سے کہوں کہ مجھے پیار کرو تو کیا تم ایسا کرو گے ؟

میرے دل کو دھکا سا لگا۔ کیا یہ سب کچھ سچ ہے ؟ کیا اس اظہار کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ میرے جذبات سے واقف ہو کر میڈم مجھے بیوقوف بنا رہی ہیں !

ہاں اگر میرا بھی جی چاہتا ہوگا تو کروں گا اور ضرور کروں گا۔

تمہارا جی چاہتا ہے ؟

"ہاں"

"تو کرو"

"کیوں ہم دونوں آدھے راستے پر نہ ملیں۔ اب جب کہ میری اور تمہاری خواہشات ایک سی ہیں تو میں کیوں پیش دستی کروں؟"

یہ سنکر میڈم میری طرف پلٹیں۔ مجھے دیکھ کر مسکرائیں اور کہنے لگیں

"تم اگر مجھے پیار کرو تو یہ بھی ممکن ہے کہ شاید میں تمہیں اس گھر سے نکال دوں"

"میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں پہلے ایک ایسی چوٹ اٹھا چکا ہوں۔ اور اس کا زخم ابھی تازہ ہے"۔

"مگر عورت تو ایسا ہی قابو چاہتی ہے"

وہ پھر میری طرف مڑیں۔ اُن کے چہرے پر افسوس کے آثار تھے۔ گویا اب انہیں میری طرف سے یہ احساس ہو گیا کہ میں اُن سے کھیل رہا ہوں۔

میں بدحواس سا ہو گیا اور کھڑا ہو کر جلدی سے میڈم کی کرسی کے پیچھے پہنچ گیا۔ اپنے ہاتھ میڈم کی گردن میں ڈال دیئے اور جھکا چاہتا تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے میرے دونوں ہاتھ الگ کر دیئے اور اوپر میری طرف کو دیکھ کر کہنے لگیں۔

"افسوس! آپ غلطی پر ہیں۔ شاید میرا منشا تم نہیں سمجھے"۔

"میڈم۔ میڈم" میں نے بدحواس ہو کر کہا اور اب میں ان کے سامنے تھا اور ان کے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کیا کیا میڈم کی آنکھوں میں استقلال اور حسرت تھی "نہیں ہرگز نہیں۔ تم بزدل ہو۔ کبھی عورت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اب سب فضول ہے!"

مایوسی ایک ٹھنڈی لکیر بن کر میرے جذبات میں دوڑ گئی۔ اور میں خاموشی سے اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ میڈم کی طرف سے منہ موڑ کر نیچے کر لیا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہیں۔

"تمہیں مجھ سے نفرت تو نہیں ہو گئی ہے۔ میں جاؤں ؟ اور تمہیں اپنی موجودگی سے دق نہ کروں"

میڈم نے نرمی سے کہا۔ "نہیں مجھے تم سے نفرت بالکل نہیں ہے اور میں تم سے جانے کو نہیں کہہ سکتی"۔

کچھ دیر کے سکوت کے بعد میں نے پھر میڈم کے پاس جا کر کوشش کی کہ انہیں اپنی محبت کا یقین دلاؤں۔ اور باوجود اس کے کہ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایسا اب بھی چاہتی ہیں۔ ان کے ہاتھوں نے مجھے ایسا کرنے سے ناکامیاب رکھا۔

میں اپنی بے سود کوشش سے تھک کر پشیمان سا الگ کھڑا تھا۔ کہ پیروں کی چاپ سنائی دی اور نیاز دوسرے کمرے میں نمودار ہوا۔ میڈم ایسی تڑپ کر کھڑی ہوئیں گویا انہیں کسی نے برقا دیا ہے چہرہ سرخ۔ بے تحاشا بھاگتی ہوئی دوسرے کمرے میں اپنے شوہر کے پاس پہنچیں اور دونوں ہاتھ اس کے گلے میں ڈال دیئے۔ "میرے پیارے۔ میرے پیارے" انہوں نے کئی دفعہ کہا اور ہر دفعہ انہوں نے نیاز کی پیشانی اور گالوں کو چوما۔

میں اب اس سے زیادہ کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ سناٹے میں اپنی ٹوپی اٹھائی اور لپٹے ہوئے میاں بیوی کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے باہر چل دیا۔

(بصیر)

فلسفی عاشق

(اثر۔ حضرت شاہ ۔ ریاض (علیگ))

ہمارے ساتھیوں میں ایک صاحب تھے فلسفی۔ بدقسمتی سے انکو
...صاحبہ سے عشق ہو گیا۔ فلسفۂ عشق یکجا ہو گئے۔ پھر کیا تھا۔ فلسفۂ عشق پر
وہ اپنے مقالات یار دوستوں کو سنانے لگے۔

ایکدن کا ذکر ہے۔ شام کا وقت تھا۔ کالج میں کھیل بند تھے کیونکہ
...کورٹ کے ممبر کا انتقال ہو گیا تھا۔ ہم سب ادھر ادھر گھوم رہے
...۔ اتنے میں ایک صاحب آئے اور کہنے لگے "آج حضرتِ عاشق کا جنون
...ری پر ہے۔ چلو ان سے لطف اٹھائیں"۔ ہم لوگ ان کے ساتھ ہو لئے۔
...پلی پارک کے ایک کمرہ کے سامنے مونڈھے پڑے ہوئے تھے۔ ایک
...احب منہنی قد کے منہ میں حقہ لگائے ایک مونڈھے پر تشریف فرما تھے اور
...ن کے گرد دو چار صاحبان سلیقہ سے بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت بار بار حقہ کا
...ش لیتے تھے۔ اور بلند آواز سے کچھ فرماتے جاتے تھے۔ ہم لوگ بھی مونڈھے
...لے کر ان کے گرد بیٹھ گئے۔

یکایک وہ ہماری طرف پھرے اور بولے۔ "حضرات آپ لوگ
مسکرا رہے ہیں۔ خیر مسکرائیے۔ آپ کو کیا خبر کہ کسی کے دل پر کیا گذر رہی ہے"
ہم لوگ ایک آواز ہو کر بولے "نہیں نہیں آپ مطمئن رہئے ہم سب
آپ پر بھلا ہنس سکتے ہیں؟ ایک اور بات تھی"۔ (خیریت ہوئی انہوں نے
وہ بات نہ پوچھی ورنہ آپس میں اختلاف ہو جاتا) حضرت کو شاعری میں بھی
دخل تھا۔ خود بھی شعر کہنے کی کوشش کرتے تھے اور دوسروں کے شعر بھی
یاد تھے۔ کہنے لگے :۔ واقعی کسی فارسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

بہ باغ رفتم و گل چیدم و فغاں کردم ؛ زیارت دل مجروح بلبلاں کردم
بمن بگفت یکے بلبلے کہن سالے ؛ ہزار سال دریں باغ آشیاں کردم
وفائے عہد و مودت ز گلرخاں مطلب ؛ من ایں معاملہ کردم و زیاں کردم

اب ہم لوگوں کو یقین ہو گیا کہ واقعی آج دورہ پڑا ہے۔ ہر شخص
اپنی اپنی جگہ سوچنے لگا۔ کہ کس طرح ان کو ابھارنا چاہئے۔ شاعری کا سلسلہ
اچانک آیا تھا۔ ایک صاحب بولے۔ "واقعی عشق بھی کیا چیز ہے۔ اس نے
کتنے گھر تباہ کئے۔ یہ ایک عذاب الٰہی ہے۔ استاد امیر نے کیا خوب کہا ہے

"سخت کافر تھا جس نے پہلے پہل ؛ مذہب عشق اختیار کیا"

حضرت یکایک کھڑے ہو گئے۔ بگڑ کر بولے: "آپ نے یہ کیا کہا کہ
عشق گھروں کو تباہ کرتا ہے؟ اور یہ عذاب ہے! آپ کو اس کی لذت ملی ہو
تو آپ جانیں۔ یہی زندگی ہے۔ اسی میں زندگی کا لطف ہے۔ بے عشق کی
زندگی کوئی زندگی ہے؟ افسوس ظالم تو نے چکھی ہی نہیں۔ استاد امیر نے
بھی کس مزے میں کہا ہے۔ ؎

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب ؛ مرے دونوں پہلوؤں میں دل بیقرار ہوتا

ہجر ہی اصل وصل ہے۔ تڑپ ہی سکون ہے۔ تکلیف آرام ہے اور
مصائب ہی مسرت۔ افسوس ہے آپ لوگوں پر جنہیں کسی سے عشق نہیں۔
تمہارے دل نہیں پتھر ہیں۔ تم ذی حس نہیں۔ بے حس ہو۔ ایک میں ہوں
کہ میرا کلیجہ پھنک رہا ہے۔ اور مجھے اس میں لطف آرہا ہے۔ اے غم جدائی
تو اور بڑھ۔ اے سکون کچھ اور دور بھاگ۔ مجھے تو صرف اپنے دوست کی
خوشی منظور رہے۔ جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔ عراقی کا شعر بھی کسقدر
صحیح تعریف پیش کرتا ہے۔ ؎

بہ عالم ہر کجا درد و غمے بود ؛ بہم کردند و عشقش نام کردند

افسوس میں تم کو حسن و عشق کے معاملات سمجھا نہیں سکتا۔ کیونکہ
عشق و تصوف کا ایک معاملہ ہے۔ صوفی تصوف کے مسائل کو اگر سمجھانے کی
کوشش کرے تو وہ صوفی نہیں۔ اسیطرح عاشق اگر یہ دعوے کرے کہ عشق کی

گہرائیوں کو سمجھا سکتا ہے تو وہ عاشق نہیں۔ ع

آنزا کہ خبر شد خبرش باز نیامد

اب انکا جوش خوب بڑھ چکا تھا۔ حقہ الگ پڑا تھا اور یہ حضرت کھڑے بپھر رہے تھے اتنے میں یونیورسٹی کے قدیم پوشین خالق داد خاں تشریف لائے اور حضرت فلسفی کی طرف ایک خط بڑھایا۔ خط کو دیکھتے ہی حضرت کے چہرہ کا رنگ فق ہوگیا۔ جب خان صاحب چلے گئے تو فرمانے لگے۔ دیکھتے ہو میرے محبوب کی شوخی۔ میں نے اسے خط لکھا تھا اور اس نے خط واپس کر دیا۔ وصول بھی نہ کیا۔ خیر اب مجھے اس میں لطف آتا ہے اگر وصول کر کے جواب نہ لکھتا تو زیادہ برا تھا (حضرت کی ایک خوبی تھی کہ ہر بات کی تاویل کر لیا کرتے تھے)

ہم لوگوں کو شوق ہوا کسی طرح اس خط کو دیکھنا چاہئے۔ اشاروں میں آپس میں گفتگو ہوگئی۔ تجویز مقرر کی گئی۔ ایک صاحب ہم لوگوں کو اشارہ سے منع کرتے ہوئے حضرت سے مخاطب ہوئے

جناب آپ کی تقریر و تحریر میں اتنا زور ہوتا ہے کہ اگر کوئی ایک مرتبہ بھی دیکھ یا سن لے تو پھر وہ آپ کا قائل ہو جاتا ہے۔ آپ کا دوست بھی بڑا ہشیار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو خبر لگ گئی تھی۔ اسی لئے اس نے خط واپس کر دیا۔"

محترم کے چہرہ پر ہنسی آگئی۔ بولے۔ اچھا آپ لوگوں سے کیا پردہ آپ ہمارے پرانے دوست ہیں۔ لیجئے میں سنائے دیتا ہوں۔ میں کیا اور میری تحریر کیا۔ لیکن شائد آپ اسے پسند کریں۔

انہوں نے خط کھول کر ہم لوگوں کو سنانا شروع کیا۔ خط تھا بہت طویل۔ اسمیں سے جستہ جستہ میں پیش کرتا ہوں۔ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ القاب دلچسپ تھا اور طویل۔ اسوقت مجھے یاد نہیں۔ القاب میں کئی کئی مصرعے تھے۔ مجھے ایک یاد رہ گیا ہے۔ ع

"جانِ من۔ جانانِ من۔ غنچہ دہن۔ بالکل چمن"

بیوفائی کا گلہ۔ ہجر کی مصیبت۔ وعدہ خلافی کی شکایت۔ جذبات محبت کا بحر بے پایاں۔ محبوب کی تعریف۔ رقیبوں سے خدشہ غرض سب کچھ درج تھا۔ ایک جگہ پھر انہوں نے اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

بہت سے دلائل پیش کئے تھے۔ انکی منطق دانی یا معشوق فریبی ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:-

مقدمہ اول   مقدمہ دوم

تم نازک اندام۔ میں لاغر و ناتواں گویا بید مجنوں۔ اس لئے تم اور میں ایک

تمہاری آنکھیں ڈوروں سے سرخ۔ میری کثرت گریہ سے۔ 〃 〃 〃

تمہارے رخ زیبا پر پاؤڈر۔ میرے چہرہ پر گرد 〃 〃 〃

تم کو بھی مستی۔ مجھے بھی مستی۔ تمہیں بادہ حسن کی مجھے عشق کی 〃 〃

تم بھی بیوفا۔ میں بھی بیوفا۔ تمہیں مجھ سے بیوفائی مجھے چارہ گر سے 〃 〃

تم بھی آہستہ خرام۔ میں بھی آہستہ خرام۔ تم نازکی سے میں ضعف سے 〃 〃

اس قسم کی دلائل کا ایک سلسلہ تھا۔ بہت کچھ فراموش ہوگئیں ہم ابھی اور لطف اٹھاتے اور ہر چیز کی تشریح کراتے۔ مگر مغرب کی اذان ہوگئی۔ اور ہم جرمانہ کے ڈر سے مسجد پہنچ گئے حضرت کو پرانے ساتھیوں نے پہچان لیا ہوگا۔ نام ظاہر کرنا مناسب نہیں۔ ایک اچھے عہدہ پر براج رہے ہیں۔ اگر کہیں کسی معاملہ میں پھانس لیا تو قیامت ہوگی۔

....

....

شاہ ریاض

افسانہ

سحرِ جمال

(اثر حضرت عزیز احمد صاحب خلش صدیقی بی اے لکھنؤ)

جمال حسین تھا اور خود بھی اپنے حسن سے بے خبر نہ تھا۔ اپنے حسن سے
خبر ہوتا ہی کون ہے!! — نہ کہ پھر جمال جس نے اپنی نگاہ جادو
ے اپنی آنکھ سے دیکھے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس میں ایک قسم کی کشش
، جس کے سامنے ہر قوت سرنگوں ہو سکتی ہے۔ نہ کہ پھر عورت جیسی
ز! عورت تو اس کی پرستار تھی۔ وہ جدھر نکل جاتا نگاہیں سہمیں
ر کر رہ جاتیں۔ میں سچ کہتی ہوں میں نے اپنی آنکھ سے حسین ترین
کو اس کے سامنے نقش حیرت او محویت کا بت بنا ہوا دیکھا ہے۔

ممکن ہے میں نے اس کے حسن کے بیان میں مبالغہ سے کام لیا ہو
خود ایک "عورت" ہوں — اور ایک ایسی عورت جو اس سے
رتی ہے۔ لیکن اس کے کمال حسن کا یہی کیا کم ثبوت ہے کہ دماغ اسکی
، عاری ہے۔ نظر اس کو دیکھ کر مست ہو جاتی۔ دل اک نغمۂ خاموش
ب جاتا۔ روح وجد میں آجاتی۔ اور دماغ حیرت آئینہ بنکر رہ جاتا
کو اس کی ایک جھلک دکھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ پھر چاہیں
ے بد مذاق ہی کیوں نہ کہیں —

اس کا رنگ صندلی تھا۔ چہرہ بیضاوی۔ اور اس کے لبوں کی
ر تازگی ترغیب مجسم!! ان اودے ہونٹوں میں ہر وقت ایک
ہی رہتی تھی۔ ان پر اکثر اپنی زبان پھیر لیا کرتا تھا۔ گویا اسے ڈر تھا
وہ خشک نہ ہو جائیں — یہ اس کی اک ادا تھی!! ان جادو بھری
ھڑیوں پر اس کی اونچی ستواں ناک میں بیان نہیں کر سکتی کسقدر
م ہوتی تھی۔ پھر اس کے داہنے بائیں دو آبدار۔ رس بھری خوبصورت
یں قیامت تھیں۔ جس طرح بعض آنکھوں میں ہر وقت ایک
خمار سا رہتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں محبت برفشاں رہتی تھی۔ وہ ہر وقت
رازدارانہ انداز میں کچھ کہتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھیں — مجھے ان سے
کسقدر رشتہ معلوم ہوتی تھی!!! اس کی پلکیں لانبی تھیں جنکی جڑیں "نین رس"
میں بھیگی رہتی تھیں۔ اس کی ابرو سیاہ اور گھنی تھیں۔ اس کے بال بھی
نرے سیاہ تھے۔ اور لے انتہا گھونگھر والے — جیسے "عشق پیچاں" کے لچھے!
اوسط درجہ کا اس کا جسم تھا اور اوسط سے ذرا زیادہ اس کا قد — غرض
وہ حسین تھا اور ایک حسین مرد! عورت اسے اپنی آنکھوں میں اپنے
دل میں جگہ دینے کے لئے مجبور تھی۔ حسن کے معاملہ میں صرف مرد ہی
لطیف الحس نہیں ہوتے!

جمال کا دل بھی حسین تھا۔ وہ حسن پرست تھا اور غضب کا
حسن پرست! میں نے اپنی آنکھ سے اس کی کیفیت دیکھی ہے۔ جب حسن
اس کے سامنے ہوتا۔ تو وہ ایک زخم خوردہ ہرن کی طرح بے بسی کے ساتھ
ہر ایک کو دیکھتا۔ اور اس لمحے کے لئے یہ بالکل بھول جاتا۔ کہ وہ خود بھی قاتل ہے
اسے قطعی خبر نہ ہوتی کہ اس کی محبت بھری حزن بار آنکھیں اسوقت خود
کیوپڈ بن کر میٹھے زہر میں بجھے ہوئے تیر برساتی ہوتی ہیں۔ لیکن جسوقت
اسے اپنے بسمل کی تڑپ کا۔ اپنے تیر کی کامیابی کا احساس ہوتا تو وہ گھبرا جاتا
اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیا کرے — آخر احساس فتح غرور حسن
بنکر اس پر غالب آتا اور وہ ایک تمکنت ریز جمود و سکون کے ساتھ
اپنی مغرور نگاہیں فرش زمین یا طبق آسمان پر جما کر بیٹھ جاتا۔ اسے
یقین ہو جاتا کہ "اب یہ زخمی میرا ہو گیا" اس کے بعد اسے ہوش اس وقت
آتا جب "بسمل" کو حسرت نظارہ اور التجائے باز دید کی کچی کلیاں پہلو میں دبائے

ہوئے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جانا پڑتا ——— اس طرح نہ معلوم کتنے افسانے نامکمل اور نہ معلوم کتنی زندگیاں ادھوری رہ گئی ہونگی۔

میں نے اسے پہلی مرتبہ اپنے اسکول کے ڈرامے میں دیکھا تھا۔ ڈرامے میں ٹکٹ نہ تھا نہ عام طور پر مردوں کو اجازت تھی۔ صرف چند مخصوص اشخاص کو دعوتی کارڈ بھیجدئے گئے تھے۔ اور تمام زنانہ اسکولوں کی لڑکیاں عام طور پر مدعو تھیں۔ آنے والے مردوں میں سے ایک جمال بھی تھا۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ آیا جمال ان خاص لوگوں میں سے تھا جو مدعو کئے گئے تھے۔ یا اپنی کسی ترکیب و کوشش سے وہانتک پہنچ گیا تھا۔ کیونکہ اسکول نسواں کی تقریبیں تو حسن پرستوں کے لئے فردوس کا حکم رکھتی ہیں!

میں اپنی ہم جماعت شکیلہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور میرے سامنے دو قطاریں چھوڑ کر مدعو حضرات اور استانیوں کی صف تھی۔ جمال بالکل میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس لئے اس کو میں صرف اسوقت دیکھ پاتی تھی جب وہ کسی طرف مڑتا تھا۔ ہال عورتوں اور لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس فضائے جمیل میں جو نغمۂ حسن سے مرتعش تھی۔ جمال کے دل پر کیا گذر رہی ہوگی اور خود جمال خاموش و مضطرب آنکھوں والا جمال دوسروں پر کیسی سحر باری کر رہا تھا۔ میں اس حقیقت پر بھی پردہ پڑا رہنے دونگی۔ کہ خود مجھے بھی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی اندر سے میرے دل کو مسل رہا ہو۔ لیکن میں دوسری لڑکیوں کی طرح اس کے مظاہرۂ عام کے لئے تیار نہ تھی۔ حال ظاہر ہو تو اسی پر ہو جس کا وہ حال بنایا ہوا ہو۔ دوسرے پر کیوں ظاہر ہو؟ کیا کسی سے اپنے درد کی داد لینا ہے؟ اور پھر اس درد کی جو ایک ایسی ہستی کے لئے ہو جو گل رہگذار کی طرح ایک لمحے کے واسطے بصارت نواز ہو کر ایک لامحدود عرصہ کے لئے غائب ہو جانے والا ہو!! لیکن سچ پوچھیئے تو میرے دل میں اسی وقت یہ تمنا بھی پوشیدہ تھی کہ کاش مجھ سے کوئی میری عقل چھین لے۔ کاش کوئی میرے پندار کو چکنا چور کر دے۔ عورت بھی مرد کے حسن سے اسیقدر متاثر ہوتی ہے جسقدر عورت کے حسن سے مرد بلکہ اس سے زیادہ لیکن اس کی خداداد قوت ضبط اس میں اک شان بے نیازی و اک کیفیت رمیدگی پیدا کر دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بیک وقت "ظالم" بھی ہو جاتی ہے۔ اور مظلوم بھی ——— مظلوم اس لئے کہ اس طرز عمل سے قدرت کا اصول تحفظ تو ضرور پورا ہو جاتا ہے لیکن بعض وقت یہی وقتی بے نیازی اور رمیدگی اسے عمر بھر رلاتی ہے۔ حالانکہ جس طرح رم آہو کا اشارہ یہ ہوتا ہے کہ "تم میرا تعقب کرو" اسی طرح عورت کے گریز کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا تعقب کیا جائے اور اسے فتح کر لیا جائے۔

میں نے شکیلہ کو کہنی سے مخاطب کرتے ہوئے اس لڑکی کی طرف دیکھنے کو کہا جس کی بیتابیاں اور پرشوق نگاہیں حیاسوزی کی حد تک پہونچی جا رہی تھیں۔ شکیلہ نے مسکرانے میں میرا ساتھ تو دیا مگر اس کی مسکراہٹ جو آنکھوں سے غائب ہو۔ صرف لبوں پر ہو۔ سطحی ہوتی ہے۔ مگر پر اسرار اور پر معنی۔ وہ مبہوت بیٹھی ہوئی تھی۔ انتہائی سنجیدہ۔ کچھ ناراض سی! ——— مجھ سے نہیں۔ اور نہ کسی اور سے بلکہ خود سے یا پھر زمانے بھر سے! میں سمجھ گئی کہ اس کا زخم سب سے زیادہ گہرا ہے۔ میں چپ ہو گئی۔ اسے زیادہ چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن سب سے زیادہ تعجب مجھے اس بات پر ہے کہ اسوقت میرے دل میں رقابت کا جذبہ کیوں نہ پیدا ہوا۔ کیا میرا جذبہ کمزور تھا؟

شکیلہ کی ساری پر سبز۔ نیلے اور سنہری رنگ کی آمیزش سے طاؤسی پھول بنے ہوئے تھے۔ ساری شکیلہ کے جسم کے گرد نہ تھی بلکہ خوبصورت آنکھوں کا ایک جال تھا جس میں ایک حور لپٹی ہوئی تھی۔ بالکل اسی لباس میں جمال کے قریب ایک اور لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے شکیلہ کو اکبار پھر مخاطب کر کے پوچھا۔

"کیا یہ نوشابہ ہیں؟"

شکیلہ چونکی اور اثبات میں سر ہلا کر پھر خاموش ہو گئی۔ میں نے پھر کہا۔

"نوشابہ بہن تو اس ساری میں غضب کی حسین معلوم ہوتی ہیں۔"

شکیلہ نے میری طرف نگاہیں اٹھائیں اور پھر جھکا لیں۔ اس کی نگاہوں میں حسرت تھی۔ کرب تھا۔ نوشابہ کے حسن کی تعریف سے اسے تکلیف ہوئی یا یوں کہئے کہ وہ خوفزدہ ہو گئی۔ ہر عورت کی طرح اس کے دل میں اس وقت ایک راز دارانہ خواہش اس بات کی تھی کہ کاش دنیا میں سب سے زیادہ حسین وہ خود ہی ہوتی کہ جمال اس کے سوا کسی اور کا نہ ہو سکے ✤

نوشابہ شکیلہ کی بڑی بہن تھی۔ وہ دونوں بھی بے حد حسین تھی مگر اس
نت تو وہ حسینان عالم کی تاجدار معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا ناک نقشہ
لیلہ سے بہت مشابہ تھا۔ اتنا مشابہ کہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ آگے چلکر
ن دونوں میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ میں نے اس سے پہلے اس پر غور نہیں کیا
ا۔ مگر آج دونوں کو ایک لباس میں دیکھ کر میں کہہ اٹھی کہ "دونوں
ورتوں میں محض سن کا فرق ہے اور "وقت" ان دونوں کی شبیہوں کو ایک
کے اپنی چابکدستی کا مظاہرہ کرنے کی فکر میں ہے"۔

جب مہمان جانے کے لئے کھڑے ہوئے تو جمال نے ایک آخری نگاہ
لی ——— گویا اس کی مخمور آنکھیں ایک حریص شرابی کی طرح ایک ہی
دش میں ساری شراب پی جانا چاہتی تھیں۔ اس دوران میں اس نے
نے زخمی کو بھی دیکھا ——— شکیلہ کو۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔ اس کی
ورت نے سب کچھ کہدیا۔ لیکن اس میں غالباً جمال کے لئے کوئی ندرت
تھی۔ اس زبان کا ماہر ہونے کی حیثیت سے وہ سمجھ تو ضرور گیا ہوگا لیکن
نیں کہا جا سکتا کہ اس نے اسے کوئی اہمیت دی یا نہیں۔ اس کی آنکھوں
ں کے دل کی مجروحی کا پتہ ضرور چلتا تھا لیکن اس کے چہرے پر اک شان
نیازی اور اک عجیب تمکنت تھی جیسے وہ سمجھتا ہو کہ تمام ہستیوں کی مسرت
کی ایک ہاں پر منحصر تھی۔ یہ احساس بھی انسان میں کس قدر غرور اور
پیدا کر دیتا ہے!! لطف یہ تھا کہ وہ بھی مجسم تمنا تھا لیکن ایسی تمنا جو اپنی
یل سے بے نیاز ہو۔ اور یہی ستم تھا۔

عورت ——— ہندوستانی عورت مجبور محض ہے۔ اسے اگر کسی
ت ہو جاتی ہے۔ اسے اگر کوئی دیوانہ بنا جاتا ہے تو اس کے لئے سوا اس کے کوئی
رہ نہیں کہ گھل گھل کر اپنی جان دیدے۔ وہ پوری طرح مرد کے رحم و کرم پر
تی ہے۔ مرد ہی اس پر ترس کھائے تو اس کی تمنا تکمیل تک پہونچ سکتی ہے
اتنا بھی معلوم نہیں کر سکتی کہ اس کا قاتل کون ہے۔ مرد آزاد ہے۔ وہ اپنی
اکی جستجو میں نکل سکتا ہے۔ وہ اپنے قاتل کا نام و پتہ معلوم کر سکتا ہے اور
پنے مقصد تک پہونچنے کے لئے کم از کم اک جان توڑ کوشش ضرور کر سکتا
ہے۔ نہ اس پر مذہب الزام لگاتا ہے نہ اسے سوسائٹی مجرم قرار دیتی ہے۔ برخلاف
س کے عورت بے بس نامراد عورت۔ اس بے زبان گڑیا کی طرح ہے۔ جو

دوکان پر کسی گاہک کی نذر انتخاب کا نشانہ بننے کے لئے رکھی ہو۔ خواہ کوئی گاہک
اسے پسند ہو یا نہ ہو۔ وہ اپنے گاہک نہیں چن سکتی بلکہ گاہک اس کو انتخاب
کرتے ہیں۔ گویا اس میں نطق ہے نہ ادراک۔

جمال نے شکیلہ کو مجروح کر دیا تھا اس میں شکیلہ کی کیا خطا تھی۔
کوئی اپنی خوشی سے تو مجروح نہیں ہوتا۔ اب اگر جمال عمر بھر نظر نہ آتا تو وہ
بیچاری کیا کر سکتی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا اور شکیلہ کی خوش قسمتی کہ جمال نے
اسکول آنا شروع کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ خود بھی مجروح ہوا تھا۔

میری اور شکیلہ کی محبت قابل رشک تھی۔ دیکھنے والے ہم دونوں کو
ایک دوسرے کی بہن سمجھتے تھے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے پر بڑا اعتماد تھا
شکیلہ نے مجھے اپنا رازدار بنا لیا میں بھی تہِ دل سے اس کی غمگسار بن گئی
جمال مجھ پر اثر انداز ضرور ہوا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میرے دل میں تمنا کا
راج ہو شکیلہ نے درمیان آ کر مجھے گرفتار ہوتے ہوتے بچا لیا۔ مجھے اس پر
نہ حسد ہوتا تھا نہ رشک آتا تھا۔ بلکہ اس کی غمگساری میں ایک خاص لذت
حاصل ہوتی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے مجھے ایک بہت بڑی مصیبت سے
بچا لیا تھا۔ کیونکہ میرے گھر والے ایسے تھے کہ میری تمنا کی قطعی پروا نہ کرتے
میں ہندوستان کی ایک کمبخت اور بے بس لڑکی تھی۔ والدین نے قریب
قریب میری شادی کا انتظام کر لیا تھا۔ میری "قسمت کا فیصلہ میرے خیر خواہوں"
اپنی پسند اور اپنے اصول کے مطابق کر دیا تھا۔ دنیا کا ہر قانون بدل سکتا
تھا۔ لیکن یہ فیصلہ بدل نہ سکتا تھا۔ مجھ پر ایک ہستی سے محبت کرنے کا فرض
عائد تھا جسے میں نے کبھی اپنے خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ ہر حال میں اس
قربانگاہ پر چڑھنے کے لئے تیار تھی۔ میرے لئے اور چارہ ہی کیا تھا۔ مجھے اتنا
موقعہ ہی کب دیا گیا کہ اپنی پسند سے کام لوں۔ اگر دل کو سمجھانے کے لئے شکیلہ کا
بہانہ ہاتھ نہ آتا تو جمال کے خیال کو ترک کرنا محال ہو جاتا جس کا انجام ظاہر
تھا۔ غرضکہ جذبات کی تشفی شکیلہ کی ہمدردی اور غمگساری کے سوا کسی اور
صورت سے نہ ہو سکتی تھی۔

میں اپنے جذبات کو بھول گئی۔ میں نے اپنے احساسات کو شکیلہ کے
احساسات میں فنا کر دیا۔ میں اپنی ہستی کو شکیلہ کی ہستی میں سمو دینا چاہتی
تھی۔ تاکہ میری روح میرے قالب سے بے نیاز ہو کر شکیلہ کی روح کی ہم آہنگی
میں اپنی پرستش خاموش کو جاری رکھ سکے۔ مگر مجھے افسوس تھا کہ میری ارزوئیں

میری ہمدردی سے اس غریب کو کوئی خاص فائدہ نہ پہونچ سکا۔ کیونکہ میں ان معاملات میں ہمیشہ سے کم ہمت تھی۔ میں اسے ہمت کیا دلاتی میں تو اور اس کی ہمت کو توڑ دیا کرتی تھی۔ اسے قدم قدم پر روکتی تھی۔ اسے ضبط سکھاتی تھی۔

شکیلہ سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ جمال اکثر اس کے مکان کی طرف سے گذرتا تھا اور بالارادہ گذرتا تھا۔ اس کی متجسس نگاہیں شکیلہ کے بالاخانے پر پڑتی تھیں اور ناکام لوٹنا نہ چاہتی تھیں۔ شکیلہ بھی اکثر ہمت کرکے کوئی بہانہ نکال کر سامنے آجایا کرتی تھی۔ تاکہ ان کی زحمت جستجو ان کیلئے تکلیف دہ ثابت نہ ہو" جمال شکیلہ کو دیکھتا تھا۔ اس کی نظر جھک جاتی تھی۔ تو جھکی ہی رہتی تھی اور اگر دیکھتا تھا تو دیکھتا ہی رہتا تھا اسلئے تو جمال آیا ہی کرتا تھا لیکن وہاں بہت کم ایسا ہوا کہ اس کی اور شکیلہ کی نظریں ملی ہوں۔ شکیلہ ضرور اس کو دیکھ لیا کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ جمال بھی اس کو دیکھے۔ جمال کی نظروں میں جستجو ضرور ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ ہر دھوکے پر بھی وہ ایک لحظہ رکجایا کرتا تھا۔ لیکن زیادہ تر وہ گذرتا ہی چلا جاتا تھا۔ اس میں یہ قابل تعریف بات تھی کہ حسن پرست ہونے کے باوجود اپنی عزت کا اسے بڑا پاس تھا۔ حسن پرست عموماً اسقدر محتاط نہیں ہوتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ خود حسین تھا۔

میں شکیلہ کو اس کی زیادہ ہمت افزائی نہ کرنے دیتی تھی ——

کاش مجھے اسی وقت معلوم ہوتا کہ یہ میری غلطی تھی۔ شکیلہ کو میری مزاحمت سے تکلیف تو بہت ہوتی تھی مگر میرے خیال سے ضبط کئے بیٹھی رہتی تھی شاید دوسری لڑکی ایسا نہ کرسکتی۔ کبھی وہ کہتی کہ "وہ تو دوڑ کر میرے لئے یہاں آئیں اور میں انکی طرف مخاطب بھی نہ ہوں" —— یہ محض ایک فریاد ہوتی تھی اور جائز فریاد۔ لیکن نہ معلوم کونسی چیز مجھے اس فریاد کو بھی نظر انداز کر دینے پر قادر کردیتی تھی۔ حالانکہ یہ میں سمجھتی تھی کہ محبت کے ساتھ اس کی ہمت بھی بڑھ رہی ہے۔ اور اس خیال کے ساتھ ہی اس کا باغی چہرہ میرے تصور پر چھا جاتا تھا۔

جمال عموماً چھٹی کے وقت آیا کرتا تھا۔ اس لئے میں دیکھتی تھی کہ آخری گھنٹے میں شکیلہ کا دل کتاب سے اچاٹ ہوجایا کرتا تھا اور اس کی نظر بےچینی کے ساتھ محو جستجو اور صرف انتظار ہو جاتی تھی۔ خوش قسمتی سے درجہ پھاٹک کے سامنے تھا۔ میں ایسے وقت اپنا رخ دوسری طرف کر لیتی تھی۔ تاکہ اسے کسی قسم کی مزاحمت محسوس نہ ہو —— جس گرفتار محبت کو محبوب نوازی کی اجازت نہ ہو کیا اسے اس قسم کی جذبات نوازی سے بھی محروم رکھنا ظلم نہیں ہے؟

جب جمال آجاتا تو وہ میری طرف دیکھتی اور اس کی نگاہ کا انداز مجھے بتا دیتا کہ جمال آگیا۔ میں اسے لے کر چمن میں نکل جاتی اور چھا اچھوٹے چھوٹے پھولوں کے پاس بیٹھ کر اسے میٹھی میٹھی باتوں میں مشغول کرنے کی کوشش کرتی۔ چھوٹے درجوں کے بچے جن کا گھنٹہ خالی ہوتا پھولوں کی طرح چاروں طرف چھٹکے ہوتے۔ شکیلہ پھاٹک کی طرف اپنا رخ کئے ہوئے گم سم سی بیٹھی رہتی یا کبھی میری باتوں پر "ہوں" "ہاں" کر دیتی۔ اس کا کہیں اور ہوتا۔ اس کی نگاہ بھلی نہ بیٹھتی۔ جب جمال کو وہ دیکھ لیتی تو اس کا چہرہ تمتما اٹھتا لیکن جوں جوں وہ نظروں سے اوجھل ہوتا جاتا اس کے چہرے سے رونق زائل ہوتی جاتی —— جس طرح ایک شفاف آئینہ کے سامنے سے ایک سرخ بادل آہستہ آہستہ گذر جائے۔ میں اس وقت اس سے نظر نہ ملاتی تھی۔ زمین یا کسی پھول پر نظر جما کر اس سے بات کرتی تھی۔ اور اگر دیکھتی تھی تو چرا کر دیکھتی تھی۔ میں ڈرتی تھی کہ کہیں میری نگاہوں کی مزاحمت اس کے لئے مزید تکلیف کا باعث نہ ہو۔ میں جتنا زیادہ شکیلہ میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ جب ہمارے پاس کوئی اور لڑکی بیٹھ جاتی تو شکیلہ کے کرب کی حالت قابل رحم ہوجاتی۔ پھولوں کی پنکھڑیاں چٹکی سے مسل ڈالتی۔ آنسوؤں کو روکتے روکتے اس کی آنکھیں گلابی ہوجاتیں۔ اور بہت پیاری معلوم ہونے لگتیں۔ میں مذاق میں اس سے کہتی "کاش کوئی اور بھی تمہاری آنکھوں کے اس رنگ میں ڈوب سکتا!" وہ شرما کر گردن جھکا لیتی۔ پھر جب میں اس کا چہرہ اٹھاتی تو اس کے رخساروں کو آنسوؤں سے تر پاتی۔ میرا مقصد یہی ہوتا تھا کہ امڈے ہوئے بادل برس جائیں۔ اس وقت خدا جانے میرے دل میں کہاں کی قوت آجاتی تھی کہ ان باتوں کو برداشت کرلیتی تھی جنہیں بعد کو تنہائی میں یاد کرکے رونا آتا تھا۔

ایک دن وہ گھبرا کر کہنے لگی "آخر کب تک دونوں طرف سے یہ خاموشی رہے گی؟ میری قسمت کا ستارہ کہیں میری غفلت کی تاریکی

نہ ہو جائے !!"

میں نے سادگی کے ساتھ جواب دیا "تم آخر کر ہی کیا سکتی ہو؟ ب وہ مرد ہو کر کسی قسم کی جرأت نہیں کرتے تو تم تو عورت ذات ہو"

"فرض کرو وہ کبھی جرأت نہ کریں !" اس نے تیکھے پن سے جواب کا الیہ کیا۔ "اور جرات بھی کریں تو کس طرح۔ وہ سوچتے ہوں گے کہ نہ معلوم ان کی پیش قدمی کو پسند کروں یا نہ کروں۔ آخر انہیں اپنی عزت کا تو خیال ہے۔ وہ کیا جانیں کہ میری خاموشی بے اعتنائی نہیں بلکہ رت ہونے کی لاج ہے ؟ افسانۂ محبت کی سرخی ہمیشہ عورت کو اپنے نہ سے لکھنا چاہئے"

میں مرعوب ہو گئی لیکن فوراً حواس بجا کر کے نہایت بزرگانہ انداز ں سمجھایا کہ "شکیلہ ! جتنی دیر ہو اچھا ہے۔ اس معاملہ میں جلدی نہ کرنا ہئے۔ ممکن ہے ان کے جذبات محض وقتی ہوں۔ نہ معلوم وہ کس قسم کے می ہوں۔ نہ پتہ معلوم نہ نشان۔ خدا جانے تمہارے گھر والوں کے خیالات ہوں ـــــ"

"گھر والوں کے خیالات !!" اس نے انتہائی حقارت آمیز اور طنزیہ از میں دہرایا۔ اس کے بعد اس نے کہا "اول تو میرے والدین نے پوری طرح اطمینان دلا دیا ہے کہ میری شادی کے معاملے میں وہ میری ئے کو مقدم سمجھیں گے۔ لیکن اگر وہ سنگ راہ بنے بھی ـــ تو ـــ تو ـــ"

یدم ہو گئی۔ میں کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے بگڑ کر کہا "بس چپ رہئے" کی نگاہیں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ میں چپ ہو گئی۔ اس کے بعد وہ خوب ب مجھ پر برسی۔ میری بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کا غصہ بڑھتا گیا۔ میری وشی پر اسے اور غصہ آ رہا تھا۔ اس کا غصہ اور بڑھتا گیا۔ مجھے اس کے سوم غصہ پر ہنسی آ گئی۔ وہ تلملا گئی۔ غصہ اکدم اپنے تمام منازل طے کر گیا ! بادل گرج گرج کر آسمان پر امڈ رہے تھے۔ آخر انتہا یہ ہوئی کہ وہ رونے ی۔ جب خوب رو چکی تو اسے اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔ اس نے نادم کر میری طرف دیکھا۔ مسکرائی ـــ جیسے بارش کے بعد سورج کی کرنیں ی اونچے درخت کی سبز و نم پتیوں پر پڑ کر نہایت دلکش معلوم ہونے لگتی یں۔

"میں بھی بعض وقت کیسی بیوقوفی کی باتیں کرنے لگتی ہوں ـــ آخر دیوانی ہی تو ٹھہری"۔ یہ کہکر وہ میرے پاس سے چلی گئی۔ اسے یقین تھا کہ میں اسے معاف کر دوں گی اور میں نے واقعی اسے معاف کر دیا۔

چار پانچ ماہ یہی حالت رہی۔ نہ جمال اس سے آگے بڑھا نہ شکیلہ کو کسی قسم کی جرأت ہوئی۔ امتحان کے بعد یہ محفل بھی درہم برہم ہو گئی۔ میں نے جمال میں بذاتِ خود کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ مگر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے میں ایک شیریں خواب دیکھ رہی تھی جس کے دوران میں اکدم جگا دی گئی۔ کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ ایک ایسا وقت بھی آنے والا ہے جب نہ شکیلہ سے ملاقات نصیب ہو گی نہ جمال کا دیدار۔ شکیلہ کی کہانی کو میں اپنی کہانی سمجھنے لگی تھی۔ اس سے جدا ہوتے وقت مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں اپنی روح سے جدا ہو رہی تھی۔ شکیلہ کی بھی حالت غیر تھی جیسے نبضیں چھوٹ گئی ہوں۔ وہ بے حد ذی حس واقع ہوئی تھی۔ اور سر سے پیر تک جذبات۔ اسے ایسی چپ لگی تھی کہ میں دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ چلتے وقت بھی اس نے کچھ نہ کہا۔ ہاں مگر آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کے پتے لکھ لئے تھے۔ کیونکہ اسے گونڈے اپنے والد کے پاس جانا تھا جہاں وہ حاکم خزانہ تھے۔ ہم دونوں میں برابر خط و کتابت ہوتی رہی۔ جب دو محبت کرتے ہوئے دلوں کے درمیان سیکڑوں کوس کا فاصلہ واقعہ ہو تو خط اور تصور کے علاوہ روحوں کی ملاقات اور کیا ذریعہ ہو سکتا ہے ! شکیلہ کے خطوط بہت پر درد۔ دلگداز اور موثر ہوتے تھے۔ ان کے ذریعہ سے کل واقعات معلوم ہوتے رہتے تھے ـــ

اسکول کے بند ہونے کے بعد سے جمال نے شکیلہ کے مکان کے طواف میں زیادتی کر دی تھی۔ پھر اکدم اس میں کمی ہو گئی۔ جمال کچھ مغموم اور بدلا ہوا سا معلوم ہونے لگا۔ نوشابہ خاتون اپنی خالہ کے ہمراہ جودھپور چلی گئیں۔ اس کے بعد جمال کی آمد بالکل بند ہو گئی۔ شکیلہ دیدار کو بھی ترسنے لگی۔ اسے یکایک یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ جمال نوشابہ سے محبت کرتا ہو۔ شبہ پہلے بھی ہوا تھا۔ مگر اب تو اسے یقین ہو گیا تھا ـــ وہ مضطر تھی اور میں اس سے ملنے کے لئے بیتاب۔

اب تک تو مجھے امید بھی تھی کہ تعطیل کے ختم ہونے پر شکیلہ سے پھر اسکول میں ملاقات ہو گی۔ لیکن قسمت کے ہاتھوں وہ بھی منقطع ہو گئی۔ کیونکہ امی جان نے کہا "اب آگے پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں" جس کا مطلب

یہ تھا کہ اب میری شادی کر دی جائے گی۔ بات تو دو ماہ قبل ہی طے ہو چکی تھی مگر میں یہ نہ سمجھتی تھی کہ اسقدر جلد گرفتار کر دی جاؤں گی۔ میں نے اختتام تعلیم کا بہانہ رکھ کر اس کی مخالفت کی اور سخت مخالفت مگر والدین تو اپنے آپ کو حکمراں سمجھتے ہیں۔ لڑکوں کی نہیں چلتی تو پھر لڑکیاں کس شمار میں ہیں! جب ہر کوشش ناکام ہو گئی تو میں نے شکیلہ کو بھی لکھ بھیجا کہ "تمہاری بہن کو دیس نکالا دیا جا رہا ہے۔ اس میں تمہاری شرکت ضروری ہے۔ اسکول میں ملنے کی امید تو ٹوٹ گئی۔ اب یہیں آ کر مل جاؤ۔ تمہارے بغیر میرے غم غلط نہیں ہو سکتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس کا جواب جودھپور سے آیا اور بڑی وحشت اثر خبر لایا۔ لکھا تھا

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں گھبرا کر جودھپور چلی آئی۔ میرے شکوک صحیح نکلے۔ دل کا چور بے نام قاتل اسٹیشن ہی پر نظر آ گیا۔ غالباً لکھنؤ واپس جا رہے تھے۔ کیا اب بھی آپ میری بات نہ مانیں گی؟ کیا ان کا جودھپور جانا نوشابہ باجی کی وجہ سے نہ تھا؟ مگر کیا ستم ہے کہ وہ نوشابہ باجی کو چاہتے ہیں۔ اور نوشابہ باجی وکیل بھائی کو ـــــ محبت کسقدر اندھی ہے۔ اور قسمت کسقدر ظالم۔ لیکن اگر نوشابہ باجی کو بھی ان سے محبت ہوتی تو ان کے ملاپ میں کوئی مشکل نہ ہوتی ـــــ اور ـــــ شاید میں ان کے ملاپ کا منظر برداشت نہ کر سکتی۔ وہ میرے ہو کر رہیں یا کسی کے نہیں۔ اگر وہ کسی اور کی قسمت میں لکھے ہیں تو خدا کرے کہ میں اس لمحے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہوں۔ آپ مجھے حاسد کہیں گی۔ رقابت کا الزام لگائیں گی۔ لیکن پیاری سہیلی! میں مجبور رہوں۔ کاش آپ کو بھی کسی سے محبت ہوتی!

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور سب سے زیادہ تکلیف وہ خبر یہ ہے کہ کل سے نوشابہ باجی بھی اس موذی مرض میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ خدا اپنا فضل و کرم کرے۔ اب ہم لوگ یہاں سے بھاگ بھی نہیں سکتے۔ شاید میری بھی موت ہی مجھے یہاں لائی ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آپ کی شادی کی اچانک ضرور ہے اور بے موقعہ بھی۔ لیکن مسرور کن۔ مجھے آپ پہ بڑا رشک آتا ہے۔ آپ مجھ سے بہت زیادہ خوش قسمت ہیں۔ جو محبت نہیں کرتے وہی مزے میں رہتے ہیں! میں تو بے بلائے شریک ہوتی۔ لیکن اب کس طرح ممکن ہے؟ خدا سے دعا کیجئے کہ باجی اچھی ہو جائیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہرحال میری دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ لیکن جب ملوں گی تو آپ سے آپ کی شادی کی ایک دعوت ضرور لے لوں گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا حافظ۔" "تمہاری غریب شکیلہ"

اس خط نے میرے دل پر جو اثر کیا اس کو بیان نہیں کر سکتی۔ بار بار اس کے جملے میرے دماغ میں گردش کرتے تھے۔ شکیلہ کے شکوک کی تصدیق نوشابہ کی مہلک بیماری۔ شکیلہ کی ملاقات سے ناامیدی ـــــ یہ تھے وہ نشتر جو اس خط میں چھپے ہوئے تھے اور میرے دل میں کھٹک رہے تھے میں شکیلہ کو کس طرح یقین دلاتی کہ میں اپنی شادی سے واقعی نفرت کرتی تھی ـــــ وہی شادی جس کی وجہ سے اس نے لکھا تھا کہ میں تم پر رشک کرتی ہوں۔ اور محبت؟ ہاں۔ شکیلہ نے ٹھیک لکھا۔ مجھے یہ کہنے کا کوئی حق نہ تھا کہ میں محبت سے بہرہ مند ہوں کیونکہ مجھے اپنے جذبات پر قابو تھا۔

شادی کا دن جسے میں موت کا دن سمجھتی تھی۔ قریب آ گیا۔ اس کے دو روز پہلے شکیلہ کا ایک اور خط آیا جس میں نوشابہ کے انتقال اور شکیلہ کے نہ آسکنے کی خبر تھی۔ ہر وہ لمحہ جو گزر رہا تھا میری شادی کو میری نظر میں تلخ تر بناتا جا رہا تھا۔ ذرا زمانے کی سفاکی پر آنسو بہائیے کہ ایک ایسی ہستی جو میری روح سے اسقدر قریب تھی اپنی بہن کی موت پر ماتم کر رہی تھی اور اسی وقت یہاں میری شادی رچائی جا رہی تھی۔ اور ان لوگوں کے نزدیک شادی کے ملتوی کرنے کی ضرورت کیوں نہیں تھی؟ اس لئے کہ ہم میں اور ان میں کوئی رشتہ داری تو تھی نہیں۔ سبحان اللہ! کیا دلیل تھی!

آخر میری شادی ہو گئی۔ اور اس رات کو جسے حیات انسانی کی زریں رات کہا جاتا ہے۔ بجائے اپنے شوہر کے انتظار کے جمال اور شکیلہ کے قصہ پر غور کر رہی تھی۔ بجائے اس کے کہ ان لمحات رنگین سے کسب لطافت کرتی اور حسن رومانیت سے لطف اندوز ہوتی۔ میں اس وقت یہ سوچ رہی تھی کہ اگر انسان کی زندگی زہر کا کڑوا جام بن جائے تو اس کے پینے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ جو جانور قربانگاہ پر چڑھایا جاتا ہے اسے اپنے جلاد کی شخصیت کے متعلق اتنی کاوش نہیں ہوتی۔ وہ کوئی بھی ہو۔ اس کے دل و دماغ پر تو محض یہ خیال چھایا ہوتا ہے کہ "میں قربان ہو رہا ہوں"۔ میں لرز ضرور رہی تھی۔ لیکن یہ جوش انتظار نہ تھا بلکہ تصادم اجنبیت کا کھٹکا ـــــ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ میرا شوہر۔ میرا نامعلوم خدا۔ خود جمال تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں

ئں یاروئں۔ وہ پیکرِ خیال جسے میں نے قسمت کی رسائی کے ملو را
ہ کر چھوڑ دیا تھا۔ بھلا دیا تھا۔ شکیلہ کو سونپ دیا تھا۔ میری آنکھوں کے
منے تشکل پذیر نظر آ رہا تھا۔ میں بدحواس ہو گئی۔ مجھ کو یقین نہ آتا تھا کہ میرے
منے وہی بت تھا۔ جس کی پرستش کی رازدارانہ ــــ غیر محسوس حد تک
زدارانہ۔ خواہش میرے قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں پوشیدہ تھی اور
ب ابھر ابھر کر دل و دماغ سے ٹکرا رہی تھی۔

لیکن ــــ شکیلہ کے خیال نے ساری خوشی پر پانی پھیر دیا
رے ضمیر کو جگا کر۔ مجھے ہوش میں لا کر میرے رباب کو توڑ دیا۔ جس میں ہزاروں
ے گنگنا رہے تھے۔ قدرت کسقدر ستم ظریف واقع ہوئی ہے! اب میں
یلہ کو کس طرح منہ دکھاؤنگی؟ کون سا عذر اس کے سامنے پیش کرونگی؟
کر اسے دلاسا دوں گی؟ وہ کیا خیال کرے گی؟ کیا وہ مجھے مکار اور دغاباز
ور نہ کرے گی؟ میں اس معاملہ میں اسے ہمیشہ روکتی رہی تھی۔ اس کا
للب اب وہ کیا نکالے گی؟ اس نے اپنے خط میں حد درجہ کی رقابت
تی کا اظہار کیا تھا ــ کہ "وہ میرے ہو کر رہیں یا کسی کے نہیں" وہ ہرگز
ے معاف نہ کرے گی۔ اور اگر معاف بھی کر دیا تو وہ اسقدر نازک دل ہے،
اس اذیتِ قلبی سے ہرگز جانبر نہ ہو سکے گی۔ میں جانتی ہوں کہ عورت کی
رت کیا ہے۔ وہ غیروں سے اتنی رقابت نہیں رکھتی جتنی اپنوں سے
ا کوئی قصور نہیں۔ لیکن میں اسے اپنی بے گناہی کا کیونکر یقین دلاؤنگی؟
شکیلہ کی سمجھ میں یہ بات آ جائے گی کہ یہ محض اتفاق تھا یا قدرت کا اک
لے سا مذاق۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی جانتی تھی کہ جمال پر واقعی حق
لیلہ ہی کا تھا۔ اس نے اس کی یاد میں راتیں جاگ جاگ کر کاٹی تھیں
ہنے اس کے تصور کی مورتی پر آنسوؤں کے موتی چڑھائے تھے اور وہ اسکی
ر ہر مصیبت کو برداشت کرنے کے لئے تیار تھی ــــ اگر انسان کے پاس
یر نہ ہوتا تو وہ چین سے ہوتا۔ لیکن کسقدر خود غرض! کسقدر بے حیا!

جمال میری مسہری پر بیٹھ گیا جس سے میرا سلسلۂ خیال ٹوٹ گیا۔
ن میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ میں اس وقت مسرور تھی اور تا حد مدہوشی
ور تھی۔ لیکن مجھے تکلیف بھی تھی۔ اور نزع کی سی تکلیف!!

جمال کا پہلا جملہ افسردہ۔ میرے لئے اس کا برداشت کرنا بہت
... وہی شخص ... کر وہی سمجھ سکتا ہے۔ جس نے اپنے محبوب کو مغموم دیکھا
ہو۔ میں یہی سمجھ رہی تھی کہ ان کی افسردگی کا باعث میں ہی کمبخت تھی کیونکہ
میں ان کی محبت میں حائل ہوئی تھی ــــ خواہ وہ محبت نوشابہ کے لئے ہو
خواہ شکیلہ کے لئے۔ وہ بہت دیر تک یونہی افسردہ بیٹھے رہے۔ ہر لمحے کے ساتھ
ان کی افسردگی بڑھتی جاتی تھی۔ میں بولنا چاہتی تھی مگر ہمت نہ ہوتی تھی۔ حیا
اجازت نہ دیتی تھی۔ آخر ان کی حسین آنکھوں سے ایک رقیق موتی ڈھلک کر
دامن میں جذب ہو گیا۔ اور دوسرا گوشۂ چشم میں دمکنے لگا۔ ان کو اس حال
میں دیکھ کر میں کس طرح چپ رہ سکتی تھی۔ میں نے بولنے کا تہیہ کر لیا۔ کئی بار
آواز سرمہ در گلو ہو کر رہ گئی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میرے جسم میں لرزش
تھی۔ آخر میں اتنا کہنے میں کامیاب ہو گئی کہ

"آپ روتے کیوں ہیں؟ میرا کوئی قصور نہیں"۔

میرے جملے کے آخری ٹکڑے سے وہ چونکے پھر تھوڑی دیر کے بعد بولے

"میں آپ کی حالت پر افسوس کر رہا ہوں۔ میرے ساتھ آپ کی
شادی کر کے آپ پر ظلم کیا گیا ہے"۔

میں نے دبی آواز میں جواب دیا۔

"آپ کو میری قسمت پر رائے زنی کرنے کا کیا حق ہے؟"

وہ مسکرائے۔ مگر پھر سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

"مجھے آپ سے ہی نہیں بلکہ کسی سے شادی کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔
میں حسن پرست ہوں۔ حسن پرست کو شادی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس کی
فطرت کا یہی تقاضا ہے کہ وہ ناکام رہے۔ حسن پرست حسن کی دھیمی سے دھیمی
کرن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور عورت ایک حقیر سے حقیر ذرہ کی
رقابت کو برداشت نہیں کر سکتی" بیوی توجہ چاہتی ہے اور میں لاابالی۔
اس کے علاوہ حسن پرست کی زندگی اسی میں مضمر ہے کہ اس کی منزل اس سے
گریزاں رہے۔ اس کی فطرت ایک دائمی تعقب چاہتی ہے ــــ"

"میں اس نکتۂ حسن پرستی کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن
میں اتنا جانتی ہوں کہ سب عورتیں یکساں نہیں ہوتیں۔ اس کے علاوہ
اگر عورت کو محبت ہو تو محبت کی خاطر وہ سب کچھ کر سکتی ہے"۔ میں نے ڈرتے
ڈرتے کہا۔

"محبت؟ ــــ عورت کی محبت! یہ صرف دور سے مجھے ترسانے کیلئے
پیدا ہوئی ہے"۔ اس نے انتہائی تلخی کے ساتھ کہا۔

یہ سنکر مجھے بیحد تعجب ہوا ——— وہ جمال جس پر عورت جان دیتی تھی وہ جمال جو شکیلہ کا خدا تھا۔ وہ جمال جس کی پرستش خاموش میرے دل کی معمول تمنا تھی۔ وہ جمال جس نے میری نظر کے سامنے حسین ترین پیکر ہائے دوشیزگی کو مجروح کر دیا تھا۔ عورت کی محبت کے لئے ترس رہا تھا! اس پر مجھے یقین نہ آتا تھا۔ کم از کم اس پردہ ہستی پر تو کوئی عورت میری نظر میں ایسی نہ تھی۔ جو جمال کی دعوت محبت کو ٹھکرا سکتی۔

میں نے موقعہ کو غنیمت جان کر کہا۔

"یہ آپ کا خیال ہے ——— شکیلہ سے زیادہ کوئی عورت محبت نہیں کر سکتی"۔

"شکیلہ کون ہے؟" اس نے حیرت کے ساتھ دریافت کیا۔ پھر میرا باریک گھونگھٹ ہٹاتے ہوئے کہا۔ "چہرہ کھول کر مجھ سے باتیں کیجئے مجھے الجھن ہوتی ہے۔ بہت دیر سے اس الجھن کو برداشت کر رہا ہوں"

مجھے دیکھنے کے بعد اس نے پوچھا۔

"کیا میں نے آپ کو اس سے پہلے کہیں دیکھا ہے؟"

میں نے سادگی کے ساتھ جواب دیا۔

"کیا گرلس اسکول کا ڈرامہ آپ کو یاد نہیں؟"

اس نے گھبرا کر کہا۔

"اتنی باتیں مجھے یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ اس قسم کی صورت میں نے اس سے پہلے بھی کہیں دیکھی ہے"

اس کے بعد وہ مسہری کے تکیہ سے ٹیک لگا کر کسی خیال میں ڈوب گیا۔

——— یکایک اس نے پھر سوال کیا۔

"اچھا یہ شکیلہ کس کا نام ہے؟"

میں گھبرا گئی کہ اس کا جواب کیا دوں۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے جواب سے ایک بہت بڑی اہمیت اور ذمہ داری وابستہ ہے میں نے یہی بہتر سمجھا کہ اس جواب کو دوسرے موقعہ کے لئے اٹھا رکھوں اس وقت کسی طرح ٹال دوں۔ میں نے کچھ دیر توقف کر کے کہا۔

"میں یہ آپ کو نہیں بتا سکتی۔ کسی ناکام کو بدنام کرنے سے کیا فائدہ؟"

"بدنامی کی اس میں کیا بات ہے؟"

"کیوں نہیں۔ بدنامی بھی بے عزتی بھی"

"وہ کس طرح؟"

"اگر کوئی شخص کسی سے محبت کرتا ہے۔ لیکن دوسری طرف سے خواہ خواہ جواب نہیں ملتا تو اس کے لئے خاموشی ہی بہتر ہے۔ کم از کم دوسرے کی نظر میں حقیر تو نہ ہوگا۔ شکیلہ آپ سے محبت کرتی ہے اور اپنے دل کی پوری قوت کے ساتھ محبت کرتی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے آپ کو اس سے محبت نہیں آپ کو اس کا نام تک نہیں معلوم ——— میں اس کی راز دار تھی اور اسی راز داری کا پاس ہے کہ میں اس کا نام و نشان اس کے دیوتا کے سامنے بھی افشا کرنا نہیں چاہتی ———"

اس نے بات کاٹ کر کہا۔

"خدا کے لئے میرا دماغ خراب نہ کیجئے۔ یا الٰہی میں کس قدر گنہگار ہوں خدا کے لئے بتا دیجئے کہ شکیلہ کون ہے اور اس کے متعلق آپ کیا جانتی ہیں۔ ——— لیکن نہیں آپ میری منکوحہ ہیں آپ مجھے نہیں بتا سکتیں۔ نہ مجھے آپ سے پوچھنا چاہئے۔ مجھے کسی سے نہ پوچھنا چاہئے۔ مجھے شکیلہ کے بارے میں نہ معلوم ہو یہی بہتر ہے۔ کیونکہ میرا دل بہت رقیق ہے۔ شاید میں اپنے فرائض بھول جاؤں ———"

میں نے پر مذاق انداز میں کہا۔

"حسن پرست بھی فرائض کا احترام کرتے ہیں؟"

اس نے فوراً جواب دیا۔

"ہاں۔ حسن پرست بھی شریف ہوتے ہیں ——— لیکن دیکھئے میں شوہر ہونے کے کس قدر ناقابل ہوں۔ ہماری شادی کی یہ پہلی رات جو خوشبو میں بسی ہوئی ہے۔ اس کا تقاضہ یہ تھا کہ میں آپ سے اظہار محبت کرتا اور اگر جھوٹ بولتے مجھے شرم آتی تو کم از کم آپ کے حسن کی تعریف کرتا اس موقعہ کی رومانیت پر نغمہ سرائی کرتا اور محبت بھری باتیں کرتا۔ لیکن ان تمام فرائض کو نظر انداز کر کے میں آپ سے اس ہستی کا نام و نشان پوچھ رہا ہوں۔ جس سے قدرتاً آپ کو رقابت ہونا چاہئے ——— یہ میری کتنی بڑی غلطی ہے آپ ہی بتائیے کہ کیا مجھے شادی کرنا چاہئے تھی؟"

میں دم بخود تھی وہ کانپ رہا تھا۔ آخر میں نے کہنا شروع کیا۔ میں دوسری عورتوں کی طرح رقابت پرست نہیں۔ اس کے علاوہ میں شکیلہ کی دوست تھی اور رازدار۔ لہٰذا میری کوشش ہو

کہ آپ کا اور شکیلہ کا ملاپ ہو جائے۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی کو کیا کیا جاؤ کہ آپ کی شادی میرے ساتھ لکھی تھی ——— میں اس کو اپنی انتہائی خوش قسمتی سمجھتی لیکن ضمیر کی سرزنش ہمارے عیش کو برباد کر دے گی اور شکیلہ کی آہ ہمارے آشیانے کو خاک کر ڈالے گی۔ میں اسے کس طرح یقین دلاؤں گی کہ میں نے آپ سے جان کر شادی نہیں کی۔ میں اب بھی ہر اس صورت کے لئے تیار ہوں جس سے آپ دونوں ایک دوسرے کے ہو جائیں ——— رہا یہ خیال کہ رقابت کیوجہ سے میں اس کا نام و نشان نہ بتاؤں گی بالکل غلط ہے۔ وہ میری ایک ہم جماعت تھی اس سے زیادہ مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ اور خواہ یہ معلوم ہو یا نہ ہو کہ وہ کیا ہے کون ہے کہاں ہے۔ یہ معلوم ہو جانا بہت کافی ہے کہ وہ آپ سے محبت کرتی ہے اور سچ پوچھئے تو بمقابلہ میرے آپ اس سے زیادہ واقف ہیں ——— "

جمال ہنس پڑا۔ اس نے کہا۔

"یہ آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں کہ میں بمقابلہ آپ کے زیادہ واقف ہوں ——— یہ شاید آپ رقیبانہ انداز سے کہہ رہی ہیں ——— رہی میرے اور شکیلہ کے ملاپ کی صورت تو اس امر کے متعلق میں اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ قسمت پر صبر کرنا سب سے بڑی شرافت ہے۔ میں نے آپ سے شادی کی ہے تو تادم آخر اسے نباہونگا ——— اور اس کی خاطر حسن پرستی! ——— ہاں حسن پرستی کو بھی چھوڑ دینے کی کوشش کروں گا"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"ایسا وعدہ نہ کیجئے جو پورا نہ ہو سکے۔ حسن پرستی بالارادہ کون کرتا ہے یہ چیز تو جزو فطرت ہوتی ہے"

اس نے کہا۔

"ہاں یہ آپ ٹھیک کہتی ہیں ——— لیکن میں آپ کو بتانا یہ چاہتا ہوں کہ میں آپ کا کتنا احترام کرتا ہوں ——— کیونکہ میں سب کچھ ہوں کمینہ نہیں ہوں"

"خدا کے لئے ایسی ترغیب کی باتیں نہ کیجئے کہ میں اپنے فرض کو بھول جاؤں میں آپ کے اس احترام کی قدر کرتی ہوں اور اس پر نازاں ہوں ——— لیکن آپ کی شرافت کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ اس ہستی کا خیال کیجئے جو آپ سے محبت رکھتی ہے ——— میں شکیلہ کے بارے میں کہہ رہی ہوں"

"مجھے آپ کی زبان سے یہ باتیں سنکر سخت تعجب ہو رہا ہے ——— آپ کی باتیں انسانی فطرت کے خلاف ہیں"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ اگر یہ باتیں دنیا کے سامنے پیش کی جائیں تو وہ ہرگز اسے باور نہ کریں گے کیونکہ زیادہ تر لوگ خود غرض ہوتے ہیں۔ اسقدر خود غرض کہ خود غرضی کو وہ انسانی فطرت سمجھنے لگے ہیں ——— لیکن میں کہتی ہوں کہ اگر انسان کے پاس ضمیر نہ ہوتا تو وہ واقعی خود غرض ہوتا اور دلیر خود غرض"

"تو پھر آپ ہی بتائیے میں اس معاملہ میں کیا کر سکتا ہوں"۔

"اچھا یہ بتائیے کہ آپ کو کبھی کسی سے محبت ہوئی ہے؟ آپ نے کبھی کسی کی گلیوں کی خاک چھانی ہے"

"آپ کو معلوم نہیں کہ حسن پرست گلیوں کی خاک چھاننے ہی کیلئے پیدا ہوا ہے؟"

"ہاں ۔ مگر حسن پرست کو محبت نہیں ہوتی ——— وہ ہر دھوکے کو محبت سمجھ لیتا ہے"

"لیکن کیا ان دھوکوں کے حسین ہونے سے آپ کو انکار ہو سکتا ہے؟

——— سنئے میں آپ کو اپنے حالات سناتا ہوں ——— حقیقتاً مجھے آج تک کسی عورت سے محبت نہیں ہوئی۔ قطع نظر اس عالمگیر جذبۂ محبت سے جو ہر حسن پرست کے دل میں قدرت ودیعت کر دیتی ہے۔ ایک بار دھوکا ہوا تھا۔ لیکن وہ بھی بہت جلد جاتا رہا۔ میرا افسانہ جس کو میں "دھوکا" کہتا ہوں۔ آپ کے اسکول کے ڈرامہ سے شروع ہوا۔ میں ہمیشہ سے حسن پرست واقع ہوا تھا اور ایک خوش نصیب حسن پرست کیونکہ "حسن" خود میری نظر کا گرویدہ۔ میری جنبش نگاہ کا تابع نظر آتا تھا۔ مجھے اس یقین میں بڑی لذت محسوس ہوتی تھی کہ ہر عورت مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اور میں جس پر چاہوں حکومت کر سکتا ہوں۔ ممکن ہے یہ دھوکا ہی ہو۔ اور محض مغالطہ مگر بڑا حسین دھوکا تھا اور بڑا رنگین مغالطہ۔ میں اپنی زندگی اسی دھوکے میں مبتلا رہ کر گذار دینا چاہتا تھا۔ اور کبھی یہ جاننا ہی نہ چاہتا تھا کہ یہ دھوکا ہے۔ میں حسن کا دلدادہ تھا۔ وہ جہاں ہو جس میں ہو۔ جس رنگ میں ہو۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ حسن کا بہترین مظہر "عورت" ہے لیکن حسن ایک شخصیت میں محدود نہیں ہو سکتا اور ہر پیکر جمیل کو میں حاصل نہیں کر سکتا

[redacted]

اس لئے سب سے بہتر میں اس بات کو سمجھتا تھا کہ سب کی تمنا کی جائے لیکن کسی کو حاصل نہ کیا جائے۔ چنانچہ میں شادی سے بھی متنفر تھا۔ کسی ایک ذات میں اتنا ڈوب جانا کہ پھر کسی اور میں حسن نظر ہی نہ آئے اسکو میں اندھا پن سمجھتا تھا۔ حسن کا کوئی "آئیڈیل" نہیں۔ دنیا کی تمام عورتوں میں کوئی ایک عورت بھی ایسی نہیں جو یہ دعویٰ کر سکے کہ "میں سب سے زیادہ حسین ہوں" جس طرح ہر پھول اپنی جگہ پر پھول ہوتا ہے اور کسی ایک پھول کو حسین ترین پھول۔ یا آئیڈیل پھول کی حیثیت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ گلاب زیادہ حسین ہوتا ہے یا کنول؟ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ ایک متین و سنجیدہ لڑکی زیادہ حسین ہوتی ہے یا شوخ اور چنچل؟ کم از کم میں تو آج تک نہیں طے کر سکا۔ میری نظر میں دونوں اپنی اپنی جگہ پر قیامت ہیں۔ لہذا مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی ایک ہستی کے لئے پیدا نہیں ہوا ہوں بلکہ دنیا کے تمام حسن کے لئے۔ لیکن جس روز میں نے نوشابہ کو اس ڈرامہ کے موقعہ پر طاؤسی ساری پہنے ہوئے دیکھا۔ اس روز مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے میں صرف اسی ایک ذات کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ اور دنیا کا مجموعی حسن وہی ہے۔ میں نے اپنی حسین اور دلکش زندگی کی لذت کو نوشابہ کی آرزو پر قربان کر دیا۔ مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ نوشابہ کو خدا نے مجھ سے دنیا کے مجموعی حسن کی دل آزاری کا انتقام لینے کی غرض سے پیدا کیا تھا۔ دنیا کی ہر عورت کے لئے مجھ میں دلکشی تھی مگر نوشابہ کیلئے نہ تھی۔ مجھ سے محبت کرنا تو درکنار وہ میری طرف دیکھتی بھی نہ تھی۔ اسکی اس بے نیازی اور بے توجہی سے میرے پندار کو ٹھیس لگی۔ میں نے اسپر قابو پانے کی کوئی ممکن صورت اٹھا نہ رکھی۔ جب میری ہر کوشش ناکام ہو چکی تو میں اس نتیجے پر پہونچا کہ نوشابہ جانتی ہی نہیں محبت کیا چیز ہے اس کا دل سرد ہے۔ اس میں جذبات پیدا ہی نہیں ہوتے۔ خدا نے اس سے اس کی زندگی کا جوہر اس کا اصلی حسن چھین لیا — میرے نزدیک محبت انسان کی روح کا حسن ہے۔ حسن بغیر محبت کے اس جڑاؤ لیمپ کی طرح ہے جو اوپر سے بہت خوبصورت ہو۔ لیکن اندر سے روشنی نہ ہو۔ اعضا کا تناسب بہتر سے بہتر ہو۔ چہرے کی تراش حسین سے حسین ہو لیکن اگر دل میں محبت کے جذبات نہیں ہیں تو حسن بے جان ہے نگاہ میں محبت کا رنگ نہیں ہے تو آنکھیں بے نور ہیں۔ محض تناسب اعضا پر جان دینے کو جی نہیں چاہتا لیکن محبت بھری نگاہ پر سو زندگیاں ملیں تو وہ بھی نثار کی جا سکتی ہیں۔ حسن مخاطب ہی زہد شکن ہوتا ہے حسن کی برگشتگی بھلی نہیں معلوم ہوتی — چنانچہ جب میں نے نوشابہ میں یہ کمی محسوس کر لی تو میری نگاہ میں اس کا حسن کم ہو گیا۔ میری پسندیدگی ختم ہو گئی۔ میری آرزو مر گئی۔ لیکن محبت شاید اب بھی میری رگ رگ میں چھپی ہوئی ہے۔ اکثر بیٹھے بیٹھے اس کا خیال آجاتا ہے جب کبھی کسی میں اس کی مشابہت دیکھ لیتا ہوں تو تڑپ اٹھتا ہوں اور "نظارے" کو "جنبشِ مژگاں" بھی "بار" ہو جاتی ہے۔"

اتنا کہکر وہ دم لینے کے لئے رک گیا۔ ایک ٹھنڈی سانس لی اور مجھ سے پان کی فرمائش کی۔ میں پان بنانے میں مصروف ہو گئی تو اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"اس آرزو سے دست بردار ہو کر اس عارضی دیوانگی سے رخصت ہو کر میں پھر اپنی پہلی زندگی میں آگیا۔ جہاں حسن ہی حسن تھا۔ جہاں محبت ہی محبت تھی۔ جہاں نگہ بندہ نواز اور عشرتِ نظارگی سے زینت حیات تھی۔ جہاں ناکامی حیات سوز نہ تھی بلکہ سرمایۂ لذات۔ اور باعثِ جذبات مجھے اپنی دیوانگی پر افسوس آیا کہ میں نے ایک دھوکے میں مبتلا ہو کر اس فضائے حسن و محبت سے کیوں منہ پھیر لیا تھا!!"

میں نے پانوں کی تھالی اس کی طرف کھسکا دی۔ اس نے ایک پان اٹھا کر کھا لیا اور پھر کہنے لگا۔

"جب میں جودھپور سے واپس آیا جہاں نوشابہ اسکول کے بند ہونے کے بعد چلی گئی تھی تو یہ معلوم ہوا کہ میری شادی کی تاریخ بھی طے ہو چکی ہے۔ گویا ایک قفس سے نکلنے کے بعد میرے لئے دوسرا قفس تیار تھا۔ میں اپنی زندگی کو اپنی فطرت کو اپنی حسن پرستی کو نذرِ قفس کرنا نہ چاہتا تھا — مگر — قدرت کی ستم ظریفی سے خدا بچائے۔ ایسے شکنجے میں کس دیتی ہے کہ اس سے نکلنا محال ہو جاتا ہے — اچھا ہٹائیے ان باتوں سے کوئی بحث نہیں کہ میری شادی کیسے ہوئی۔ آپ کی جو فرمائش تھی وہ میں نے پوری کر دی —"

اس کے اس مقام پر رکجانے سے مجھے تکلیف ہوئی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ یہ بھی بتا دے کہ میری شادی اس کے ساتھ کیسے ہوئی۔ لیکن میں اصرار کس طرح

کر سکتی تھی۔

اس کی باتیں سنکر اور یہ خیال کرکے کہ نوشابہ جس نے جمال کو اسقدر موہ لیا تھا اس دنیا کو خیرباد کہہ چکی تھی۔ اور اس کی جمال کو مطلق خبر نہ تھی۔ میرا دل بھر آیا۔ میں نے اپنے اس سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن میرے دماغ میں ایک انوکھا خیال آیا۔ وہ یہ کہ جب نوشابہ کے حسن نے جمال کو موہ لیا تھا تو شکیلہ کا حسن بھی ضرور اسے موہ لے گا۔ کیونکہ وہ دونوں ایک ہی طرز ادا اور ایک ہی رنگ میں پردۂ ہستی پر رونما ہوئی تھیں ——— میں سوچنے لگی اور انتہائی انہماک کے ساتھ سوچنے لگی۔ میرا دل شکیلہ کے لئے رو رہا تھا۔ میں اپنی ہر مسرت اور ہر تمنا کو قربان کرکے شکیلہ کو محبت میں کامیاب دیکھنا چاہتی تھی۔ میں اپنے ضمیر کی تشفی کرنا چاہتی تھی۔

میں سوچ رہی تھی اور بڑی امیدوں کے ساتھ سوچ رہی تھی۔ میں تھوڑی دیر کے لئے جمال سے بے خبر سی ہو گئی تھی۔ اب ہوش میں آئی تو اسے ایک عجیب لے میں ایک بے پناہ دھیمے ترنم کے ساتھ اس شعر کو گاتے ہوئے سنا کہ ؎

تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی ؏ ہاں مگر چین سے بسر نہ ہوئی

وہ مسہری کے تکیہ سے ٹیک لگائے لیٹا تھا۔ نگاہیں چھت کی طرف تھیں۔ اور اب وہی غم انگیز شیریں راگ چھیڑے ہوئے تھے کہ ؎

تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی ؏ ہاں مگر چین سے بسر نہ ہوئی

میں جمال کے ساتھ اپنے دن ایک مہمان کی حیثیت سے گذار رہی تھی۔ دل اس کے گھر کو اس کی ہر چیز کو خود اس کو اپنا سمجھنے پر آمادہ ہوتا تھا لیکن شکیلہ کا خیال قدم جمنے نہ دیتا تھا۔ سکون مکمل ہونے سے پہلے اضطراب میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ خیالات مجتمع ہوتے ہی پھر منتشر ہو جاتے تھے۔ جمال حسن پرست تھا لیکن مکمل ہونے سے پہلے اضطراب میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ خیالات مجتمع ہوتے ہی پھر منتشر ہو جاتے تھے۔ جمال حسن پرست تھا لیکن مجھے اس سے شکوہ نہ تھا۔ میں جانتی تھی کہ ایک حسن پرست کے ساتھ زندگی کس طرح خوشگوار رہ سکتی ہے۔ اور اس معاملہ میں میں شکیلہ میں بہت سی کمیاں دیکھتی تھی۔ جمال مجھ میں زیادہ دلچسپی نہ لیتا تھا۔ لیکن میں خود اس میں پوری طرح دلچسپی لیتی تھی ——— وہ مجھے پسند ضرور کرنے لگا تھا۔ مگر محض ایک موزوں اور قابل قدر "شریک زندگی" کی حیثیت سے۔ میں یہ بھی دیکھ رہی تھی۔ کہ یہ پسندیدگی رفتہ رفتہ محبت بن رہی تھی۔ لیکن اس سے میں خائف تھی کیونکہ اس سے جمال اور شکیلہ کے درمیان کی دیوار اور سنگین ہو رہی تھی

ایک روز پھر میں نے جمال کو ٹٹولنے کے لئے شکیلہ کا قصہ نکالا۔

وہ تلملا گیا۔ اور ایک شدید روحانی کرب کے ساتھ اس نے کہا۔

"خدا کے لئے اس کا ذکر نہ کرو۔ جس خیال کو میں بھلا دینے کی کوشش کر رہا ہوں تم اسے کیوں جگاتی ہو؟ مجھے اب اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے۔ کہ تمہارے علاوہ کسی اور کے ساتھ میں ازدواجی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ میں شکیلہ کے آگے شرمندہ ہوں۔ اور اس سے معافی مانگنے کے لئے تیار لیکن میں اپنے بنے گھر کو اجاڑنے پر ہرگز تیار نہیں ہو سکتا اور کیا معلوم یہی ہمارے اور شکیلہ دونوں کے حق میں بہتر ہو۔ اگر شکیلہ محبت کرتی ہے تو کرے۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن اس محبت میں جو تکلیف ہو اس کا برداشت کرنا بھی اس کا فرض ہے۔ یہی محبت کی عظمت ہے اس کے علاوہ محبت میں شادی کوئی لازمی چیز نہیں۔ اگر بغیر شادی کے قربت میں دوام حاصل ہو سکے تو کوئی شادی نہ کرے۔ شادی محض جدائی کے ڈر سے کی جاتی ہے ——— دیکھو اب میرے قدموں کو لغزش کا سبق نہ دینا"

میں نے کہا۔ "اگر نوشابہ آپ کو محبت کی دعوت دے اور خود حاضر خدمت ہو کر محبت کی بھیک مانگے؟"

وہ بیتاب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے مسکراتا ہوا چھوڑ کر باہر چلا گیا یہی اس کی کمزوری تھی۔ اور اسی سے میں نے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا تھا۔

والد صاحب کا تبادلہ گونڈے سے گورکھپور ہو گیا۔ مجھے دو ماہ لکھنؤ میں رہنے کے بعد وہیں بلا لیا گیا۔ عید کا چاند وہیں دیکھا تھا۔ اسکول کھلنے پر شکیلہ لکھنؤ آئی لیکن میں اس وقت گورکھپور میں تھی۔ اس کا بہت بیتابانہ شکوے شکایت کا خط گونڈے ہوتا ہوا گورکھپور پہونچا۔ مجھے شکیلہ سے اس قدر شرم معلوم ہونے لگی تھی کہ میں اسے خط لکھتے بھی جھجکتی تھی۔ اس سے ملنے کے لئے جی بیچین ضرور تھا مگر جب اس کا سامنا کرنے کا خیال آتا تھا۔ تو میرا عجیب حال ہو جاتا تھا۔

تقریبًا ایک سال تک ہم دونوں ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ آخر لکھنؤ سے خط آیا کہ جمال کے والد پر فالج گر گیا ہے اور حالت نازک ہے۔

ہم سب جیسے بیٹھے تھے۔ ویسے ہی اٹھے چلے گئے۔ لیکن ہمارے پہونچنے سے پہلے ہی وہ اس دارِ فنا کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ جمال کا برا حال تھا۔ اسے اپنے والد سے غیر معمولی محبت تھی۔ ان کے انتقال سے جمال کی مشغولیت میں اضافہ ہوگیا۔ کیونکہ جائداد کا کام اب اسے خود دیکھنا تھا۔ اب گھر میں وہی سب کا مربی تھا۔ اس کی آزادی تکلیف دہ حد تک محدود ہوگئی۔ گویا ایک قدرتی دریا کو جو مظاہر فطرت سے اٹکھیلیاں کرتا ہوا بہ رہا تھا پختہ نہر بنا دیا گیا۔ جمال جیسے لاابالی طبیعت رکھنے والے کو جو تکلیف ہونا چاہئے ظاہر ہے۔ وہ اب کافی سنجیدہ اور متفکر رہنے لگا تھا۔ مجھے افسوس ہوتا تھا کہ مجھ سے اس کا دل نہ بہلتا تھا۔

ایک روز شام کو جمال گھوم کر لوٹا تو پیشانی پر شکن تھی جو خیالات کی گہرائی کی شاہد تھی۔ ہونٹ خشک تھے اور ان کو وہ زبان سے نم کرنا بھول گیا تھا۔ صندلی رنگ مائل بہ زردی تھا۔ آنکھیں ایک زخمی ہرن کی آنکھوں کی طرح اظہار بے بسی کر رہی تھیں۔ باتوں کا جواب ملتا تھا مگر بہکا بہکا سا میں سمجھ گئی کہ دل پر کوئی تازہ چوٹ لگی ہے۔

"کس کو دیکھ لیا؟" میں نے خوش مزاجی کے ساتھ دریافت کیا۔ وہ گھبرا گیا۔

"کسی کو نہیں"۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ اور پہلے سے بھی زیادہ مغموم ہوگیا۔ جیسے چراغ کی لو ہوا کے جھونکے سے بھڑک کر پھر مستقل ہوگئی۔ آہ۔ وہ جب مغموم ہوتا تھا تو اس کے حسن کو چار چاند لگ جاتے تھے۔ میں تھوڑی دیر تک تو اسے حریصانہ نگاہ سے دیکھتی رہی اس کے بعد از سرِ نو اصرار شروع کیا۔

بڑی منتوں کے بعد آخر کار اس نے بتانا شروع کیا کہ

"آج میں غلطی سے نوشابہ کے مکان کی طرف سے گذر رہا تھا کہ سامنے وہ غارتگر ہوش نظر آگئی — اور — امید کے خلاف متوجہ تھی اور مائل بہ کرم — میں تڑپ جانے پر مجبور تھا۔ میں اگر اسے نہ دیکھوں تو اس سے بے نیاز رہ سکتا ہوں۔ لیکن اگر وہ سامنے ہو اور نگاہ بندہ نواز کے ساتھ۔ تو پھر میں اپنا نہیں رہتا۔ اسی خطرے کے خیال سے میں نے ادھر سے نکلنا بھی ترک کر دیا تھا — لیکن آج — آج —"

وہ چپ ہوگیا۔ اسے واقعی دلی تکلیف تھی۔ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا ساتھ ہی مجھے حیرت بھی تھی کہ اس نے نوشابہ کو کہاں سے دیکھ لیا۔ کیا یہ حسن جمال کے تخیل کی کارفرمائی تھی؟ لیکن اکدم میری سمجھ میں بات آگئی۔

"اچھا تو کیا آپ نوشابہ سے ملنا چاہتے ہیں؟" میں نے بیساختگی کے ساتھ سوال کیا۔ گویا سارے امکانات عالم میری ہی مٹھی میں تھے۔ اس نے گہری نگاہ سے میری طرف دیکھا۔

"نہیں" اس نے طے کرتے ہوئے کہا۔ اور باہر چلا گیا۔ میں سوچ میں پڑ گئی۔

اس واقعہ کے چوتھے روز شکیلہ خود میرے گھر آئی۔ ہم دونوں دیکھتے ہی ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اور بڑی دیر تک روتے رہے۔ گھر میں مہمان تھے۔ اس لئے کوئی مفصل گفتگو نہ ہوسکی اور مفصل گفتگو میں ابھی چاہتی بھی نہ تھی۔ میں پریشان تھی کہ اس سے کیا کہوں۔ خاصکر جب اس نے انتہائی سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ کہا۔ "لاؤ تمہارے شوہر کی تصویر کوئی ہو تو دکھاؤ"۔ تو مجھ پر جیسے بجلی گر گئی۔ اسوقت تو میں نے یہ کہکر ٹال دیا کہ "ابھی موجود نہیں" لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مستقبل میں کیا کرونگی۔ سب سے بڑا ڈر یہ تھا کہ کہیں جمال پر اس کی نظر نہ پڑ جائے۔ مگر اس روز شکیلہ کو بھی جلدی تھی۔ میں نے بھی جانے کی اجازت دیدی لیکن مفصل ملاقات کے لئے ایک دن مقرر کر دیا۔

شکیلہ کو اس مرتبہ دیکھ کر سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ لوگوں کی پیشین گوئی کے مطابق اب اس میں اور نوشابہ کی صورت میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس سے میرے اس خیال کی بھی تصدیق ہوگئی کہ اس روز جمال نے شکیلہ ہی کو نوشابہ سمجھا تھا۔ میں خیالات میں ڈوب گئی اور امکانات کی وسعت پر غور کرنے لگی۔

میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ جمال آگیا۔ آج بہت عرصہ کے بعد وہ نسبتاً کچھ مسرور سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔

"آج کون آیا تھا؟"

میں نے مسکرا کر اس کی نظر سے نظر ملائی۔ اور ایک منٹ کے وقفہ کے بعد جواب دیا۔

"نوشابہ"

اکدم اس کا چہرہ سنجیدہ ہوگیا۔ اس کے بعد قدرے تبسم کے ساتھ کہا

"طعنے دیتی ہیں آپ؟"

"میں اور آپ کو طعنہ دوں گی! —— توبہ کیجئے! —— یقین نہیں؟ —— اچھا بتائیے آپ نوشابہ سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"دیکھئے یہ چھیڑ تکلیف دہ ہے اور خطرناک!" اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا آپ شکیلہ سے ملنا چاہتے ہیں؟" میں نے ذرا شرافت کے ساتھ پوچھا۔

"مجھ سے پہیلیاں کیوں بجھواتی ہیں آپ؟ بتا نہ دیجئے ٹھیک ٹھیک کہ کون آیا تھا۔" اس نے پریشان ہو کر کہا۔

"نوشابہ کو آپ کیا جانیں"

"میں آپ سے زیادہ جانتی ہوں —— وہ میرے ساتھ پڑھ چکی ہے۔"

"اچھا بتائیے نوشابہ کون ہے؟"

"نوشابہ وہی ہے جس کو میں شکیلہ کہتی ہوں —— یا یوں کہئے کہ شکیلہ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ جسے آپ نوشابہ کہتے ہیں"

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟"

"اسی طرح جسطرح اور باتیں ہوتی ہیں"

"اچھا آپ کہتی تھیں کہ شکیلہ محبت کرتی ہے"

"میں اب بھی یہی کہتی ہوں"

"لیکن نوشابہ تو مجھ سے نفرت کرتی تھی"

"آپ نے پہلی غلطی یہ کی کہ شکیلہ کو نوشابہ سمجھا —— اور اس سے بڑی یہ کہ اس کی ذہنیت کو نہ سمجھے۔"

"کیا معلوم؟ انہیں کے ایک ملازم سے نام معلوم ہوا تھا اب وہ کمبخت بھی نہیں رہا جس سے دوبارہ جا کر پوچھوں۔ لیکن یہ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی"

"معلوم ہوا کہ عورت کی فطرت کے متعلق آپ کو قطعی علم نہیں"

"نہیں اس معاملہ میں مجھ سے غلطی نہیں ہو سکتی۔"

"اچھا تو بتائیے مجھے آپ سے محبت ہے یا نہیں —— نہیں معلوم؟ وہ تو میں پہلے ہی جانتی تھی۔ اچھا تو یہ بتائیے کہ آپ میری شکیلہ یا اپنی نوشابہ سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم"

"اب آپ کو کچھ نہیں معلوم؟ —— آپ شاید مجھ سے ڈرتے ہیں۔ اچھا پرسوں دس بجے رات کو —— لیکن شرط یہ ہے کہ زبان سے لفظ "نوشابہ" نہ نکلے —— خبردار"

شکیلہ مقررہ دن ساڑھے آٹھ بجے رات کو آگئی۔ تنہائی اور خلوت کا پورا انتظام تھا۔ کھانے کے بعد باتیں شروع ہوئیں لیکن میں نے اپنی شادی کا راز اسے قطعی نہ بتایا۔

"اچھا شکیلہ!" میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "اب تم ہمیں اپنی داستان سناؤ —— اسکول کا کیا رنگ ہے؟ تمہارا دیوتا تمہیں نظر آتا ہے یا نہیں؟ معاملات کہاں تک پہونچ چکے ہیں"

اس نے میری طرف حسرت بھری نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ "بجھتی ہوئی آگ پر تیل کیوں چھڑکتی ہو؟ دکھے ہوئے دل پر نمک پاشی نہ کرو۔ تم کو کیا معلوم کہ مجھ پر کون کون سی حالتیں گذر گئی ہیں۔ تم کو میری کیا فکر؟ ایک مجروح محبت کی غم بھری داستان سننا گناہ ہے"

اس کے الفاظ میرے دل میں چھد رہے تھے اس کی بھرائی ہوئی آواز رگِ جان پر چھری پھیر رہی تھی۔ میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"دیکھو شکیلہ میرے دل کو نہ دکھاؤ۔ تم خوب جانتی ہو کہ میں تم سے ملنے کے لئے کسقدر بیچین تھی —— مجھے اور تمہیں جو مجبوریاں جدا کئے رہیں کیا تم ان سے بے خبر ہو؟ —— تم کو ابھی معلوم نہیں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں"

اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔

"دیکھو رونا نہیں۔ آج کے جیسے مبارک دن آنسو بہانا نازیبا ہے"

"مبارک دن!!" وہ زہر خند کے ساتھ بولی۔ "میری قسمت میں جتنے مبارک دن تھے سب ختم ہو گئے۔ اب تو صرف موت کے مبارک دن کا انتظار ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "کیا تمہیں اب بھی اپنے اس نامعلوم ہیرو سے محبت ہے؟ —— جو بقول تمہارے

تم سے محبت نہیں کرتا۔"

اس نے نگاہیں دوسری طرف کرلیں اور خاموش ہوگئی۔

"ادھر دیکھو!" میں نے کہا اور اس کی ٹھوڑی پکڑکے اس کا چہرہ اپنی طرف کرلیا۔ اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملائیں۔ اس کے سیاہ دیدے آنسوؤں میں تیر رہے تھے ـــــ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دو لبریز جام چھلک پڑے۔ اس نے چہرہ پھر جھکالیا۔ میرا دل کراہا۔ لیکن میں نے اس کراہ کو لبوں تک نہ آنے دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ۔" میں نے کچھ توقف کے بعد پوچھا۔ "تم انہیں دیکھوگی؟ ـــــ ان سے ملاقات کروگی؟"

اس نے پہلے حیرت اور پھر ایک کڑوے تبسم کے ساتھ مجھے دیکھا۔ وہ سمجھ رہی تھی۔ کہ میں اس سے مذاق کر رہی ہوں۔

"کیا تم مجھے جھوٹا سمجھتی ہو؟" میں نے شکایت کے لہجے میں کہا۔

"نہیں" اس نے جواب دیا۔ "لیکن میں اب ان سے مل کر انہیں تکلیف پہونچاکر کیا کروں گی؟" اللہ اللہ کیا حسرت تھی!

میں نے بات کاٹ کر ذرا ترش روئی سے کہا۔

شاید نوشابہ کا خیال تمہیں ستا رہا ہے! ـــــ لیکن وہ تمہاری صرف خیال آرائی تھی۔ اب میں حقیقت سے واقف ہوگئی ہوں۔ اس کے علاوہ اب تم خود بھی تو نوشابہ ہی ہو۔ تم نے آئینے کو غور سے نہیں دیکھا!" یہ کہتے ہوئے میں نے آئینے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے میرا ہاتھ روکتے ہوئے کہا "سبھی لوگ یہ کہتے ہیں ـــــ مگر کیا صورت کے ساتھ قسمت بھی بدلجاتی ہے؟ ـــــ کاش ـــــ"

"کیا علم قیافہ پر تمہیں اعتبار نہیں؟"

"جتنے علم ہیں سب جھوٹے ہیں"

"اچھا خیر!" میں نے پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا "اگر تمہاری محبت سچی ہے تو تمہیں ان کی ہر خطا سے چشم پوشی کرنا چاہئے۔ محض ایک غلط فہمی پر ناراض ہوجانا یہ تو محبت کے شایان شان نہیں"

"ناراض!! ـــــ مجھے ناراض ہونے کا حق ہی کیا ہے؟"

"اچھا تو بہتہ آنسو پونچھو۔ لبوں پر مسکراہٹ لاؤ ـــــ دس بجے وہ آئیں گے۔ تمہیں غمگین دیکھ کر ان کا دل دکھےگا۔ کیا ان سے ملنے کی امید تمہیں خوش نہیں کرسکتی؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا ـــــ آخر یہ سب اور آپ کے گھر پر کس طرح ممکن ہے؟"

"دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ سب سمجھادوں گی۔ لیکن ابھی نہیں ذرا صبر کرو"

وہ خاموش ہوگئی غالبًا اسے میری بات پر یقین نہیں آیا۔ لیکن اس کا اضطراب بڑھ رہا تھا اور اس کی نظر بار بار گھڑی پر پڑجاتی تھی میں اس سے برابر باتیں کرتی رہی۔ پرانے قصے دہرا دہرا کر اس کے جذبات جگاتی رہی۔ تاکہ جذبات اسقدر بڑھ جائیں کہ رقابت کا جذبہ بھی فنا ہوجائے۔ گویا میں "بین" پر افسانۂ محبت کو گا گا کر ایک ناگن کو مست کر رہی تھی۔

شکیلہ باتیں کرتے کرتے رک گئی اور گھبرا گھبرا کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے مڑکر دیکھا۔ جمال کھڑا مسکرا رہا تھا۔ شکیلہ کو دیکھ کر وہ بیخود تھا وہ "بےحس نوشابہ" کی بجائے "با محبت و مضطرب نوشابہ" کو دیکھ کر محو حیرت تھا۔ حالانکہ نظر ملتے ہی شکیلہ کا سر جھک گیا تھا۔ لیکن اس کی گردن کے خم کا انداز شرم کا پتہ دیتا تھا۔ گریز کا نہیں۔ جمال بھی سرشار تھا اور پُرشوق۔ امید بھری نظروں سے شکیلہ کو گھور رہا تھا۔ مجھ سے وہ اس قدر غافل تھا جیسے میرا وجود ہی نہ ہو۔ جمال نے ہمہ تن شوق اور سرتاپا محبت بن کر کہا۔

"نوشابہ! اپنی محبت کے مارے جمال پر آخر تمہیں ترس آہی گیا" میں نے دانتوں میں انگلی داب لی۔ شکیلہ نے تڑپ کر میری طرف پرغضب نگاہوں سے دیکھا۔ میں ایک مجرم کی طرح سہم گئی۔ جمال کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ اسے محض ایک ادا سمجھ کر اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ شکیلہ نے بھی جمال کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ لیکن جب آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تو کہا۔

"میں نوشابہ نہیں ہوں۔ میں منحوس شکیلہ ہوں۔ تم مجھے یوں نہ گھورو۔ میری طرف سے اپنی نگاہیں پھیرلو" وہ ہچکتی ہوئی [illegible] کمرے کی طرف چلی۔ جمال تڑپ اٹھا۔ اور اس کی منتیں کرکے [illegible] بیٹھا۔

"تم کچھ بھی ہو۔ تمہارا نام کچھ بھی ہو۔ مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں
ـــــ دیکھو کیا تمہیں میری نگاہوں میں محبت نظر نہیں آتی؟ کائنات کا
ذرہ گواہ ہے کہ میں نے ہمیشہ انہیں رنگین۔ عرق آلود آنکھوں سے محبت
ہے۔ ہمیشہ انہی [illegible] نازک لبوں سے لفظ محبت سن لینے کے لئے تڑپا کیا
ں۔ ہمیشہ انہیں سیاہ سیاہ پیچیدہ زلفوں میں میرا دل الجھا رہا ہے..."

جمال اسی قسم کی باتیں کرتا رہا شکیلہ نے کمرے کے اندر پہونچکر
ازہ میں کنڈی لگالی۔ ادھر دروازہ بند ہوا ادھر جمال بل کھا کر
انے کے پردہ سے لپٹ گیا۔ پردہ ٹوٹا اور پردہ کے ساتھ وہ خود بھی
پر آ رہا۔ میں دم بخود بیٹھی ہوئی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ میری سمجھ
نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ میرا سارا کھیل بگڑ گیا تھا۔

آخر میں اٹھی اور دوسرے دروازے سے شکیلہ کے پاس گئی۔ وہ
ن پر منہ لپیٹے پڑی سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر
دیا اور طنز کے تلخ ترین لہجہ میں کہا۔

"یہی آپ کو محبت کا دعوےٰ تھا؟ محبت اسی کو کہتے ہیں؟ تمہاری
ہی لڑکیاں محبت کو بدنام کرتی ہیں۔ تم نے رقابت کی انتہا کر دی۔ مجھے
ہے کہ تمہارا غرور جمال کی جان لے کر رہے گا ـــ اب آج سے تم میرے
نے یہ نہ کہنا کہ مجھے جمال سے محبت ہے یا تھی"۔

اس کو میرے الفاظ سے بڑی چوٹ لگی۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔

"میں گنہگار ضرور ہوں۔ لیکن اس پھٹکار کی مستحق نہیں۔ آپ نے
ا مگر سمجھا نہیں کہ وہ ان محبت بھری پرشوق نظروں سے مجھے نہیں دیکھ
تھے۔ بلکہ مجھ سے کوسوں دور نوشابہ کو۔ ان کی نگاہیں میرے دل تک
پہنچتی تھیں۔ بلکہ میری جلد سے ٹکرا کر کہیں اور چلی جاتی تھیں ان کا دل
رے دل کو اجنبی تصور کرتا تھا۔ ان کی روح میری روح کو غیر مانوس سمجھتی
۔ وہ نوشابہ کے دل نوشابہ کی روح کی تلاش میں تھے وہ میری صورت سے
نہ پڑھتے تھے۔ میرے دل میں نہ اترتے تھے ـــ جب تک دل نہ ملیں
میں ایک دوسرے میں سما نہ جائیں۔ اس وقت تک "محبت" محبت
ہوتی"

... کہہ رہی تھی۔ لیکن میں نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا
"تم غلطی کرتی ہو۔ تمہیں ایسا اس لئے محسوس ہوا کہ نوشابہ کے متعلق
تمہارے خیالات قائم ہو چکے تھے۔ یہ صرف ناموں کا الٹ پھیر ہے۔ میں تمہیں بتا چکی
ہوں کہ انہوں نے تمہارا نام معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن تمہارے ملازم نے
بجائے تمہارے نوشابہ کا نام بتا دیا۔ افسوس ہے کہ تمہاری محبت اتنی سی غلط
فہمی سے نفرت میں بدل گئی۔ کیا تم نے انہیں یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ تمہارا
نام جو کچھ بھی ہو۔ مجھے تم سے محبت ہے؟"

اس کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ابھی پوری طرح مطمئن نہیں
ہوئی تھی۔ میں نے پھر کہنا شروع کیا۔

"اگر تمہیں ان سے محبت نہیں رہی تو جانے دو۔ میں شرمندہ
ہوں کہ اتنی مصیبت اٹھا کر میں نے تمہاری آرزو کو پورا کرنے کی کوشش کی
میں تم سے شکایت نہ کروں گی ـــ لیکن ذرا اس پر غور کر لو۔ کہ ایک ہستی
ایسی بھی ہے جو یہ جاننے کے باوجود جمال سے محبت کرتی ہے۔ کہ وہ تم سے
محبت کرتا ہے۔ اگر وہ جمال سے شادی کرلے تو تم اس سے نفرت نہ کرنا
نہ جمال کو مجرم قرار دینا"۔

آخری فقرہ کہتے کہتے میں لرز گئی۔ اس نے نظر جھکالی۔ میں وہاں سے
یہ کہتی ہوئی چلدی کہ

"اچھا میں جاتی ہوں جمال کی خبر لوں ـــ وہ بیہوش ہو کر گر گیا
تھا۔ خدا جانے کس حال میں ہو۔ تمہارا دل تو پتھر ہو گیا"۔

جمال کے پاس آئی تو دیکھا کہ وہ بیہوش نہ تھا بلکہ بے حس و حرکت
فرش پر کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کسی خیال میں مستغرق تھا۔ آنکھوں
میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہا ـــ بالکل ہی
بیماروں کی آواز میں۔

"دھوکے کو میں نے پھر دھوکا نہ سمجھا ـــ کس قدر نادان ہوں!"

"جی نہیں۔ دھوکا نہیں"۔ میں نے ذرا سختی کے ساتھ کہا۔ "بلکہ
آپ نہ "نوشابہ" بھولیں گے نہ "شکیلہ" آپ کو یاد ہوگا۔ حالانکہ پوری طرح
میں نے سمجھا دیا تھا۔ بجائے شکیلہ کے نوشابہ سنکر وہ بدگمان ہو گئی اور وہ
حق بجانب تھی"۔

وہ بھی خاموش بیٹھا رہا۔ میں بھی چپ رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد
میں نے محسوس کیا کہ شکیلہ بھی میری پیٹھ کے پیچھے آکر بیٹھ گئی۔ اب بھی اس کو
کبھی کبھی سسکیاں آجاتی تھیں۔ میں نے مڑکے اس کی طرف دیکھا اس نے

اپنی اشک آلود آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ کیا مجھے معاف کیا جاسکتا ہے؟" دونوں طرف خاموشی تھی۔ میں وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے جھانک کر دیکھا تو وہ دونوں میٹھی میٹھی باتوں میں مشغول تھے۔ وہ محبت کرنے والے دلوں کی پہلی ملاقات اور پہلی گفتگو کسقدر دلکش اور سہانی ہوتی ہے۔

میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں سر سے پیر تک لرزہ براندام تھی ابتک میں نے انتہائی ہمت سے کام لیا تھا۔ لیکن اب ہمت جواب دے رہی تھی۔ میں نے طے کیا تھا کہ ان دونوں پروانوں کو ایک دوسرے میں مست چھوڑ کر کہیں چلدوں گی۔ کہاں جاؤں گی۔ کیا کروں گی۔ یہ مجھے خود معلوم نہ تھا۔ میں نے ایک بار پھر اپنی ہمت کو جگایا۔ میں نے دل کو سمجھایا کہ انسان دوسروں کے لئے جیتا ہے اپنے لئے نہیں۔ اپنے ضمیر کی تشفی کی خاطر انسان کو بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

میں فوراً کرسی کو میز کے قریب گھسیٹ کر بیٹھ گئی اور ایک خط شکیلہ کے نام دوسرا جمال کے نام لکھ کر لفافوں میں نام لکھدیئے۔ لفافوں کو بند ہی کر رہی تھی کہ کمرے کے باہر قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے اٹھی اور غلام گردش کو طے کرکے بیرونی دروازے کو کھول کر کھڑی ہوگئی رات اندھیری اور سنسان تھی۔ سامنے سے ایک کالی گھٹا اٹھ رہی تھی۔ سر پر تارے چمک رہے تھے۔ باغ میں نرم ہوا چل رہی تھی جس سے پتوں اور شاخوں میں ہلکی ہلکی جنبش ہو رہی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ مجھے جانے سے منع کر رہی ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے سوچا کہ مجھے جلدی کرنا چاہئے۔ اسوقت جبکہ ایک انسانی زندگی برباد ہو رہی تھی مظاہر فطرت اپنے پورے حسن پر تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آخر میں آنسوؤں کو بہنے کی اجازت دے کر کلیجہ پر پتھر رکھ کر دروازے سے نکل پڑی لیکن اس سے پہلے کہ تاریک رات شفقت مادرانہ کے ساتھ مجھے اپنی آغوش میں چھپالے کسی نے پیچھے سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں سہم گئی۔ اس کے بعد ہی اس تاریک اور سنسان فضا میں ایک نازک آواز بلند ہوئی اور اس نے چلا کر کہا۔

"بانو۔ تم کہاں جاتی ہو؟"

یہ شکیلہ کی آواز تھی۔ میں نے ہاتھ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن وہ کمرے لپٹ گئی۔ جمال بھی آگیا اور وہ دونوں مجھے گرفتار کرکے مکان کے اندر واپس لے گئے۔ میں رو رہی تھی۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہو رہا تھا کہ شکیلہ خلافِ امید بہت مسرور معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی نگاہ شرارت سے مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ظریفانہ انداز میں کچھ کہنا چاہتے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ یہ سب باتیں نمائشی ہیں۔ اور محض درد و غم کی پردہ پوشی کے لئے یہ صورت اختیار کی گئی ہے ـــــ اور اس لئے بھی کہ میری دل شکنی نہ ہو۔ جمال بالکل خاموش تھا۔ کسی گہرے خیال میں ڈوبا ہوا گرد و پیش سے بے خبر متعلقات سے بے نیاز ـــ شکیلہ ایکدم ظریفانہ انداز میں بول اٹھی۔ میں چونک گئی۔ اس نے کہا

"ہاں تو اس وقت آپ باغ کی سیر کو جا رہی تھیں؟ ـــ اسقدر اندھیری رات میں باغ نہ جایا کیجئے ـــــــ اور پھر تنہا!!"

میں بالکل خاموش رہی۔ وہ پھر کہنے لگی۔

"اچھی بانو! تم نے سنا؟ ـــــ جس لڑکی کا ذکر ابھی ابھی تم نے مجھ سے کیا تھا معلوم ہوا کہ اس نے جمال سے شادی کر لی۔ میری طرف سے اسے مبارکباد دیدینا"۔

میں بےچینی کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر سکون کے ساتھ جواب دیا۔

"لیکن تم نے یہ بھی سنا کہ اس کی شادی جمال سے کس طرح ہوئی۔ اور وہ تمہارے لئے ہر قربانی کرنے کو تیار تھی۔ یہ خط جو تم لئے ہو اس کو شاید ابھی تم نے نہیں پڑھا"

"اچھی طرح پڑھ لیا ورنہ میں آپ کو گرفتار کسطرح کر پاتی؟ ـــــ اب میں آپ کو ہمیشہ کے لئے اس مکان میں نظربند کرتی ہوں اور جمال کو آپ کا نگراں مقرر کرتی ہوں۔ کبھی کبھی میں دیکھنے آیا کروں گی"

مجھے اس کی بےمحل ظرافت پر تعجب بھی ہو رہا تھا۔ اور غصہ بھی آ رہا تھا۔

"صاف صاف باتیں کرو شکیلہ!" میں نے کہا "تم جمال سے محبت کرتی ہو اور جمال تم سے۔ میں تم دونوں کے درمیان دیوار کی طرح حائل کر دی گئی ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ مجھے تم جانے دو ورنہ زندگی بھر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہے گا ـــ شکیلہ! ضمیر کی آسودگی کے بغیر زندگی عذاب ہو جائے گی"۔

"لیکن میرے پاس بھی تو ضمیر ہے!" اس نے انتہائی درد کے ساتھ اور اب اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"بانو" وہ کہتی رہی۔ "میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ تم کچھ خیال میں سچے دل سے کہتی ہوں کہ مجھے تم سے قطعی شکایت نہیں اور میں تمہاری حالت کو پوری طرح سمجھ گئی ہوں۔ تم نے جو کچھ کر سکتی تھیں کیا تم نے فرض ادا کر دیا۔ تمہارے ضمیر کی تشفی ہو گئی۔ اب میرے ضمیر کو بھی مجروح ——— اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں خودکشی کر لونگی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں برابر آیا کروں گی۔ مجھے اس سے زیادہ نہیں چاہئے۔ محبت کو ناکامی ہی سے دوام حاصل ہے"

اس کی ظرافت ختم ہو گئی تھی۔ وہ سنجیدہ ہو کر آبدیدہ ہو گئی تھی وہ جمال سے مخاطب ہو کر بولی۔

"اگر آپ کو مجھ سے محبت ہے تو میری بانو کا خیال رکھئے گا۔ اس نے کتنا بڑا احسان کیا ہے اس نے ہماری محبت کو ہمیشگی بخشدی ہے ——— میری موٹر دروازے پر لگوا دیجئے اور مجھے سوار کرا دیجئے۔ بہت رات ——— انشاء اللہ پھر آؤنگی"۔

میں نے کہا۔ "شکیلہ اس قصہ کو طے نہ سمجھو۔ میں تمہارے فیصلہ پر عمل کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ میں تمہیں اس وعدے پر جانے دوں گی کہ کل پھر آؤ۔ تاکہ تم سے مفصل طور پر باتیں کر کے اپنا نقطۂ نظر تمہیں سمجھا دوں ——— آخری فیصلہ ہوگا"۔

اس نے کچھ سوچا۔ اس کے بعد بولی۔ "اچھی بات ہے میں کل ——— ضرور آؤنگی"۔

اس کے بعد وہ مجھ سے بغلگیر ہو گئی۔ ہم دونوں رو دیئے۔ ہم اور جمال دروازے تک پہونچانے گئے۔ ڈرائیور اتفاق سے کہیں چلا گیا تھا۔ ——— نے کہا کہ "ذرا اور انتظار کر لو شاید آ جائے" لیکن اس نے نہ مانا۔ ——— رات ہو گئی ہے"۔ اس نے کہا۔ اب میں رک نہیں سکتی۔ مجھے خود "ڈرائیو" آتی ہے۔ ڈرائیور جب آ جائے تو اسے بھیج دیجئے گا"۔ ہم لوگوں نے ——— لیکن وہ فوراً جا کر "اسٹرنگ" پر بیٹھ گئی۔ اس نے "سلف" ——— [illegible] شکریہ ادا کیا اور کہا کہ لو چلو ڈرائیو ——— [illegible] نہیں آتا۔ [illegible] پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور گیٹ سے نکل گئی۔ ہم لوگ حیران کھڑے رہ گئے۔

شکیلہ کے چلے جانے کے بعد میں نے اس دن کے واقعات کا تجزیہ شروع کیا۔ ایک ایک کر کے کل واقعات میرے ذہن میں چکر لگا رہے تھے۔ شکیلہ نے مجھے متحیر کر دیا تھا۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ طفلانہ خصلت شکیلہ اسقدر جلد اتنی سمجھدار ہو گئی ہے۔ وہی نازک مزاج شکیلہ جو ذرا سی دلشکنی اور ذرا سی ناامیدی پر رو دیا کرتی تھی۔ یا جھنجھلا پڑتی تھی اس روز اسقدر زبردست قوت برداشت کا مظاہرہ کس طرح کر گئی۔ شاید نازک ہستیاں ہی سب سے زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔ میں اسی قسم کے خیالات میں منہمک تھی۔ آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ جمال بھی اسی طرح خیالات میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ گھڑی کی ٹک ٹک سے کان پھٹنے لگے۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جمال بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا اور خواب میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اکدم وہ چیخ پڑا۔ میں سہم گئی۔

"کیا بات ہے" میں نے قریب جا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں ——— کچھ نہیں"۔ اس نے کہا اور نڈھال ہو کر لیٹ گیا۔

اس کے سینے کا زیر و بم اس کے دل کی دھڑکن کا پتہ دے رہا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے اس کی دھڑکن کانوں سے سنائی دینے لگی۔ یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ ہم دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے۔ میں بیٹھی رہی اور مجھے نہیں معلوم کہ کب تک بیٹھی رہی ——— جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ جمال میرے سر کو اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے غور سے چہرہ دیکھ رہا ہے۔ میں نے گردن موڑ کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے تین بجے تھے۔ جمال نے میرے چہرے کو پھر اپنی طرف کر لیا اور کہا۔

میں نے خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ میں خودکشی کرنے کی نیت سے دریا کی طرف جا رہا ہوں۔ اس کے کنارے پہونچکر میں نے پانی کی سطح کو دیکھا اس میں مجھے شکیلہ کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ابھی یہاں نہ آؤ۔ پانی بہت ٹھنڈا ہے۔ چلو میں بانو کے پاس تمہیں لونگی۔ میں گھبرا گیا۔ تم پر جو نظر ڈالی تو تم بالکل شکیلہ کی طرح نظر آئیں ——— میں بہت دیر سے غور کر رہا ہوں کہ تم شکیلہ ہو یا بانو"۔

میں نے چپ چاپ اس خواب کو سنا اور چپ ہی رہی۔ — مہر النساء

نواب آصف الدولہ کا مرغ خانہ

(از خواجہ عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

نواب آصف الدولہ کو مرغ بازی اور ہاتھی کی جنگ کا بیحد شوق تھا۔ اور ان کے عہد میں فیل خانہ اور مرغ خانہ قابل دید تھا۔ مرغ خانہ مشک گنج کے قریب ایک بڑی عمارت میں تھا۔ اور بڑے بڑے نامی مرغ باز اسمیں نوکر تھے اس کا خرچ ہزار روپے کا تھا۔ بڑے بڑے والیان ملک اسے دیکھنے آتے۔ مرغ خانہ ایک بہت بڑی کوٹھی میں تھا۔ اور ہر ایک مرغ باز کے متعلق صرف پانچ پانچ مرغ تھے۔ مرغ مختلف النسل تھے۔ ہر مرغ باز کا فرض تھا کہ اپنے اپنے مرغ کی نسل کی مرغیاں حاصل کرائے اس لئے ضرور سال بھر میں صرف دو انڈے لیکر دو بچے حاصل کرے کیونکہ مرغ کی عمر دس برس کی تحقیق کی گئی تھی۔ مرغ کو جنگ کے واسطے تیار کرنا بھی ایک جدا فن تھا۔ جس وقت مرغ دو برس کا ہوتا تھا تو اسے جنگ میں پیش کرتے تھے۔ اور جب سال بھر سے کم کا ہوتا تھا اور اذان دینے لگتا تھا اسے مرغیوں سے بچاتے تھے۔ اور اگر فربہ ہوتا تو جلاب دے کر دبلا کرتے۔ نحیف ہوتا تو کچے انڈے کی زردی روغن بادام شہد میں کھلاتے اور روغنی روٹی کی گولیاں بنا کر کھلاتے پھر نہایت صاف چاندنی بچھا کر ایک انیلا مرغ اس کے سامنے فرش پر لاتے اور دو چار پالی کرتے۔ مہینے میں دو ایک بار یہی شغل جاری رہتا۔ جب اس کے خار نکل آتے تو اسپر لوہا چڑھا دیتے پھر نواب سے عرض کرتے کہ حضور ہمارے پاس ایک مرغ تیار ہے۔ پچاس مرغ باز اس خدمت پر ملازم تھے۔ گرمی کے زمانے میں انکو ٹھنڈے پانی سے نہلاتے تاکہ گرمی نہ معلوم ہو اور سردی کے زمانے میں دس بجے تک دھوپ کھلاتے۔ اس کے بعد پانی میں کچھ دوائیں ڈال کر نیم گرم پانی سے نہلا کر کچھ غذا کھلا کر ٹاپے کے اندر کر دیتے ہر فصل اور موسم میں مرغ کو روزانہ نہلاتے تھے۔ اور صاف کپڑے سے پوچھ کر انکو غذا دیتے۔ بعض مرغ جو جوانی میں گرمی سے زیادہ پریشان ہوتے تھے انہیں دن میں دو دفعہ نہلا کر غذا دیتے تھے۔ نواب آصف الدولہ بہادر خود تامجان میں سوار ہو کر مہینے میں ایک مرتبہ ضرور اُن کا معائنہ کر کے مرغ بازوں کو مناسب ہدایتیں کرتے تھے مرغ خانہ ایک محلہ تھا جو آج تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے اُس کے چاروں طرف مرغ باز رہتے تھے جنکی پرورش اس پیشہ کی بدولت تھی۔

باہر کے زمیندار وغیرہ آتے تھے انکی خواہش یہی ہوتی تھی کہ جسطرح ممکن ہوسکے نواب آصف الدولہ کا مرغ خانہ اور فیل خانہ دیکھ لیں بہت رشوتیں دے کر بہت سفارشیں اٹھوا کر مرغ خانہ کی زیارت نصیب ہوتی تھی اس مرغ خانہ میں طرح طرح اور نسل نسل کے ہزاروں قسم کے مرغ تھے جو عالم شباب سے گزر جاتے تھے۔ اُن سے انڈے لے کر بچے لئے جاتے تھے اُن سے انڈے لینے کے بعد جنگ کا کام نہیں لیا جاتا تھا۔ ایک مکان کے روشن حصہ میں صاف اور سفید فرش بچھا ہوتا تھا جسے اکھاڑہ کہتے تھے جسپر مرغ ٹہلائے جاتے تھے۔ جب کوئی مرغ کسی بیماری میں مبتلا ہوجاتا تھا تو شفاخانہ میں بھیجدیا جاتا تھا۔ شفاخانہ مرغ خانے کے قریب اور مریض مرغ اس میں رہتا تھا۔ معمولی بیماری ہوتی تو مرغ باز اُس کا علاج کرتے اور اگر کوئی بیماری سخت ہوتی تو حکیم مرزا علی بہادر علاج کے واسطے بلائے جاتے جو مرغ خانے کے شفاخانہ کے ملازم تھے جیسے رتوندی۔ فالج۔ درد گردہ وغیرہ میں مبتلا ہوتا۔ حکیم مرزا علی بہادر پہلے مرغ باز تھے۔ مرغوں کا علاج کرتے کرتے حکیم بن گئے اور بڑا تجربہ انہیں اس بارے میں حاصل تھا ابتدا میں ایک مرغ باز نوکری کی تلاش میں لکھنؤ آئے تو انہیں معلوم ہوا کہ نواب صاحب کا مرغ خانہ دنیا میں ایک ہے اور پچاس مرغ باز اس سرکار میں نوکر ہیں تو مرغ خانہ دیکھنے کا بڑا شوق ہوا۔ بہت کوشش کی ناکام رہے ایک دن [illegible] مہاراجہ ٹکیت رائی کے دربار تک رسائی ہوئی۔ بیچارے روز [illegible]

بت کا حال کہنے لگے۔ کہ بندیل کھنڈ کے راجہ کے یہاں مرغ بازوں میں
ر تھا۔ تام تخفیف میں آیا ہے۔ مدت سے لکھنؤ دیکھنے کا شوق تھا۔ یہاں
جھنے سے پڑا ہوا ہوں۔ نواب تک پہنچا تو کہا کوئی مرغ خانہ بھی دکھا
میں دیتا شاید حضور کی توجہ سے یہ آرزو پوری ہو جائے۔ مہاراجہ کی
شش سے انہیں مرغ خانہ دیکھنا نصیب ہو گیا۔ دیکھا تو آنکھیں کھل
ں۔ محلہ والوں سے ملے ان کے جاہ احتشام کو دیکھا۔ اُن کی سواریاں
بیں۔ ساز و سامان دیکھا۔ سفید پوشاکیں دیکھیں۔ خرچ دیکھے۔
ں میں کہنے لگے اللہ اللہ جس کے ادنے نوکروں کی یہ شان ہے اس کے
ل کا کیا پوچھنا اس سرکار میں تو دولت کا مینہہ برس رہا ہے۔ لالچ
ا کہ کسی طرح نواب آصف الدولہ کے دربار تک رسائی ہو جائے تو کیا
پنا ہے۔ مگر ہم ایسے مسافروں کی رسائی کہاں ممکن ہے۔ مہینوں مہاراجہ کی
مت میں حاضری دی۔ ایک دن دبی زبان سے یہ بھی عرض کیا۔ آپ کی
ولت مرغ خانہ تو دیکھ لیا۔ مگر ایک دل میں حسرت باقی رہ گئی۔
راجہ نے پوچھا وہ کیا۔ عرض کیا نواب کی قدمبوسی کی آرزو باقی ہے۔
ایا یہ مشکل کام ہے۔ نواب کے دربار کے لئے قواعد ہیں۔ آداب ہیں۔
ہکے تم متحمل نہیں ہو سکتے ابھی تم نے یہاں کے رئیسوں کا دربار نہیں دیکھا
نواب کے دربار میں کیونکر جا سکتے ہو۔ عرض کیا اگر حضور توجہ فرمائیں
احسان ہوگا۔ غرض کچھ منت و سماجت کی۔ مہاراجہ کو اُن کے حال پر
م آگیا۔ فوراً وعدہ کر لیا۔ اچھا موقع سے دیکھا جائے گا۔ ایکدن موقع
را نے کہا کل آٹھ بجے سے درِ دولت پر حاضر رہنا دس بجے کے بعد
اری طلبی ہوگی۔ مرغ باز جن کا نام صفدر علی تھا بہت خوش ہوئے
ر دوسرے روز سویرے سے درِ دولت پر حاضر ہوئے۔ مرد ہے کو
پنا نام بتایا۔ صبح سے بیٹھے بیٹھے گیارہ بجے تو مردہے نے ہاتھ پکڑا اور
رِ دولت میں لال پردہ اُٹھا کر عرض بیگی کے حوالہ کر دیا۔ اس نے ہدایت کی
یسا ہم کہیں اُسی تعلیم سے آداب بجا لانا۔

اب جو دوسرا پردہ اٹھتا ہے تو کیا دیکھا کہ دو طرفہ زرق برق
شاکیں پہنے ہوئے ایک ایک کرسی اعلے مرتبہ کے لوگ رونق افروز ہیں
... میں مسند نشین پر حضور اعلے جلوہ فرما ہیں۔ سونے کا چتر لگا ہوا ہے
... مورچھل جھل رہا ہے۔ خدام خاص دست بستہ کھڑے ہیں۔ کسی کی طاقت نہیں جو آنکھ
بھر کے دیکھ سکے سب خاموش بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر اُن کے بدن میں
زلزلہ پیدا ہو گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ نیم قد ہو کر چلنے کا حکم ملا۔ دو آدمی
پکڑے ہوئے تھے۔ عرض بیگی نے حکم دیا سات مرتبہ جھک کر سلام کرو چار و
ناچار جھک کر نگہ نیچی کر کے سلام کیا اور نذر کی دو اشرفیاں دکھائیں جس پر
حضور نے ہاتھ رکھدیا۔ زبان بند ہو گئی۔ منہ سے کچھ نہ بول سکے غش پر غش
آنے لگے۔ مردہے انکو الٹے پاؤں واپس لائے۔ درِ دولت سے باہر کو یا
مردے کی طرح ڈال دیا۔ جیسے گئے تھے واپس آگئے۔ بہت شرمندہ ہوئے
اور پھر جانے کی ہمت نہ کی۔ ناکام اپنے شہر واپس گئے۔ اور عمر بھر اپنی قسمت کا
رونا روتے رہے۔

نواب کے ایک رفیق نے عرض کی حضور ایک مرغ باز دہلی سے
آیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر حضور حکم دیں تو جاوے سے مرغ لاؤں جو دنیا
میں سب سے بہتر ہوتے ہیں۔ فرمایا کہ جاوے کے مرغ ہمارے یہاں موجود
ہیں۔ انہیں نے کہا کہ حضور وہ کہتے ہیں کہ جاوے کا جو کالے تالو کا ہوتا
ہے وہی شیر مرغ کہلاتا ہے دہلی کے بادشاہوں کی سرکار میں تھا۔ ہر کسی کو
اُس کی شناخت نہیں ہے میں خود خرید کر لایا تھا۔ فرمایا کیا مضائقہ ہے
اس سے ہمارے واسطے کل مرغ منگاؤ اسے یہاں سے ہزار روپیہ مل گیا
اور چھ مہینے میں واپس آیا اور چار مرغ چکلے چوڑے لا کر حاضر کئے بہت سا
انعام ملا۔ وہ مرغ باز نوکر ہو گیا۔ اسوقت مرغ بازی کا طریقہ
بہت خراب تھا۔ یعنی حضور عالی لڑائی کے مرغ کے کانٹے پر لوہے کا خول
چڑھا دیتے تھے۔ اور اس زمانے میں یہی رواج تھا۔ کہ سب مرغ باز
اپنے اپنے مرغ کے کانٹے پر لوہے کا خول چڑھا دیتے تھے جس سے کبھی کبھی
مرغ ایسا زخمی ہو جاتا تھا کہ جانبری کی امید نہ رہتی تھی۔ مگر نواب
آصف الدولہ کی درگاہ میں ہر شخص کو یہ اختیار نہ تھا کہ وہ مرغ بازی کے لئے
حضور میں درخواست کر سکے کہ مرغ لڑانا چاہتا ہوں۔

بلکہ خود سرکاری مرغ لڑائے جاتے تھے۔ اور سرکاری عہدہ دار
اس میں تماشہ دیکھنے آتے تھے۔ جن رئیسوں کو مرغ کا شوق تھا وہ مرغ پالتے
محض نواب کی خوشی کی غرض سے اور جب حکم ہوتا تھا اپنا مرغ مشق کرتے
تھے۔ اور بعض نواب کے عزیز یہ شوق کرتے تھے کوئی مہینہ خالی نہ جاتا تھا

کہ مرغ بازی کا شغل نہ ہوتا۔ نواب عضد الدولہ شجاعت علی خاں مرزا جنگلی نواب مرزا فخر الدین حیدر نواب امیر الدولہ عرف مرزا مینڈو نواب مرزا نجم الدین حیدر نواب سالار جنگ نواب حسن رضا خاں صاحب۔ نواب امیر الدولہ حیدر بیگ خاں ان سب کے یہاں مرغ پلے تھے اور ان کے بڑے بڑے کارخانے تھے۔ نواب امیر الدولہ کا کارخانہ محلہ کاظمین کے قریب منصور نگر سے آگے تھا۔ قریب سعادت گنج کے اور انکا مرغ خانہ بھی وہیں تھا۔ ایک روز حضور سے کہا۔ حضور میرے یہاں ایک مرغ تیار ہوا ہے حکم ہوا ہم کو دکھاؤ۔ مرغ دیکھا فرمایا۔ ہمارے مرغ خانہ سے ایک مرغ پسند کرو حیدر بیگ خاں نے ایک مرغ اسیقدر قد کا اور اسی وزن کا انتخاب کیا۔ اور حضور سے عرض کیا فلاں مرغ اسی وزن کا تجویز کیا گیا ہے۔

آپ نے فرمایا اچھا ہے تو اگلی اتوار کو مرغ لڑے گا یہ شہرت تمام شہر میں پھیل گئی اور جو لوگ حضور میں حاضر ہوتے تھے اپنے اپنے سامان کرنے لگے۔ مرغ باز بھی اپنے مرغ کو تیار کر رہا ہے جب دونوں طرف سے مرغ باز تیار ہو گئے تو مرغ خانہ میں حاضر ہوئے وہاں ایک وسیع کمرہ تھا جس میں سفید چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا۔ دونوں مرغ باز اپنے اپنے مرغ فرش پر ٹہلانے لگے۔ اتنے میں حضور تامجان پر سوار ہو کر تشریف لائے سب نے سر خم ہو کر تعظیم دی۔ اس کے بعد ملک الشعرا میر تقی میر دہلوی پالکی میں سوار ہو کر آئے۔ جرنل سلیمن مارٹن صاحب۔ نواب حیدر بیگ تشریف لائے اور مرغ بازی اس طرح شروع ہوئی کہ نواب آصف الدولہ کا مرغ باز اور حیدر بیگ خاں کا مرغ باز دونوں آمنے سامنے بیٹھے اور اپنے اپنے مرغ کو سامنے چھوڑ دیا۔ دونوں مرغ تیار تھے اور جوانی میں چڑھتے ہوئے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے۔ برابر کی چوٹیں چلنے لگیں دونوں طرف کے مرغ زخمی اور کوفتہ ہو گئے۔ گھنٹہ بھر کے بعد دونوں نے اجازت لے کر اپنے اپنے مرغ کو سینکا اور خون پوچھا اور پھر ٹہلایا اس کے بعد پھر آمنے سامنے چھوڑے گئے دونوں گتھ کے شیرانہ وار کرنے لگے۔ ایک نے دوسرے کو مارے چونچوں کے زخمی کر دیا۔ دونوں طرف لہو بہنے لگا مرغ باز اپنے اپنے مرغ کو شہ دیتا تھا ہاں بیٹا اور دو چار ہاتھ رکنا نہیں پالا مار لیا ہے۔ شاباش ہے پیچھے نہ آنا ایک حملہ اور کرو اور دوسرا

مرغ ذرا تیز ہو کر اچھلا۔ مرغ باز نے کہا غصہ نہ کرو حریف کو جواب دو اس نے دو چار پنجے جھاڑ دیئے۔ ایک نے دوسرے کو نیچے رکھ لیا۔ پہونچے چلنی چلنی ہو گئے۔ باچھیں چھل گئیں۔ جب تین گھنٹے پورے ہو گئے تو سب کو خیال ہوا اب دونوں تھک گئے دونوں اٹھا لئے جائیں مگر مرغ باز نے کہا ابھی مرغ میں طاقت ہے ایک گھنٹہ اور لڑ سکتا ہے۔ آخر گھنٹہ بھر تک دونوں جی توڑ کر لڑا کئے نہ اس کی فتح نہ اس کی فتح آخر مرغباز نے پھر مرغ کو شہ دی ہاں بیٹا ایک چوٹ ایسی کرو کہ حریف منہ پھیر دے۔ یہ سنکر نواب کے مرغ نے پیٹ میں حریف کے ایسا کانٹا مارا کہ لوہے کی نوک لگنے سے اس کے پیٹ کی کھال کٹ گئی اور آنتیں نکل پڑیں۔ اس پر بھی وہ مرغ برابر لڑنے لگا۔ نواب نے حکم دیا فوراً اٹھا لو مرغ باز نے اپنا مرغ اٹھا لیا اور پیٹ کی کھال میں ٹانکے دے کر کچھ روغنِ زیتون ملا۔ اور اس کے زخم پوچھے جرنل سلیمن صاحب نے آصف الدولہ بہادر سے عرض کی حضور کی ایک صورت بہت ظلم آمیز ہے یعنی مرغ کے کانٹے اک تو یونہی خطرناک ہوتے ہیں۔ اسپر حضور کا حکم ہے کہ اسپر خول چڑھایا جائے اس سے اور زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ نوبت ہلاکت کی آجاتی ہے۔ میں حیدر بیگ خاں کے مرغ کی تعریف کروں گا کہ باوجود ایسا گہرا زخم کھانے کے پھر اپنی جان کا پاس نہیں کیا اور برابر حریف کے مقابلہ ڈٹا رہا۔ اگر یہ خطرناک چیز کو آپ دفع کر دیں تو مجھے امید ہے کہ ضرور تمام مرغ اس آفت سے بچ جائیں۔ میں نے اسوقت اپنی آنکھ سے دیکھا کہ کانٹا مرغ کے پیٹ میں گھس گیا۔ اس کا کام تمام ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی۔ نواب نے اپنے متوسلین کی طرف رخ کیا۔ سب نے کہا کہ واقعی جرنل صاحب کی تجویز بہت کار آمد ہے۔ مرغ کے کانٹے یونہی کیا کم خراب ہوتے ہیں اس پر لوہے کا خول جان لیوا ہو جاتا ہے۔ نواب نے حکم دیا کہ آج سے کسی مرغ کے کانٹوں پر خول نہ چڑھایا جائے بلکہ ان کے کانٹوں پر کپڑا لپیٹ دیا کریں تاکہ وہ مہلک طریقہ سے زخمی نہ ہوں۔ نواب کی اس رائے کو سب نے پسند کیا اور اس دن سے مرغ کو اس تکلیف سے آزادی مل گئی۔ مگر اس کے محرک جرنل سلیمن صاحب بہادر تھے جن کو مرغ کی یہ حالت دیکھ کر کمال [illegible] تیسرے دن مرغ باز امیر الدولہ حیدر بیگ کا مرغ دکھلانے [illegible] پیٹ میں زخم کا کہیں کوئی نشان تک نہ تھا ایک مرتبہ جرنل [illegible]

ک ہوکر لکھنؤ آئے اور نواب سے خوب پینگ بڑھے۔ ایک مرتبہ
ے فرمائش کی حضور کے یہاں کوئی مرغ کی لڑائی ہو تو مجھے ضرور
بے گا۔ نواب نے اسی وقت دربار کی طرف دیکھا الماس علی خاں نے
غلام کے یہاں ایک مرغ جاوے کا تیار ہوا ہے اگر حکم ہو تو حاضر ہے
نے فرمایا ہم کو پریسیڈنٹ صاحب کی خاطر ملحوظ ہے۔ اچھا اتوار کو
مرغ لے کر حاضر ہو جانا اور ہمارے مرغ خانہ سے ایک مرغ
ر۔ الماس علی خاں نے اسی قد و قامت اور اسی وزن کا ایک مرغ
۔ اتوار کے دن صرف طلبیدہ دس حضرات تشریف لائے ملک الشعرا
ی اپنی جھالدار پالکی پر تشریف لائے جان برسٹو صاحب اپنی
ہندوستانی لباس میں تشریف لائے۔ مہاراجہ ٹکیٹ رائے
الماس علی خاں اپنے حضور بیچے پر سوار ہو کر رونق افروز ہوئے
مرغ باز اپنے اپنے مرغ لے کر میدان میں آئے اور فرش پر
لگے۔ دونوں کو چھوڑ دیا اب پیچھے ہٹ کر بیٹھے۔ دونوں مرغوں نے
جوت دی ایک گھنٹہ گذر گیا۔ حکم ہوا اٹھاؤ نہیں۔ مرغ باز مائیں
گھنٹہ کامل لڑنے کے بعد نواب کے مرغ نے گردن ڈالدی اور
چونچیں کھایا کیا۔ لیکن پیچھے قدم نہیں ہٹایا لاتیں اور چونچیں
کھاتے زخمی ہو گیا۔ اور بہت مضمحل۔ لیکن حریف کے سامنے
۔ سب کا گمان غالب تھا کہ نواب کا مرغ اب بھاگ جائے گا

الماس علی خاں دل میں خوش ہو رہے تھے کہ آج جاوے والا مرغ جیتے گا اور یہ گمان یقین سے بدل جاتا تھا۔ جواب نواب کا مرغ افیونیوں کی طرح گردن ڈالے ہوئے زمین دیکھ رہا۔ تین گھنٹے ہوئے چار گھنٹے ہوئے یہاں تک کہ الماس علی خاں کا مرغ بھی تھک گیا اس کا بھی دم آ گیا۔ ہانپنے لگا۔ کسمانے لگا۔ کندھے ڈال دیئے۔ پر کھول کھول کر رہ جاتا۔ اب نواب کا مرغ افیون کے نشہ سے بیدار ہوا۔ اپنے حریف پر حملے پر حملے کرنے لگا۔ چونچوں سے زخمی کر دیا ہاتھ بھر اونچا ہو کر لاتیں رسید کیں اب الماس علیخاں کے مرغ کی خیر نظر نہیں آتی بازی کا رخ بدل گیا۔ اور ساری محفل کا خیال ہو گیا اب سو ہاتھ نواب کا مرغ مارے گا۔ جب دونوں مرغ نہایت کوفتہ ہو گئے دم ٹوٹ گیا تو نواب کے مرغ نے اُچک کر ایک لات اس زور سے ماری کہ الماس علی خاں کا مرغ بیٹھ موڑ کر لنک دم بھاگا۔ اس بازی میں نواب کو ایسی خوشی ہوئی کہ حکم دیا بادشاہی مصور کو بلوا کر حاضرین جلسہ کی تصویر کا ایک گروپ بنایا جائے۔ چنانچہ گروپ اس وقت تک حسین آباد کے تصویر خانے میں جو تالاب کے قریب موجود ہے اور قابل دید ہے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ مصور نے اپنے قلم سے ابھی ابھی تصویر بنائی ہے ؛

....

(عشرت لکھنوی)

چچا چھکن کے ابتدائی کارنامے

(از جناب محمد ابراہیم خاں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ)

رات کے کوئی نو بجے ہوں گے جو چچا چھکن نے باہر سے دروازہ پر دستک دی۔ پانچ منٹ کے وقفہ کے بعد اندر سے زنجیر کھلی اور چچا چھکن چوروں کی طرح دبے پیروں گھر میں داخل ہوئے۔ پہلے تو غلیل کا چلہ اُتار کر غلیل کھونٹی پر لٹکائی۔ گلے سے غلوں کا تھیلہ اُتار کر اسی کھونٹی پر لٹکایا۔ پھر خاکی نیکر اور قمیص اُتار کر جوتا اُتار سلیپر پہنے۔ مٹکے سے پانی لیا اور ہاتھ منہ دھونے بیٹھ گئے۔ چچی نے اُنکی کسی بات کا نوٹس نہ لیا۔ وہ اپنی بچی کو لئے ہوئے پلنگ پر لیٹی رہیں البتہ کن انکھیوں سے چچا چھکن کی تمام حرکات دیکھ رہی تھیں۔ اب چچا چھکن آستینیں چڑھا کر پلنگ پر اس انتظار میں آ بیٹھے کہ چچی اُن کے سامنے کھانا لا کر رکھیں گی۔ مگر چچی اسی طرح لیٹی رہیں۔ بلکہ چچا چھکن کی طرف سے کروٹ لے کر بچی کو تھپکنے لگیں حالانکہ بچی غفلت کی نیند پڑی سو رہی تھی۔ چچا آخر تو کوئی بچہ نہ تھے کہ اس بے رخی کی وجہ نہ سمجھ سکتے۔ جانتے تھے کہ آج بیگم صاحبہ بے حد خفا ہیں اور یہ بھی جانتے تھے کہ آن کا خفا ہونا بے جا بھی نہیں۔ سوچ رہے تھے کہ اگر آج خیریت سے گزری تو شکار پر اور اُن دوستوں پر جو زبردستی شکار کے لئے ساتھ لے جاتے ہیں۔ آئندہ لعنت بھیجدیں گے اور پھر بیگم صاحبہ کو کم از کم اس معاملہ میں ہماری طرف سے کوئی شکایت کا موقع نہ ہوگا۔

اس حالت میں پندرہ منٹ گزر گئے۔ جب چچا چھکن نے دیکھا کہ بیگم صاحبہ کے نزدیک ہماری موجودگی ابھی تک مشتبہ ہے تو اُٹھے۔ کہ آپ ہی باورچیخانے سے کھانا لا کر کھا لیں۔ چچی تاڑ گئیں کہ وہ کیا حرکت کرنے والے ہیں۔ آخر تھیں تو ہندوستانی ہی بیوی یہ تکلیف چچا چھکن کو دینا نہ چاہتی تھیں۔ اُن کی بھی ہر ہندوستانی بیوی کی طرح یہ خواہش تھی کہ میاں ہمیشہ کم از کم اس معاملہ میں تو انکا دستِ نگر ہی رہے۔ اُٹھیں اور بغیر کسی لفظ کے زبان سے نکالے کھانا گرم کیا۔ ایک کٹورے میں ٹھنڈا پانی لیا اور دونوں چیزیں سامنے لا کر رکھدیں اور پھر بدستور اپنی چارپائی پر جا لیٹیں۔

چچا چھکن نے کھانا ختم کیا۔ ہاتھ دھوئے پانی پیا اور اس انتظار میں پھر پلنگ پر آ بیٹھے کہ بیگم صاحبہ اپنے ہاتھ سے گلوری بنا کر دیں گی۔ مگر یہ وجہ آج تک کسی کی سمجھ میں آئی ہی نہیں کہ جب بیویاں خفا ہوتی ہیں تو خواہ گھر کے تمام کاج کرتی رہیں مگر اپنے ہاتھ سے گلوری ہی بنا کر دیں گی۔ آخر کار چچا چھکن کو اٹھنا پڑا اور خود گلوری بنا کر کھائی۔

اب جو پیٹ کی آگ بجھ چکی۔ طبیعت کو یکسوئی ہوئی اور جسم کو راحت ملی تو چچا چھکن نے چاہا کہ بیگم صاحبہ کو منائیں آن کا غصہ ٹھنڈا کرائیں اور ان سے بہ عاجزی عرض کریں کہ اب ہماری توبہ ہے جو شکار کو جائیں اور اگر اُنکی مرضی ہو تو ابھی ابھی غلیل کو چولہے میں رکھدیں۔ غلوں کو پھینکدیں اور شکاری لباس کو آن پر سے تصدق کر کے کسی غریب شکاری کو دیدیں۔ اس لئے وہ اپنے پلنگ سے اُٹھے اور ابھی بیگم صاحبہ کے پلنگ سے فاصلہ ہی پر تھے کہ جھک جھک کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ٹھیک آن کے چہرہ سے ایک بالشت کی بلندی سے بیگم صاحبہ کی آنکھوں کو تلاش کرنے لگے۔ چچی نے یہ دیکھ کر آنکھیں بند کرلیں اور جب چچا چھکن نے پوچھا کہ "کیا سو گئی ہو؟" تو اس طرح چونک پڑیں گویا [illegible] میں جنت کی سیر کر رہی تھیں اور وہاں سے کوئی آن کو [illegible] نکال لیا ہو۔

[illegible]

غار ختم ہوا تو وہ آدمی وہیں پر ہانپتا کانپتا جا کر بیٹھ رہا۔ ہاتھی کی یہ کیفیت کہ مارے غصہ کے غار کے منہ پر کھڑا ہوا چنگھاڑیں مار رہا تھا اور غار کے اندر جہاں تک اس کی سونڈ جا سکتی تھی ڈال کر چاہتا تھا کہ اس آدمی کو پکڑ کر باہر کھینچ لائے۔ غار میں اندھیرا تھا۔ اول اول تو اس آدمی کو وہاں کچھ نظر نہیں آیا مگر جب اندھیرے میں آنکھیں دیکھنے کی عادی ہو چکیں تو اُس نے دیکھا کہ غار کے ختم پر ایک محراب سی بنی ہوئی ہے اور کوئی کالی کالی شے اس محراب کے درمیان بیٹھی ہوئی ہے مگر معلوم نہ کر سکا کہ کیا ہے۔ تب ہاتھی نے غار کے اندر سونڈ ڈال ڈال کر ایک شور سا مچا دیا تو اُس کالی شے کو حرکت ہوئی اور جہاں وہ آدمی بیٹھا ہوا تھا اُس کی دوسری طرف سے وہ شے نکل کر غار کے منہ کی طرف چلی تو اس آدمی نے دیکھا کہ وہ کالی شے ایک بہت بڑا بچھو تھا۔ آئے گئے ہوش غائب ہو گئے۔ اب اس کو ہر طرف موت نظر آنے لگی۔ اگر غار سے باہر نکلتا ہے تو ہاتھی کاہے کو زندہ چھوڑے گا اور اگر غار کے اندر ہی رہتا ہے تو بچھو کے ایک ڈنک ہی میں خاتمہ یقینی تھا۔ سوچا کہ جب موت آ ہی گئی ہے تو کیا چارہ۔ باہر مرنے سے تو غار کے اندر ہی مرنا بہتر ہے کہ قبر کا تو کام دے گا۔ یہ سوچ کر وہ آدمی غار کے اندر ہی بیٹھا رہا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ وہی بچھو غار کے اندر چلا آ رہا ہے۔ یہ دم بخود بیٹھا رہا۔ بچھو جس راستہ سے گیا تھا اُسی راستہ سے واپس آ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ ہاتھی کے شور و غل کی آواز اب بند ہو گئی تھی۔ یہ خیال کر کے کہ شاید ہاتھی مایوس ہو کر چلا گیا ہو وہ آدمی آہستہ آہستہ غار سے نکل کر باہر آیا تو اس کا خیال صحیح نکلا۔ ہاتھی کا پتہ بھی نہ تھا۔ البتہ زرد رنگ کا کچھ پانی سا بہہ رہا تھا۔ سمجھیں کہ کیا ہوا تھا۔ بچھو کے ایک ڈنک سے وہ عظیم الجثہ ہاتھی پانی ہو کر بہہ گیا۔ اس آدمی نے اللہ تعالے کا شکریہ ادا کیا اور اپنے راستے چلا گیا۔ سچ ہے جس کو خدا رکھے اُس کو کون چکھے"۔

چچی حیرت سے اس بیان کو سن رہی تھی۔ چچا چھکن سمجھے کہ اب جلد معاملہ صاف ہوا چاہتا ہے ایک اور ایسا ہی قصہ بیان کر دوں تو پھر فرصت ہی فرصت ہے۔ یہ سوچ کر چچا چھکن نے ایک اور قصہ بیان کرنا شروع کر دیا۔

"اور وہ روزی رساں تو ایسا ہے کہ انسان کی عقل کام نہیں کرتی ایک صاحب جو حیدر آباد میں تعلقہ دار تھے وہ اپنا چشمدید واقعہ بیان کرتے تھے کہ اُن کے علاقہ میں ایک کنواں کھودا جا رہا تھا۔ جب کھودتے کھودتے پانی نکل آیا تو اُس پانی میں ایک بڑے تربوز کی برابر اور ویسا ہی گول ایک پتھر ملا۔ لوگ اُس عجیب پتھر کو لے کر تعلقہ دار صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ بھی متعجب ہوئے اور حکم دیا کہ اس پتھر کو اُن کے سامنے دو ٹکڑے کیا جائے۔ جب اُس پتھر کے دو ٹکڑے کئے گئے تو دیکھا کہ پتھر کے اندر تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ اس پانی میں سے ایک چھوٹی سی مینڈکی پھدک کر باہر آ گئی۔ لوگ...... سخت...... حیرت..... زدہ...... ہوئے۔ پتھر س پانی...... کہاں ......سے آیا...... ...اور......."

چچا چھکن اس حکایت کے آخری حصہ پر پہنچ رہے تھے کہ اُن پر نیند کا سخت غلبہ طاری ہوا۔ پہلے تو آواز میں کمزوری واقع ہوئی۔ پھر الفاظ بے ترتیب ہو گئے۔ ایک لفظ کے بعد دوسرا لفظ کئی کئی سکنڈ کے بعد ادا ہونے لگا۔ جملے بے ربط ہو گئے اور آخر کار ایک لمبے خراٹے پر یہ حکایت "تمت تمام شد" ہو کر رہ گئی۔ چچی کچھ پہلے سو چکی تھیں۔ اتنے میں دالان کی اندر سے زنجیر بجنی شروع ہوئی۔ اس آواز پر چچی ذرا ہوشیار ہوئیں پھر پوری آنکھیں کھول کر غور سے سننے لگیں۔ زنجیر برابر بج رہی تھی۔ چچی نے "بلی۔ بلی" کہکر دھتکار دیا۔ آواز موقوف ہوئی مگر چچی کو دہشت سے نیند نہ آئی۔ آدھ گھنٹہ کے بعد پھر زنجیر بجنے لگی۔

نیا مکان نیا محلہ چچی بھوت پریت کی پہلے تو بڑی قائل تھیں مگر چچا چھکن نے ہمیشہ یہی کہا کہ بھوت پریت نام ہے فقط وہم کا اور یہ سب مزخرفات ہے اور کچھ نہیں۔ چچی اُنکی ہم خیال تو نہیں بنیں البتہ عقیدہ میں کمزوری ضرور پیدا ہو گئی۔ اسوقت اُن کو یہی خیال آ رہا تھا کہ اگر بلی ہوتی تو بھاگ گئی ہوتی۔ ہو نہ ہو اس مکان میں کچھ خلل ہے۔ چچی نے پھر دھتکار دیا اور پھر زنجیر کا بجنا موقوف ہو گیا۔ مگر اب چچی کی نیند کوسوں دور تھی۔ چچا چھکن مزے سے خراٹے لے رہے تھے۔ اب جو تیسری مرتبہ زنجیر بجنا شروع ہوئی تو چچی سے نہ رہا گیا۔ اور چچا چھکن کے اس طرح بے خبر سونے پر خفا ہوتے ہوئے ایک مرتبہ تو جھنجھوڑ ہی ڈالا۔

"ایسی بھی بھلا کیا نیند۔ گھر میں کیسا شور ہو رہا ہے"

چچا چھکن۔ "ابھی بھی کیا نیند۔ ابھی تو دس بھی نہیں بجے۔ لوگ جاگتے ہیں۔"

چچی۔ "تو تم کو مجھ سے کیا غرض۔ جاؤ اپنے شوق پورے کرو۔ جہاں دن گنوایا وہاں رات بھی سہی"۔

چچا چھکن۔ "کیا واقعی خفا ہو۔ اگر شکار سے خفا ہو تو جاؤ اب شکار کو نہیں جائیں گے۔ مگر سیدھے منہ بات تو کرو۔"

چچی۔ "مجھے شکار وکار سے کیا غرض۔ جاؤ گے اپنے لئے نہ جاؤ گے اپنے لئے۔"

چچا چھکن۔ "اچھا تو خفا کس بات پر ہو۔ کچھ منہ سے بھی کہو گی یا نہیں"۔
اب چچی اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔

چچی۔ "ایک صبح سے گئے گئے اب رات کو دس بجے گھر میں گھسے ہیں۔ نہ یہ خبر کہ کیا پکے گا نہ یہ خبر کہ گھر میں کچھ ہے یا نہیں۔ مکان کیا ہوا۔ سرائے ہوئی کہ رات کو آکر پڑ رہے۔ واہ۔"

چچا چھکن۔ "اچھا اب اس غصہ کو تھوکو گی بھی یا نہیں۔ اب آئندہ جو گھر سے باہر بغیر اجازت جائے وہ مردود۔ بس!"

چچی۔ "بیسیوں مرتبہ ایسے وعدے کر چکے ہو۔ تمہارا اعتبار کیا۔ خیر یہ بھی دیکھا جائے گا۔ مجھے پردیس میں لا ڈالا ہے نہ پاس نہ پڑوس دن میں چور گھس آئیں تو جو چاہیں اُٹھالے جائیں۔ میں اکیلی عورت ذات کیا کر سکتی ہوں"۔

چچا چھکن متعجب ہو کر بولے۔ "پردیس! پردیس کیسا؟"

چچی۔ "پردیس برابر ہی ہے۔ نہ اپنا محلہ نہ اپنے ملنے والے ایک شہر ہوا تو کیا۔ خدا بھلا کرے بی پڑوسن کا اگر اسے کام سے فرصت ہوئی تو بیچاری دیوار پر تھوڑی دیر کے لئے آکھڑی ہوتی ہے اُسی سے دو چار باتیں کر لیتی ہوں اور بس"۔

یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے کہ چچا چھکن کی شادی کو تین یا چار سال کا عرصہ ہوا تھا اور وہ انتہائی وحشت جو آخر کار ان کا طرۂ امتیاز بنی ابھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ اپنے پہلے مکان سے بوجہ ایک دوسرے کرایہ کے مکان میں اُٹھ آئے تھے۔ مکان کچھ زیادہ بڑا [illegible] ایک مختصر دالان تھا۔ دالان ہی میں ایک کوٹھری تھی۔ دالان کے آگے ایک تنگ برآمدہ اور برآمدہ کے آگے تین چار پائی کا صحن تھا۔ یہ تو تھی مکانیت اب رہے مکین۔ تو چچا چھکن ایک چچی دو۔ اور ایک بچی تین۔ کسی نے کہا ہے ایک اکیلا دو گیارہ تین کا پورا کنبہ۔

اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ اس مختصر مکان میں ایک مختصر کنبہ قیام پذیر تھا۔

رات کا یہ انتظام ہوتا تھا کہ دالان کے دو دروازوں کی زنجیر اندر سے لگا دی جاتی تھی۔ اور تیسرے دروازے کی زنجیر باہر سے گرمی کا موسم تھا اس لئے صحن میں دو پلنگ بچھتے تھے ایک پر چچا چھکن اور دوسرے پر چچی مع بچی کے سوتی تھیں۔

چچا چھکن۔ "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ دفتر سے آنے کے بعد میں ہونگا اور گھر۔ اور قسم خدا کی وہ وہ لطیفے بیان کروں گا کہ ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ جاؤ۔ اس تنہائی اور وحشت کا تو خاتمہ ہی سمجھو۔ اب انشاء اللہ تعالےٰ کل سے یہی پروگرام رہے گا"

چچی اس پر ذرا مسکرائیں مگر چچا چھکن نے نہیں دیکھا ورنہ اس شکر رنجی کا تو یہیں خاتمہ ہو جاتا۔ مگر یہ سعادت جو "بزور بازو نیست" کے خلاف "بزور بازو" حاصل ہونے والی تھی کسی اور ہی لطیفہ غیبی کی منتظر تھی۔ چچا چھکن نے دل میں سوچا کہ اگر اس وقت چچی کی توجہ کسی اور طرف ہٹا دی جائے تو ممکن ہے کہ یہ غم و غصہ کے بادل جلد چھٹ جائیں۔ رہا شکار کا معاملہ تو دیکھا جائے گا۔ پھر موقع ملے گا یا نہیں۔ آئندہ کی خبر تو اللہ میاں ہی کو ہے۔ اس لئے کہنے لگے:۔

"خدا کی قدرت کے بھی عجب کھیل ہیں۔ آج ہمارے دوست مرزا صاحب بیان کر رہے تھے۔ کہ حیدر آباد یا کہیں اور کا واقعہ ہے کہ جنگل میں ایک شخص کہیں کو چلا جا رہا تھا۔ بیچ جنگل میں پہنچکر اس نے دیکھا کہ ایک مست ہاتھی چنگھاڑتا ہوا اُس کے پیچھے دوڑا چلا آرہا ہے۔ بیچارے کے اوسان خطا ہوگئے۔ کوئی درخت بھی قریب نہ تھا کہ اُسپر چڑھ کر اپنی جان بچاتا۔ غریب کو موت نظر آنے لگی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ سامنے ایک غار ہے۔ بلا وسواس اس میں گھس گیا۔ یہ جگہ پیڑ سے زیادہ محفوظ معلوم ہوئی۔ غار تھا بڑا جہاں تک جا سکا گھسا چلا گیا۔ آخر جب وہ

وہ آدمی وہیں پر ہانپتا کانپتا جا کر بیٹھ رہا۔ ہاتھی کی یہ
بے غصہ کے غار کے منہ پر کھڑا ہوا چنگھاڑیں مار رہا تھا
ر جہاں تک اس کی سونڈ جا سکتی تھی ڈال کر چاہتا تھا
کو پکڑ کر باہر کھینچ لائے۔ غار میں اندھیرا تھا۔ اول اول تو
ہاں کچھ نظر نہیں آیا مگر جب اندھیرے میں آنکھیں دیکھنے کی
ں تو اس نے دیکھا کہ غار کے ختم پر ایک محراب سی بنی ہوئی ہے
الی شے اس محراب کے درمیان بیٹھی ہوئی ہے مگر معلوم نہ
۔ جب ہاتھی نے غار کے اندر سونڈ ڈال ڈال کر ایک
تو اس کالی شے کو حرکت ہوئی اور جہاں وہ آدمی بیٹھا
ں دوسری طرف سے وہ شے نکل کر غار کے منہ کی طرف چلی
ے دیکھا کہ وہ کالی شے ایک بہت بڑا بچھو تھا۔ آئے گئے
ہو گئے۔ اب اس کو ہر طرف موت نظر آنے لگی۔ اگر غار سے
ہاتھی کا ہے کو زندہ چھوڑے گا اور اگر غار کے اندر ہی
کے ایک ڈنک ہی میں خاتمہ یقینی تھا۔ سوچا کر جب موت
لیا چارہ۔ باہر مرنے سے تو غار کے اندر ہی مرنا بہتر ہے
ے گا۔ یہ سوچ کر وہ آدمی غار کے اندر ہی بیٹھا رہا۔ اتنے
ہے کہ وہی بچھو غار کے اندر چلا آ رہا ہے۔ یہ دم بخود بیٹھا
راستہ سے گیا تھا اُسی راستہ سے واپس آ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا
غل کی آواز اب بند ہو گئی تھی۔ یہ خیال کر کے کہ شاید
کر چلا گیا ہو وہ آدمی آہستہ آہستہ غار سے نکل کر باہر آیا
صبح نکلا۔ ہاتھی کا پتہ بھی نہ تھا۔ البتہ زرد رنگ کا کچھ پانی
مجھیں کہ کیا ہوا تھا۔ بچھو کے ایک ڈنک سے وہ عظیم الجثہ
بہہ گیا۔ اس آدمی نے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا اور اپنے
سچ ہے جس کو خدا رکھے اُس کو کون چکھے"۔

ہرت سے اس بیان کو سن رہی تھی۔ چچا چھکن سمجھے کہ اب
ن ہوا چاہتا ہے ایک اور ایسا ہی قصہ بیان کر دوں تو پھر
ت ہے۔ یہ سوچ کر چچا چھکن نے ایک اور قصہ بیان کرنا

د روزی رساں تو ایسا ہے کہ انسان کی عقل کام نہیں کرتی

ایک صاحب جو حیدر آباد میں تعلقہ دار تھے وہ اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے
تھے کہ اُن کے علاقہ میں ایک کنواں کھودا جا رہا تھا۔ جب کھودتے کھودتے
پانی نکل آیا تو اُس پانی میں ایک بڑے تربوز کی برابر اور ویسا ہی گول
ایک پتھر ملا۔ لوگ اُس عجیب پتھر کو لے کر تعلقہ دار صاحب کی خدمت
میں حاضر ہوئے۔ وہ بھی متعجب ہوئے اور حکم دیا کہ اس پتھر کو اُن کے سامنے
دو ٹکڑے کیا جائے۔ جب اُس پتھر کے دو ٹکڑے کئے گئے تو دیکھا کہ پتھر کے اندر
تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ اس پانی میں سے ایک
چھوٹی سی مینڈکی پھدک کر باہر آ گئی۔ لوگ...... سخت..... حیرت....
زدہ...... ہوئے۔ پتھر..... پانی..... کہاں ...... سے آیا.....
... اور........"

چچا چھکن اس حکایت کے آخری حصہ پر پہنچ رہے تھے کہ اُن پر نیند کا
سخت غلبہ طاری ہوا۔ پہلے تو آواز میں کمزوری واقع ہوئی۔ پھر الفاظ
بے ترتیب ہو گئے۔ ایک لفظ کے بعد دوسرا لفظ کئی کئی سکنڈ کے بعد ادا
ہونے لگا۔ جملے بے ربط ہو گئے اور آخر کار ایک لمبے خراٹے پر یہ حکایت
"تمت تمام شد" ہو کر رہ گئی۔ چچی کچھ پہلے سو چکی تھیں۔ اتنے میں دالان کی
اندر سے زنجیر بجنی شروع ہوئی۔ اس آواز پر چچی ذرا ہوشیار ہوئیں پھر
پوری آنکھیں کھول کر غور سے سننے لگیں۔ زنجیر برابر بج رہی تھی۔ چچی نے
"بلی۔ بلی" کہکر دھتکار دیا۔ آواز موقوف ہو گئی مگر چچی کو دہشت سے نیند
نہ آئی۔ آدھ گھنٹہ کے بعد پھر زنجیر بجنے لگی۔

نیا مکان نیا محلہ چچی بھوت پریت کی پہلے تو بڑی قائل تھیں مگر چچا
چھکن نے ہمیشہ یہی کہا کہ بھوت پریت نام ہے فقط وہم کا اور یہ سب مزخرفات ہے
اور کچھ نہیں۔ چچی انکی ہم خیال تو نہیں بنیں البتہ عقیدہ میں کمزوری ضرور
پیدا ہو گئی۔ اسوقت اُن کو یہی خیال آ رہا تھا کہ اگر بلی ہوتی تو بھاگ گئی
ہوتی۔ ہو نہ ہو اس مکان میں کچھ خلل ہے۔ چچی نے پھر دھتکار دیا اور پھر
زنجیر کا بجنا موقوف ہو گیا۔ مگر اب چچی کی نیند کوسوں دور تھی۔ چچا چھکن مزے سے
خراٹے لے رہے تھے۔ اب جو تیسری مرتبہ زنجیر بجنا شروع ہوئی تو چچی سے
نہ رہا گیا۔ اور چچا چھکن کے اس طرح بے خبر سونے پر خفا ہو کر انہیں
ایک مرتبہ تو جھنجھوڑ ہی ڈالا۔

"ایسی بھی بھلا کیا نیند۔ گھر میں کیسا شور ہو رہا ہے"

[illegible] بیٹھو
[illegible] آنکھیں کھول کے تجھو یا نہیں۔
[illegible] ہول۔ سنتے ہو؟" چچی نے غصہ سے کہا۔

ایک مرتبہ چچا چھکن نے کروٹ بدل کر "اونہہ" تو کہا اور پھر سو گئے اب چچی کو تاب نہ رہی جلدی میں جو پلنگ سے اٹھیں پاس ہی کا بھرا گلاس رکھا تھا۔ اس میں جو ٹھوکر لگی تو تمام پانی اچھل کر کے منہ اور سر پر پڑا۔ چچا چھکن "کیا ہے۔ کیا ہے" کہتے ہوئے نیم بیدار چچی نے موقع غنیمت جان کر چچا چھکن کا ہاتھ پکڑ کر پلنگ پر بٹھا ہی تو کہنے لگیں کہ "دیکھو تو دالان کی زنجیر کیوں بج رہی ہے۔"

زنجیر بجنا موقوف ہو چکی تھی۔ چچا چھکن بولے۔

"خواہ مخواہ نیند خراب کرتی ہو۔ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیتا۔"

"ذرا صبر سے کام لو اور غور سے سنو" چچی نے کہا۔ اتنے میں زنجیر [illegible] ہوئی۔

چچا چھکن بولے "بلی ہو گی۔ ذرا ڈنڈا دینا ابھی بھگائے دیتا [illegible] چچا چھکن کود کر جو پلنگ سے اٹھے تو چچی نے ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگیں "میں یوں نہ جانے دونگی۔ مجھے تو کچھ اور ہی معلوم ہوتا ہے۔ بلی کو [illegible] رکھی ہوں اگر بلی ہوتی تو بار بار کیوں آتی"

چچا چھکن تعجب سے بولے "کیا مطلب۔ کیا مطلب کچھ اور ہی معلوم [illegible] کیا؟"

چچا چھکن کی نیند اب بالکل غائب ہو چکی تھی۔ کچھ سوچ کر پھر بولے "کیا تمہارا خیال ہے کہ اس گھر میں کچھ آسیب ہے"۔ اور پھر فوراً ہی [illegible] بیٹھ گئے۔

"ہاں" چچی نے کہا۔ "اسی لئے تو میں تم کو اکیلا نہیں جانے دیتی"

[illegible] چچا چھکن ہمیشہ چچی سے یہی کہتے رہے کہ بھوت پریت کوئی [illegible] ہے مگر اب جو ایک صورت پیش آئی تو دل میں [illegible] ساتھ مگر [illegible] دکھانے لگے تو

چچی کو یہ تجویز پسند اور چچا چھکن نے یہاں طے کیا کہ چچی تو لالٹین لے کر [illegible] چلیں اور چچا چھکن اپنا ڈنڈا لے کر چلیں۔ چنانچہ چچی نے تو لالٹین لی اور چچا چھکن بانکپن سے اپنا ڈنڈا ہاتھ میں لئے ساتھ چلے۔ دالان کی زنجیر کھول کر جو اندر گھسے ہیں تو روشنی میں ہر چہار طرف غور سے دیکھا مگر کچھ نظر نہ پڑا۔ اچھی طرح دیکھ بھال کر دونوں باہر نکل آئے اور چچا چھکن پلنگ پر بیٹھکر پھر زنجیر بجنے کا انتظار کرنے لگے۔

اس مرتبہ زنجیر زیادہ زور سے بجنے لگی۔ گویا کوئی شے ہے جو باہر نکلنے کے لئے بیتاب ہو رہی ہے۔ چچا چھکن جو ابھی تک اپنی مردانگی کو برقرار رکھے ہوئے تھے زیادہ خوف زدہ ہونے لگے۔ چچی نے کہا کہ اسوقت اچھا موقع ہے۔ جلدی سے زنجیر کھول کر دیکھیں تو کیا ہے۔ چچی کی موجودگی سے چچا چھکن کی ہمت بندھی ہوئی تھی۔ اس لئے پھر اسی عمل کا اعادہ کیا گیا مگر نتیجہ وہی کا وہی رہا۔ اب چچا چھکن کو یقین ہونے لگا کہ بیشک یہ کوئی بھوت ہی ہے جو زنجیر تو برابر بجائے جا رہا ہے مگر باوجود تلاش کے نظر نہیں آتا۔ رہی سہی ہمت بھی جواب دینے لگی۔

چچی ذرا سوچ کر بولیں۔ ایسا کرو کہ بغیر روشنی کے دالان میں داخل ہوں اور پھر وہاں روشنی کر کے دیکھیں کہ کیا اسرار ہے۔ چچا چھکن نے بادل ناخواستہ اس تجویز کو قبول کیا اور چچی ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں دیاسلائی لئے ہوئے ساتھ ہوئیں۔

جلدی سے دروازہ کھول کر دونوں اندر داخل ہوئے۔ چچا چھکن ڈنڈا لئے ہوئے کچھ آگے تھے۔ دفعتاً چچا چھکن کی زور سے چیخ نکلی اور ساتھ ہی ایک آہ کی آواز آئی۔ چچی نے جلدی سے لالٹین روشن کی تو دیکھا چچا چھکن گھٹنہ پکڑے بیٹھے ہیں۔ چچی "کیا ہوا کیا ہوا" کہتی ہوئی قریب گئیں مگر چچا چھکن فوراً ہی "کچھ نہیں۔ کچھ نہیں" کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ بات یہ ہوئی کہ اندھیرے میں کوئی جسم ان کے پیر سے مس ہوا تھا اور انہوں نے اضطراری طور پر فوراً ہی ڈنڈے سے حملہ کیا۔ مگر دالان کی چھت نیچی ہونے کی وجہ سے پہلے تو ڈنڈا چھت سے ٹکرایا اور پھر کچھ اس طرح گھوم کر پلٹا کہ زمین بوس ہونے کے بجائے چچا چھکن کے گھٹنے کی خبر لے لی۔

[illegible] دل سے بھوت پریت کا خیال تو جاتا رہا [illegible] دل میں ایک نامعلوم جسم کو گزرتے ہوئے

- اب بیخوف ہو کر چلانے لگے ۔
ں جائے گا مردود۔ اگر جان ہی سے نہ مار ڈالا ہو تو نام بدل دینا
۔کدھر ہے ۔ لو ں تیری خیر۔ بہت دیر سے پریشان کر رکھا ہے
ت آتی ہے تو شہر میں بھاگ کر آتا ہے"۔
چھکن کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ رات آدھی سے
تی ۔ چچی کھڑی کھڑی چچا چھکن کا تماشہ دیکھ رہی تھیں جو
پنے ڈنڈے کو گھما گھما کر والان کے چاروں کونوں میں مار
ور ساتھ ہی ساتھ چلاتے بھی جا رہے تھے ۔
ہمسائی خیریت تو ہے۔ یہ کیسا شور ہے ۔ضرورت ہو تو ہم
ایک عورت نے برابر والے مکان کی دیوار سے آواز دی۔
کون تھا۔ چچا چھکن نہ تو کچھ بتاتے ہی تھے اور نہ چپ ہی
ور بڑھ رہا تھا۔
ں جا کر بیٹھا ہے ۔ ذرا نکل تو مزہ چکھاؤں۔ بہت دق کر چکے
نکل آؤ ۔ ایک ڈنڈے کا دم نہیں آتے ہیں ہم سے اُلجھنے ساری
ہیں نانی سے ٹھٹول"۔
نے میں چچی سے بولے۔" ذرا لالٹین ادھر تو لاؤ کوٹھری اور

ز کچھ بتاؤ تو ہے کیا۔ تم نے کیا دیکھا۔ کوٹھری میں کیا ہے"؟
ہو کر پوچھا۔
چچا چھکن بولے ۔ باتوں میں دیر نہ کرو ۔ ایسا نہ ہو کہیں بھاگ جائے
رو۔ ہاں یونہی چلی آؤ۔ ڈرو نہیں"۔
ہی کوٹھری کے کواڑ جو بھیڑے ہوئے تھے کھلے اور لالٹین کی روشنی
چھکن نے فوراً ایک نعرۂ جاں گداز کے ساتھ ایک وار ڈنڈے کا
، کپڑا دلکے صندوق پر پڑا۔
غصہ سے بولیں۔" اے میں کہتی ہوں تم کو ہو کیا گیا ہے۔ خواہ مخواہ شور
ارے محلہ کو سر پر اٹھا لیا۔ نہ کچھ بتاتے ہو نہ کچھ کہتے ہو ۔ میرے صندوق کو
ذرا حواس درست کرو"۔
چا چھکن نے ۔ ابھی نہیں وہ ایک گوشہ کی طرف گھٹنوں پر ہاتھ رکھے
کر کسی چیز کو غور سے دیکھ رہے تھے ۔ چچی نے بھی اس چیز کو دیکھ لیا اور

ہنستے ہنستے بیتاب ہو گئیں ۔ چچا چھکن کو اُن کی یہ بے وقت کی ہنسی سخت ناگوار گزری
اور غصہ سے کہنے لگے ۔" یہ ہنسی کا کون موقع ہے ۔ نہ معلوم کیا بلا ہے ۔ جو دو صندوقوں کے
درمیان کالی کالی بیٹھی ہوئی ہے ۔ کیا معلوم جو کوئی بھوت ہی ہو اور اس نے
ہم کو ڈرانے کے لئے یہ شکل اختیار کر لی ہو"۔
چچی نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے جواب دیا ۔" تمہیں تو اللہ میاں نے ویسے ہی
مرد بنا دیا ۔ صاف نظر آ رہا ہے ۔ میں پوچھتی ہوں تم تو بھوتوں کے قائل ہی نہ تھے
اب کیوں ان کا اقرار کرنے لگے"۔
چچا چھکن چوہے کو پہچان چکے تھے ۔ اکڑ کر کہنے لگے ۔
" اب بھی کون بھوتوں کا قائل ہے ۔ میں تو تم کو چڑانے کیلئے کہہ رہا تھا"۔
مشکل یہ تھی کہ چوہا سہما ہوا دو صندوقوں کے درمیان سمٹا سمٹایا ہوا
اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ وہاں ڈنڈے کا کام نہ تھا ۔ اس کو ماریں تو کیسے ماریں
صدقے جائیے چچا چھکن کی عقل رسا کے کہ چچی تو سوچتی ہی رہیں انہوں نے اس
مشکل کو بھی حل کر لیا ۔ بڑے بوڑھوں کی ایک نشانی تلوار گھر میں رہ گئی تھی
فوراً نیام میں سے نکال اس کی نوک سے چوہے کا کام تمام کر دیا اور تن کر کہنے لگے
" دیکھا بہادری اسکو کہتے ہیں ۔ اگر تمہاری طرح میں بھی ڈر گیا ہوتا تو آج رات
نیند آنے سے رہی تھی اور کل ہی مکان بدلنا پڑتا وہ علیحدہ "۔
غرضکہ وہ چوہا مکان کے باہر پھینک دیا گیا ۔
رات کافی جا چکی تھی ۔ چچا چھکن اور چچی دونوں خوب ہلکان ہو چکے
تھے ۔ پلنگ پر پہنچنے کی دیر تھی کہ دونوں غافل ہو کر سو گئے ۔ چچی کی حسب عادت
نماز فجر کے وقت آنکھ کھل گئی ۔ سر میں درد تھا بہتیرا چاہا کہ پھر پڑ کر سو رہیں مگر
نیند نہ آئی ۔ اس لئے گھر کے کام کاج میں مشغول ہو گئیں ۔ چچا چھکن بدستور
سو رہے تھے ۔ جب دس بجے کا عمل ہوا تو چچی نے چچا چھکن کو یہ کہہ کر
جگانا چاہا ۔" اے بس اب اٹھو گے بھی یا نہیں ۔ دس بج رہے ہیں ۔
کیا دفتر نہ جاؤ گے ۔ اور آج کھاؤ گے کیا؟"
چچا چھکن نے نیم باز آنکھوں سے گھر میں پھیلی ہوئی دھوپ کو
دیکھا ۔ اور یہ کہتے ہوئے چادر تان کر پھر سو گئے ۔
" نیند ابھی نہیں بھری ۔ دفتر کی تعطیل ہے ۔ تھیلے میں چار کبوتر
اور تین فاختہ پڑی ہیں ۔ انہی کو بھون بھان لو ۔ کل جائیں گے تو زیادہ شکار
لائیں گے"۔

(محمد ارا آہمہ ۱۱

انتخاب

(افغانی سرحد کا ایک دلچسپ افسانہ)

(از جناب محمد اختر صفوی - صفی پوری)

عظیم نے صحن باغ میں داخل ہو کر ایک بیفکرانہ نظر سے ہر چہار طرف دیکھا۔ وہ کسی خیال میں غرق تھا کہ اتفاق اس کی نظر سامنے کی جانب گلاب کی ایک گھنی جھاڑی سے گزرتی ہوئی ایک سفید ریشمی متحرک کپڑے پر پڑی پہلے تو ایک لمحہ کے لئے تجسس آمیز حیرت کے ساتھ اس کی بھنویں ایک دوسرے کر مل گئیں۔ لیکن پھر اس کو خیال گزرا کہ غالباً یہ اس کے باپ کے دوست محمد اکبر کی لڑکی سلمیٰ ہے۔ عظیم کے دل میں اس کے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی اور کسی خیال سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

عظیم اپنے باپ عزیز کے ہمراہ تجارتی سلسلہ سے آج ہی صبح محمد اکبر کے یہاں پہونچا تھا۔ عظیم اور اس کا باپ گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ اثنائے راہ میں عزیز نے اس کی شادی کے متعلق عظیم کا عندیہ لینے کی غرض سے متفرق و متعدد سوالات کئے۔ عزیز نے کہا کہ ایک جوان آدمی کے لئے یہی زمانہ ہوتا ہے۔ کہ وہ شادی کر کے اپنا گھر آباد کرے۔ عظیم کا یہ زمانہ بالکل آزادی کا تھا۔ چنانچہ وہ کئی سرحدی یورشوں میں بھی حصہ لے چکا تھا اور اسی آزادی کو دور کرنے کے لئے عزیز کی انتہائی خواہش تھی کہ عظیم کو متاہل زندگی کی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔ اپنے باپ کے استفسار پر عظیم نے مسکرا کر گردن جھکا لی اور اپنے دل میں کہا کہ میں شادی کر کے اپنی آزادی کو بیوی کی خاطر ہرگز ہرگز برباد نہیں کر سکتا۔ زندگی ابھی ہزاروں ایک سے ایک بہتر اور دلچسپ چیزوں سے معمور ہے۔ وحشی اور جنگلی گھوڑوں کو سدھانا آزادانہ اور بیفکرانہ جنگلوں اور پہاڑوں میں گھومنا اور اسیطرح کے دسیوں دلچسپ مشاغل میرے لئے کافی ہیں۔

عظیم کی خاموشی پر اس کے باپ نے ایک ٹھنڈی سانس لی ا
اکلوتے لڑکے کے چوڑے سینے بھرے بھرے بازوؤں۔ حسین اور شگفتہ
طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "محمد اکبر کی لڑکی جہیز بکثرت پائیگی۔ میں محمد اکب
متعلق گفتگو کروں گا۔"

"آپ ان سے گفتگو کیجئے آپ کی خوشی۔" عظیم نے مسکراتے اور ر
اپنی گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں شادی خود اپنے انتخاب سے
جسوقت مناسب سمجھونگا اسوقت کرونگا۔"

عظیم کے اس جواب کے بعد اس کے باپ نے گفتگو کا موضو
اور کم از کم عظیم نے تو اس خیال ہی کو اپنے دماغ سے نکال دیا۔

لیکن اسوقت سفید ریشمی ساری کی جھلک نے عظیم کے
بیسیوں خیالات کی آماجگاہ بنا دیا۔ کیا یہ سلمیٰ ہے؟ لیکن وہ تو
اپنے عزیز و قریب کے اور سب سے پردہ کرتی ہوگی۔ پھر آخر یہ
عظیم آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھا اور پھلوں کے درخ
آڑ لیتا ہوا باغ کے کنارے پہونچا۔ اس وقت نہ تو باغ کا کوئی ملا
نہ خود لڑکی اس کی موجودگی سے واقف تھے۔ عظیم کا مقصد لڑکی
کرنا نہ تھا بلکہ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ اگر یہی سلمیٰ ہے تو وہ اپنے با
کہنے کو ٹال کر کیا واقعی کوئی حسین چیز ہاتھ سے کھو رہا ہے۔ چنا
عظیم بالکل قریب پہونچا تو اس نے درختوں کی آڑ سے ایک زر
ساری دیکھی اس وقت صرف ایک جھاڑی ان کے درمیان
تھی اس لڑکی کی پشت عظیم کی طرف تھی۔

، اس لڑکی کو ذرا اور قریب سے دیکھنا چاہا اور کچھ آگے بڑھا۔ وجود انتہائی احتیاط کے اس کی شلوار گلاب کی ایک شاخ ہ گئی۔ اتنی آواز ایک چوکنا ہرنی کے لئے کافی سے زیادہ تھی بلٹ کر پشت کی جانب دیکھنے لگی۔ اسوقت عظیم کے ہوش وحواس خدا کی قدرت کا ایک مکمل اور حسین ترین نمونہ اس کے سامنے تھا۔ وہ سپیدہ صبح سے زیادہ حسین تھی۔ آنکھوں میں ایک خاص مقناطیسی کشش تھی اور ایک اجنبی شخص کی خلاف امید موجودگی کے کے باعث ان سے حیرت اور استعجاب کی بارش ہورہی تھی ایک لمحہ کے لئے وہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ حیرت ب نے اس کے پیر زمین میں گاڑ دیئے لیکن دوبارہ جب اس کو نبی کی موجودگی کا خیال ہوا تو اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ ۔ اور وہ اپنے گھر کی طرف بھاگی لیکن عظیم نے اپنے ارادہ کے ے بے خبر اپنی حرکت کے اشت از بام ہونے کے عواقب سے لاپروا بھی زیادہ تیز دوڑ کر اس کا راستہ روک لیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں" عظیم نے اس کے حسین چہرہ کو غور سے ہوئے کہا۔

لیکن مثل برق وہ ایک طرف کو مڑی اور ساری کو مضبوطی کے پنے جسم سے لپیٹتے ہوئے باغ کے دوسرے کنارے کی طرف بھاگی۔ ہونکہ چوکنا ہرنی کے مانند اسنے اپنے شانوں کو دیکھا لیکن عظیم کو زیب پہونچتے دیکھ کر اور یہ محسوس کرکے کہ اب اس سے جائے مفر وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح پلٹ پڑی۔ اس کا چھوٹا سا سینہ مارے ٹے کے ابھرا ہوا تھا۔ اور آنکھوں سے بجائے خوف وہراس کے غضب کے آنسو بہہ بہہ کر اس کا گریبان ترکر رہے تھے۔ لیکن جب عظیم نے وسلمیٰ کو قریب اور غور سے اسے دیکھنے کا موقع ملا عظیم اس وقت بیت اور عجز وانکسار کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس کے سیاہ بال آنکھیں۔ سرخ وسفید چہرہ حسین خد وخال اور اسپر شباب اور ں کے جوہر جو نمایاں طور پر عیاں تھے ان سب نے مل کر پہلی ہی سلمیٰ کے غضب اور غصہ کو ہرن کر دیا۔ لیکن پھر اس نے اپنے سنبھالا اور زمین پر پیچ کر کہا۔ "تم کیوں میرے پیچھے پڑے ہوئے ہو یہ ایک خانگی باغ ہے جس میں صرف میرے خاندان کے افراد آجا سکتے ہیں"۔

"میں آپ کو کوئی تکلیف پہونچانا نہیں چاہتا" عظیم نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم پیچھے گھوم کر مجھے نہ دیکھتیں تو میں کب کا چلا گیا ہوتا۔ لیکن اب تمہیں دیکھنے کے بعد میں سب کچھ بھول گیا۔ ہاں تم سے کچھ دیر بات چیت کرنے کی خواہش ضرور باقی رہ گئی ہے"۔

"تم مجھ سے ہرگز گفتگو نہیں کرسکتے۔ یہ ایک معیوب بات ہے تمہیں معلوم ہونا چاہئے"

تمہارے باغ سے سامنے والی پہاڑی کا منظر جس کو تم ابھی دیکھ رہی تھیں کسقدر ــــــــ"

"میں ابھی تم سے کہہ چکی کہ میں ہرگز کوئی بات چیت تم سے نہیں کرسکتی" اس نے خوف سے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آخر اس میں نقصان کیا ہے" عظیم نے لجاجت کے ساتھ دریافت کیا "ہمیں یہاں کوئی دیکھ نہیں رہا ہے مجھے بھی ان پہاڑیوں کا منظر بہت پسند ہے وہ اس وقت کتنی حسین نظر آرہی ہیں۔ لیکن ان تک رسائی میرے اختیار سے اتنی ہی باہر ہے جتنی تم تک"

سلمیٰ نے گھبرا کر اپنے چہرہ کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور بھاگنے کی کوشش کی لیکن عظیم نے ایکبار پھر اس کا راستہ روک لیا اور اپنے بازوؤں کو پھیلا کر اس کو اپنی آغوش میں لینا چاہا۔ سلمیٰ نے کترا کر عظیم کی گرفت سے اپنے کو بچایا اور قبل اس کے کہ بھاگے ایکبار پھر عظیم کو سر سے پیر تک بغور دیکھا اس وقت عظیم یہ سمجھ چکا تھا کہ یہ محمد اکبر کی لڑکی ہے۔ اور انہی خیالات میں غرق ایسا کھڑا تھا گویا پتھر کا مجسمہ ہے جو اس جگہ نصب ہے۔ یہی وہ سلمیٰ ہے جس کے ساتھ اس کا باپ اس کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ عظیم نے اپنے دل میں کہا مجھے یقین ہے کہ نور جہاں اس سے زیادہ حسین نہ ہوگی۔ ایک متفکرانہ مسکراہٹ کے ساتھ جو عظیم کے ہونٹوں پر نمایاں تھی وہ آہستہ آہستہ اپنی جائے قیام پر واپس آیا۔

شادی ؟ گھر ؟ ہوں ! یقیناً یہ ایک بہت خطرناک جال ہے۔ جس میں پھنس جانے کے بعد رہائی معلوم ! لیکن ایکبار مجھے سلمیٰ کو پھر دیکھنا ہے۔ اور اس سے گفتگو کرنا ہے۔ اپنے دل میں ملنے کا مضبوط ارادہ کرکے عظیم نے ملنے کے ذرائع پر غور کرنا شروع کیا۔ چنانچہ باغ کے مالی کی وساطت سے ملنا اس کو ممکن نظر آیا

"میں اس کو رشوت دے کر اور پھر انعام کا وعدہ کر کے راضی کر لونگا کہ وہ میرا ایک پرچہ سلمیٰ تک پہونچا دے" علیم نے کہا۔ چنانچہ دوسرے دن ایک پرچہ پر مختصراً مندرجہ ذیل عبارت لکھی۔

"تمہیں پریشان ہونے یا خوف کھانے کی ضرورت نہیں مجھے چند باتیں تم سے بہت ضروری

"کہنا ہیں بعد مغرب باغ کے مشرقی گوشہ میں مجھ سے ملو میں انتظار کروں گا۔" "علیم"

اس پرچہ کو لے کر علیم باغ کے مالی کے پاس پہنچا اور چند منٹ تک اِدھر اُدھر کی گفتگو کرنے کے بعد اسنے یہ پرچہ مع چند روپیوں کے مالی کے ہاتھ میں دیدیا اور اس کو بحفاظت سلمیٰ تک پہونچا دینے کی تاکید کرتے ہوئے مزید انعام کا وعدہ کیا اور چلا آیا۔ انتہائی بے چینی کے ساتھ علیم نے بقیہ دن گزارا جب شام کا دھندلکا چھانا شروع ہوگیا۔ چرواہے اپنے مویشیوں کو واپس لے آئے اور وحوش و طیور اپنے اپنے آشیانوں میں تمام دن کی تگ و دو کے بعد واپس لوٹ کر شب باش ہوگئے اور جب ہر طرف خاموشی چھا گئی تو علیم اپنے کرہ سے نکلا اور آئندہ و روند کی نظروں سے بچتا ہوا باغ کے مشرقی گوشہ کا راستہ لیا۔ یہاں پہنچکر علیم کی عجیب حالت تھی دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور پتیوں کی سرسراہٹ پر بھی جو ہوا کی وجہ سے اِدھر اُدھر اُڑ رہی تھیں وہ چونک چونک پڑتا تھا۔ ایک چھوٹا سا حلقہ بنا کر علیم نے سخت انتظار کے عالم میں اس کا چکر کاٹنا شروع کیا۔ وقت گزرتا چلا جا رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ اس کا دل بیٹھا سا جاتا تھا۔

"وہ نہیں آئے گی یا مجھے یہ پہلے ہی سوچ لینا چاہئے تھا۔ علیم اپنے دل سے یونہی گفتگو کر رہا تھا۔ کہ پشت کی جانب اس کو کچھ آہٹ معلوم ہوئی ابھی وہ اچھی طرح پلٹنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ سلمیٰ انتہائی شرمائی اور لجائی ہوئی اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

"میں یہاں ٹھہر نہیں سکتی" اسنے آہستہ سے کہا۔ "نہ مجھ کو یہاں آنا چاہئے تھا۔ تمہیں مجھ سے کیا کہنا ہے؟"

ایک لمحہ کے لئے علیم کے دل کی حرکت بہت تیز ہوگئی۔ اور وہ بالکل کوئی جواب نہ دے سکا۔ آخر کچھ دیر کے بعد بمشکل اس نے دل کو قابو میں کیا اور کہا۔ بہت ہی منکسرانہ انداز میں کہا "عالم نسواں میں تمہاری وہ حیثیت ہے جو ستاروں میں ماہتاب کی۔ تم سے کچھ دیر کے لئے بھی گفتگو کرنا میرے لئے انتہائی باعث فرحت و انبساط ہے۔ تم سے ملنے سے خوشی مجھے حاصل ہوئی ہے وہ کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھی"

"تم نے مجھے لکھا ہے کہ کچھ بہت ضروری باتیں تمہیں مجھ سے کہنا ہیں" سلمیٰ نے پریشانی کی حالت میں کہا۔

"مجھے یہ کہنا ہے کہ تمہاری خدمت کرنا میرے لئے انتہائی مسرت ہے۔ میں تمہیں خوش رکھنے کے لئے اپنی جان بھی قربان کرنے کے لئے تیار ہوں"

"بس یہی کہنا تھا"

"ارے ظالم یہ کافی نہیں؟ ہاں میں تمہارے ہونٹوں سے بھی سننا چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے ناخوش نہیں ہو۔ میری پیاری سلمیٰ یقین دلا دو کہ ایسا نہیں ہے"

علیم ایک عالم وارفتگی میں یہ سب کچھ کہہ رہا تھا اور سلمیٰ کھڑی سن رہی تھی۔

"نہیں نہیں میں تم سے ہرگز خفا نہیں ہوں" سلمیٰ نے آہستہ کہا۔ علیم ایک قدم اور آگے بڑھ گیا تاکہ اس سے زیادہ قریب ہو

"مجھے اب جانا چاہئے" سلمیٰ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا "رات زیادہ ہوگئی۔ خادمائیں مجھے تلاش کرتی ہوں گی یہ کھانے کا وقت

"لیکن علی الصباح میں یہاں سے چلا جاؤں گا"

"اسقدر جلد" یہ الفاظ عالم بیخودی میں ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ سلمیٰ کے منہ سے نکل گئے۔

"لہٰذا تھوڑی دیر میرے پاس اور ٹھہرو" علیم نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"نہیں نہیں وہ لوگ یا تو میرے منتظر ہونگے یا مجھے تلاش کر رہے ہونگے"

"میں بلا ایکبار تمہیں اور دیکھے نہیں جا سکتا"

"اب یہ قریب قریب غیر ممکن سا معلوم ہوتا ہے"۔ اس نے علیم کے چہرہ پر اپنی نظریں جماتے ہوئے کہا۔ سلمیٰ کی بڑی بڑی سی آنکھیں اسوقت شراب محبت سے معمور تھیں۔ اس کا خوبصور

ایک غنچۂ نودمیدہ کے تھا جس کی خوشبو کی لپٹوں نے ہوا میں
ہ ومہ کی مشام جان کو معطر کر رکھا ہو۔ عظیم اسوقت بالکل بیخود
ا قبل اس کے کہ وہ اس کی حالت کو محسوس کرے اس کے ہاتھ
سلمے کو اپنے حلقہ میں لے کر گلے سے لگا لیا ایک لانبی سانس لینے کے
ں کے لئے سلمیٰ نے اپنے کو عظیم کے مضبوط ہاتھوں میں چھوڑ دیا۔
بعد سلمیٰ نے اپنی اس حالت کو محسوس کیا اور جلدی ۔ "مجھے
و"

میں تمہیں دوبارہ پھر دیکھوں گا"

میں تم سے کہہ چکی کہ اب یہ قریب قریب غیر ممکن سا نظر آتا ہے
تاکہ اپنے کمرے میں سونے کے لئے نہ چلی جاؤں ۔میری خادمائیں
ساتھ رہیں گی۔

"تو مجھے ایکبار پیار ہی کر لو"

"نہیں نہیں مجھے جانے دو!"

جواب کے لئے عظیم نے اس کے سر کو پیچھے ہٹایا اور آہستہ سے محبت
دی ۔سلمیٰ نے عظیم کی گرفت ڈھیلی پا کر مثل ہرنی کے ایک جست کی
کی گرفت سے نکل کر درختوں کی آڑ لیتی ہوئی اپنے کمرے کیطرف
گئی ٭

(۲)

دوسرے دن علی الصباح عظیم اور اس کا باپ اپنے اپنے گھوڑوں
کر اپنے گاؤں کو روانہ ہوئے قبل اس کے کہ راستہ کا گھماؤ سلمیٰ کے
ان کی نظروں سے پوشیدہ کردے ۔عظیم نے پیچھے مڑ کر دیکھا اسوقت
کے بالاخانے کی کھڑکی میں سے ایک ارغوانی رومال ہوا میں اڑتی دکھائی
ہم یہ دیکھ کر مسکرایا اور اپنے گھوڑے کو کچھ روک کر تاکہ اس کا باپ
جائے۔ ہاتھ کا اشارہ کیا۔جواب میں ایک سرخ رومال کو جنبش
ور پھر یکایک کھڑکی بند ہو گئی۔

اثنائے راہ میں عظیم کا باپ خلاف معمول زیادہ خاموش تھا
کے چہرے سے غم و غصہ کا بھی اظہار ہو رہا تھا۔عظیم نے اپنے
اس خاموشی کو حسب توقع منافع بخش سودا نہ ہونے کا سبب
پشاور پہونچکر عظیم اور اس کا باپ ایک دوسرے سے علیحدہ
ہو گئے ۔اس کا باپ تو اپنے گاؤں کو جو پہاڑوں کے درمیان واقع تھا چلا گیا۔
اور عظیم نے دوسری سمت پشاور سے چند میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کی جہاں
گھوڑوں کا میلہ ہو رہا تھا راہ لی ۔عظیم جب میلے میں پہونچا تو دوپہر کا وقت
تھا۔ پہلی ہی نظر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ میلہ ایکی بار ہلکا ہے ۔اول تو جانور ہی
بہت کم تھے اور جو تھے بھی وہ معمولی قسم کے چھوٹے چھوٹے ۔عظیم گھومتا اور
گھوڑوں کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔کہ اس کی نظر ایک طرف کچھ آدمیوں کے
مجمع پر پڑی یہ لوگ ایک گھوڑے کا مول کر رہے تھے ۔عظیم بھی پہونچا اسوقت
گھوڑے کا سر صرف مجمع کے اندر سے دکھائی دے رہا تھا اور صرف سر ہی کو
دیکھ کر عظیم نے اندازہ کر لیا کہ جانور اچھا ہے۔کانوں کی نوکیلی لویں چوڑی پیشانی
کستا ہوا منہ پھولے ہوئے نتھنے چھوٹا سا دہانا اور چمکدار آنکھیں دیکھ کر
عظیم نے اسے بہت پسند کیا ۔عظیم نے جب مجمع کے اندر گھس کر اسے غور سے
دیکھا تو اس کو سخت حیرت ہوئی ۔مضبوط اور صاف ہاتھ پیر۔ چوڑا سینہ
بھاری پشت اور لمبی دم ۔ اتنا نفیس گھوڑا یہاں آیا کہاں سے عظیم نے اپنے دل
میں سوچا اور پھر جس قیمت پر اس کی گفتگو ہو رہی تھی وہ اور بھی تعجب کن تھی
آخر جب دام نہیں پٹے اور سب لوگ یکے بعد دیگرے چلے گئے تو عظیم نے پہلے تو
اپنا روپیہ شمار کیا اس کے بعد وہ اس سوداگر کے پاس پہنچا۔

سلام علیکم ۔عظیم نے پہونچتے ہی کہا۔

وعلیکم السلام۔ سوداگر نے جواب دیا۔

مجھے ایک گھوڑے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس مرتبہ میلہ بہت ہلکا ہے
اچھے جانور ہی نہیں آئے اور جو ہیں وہ مجھے پسند نہیں تاہم سو روپیہ تک
میں تمہیں اس گھوڑے کی قیمت دے سکتا ہوں۔

سوداگر بہت زور سے ہنسا اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جناب
اس طرف چلے جائیے گدھے آپ کو وہاں ملیں گے"

مجھے معلوم ہے اور میں اسی طرف سے آ رہا ہوں اور اگر آپ اس سے
زیادہ مانگیں گے تو میں اسی طرف چلا جاؤں گا۔

سوداگر نے عظیم کو غور سے دیکھا اور اس قسم کی گفتگو کو فضول سمجھکر کہا
کہ میں آپ سے ایکسو اسی روپے لونگا"۔ عظیم نے ایک تنقیدی نظر سے گھوڑے کو
دیکھا اور اپنے جی میں کہا ۔ یہ جانور اس قیمت میں یا تو بہت سستا ہے
یا پھر گراں یہ صاف صاف جوا ہے اگر ہار گئے تو سراسر نقصان اور اگر جیت گئے

تو پھر فائدہ ہی فائدہ چنانچہ اس نے خریدنے کا ارادہ مستقل کرکے اپنے کرتے کے نیچے سے ایکسو پچاس روپیہ کے نوٹ نکالے اور کہا کہ میرے پاس صرف اسقدر ہے اب تمہارا جی چاہے تو اس قیمت پر دید و ورنہ تمہاری خوشی۔ سوداگر نے کن انکھیوں سے نوٹوں کی طرف دیکھا اور عظیم سے متعجب ہوکر پوچھا آپ اسپر سواری کرکے دیکھیں گے بھی نہیں۔

نہیں۔ عظیم نے جواب دیا۔

"خیر لے لیجئے خدا آپ کا محافظ ہو"۔ سوداگر نے کہا اور نوٹ شمار کرنے لگا۔

عظیم نے گھوڑے کی رسی اپنے ہاتھ میں لی اور اپنے گھوڑے کے پاس لاکر اس کو بھی باندھ دیا۔ کچھ دیر ادھر اُدھر گھومنے کے بعد عظیم جب میلے سے روانہ ہوا تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ وہ ابھی راستہ ہی میں تھا کہ اندھیرا چھا گیا۔ چنانچہ سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے اس نے شب گذاری۔ علی الصباح جب عظیم بیدار ہوا تو سب سے پہلے اسکی نظر ایک بہت روشن ستارے پر پڑی چنانچہ اسنے اپنے اس نئے گھوڑے کا نام "ستارہ" رکھدیا گھوڑوں کو دانا کھلانے کے بعد عظیم پھر روانہ ہوگیا اور بعد دوپہر اپنے گاؤں میں پہونچگیا۔ شام کے وقت عظیم نے اپنے باپ کو گھوڑا دکھایا۔ اس کی خریداری کا قصہ سناتے ہوئے عظیم نے کہا کہ میں دو چار دن میں اس پر سواری کروں گا۔ "ہاں ہاں" اس کے باپ نے جواب دیا۔ "یہ بہت نایاب قسم کا گھوڑا ہے تم نے بہت اچھا کیا جو اس کو خرید لیا"۔

"اس کو پھرانے اور شائستہ کرنے کے بعد میں اس کی قیمت کم از کم ایک ہزار روپیہ وصول کروں گا" اور پھر کچھ شرماتے ہوئے کہا۔ "اس کے بعد میں آپ کے حسب منشا شادی کے متعلق غور کرونگا"

عظیم کے باپ نے جس کے چہرے سے برہمی کے آثار نمایاں ہو چکے تھے کہا۔ "پہلے مجھے تمہارے لئے دولھن تلاش کرنی ہوگی"۔

"میرا یہ خیال تھا کہ آپ تلاش کر چکے ہوں گے" عظیم نے معصومانہ انداز سے کہا۔

عظیم کے باپ کی برہمی اور ہوگئی "نہیں" اس نے جواب دیا۔ "میں محمد اکبر سے اس کے متعلق گفتگو کی لیکن ہمارے ساتھ وہ اس رشتہ کو تیار نہیں ہے اس کی گفتگو سخت تحقیر آمیز تھی"

عظیم اپنے باپ کی طرف مڑا اسوقت اس کا چہرہ مارے غصہ تمتما رہا تھا۔ "کیا آپ کا اس سے یہ مطلب ہے کہ ہم اس کے برابر کے نہ ——ہمارا خاندان اتنا ہی پرانا ہے۔ جتنا کہ محمد اکبر کا"—— "بالکل میرے بیٹے لیکن تم نے دیکھا ہوگا کہ محمد اکبر اب مالدار ہوگیا ہے وہ بجائے گھوڑوں کے سوداگر کے لڑکے کے۔ اپنی لڑکی کے لئے کسی ا[ور] خواہشمند ہے۔ مینے جب اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو پہلے بہت مسکرایا اور کہا۔ کہ "وہ اپنی لڑکی کی شادی کی گفتگو محمد جمال [کے] ساتھ کر رہا ہے جو پشاور کے ایک مالدار بیرسٹر ہیں"۔

"اور—— اور—— لڑکی۔ اس کا کیا خیال ہے۔ اس [کے] متعلق؟"

عظیم کا باپ ہنچپایا۔ "لڑکی کو اس سے کیا تعلق" اور میرے [خیال] میں تو اس غریب کو ابھی اس کا علم بھی نہ ہوگا اور بفرض محال اگر ما[لوم] بھی ہے تو جہاں اس کا باپ چاہے گا اسکو وہیں شادی منظور کرنا [ہوگی]

"ہوں" عظیم نے کہا اور چلا گیا۔ لیکن اس کی رگوں میں ا[س کا] افغانی خون جوش مار رہا تھا۔ "ہرچہ بادا باد۔ دیکھا جائے گا۔ شا[دی] شادی میں اب کرونگا ہی نہیں"۔

(۳)

بعد کے دو دن عظیم نے اپنے نئے گھوڑے کی تربیت پر صرف کئے لیکن اسوقت بھی محمد اکبر کا جواب اور اس کے گھر کی تحقیر جو اس طر[ح] ہاتھوں ہوئی تیر اور نشتر کی طرح عظیم کے دل میں چبھ رہی تھی۔ لیکن خاموشی کے چارۂ کار ہی کیا تھا۔ اس کی تمام تر توجہات کا مرکز ا[ب] "ستارہ" تھا۔ عظیم کی یہ انتہائی کوشش تھی کہ وہ اسے خوب اچھی [طرح] مانوس کرلے۔ محبت اور اخلاص وہ شے ہے جو بدطینت سے بدطینت [کو] وہ چاہے حیوان ہو یا انسان اپنا گرویدہ بنالیتی ہے اور پھر گھوڑا [تو] عاقل جانور۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہی دن میں "ستارہ" عظیم کی حسب خواہش اس سے بے حد مانوس ہوگیا۔ تیسرے دن شام کے وقت کچھ دیر کے لئے اسپر سواری کی چوتھے دن صبح کے وقت ایک گھنٹہ شام کو دو گھنٹہ اسپر بیٹھا اب ستارہ اسقدر شائستہ اور فرمانبردار ہو[گیا] کہ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ وہی جنگلی اور خود سر گھوڑا ہے جو کچھ د[ن]

زیدا تھا۔

ایک دن عظیم نے "ستارہ" کو خوب صاف کیا اور اس پر بیٹھ کر روانہ سڑک پر اسوقت چلا جا رہا تھا وہ پشاور کو جاتی تھی۔ عظیم کو خود کہ وہ آخر اس سڑک پر کیوں جا رہا ہے۔ البتہ اس کے دماغ میں ان کن اور تکلیف دہ خواہش یہ ضرور تھی کہ وہ اس محمد جمال کو ی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ عظیم شام کے وقت پشاور نب ایک سرائے میں گزاری۔ صبح اٹھ کر عظیم نے ایک پشاوری ے جو گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا۔ محمد جمال کے متعلق دریافت گر نے کہا کہ محمد جمال کنٹونمنٹ میں ایک عالیشان بنگلہ میں وہ بڑا آدمی ہے اس کے مراسم صاحب لوگوں سے بھی ہیں۔ ، اور متعدد ملازم ہیں۔ مینے ایکبار ایک گھوڑا اس کے ہاتھ کیا تھا۔ اس کے بعد مجھے اتنی قیمت کسی گھوڑے کی نہیں ملی جمال کو پسند آجائے اس کی وہ زیادہ سے زیادہ قیمت دینے ریغ نہیں کرتا۔

تو کیا وہ سواری بھی کرتا ہے؟"

سوداگر ہنسا۔ خدا کی قسم کبھی نہیں۔ اس موٹے آدمی کا وزن ا برداشت ہی نہیں کرسکتا۔

پھر کیوں؟"

بات یہ ہے کہ گھوڑ دوڑ اس کا مشغلہ ہے اس کے پاس متعدد وڑے ہیں اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنی بیوی بچوں سے نے گھوڑوں سے محبت کرتا ہے۔

اچھا تو اس کی شادی ہو چکی ہے"

ہاں ہاں! اس کے چار لڑکیاں ہیں۔ لڑکا کوئی نہیں۔ لیکن کہ وہ کسی ... لڑکی سے دوسری شادی کر رہا ہے"۔ سوداگر نے تے ہوئے کہا۔ عظیم نے جمال کے متعلق اب کافی معلومات تھیں۔ چنانچہ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر عظیم کے بنگلہ کی تلاش ور بلا کسی زحمت اور دقت کے بنگلہ پر پہونچ گیا۔ پھاٹک پر ار باقاعدہ وردی پہنے کھڑا تھا۔ "یہ بنگلہ محمد جمال ہی کا ہے؟" عظیم نے چوکیدار سے دریافت کیا۔

چوکیدار نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تمہیں میرے آقا سے کیا کام ہے" چوکیدار کا لہجہ اس کے قلبی شکوک کا آئینہ بردار تھا۔ عظیم نے کہا کہ میں ایک گھوڑا فروخت — — چوکیدار نے جو اسوقت "ستارہ" کو بغور دیکھ رہا تھا بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ٹھہرو میں ابھی انہیں بلاتا ہوں" اور یہ کہتے ہوئے وہ اندر چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد دروازہ کھلا اور چوکیدار نے اشارہ سے عظیم کو بلایا۔ عظیم ستارہ کو لے کر آگے بڑھا ہی تھا کہ محمد یوسف بھی اندر سے نکل آیا جمال ضرورت سے زیادہ موٹا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں تھیں اور موٹاپے نے ایک ٹھوڑی کی بجائے کئی ٹھوڑیاں بنادی تھیں اسوقت عظیم نے سلمیٰ اور جمال کا موازنہ کیا تو اس کا دل بیٹھنے لگا۔ خدا کی پناہ! یہ کیا غضب ہے سلمیٰ کی شادی محمد جمال کے ساتھ! "تمہارا ہی نام محمد یوسف ہے؟" عظیم نے ایک حقارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ دریافت کیا۔ محمد یوسف نے سر سے پیر تک دیکھ کر کہا۔ "ہاں اے بادیہ نشین" عظیم نے اپنی نظریں اسپر سے ہٹالیں۔ اور منتظر رہا کہ محمد یوسف دوبارہ آغاز گفتگو کرے۔

"تم یہ گھوڑا بیچنا چاہتے ہو؟" محمد جمال نے گھوڑے کو تنقیدانہ نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ عظیم نے محسوس کیا کہ جمال کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گھوڑے کی موزونی اعضا اور اس کے حسن پر فریفتہ ہیں۔ عظیم ابھی یہی دیکھ رہا تھا کہ یکایک اس کو پشاوری سوداگر کی گفتگو یاد آگئی۔ کہ محمد جمال اپنی بیوی بچوں سے زیادہ اپنے گھوڑوں سے محبت کرتا ہے"۔ "میرے پاس یہ گھوڑا ہے" عظیم نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن میں اس کو کسی قیمت کو بھی علیحدہ نہیں کرسکتا"۔

بیرسٹر نے ایک قلبی الجھن کے ساتھ عظیم کو غور سے دیکھا۔ "تمہارا اس سے کیا مطلب ہے؟" جمال نے دریافت کیا۔

عظیم نے اپنی آواز کو آہستہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم محمد اکبر کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہو۔ اس خیال کو اپنے دل سے نکال دو اور گھوڑا تمہارا ہے!"

یہ سنکر محمد جمال کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مارے استعجاب کے کھلی کی کھلی رہ گئیں اس نے عجیب حیرت سے عظیم کو دیکھا پھر یک بیک اس کے خیال نے پلٹا کھایا۔ پہلے تو موٹے چہرے پر مسکراہٹ کی موٹی موٹی لکیریں نمودار ہوگئیں اور اس کے بعد پھر ناقابل برداشت طریقے سے جمال نے ...

شروع کیا اور سارے قہقہوں کے مکان سر پر اٹھا لیا اور پھر جب ضبط نہ کر سکا تو پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا "ارے احمق تو کہتا کیا ہے۔ جمال نے ہانپتے ہوئے کہا "واہ خدا کی قسم کیا لاجواب بات کہی ہے۔ ایک گودڑ پوش بادیہ نشین پٹھان کا لڑکا اور سلمٰی کے ساتھ شادی کی خواہش اور چونکہ پیسہ پاس نہیں اس لئے بڈھا بچہ (ستارہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس کے بدلے میں دینا چاہتا ہے کس قدر عجیب پیش کش ہے" اب ایکبار پھر جمال کے چہرہ کی رنگت بدلی۔ "بیوقوف!" جمال نے نہایت حقارت کے ساتھ کہا۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ بفرض محال اگر میں راضی بھی ہو جاؤں تو کیا محمد اکبر تجھ ایسے شخص کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی گوارا کرے گا؟ تم ایک غریب آوارہ گرد گھوڑوں کے سوداگر یا نکے ٹھگ ہو! تم کسی لڑکی کو کیا آرام پہونچا سکتے ہو۔ میں ان کے لئے ملازم رکھتا ہوں۔ انہیں نفیس نفیس زیورات دیتا ہوں اور ہر طریقہ کا آرام پہونچاتا ہوں۔ میری بیوی اعلیٰ درجہ کی موٹروں میں سیر و تفریح کو جاتی ہے۔ اور بیش قیمت کپڑے پہنتی ہے۔ سلمٰی تو پردہ بھی نہ کرے گی۔ وہ انگریز افسروں کی بیویوں سے ملے گی۔ تمہارے لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ تم اپنے پہاڑی غاروں اور چٹیل میدانوں کو واپس جاؤ اور وحشیانہ خون آشامیوں میں اپنی زندگی گزار دو"

عظیم نے ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں نکالا۔ لیکن اس کی انگلیاں جمال کا گلہ دبانے کے لئے بیقرار ہو رہی تھیں۔ عظیم نے سوچا کہ چند سیکنڈ کا کام ہے کہ میں اپنا چاقو اس گوشت کے تودے میں پیوست کر دوں اور اس سے بہت کم وقت لگے گا کہ میں اپنے "ستارہ" پر بیٹھکر غائب ہو جاؤں۔ لیکن آخر عظیم اپنے ان ارادوں پر غالب آیا اور اس خیال کو ترک کر دیا۔

محمد جمال نے پھر سلسلہ کلام شروع کرتے ہوئے کہا۔ آج شام کو میں محمد اکبر کے یہاں جا رہا ہوں اور وہاں میرے اور ان کے اعزہ جمع ہونگے اور رسم منگنی کی ادائیگی ہوگی۔ بہتر ہے کہ تم اب واپس جاؤ! اور اللہ تمہیں عقل عطا کرے۔

"بہتر ہے او موٹے" عظیم نے اسی لہجے میں جس میں محمد جمال گفتگو کر رہا تھا جواب دیا "میں جاتا تو ہوں لیکن جب تم اپنے مستقبل پر نظر ڈالو تو یہ یاد رکھنا کہ تم نے میرے گھر کی بے عزتی کی ہے اور میرے گھر کے کسی ایک فرد نے بھی کہ ... جب ... ۔ ... جو دعا ہے وہ کوئی ہو [illegible]

یہ کہکر اور جست کرکے عظیم اپنے گھوڑے کی زین پر پہونچا اور اس نے ... گھوڑے کو موڑا کہ جمال اس کی ٹاپوں سے بچنے کے لئے بدحواس ہو کر طرف ہٹ گیا۔ اور عظیم جمال کی طرف اپنی مٹھی دکھاتا اور دانت ... ہوا پھاٹک سے باہر نکلا۔ اور گھوڑے کو تیز کرکے پہاڑی راستہ پر ... اسوقت عظیم کا دل مارے غصہ کے تڑپ رہا تھا۔ صرف اپنی امید ناکامیابی ہی اس کے لئے باعث رنج و الم نہ تھی۔ بلکہ اپنے گھر کی ... اور تذلیل کا احساس بھی تھا جس کو وہ بلا بدلہ لئے چھوڑے جاتا اگر عظیم کو مجبوراً اس شادی کے لئے تیار ہونا پڑا ہوتا جیسا کہ عموماً ہے تو اسکو ذرہ برابر بھی پروا نہ ہوتی لیکن یہ ان لوگوں میں تھا جو ارادے خود قائم کرتے ہیں۔ اور پھر ان ارادوں کو بہرصورت ... پہونچانے میں کسی چیز کی بھی پروا نہیں کرتے۔ عظیم نے سلمٰی کے ساتھ شا... ارادہ مستقل کر لیا تھا۔ اور اب صرف تقدیر ہی امور ہی اس کو اپنے خیال سے باز رکھ سکتے تھے۔ محمد جمال کا خیال اور اس کے تذلیل ... اس وقت عظیم کے زخم خوردہ دل پر نمک پاشی کر رہے تھے۔ سرحدی ... اس وقت اس کی رگوں میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ جوش غضب کی وجہ سے آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ کہ ... خیالی پیکر اپنی تمام رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ اس کے سا... آ موجود ہوا۔ اس وقت عظیم کو ایسا محسوس ہوا جیسے سلمٰی اس سے کہہ رہی ہے کہ مجھے جمال کے پنجہ سے بچاؤ۔ عظیم کیا تم مجھے اسقدر جلد ... کیا مجھ پر نازل ہونیوالی آفت کی تمہیں پروا نہیں.....

عظیم نے فوراً اپنے گھوڑے کی باگ کھینچ لی اس وقت شدت غضب سے اس کی آنکھیں نکلی پڑتی تھیں۔ جوش غضب نے نیک ... تمیز مٹا دی تھی۔ اور انتقام کے خوفناک دیوتا نے حق و باطل سے بیگانہ کرکے اپنے تمام شیطانی ارادوں کو اسپر مستولی کر دیا تھا۔ عظیم نے اپنے ... جو شدت غضب کے باعث خشک ہو گئے تھے۔ زبان سے تر کیا اور گھوڑے کو بجائے اپنے پہاڑی گاؤں کی طرف لے جانے کے محمد اکبر کے گاؤں کی طرف موڑ دیا جس کے مشرقی کنارے پر ایک سرسبز و شاداب باغ کے ... محمد اکبر کا مکان تھا۔

(۴)

لرچہ رات اندھیری نہ تھی لیکن آسمان پر سیاہ سیاہ بادلوں کے
کو اپنے دامنوں میں چھپائے ہوئے تھے اس لئے جب کبھی چاند
باہر آجاتا تو چاندنی پھیل جاتی اور جب پھر بادل کے ٹکڑے
ندھیرا ہو جاتا۔ اسی حالت میں غظیم نے باہر ہی باہر لوگوں کی
بچتے گاؤں کا چکر کاٹا اور محمد اکبر کے باغ میں پہونچکر مکان سے
گوشہ میں درختوں کی جھاڑیوں کی آڑ لے کر گھوڑے سے اترا
ں کنج میں تو گھوڑے کو باندھ دیا اور خود نہایت ہوشیاری کے
ن آہٹ لیتا ہوا محمد اکبر کے مکان کی پشت پر پہونچا اسوقت
چھپا ہوا تھا اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اوپر کی
یک کھڑکی جو پشت کی جانب تھی کھلی ہوئی تھی۔ اندر تیز روشنی کا
روشن تھی۔ کچھ لوگ حقہ پی رہے تھے کچھ ہنس بول رہے تھے
گی اور متانت سے بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ ان سب کی آوازیں
لڑ گڑاہٹ کے غظیم پشت پر تھا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ ہم
ئیگی کے سلسلے میں یہ خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ غظیم ذرا اور
تو وہ اس کھڑکی کے نیچے ہو گیا جس میں سبز پردے پڑے تھے
کھڑے ہو کر پہلی بار رو انگی کے دن سلمیٰ نے سرخ رومال ہلایا کر
یاد کیا تھا۔ اسوقت غظیم کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا
ہے! وہ اسوقت یقیناً یہیں ہو گی۔ لیکن کیا وہ تنہا ہو گی؟
ف کھلی ہوئی تھی۔ اور سبز پردہ ہوا میں ادھر ادھر اڑ رہا
اسوقت ہمہ تن اندر کی آہٹ لینے میں مشغول تھا۔ لیکن بہت
ب کسی قسم کی کوئی بھی آہٹ نہ ملی۔ تو پہلے سر چار طرف نظر ڈالکر
ن کیا اور پھر پیروں سے چپلی اتار کر اور کھڑکی کی دہلیز پکڑ کر
بلا تو بلی کی ایسی تیزی اور خاموشی کے ساتھ وہ کھڑکی اور پردہ کے
ا ہو چکیا۔ یہاں کچھ دیر ٹھہر کر اسنے پھر آہٹ لی تو اس کو بہت
تہ سانسوں کی آواز آتی معلوم ہوئی اسوقت کمرہ میں بالکل
۔ جب غظیم کی آنکھیں اس اندھیرے سے مانوس ہوئیں۔ تو
یکھا کہ اس کمرہ میں صرف ایک شخص ہے جو سو رہا ہے۔
سوقت آسمان پر عین کھڑکی کے مقابل چاند اپنی پوری آب و تاب کے
ساتھ چمک رہا تھا غظیم نے سبز پردہ کو ایک جانب ہٹایا تو کمرہ میں کافی روشنی
پہونچ گئی۔ غظیم پردہ کو ہٹا کر جو دوبارہ اس سونے والے کے پاس آیا۔ تو
اس کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ یہ سلمیٰ تھی جو ایک کوچ پر لیٹی محو خواب تھی۔
چہرہ کسی اندرونی فکر اور پریشانی کے باعث زرد تھا۔ سر کے بال کھلے ہوئے
تھے۔ اور برہنہ کلائی پر سر رکھے سو رہی تھی۔

غظیم نے پہلے تو اپنی سانس کو روکا اور پھر آہستہ سے آواز دی
"سلمیٰ"۔

سلمیٰ نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحہ کے لئے نہایت استعجاب سے
غظیم کو دیکھا پھر اس کے ہونٹ کھلے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیخنے ہی
والی ہے۔ لیکن ——

"میں ہوں تمہارا غظیم" غظیم نے جلدی سے کہا۔ اور یہ سنکر سلمیٰ
اٹھ کر بیٹھ گئی۔

تم۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ سلمیٰ نے نہایت متحیر ہو کر دریافت کیا۔
تم یقینی پاگل معلوم ہوتے ہو۔ تمام گھر میرے رشتہ داروں سے بھرا
ہوا ہے۔ اگر اس وقت میرے منہ سے چیخ نکل جاتی تو سب لوگ یقینی دوڑ پڑتے
اور پھر ظاہر ہے کہ تمہاری زندگی کے لالے پڑ جاتے۔

ہاں۔ غظیم نے جواب دیا۔ مگر تمہاری ... کی دیر ہے۔

"تمہارا اس سے مطلب؟"

"تو کیا اس جاہل سے تم شادی کرنے پر رضامند ہو۔"

"میں مجبور ہوں۔ میرے باپ کی خواہش ہی ہے۔"

"اور تمہاری کیا خواہش ہے۔"

"اس سے تمہیں غرض"

"سنو" غظیم نے کہا۔ "جس بھدے مگر مالدار شخص سے تمہاری شادی
ہو رہی ہے اس کو تم نے دیکھا بھی ہے۔"

"سلمیٰ نے اثبات میں سر ہلایا"۔

"تم اس کے ساتھ یقیناً ایک آرام زندگی گزاروگی۔ موٹروں پر
سیر و تفریح کے لئے جاؤ گی۔ جواہرات اور قیمتی کپڑے تمہارے بدن پر ہونگے
اور دسیوں خادمائیں اور ملازم تمہارے احکامات کے منتظر رہیں گے...."

"تو آخر تم چاہتے کیا ہو تمہارا مطلب کیا ہے؟ میری قسمت کا لکھا

میرے سامنے آ رہا ہے۔ اللہ کی مرضی یہی معلوم ہوتی ہے۔"

"پیاری سلمیٰ سنو۔ مجھ سے آج پوچھا گیا کہ میں جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں اس کو کیا دے سکتا ہوں اور اس کے لئے کیا کیا سامانِ آسائش بہم پہونچا سکتا ہوں۔"

"کیا تم سننا چاہتی ہو"

"سننے سے فائدہ۔ اس کے علاوہ میرے لئے اب اس میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

میں اپنی ہونیوالی بیوی کو سنگلاخ پہاڑیوں کی سخت اور تکلیف دہ زندگی پیش کرتا ہوں۔ بجائے ملازمین کے میری بیوی گھر کا کل کام خود کریگی اور سب کو آرام پہونچائے گی۔ رائفلوں کی آوازیں اس کی شب خوابیاں اکثر و بیشتر مخل ہوا کریں گی۔ اس کے بعض لمحے سخت انتظار میں گزریں گے اور پھر ایسی صورت میں جبکہ دشمنوں پر شبخون مارنے کے بعد گاؤں کے اور لوگ واپس آگئے ہوں اور ان میں سے بعض دفعہ سب لوگ واپس بھی نہیں آئیں گے.......... ایسی ہی زندگی میری ماں نے گزاری اور ایسی ہی تمہارے باپ کے ساتھ جانے سے قبل تمہاری تمہاری ماں نے۔ لیکن میرے بچے ایسے موٹے اور تھس نہ ہو جیسے محمد جمال کے ہوں گے۔ وہ مرد ہوں گے۔ باہمت شجاع۔"

"ایسے ہی جیسے ان کا باپ" سلمیٰ نے اسقدر آہستگی سے اس کو سمجھ نہ سکا۔

"ایک ایسا راستہ بھی ہے جس سے بہت کم لوگ وا عظیم نے کہنا شروع کیا۔ اور اس راستہ میں صرف خاص خاص جیسا کہ میرا ہے مجھے اور ایک کسی اور کو قبل طلوعِ آفتاب نہایت اطمینان کے ساتھ میرے پہاڑی گاؤں میں پہونچا سکتے ہیں"

سلمیٰ اٹھی اور خاموشی کے ساتھ عظیم کے سامنے ہو گئی۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے چہرہ کو غور سے دیکھا

"آؤ پیارے عظیم آؤ مجھے اپنے گھوڑے تک لے سورج نکلنے سے قبل ہم اپنے پہاڑی گاؤں میں پہونچ

....

(محمد اختر صف







MURAL PAINTINGS

مصوری و دیوار ... کی آرٹ کے چند نادر نمونے
جو دہلی کی شاہی عمارات پر نقش
کئے گئے ہیں ۔



محبت و پیار ۔



امن و سلامتی ۔

سامانِ حیات

(علامہ وصل بلگرامی مدظلہ العالی)

پھر مرے جذبات نے جینے کا ساماں کر دیا
پھر انہیں آمادۂ لطفِ فراواں کر دیا

پھر جنونِ دل نے محورِ رازِ عرفاں کر دیا
کافری کو وہ جلا بخشی کہ ایماں کر دیا

پھر کسی نے یوں اُٹھایا صحنِ گلشن میں رباب
باغ کے ہر ایک ذرے کو غزلخواں کر دیا

پھر دلوں میں سرفروشی کی تمنا جاگ اُٹھی
پھر کسی سفاک نے بانہوں کو عریاں کر دیا

پھر لگاوٹ نے کسی کی زخمِ دل کے بھر دیئے
پھر تبسم نے کسی کے گل بداماں کر دیا

پھر بنایا دل کو اُس چشمِ کرم نے حق شناس
پھر دماغِ کفر پرور کو مسلماں کر دیا

پھر اُسی مشکل کو کہتی ہے جسے دُنیا حیات
میرے حق میں جلوۂ جاناں نے آساں کر دیا

پھر اُٹھایا خوئے کرم سے ہاتھ اُس بدمست نے
عشق کو پھر قائلِ عمرِ گریزاں کر دیا

پھر رُخِ گلرنگ سے یوں حسن نے اُلٹی نقاب
مجھ پہ خود میرے ہی جلوؤں کو نمایاں کر دیا

پھر لبِ رنگین و چشمِ ناز کو جنبش ہوئی
حسن نے پھر ایک عالم میں چراغاں کر دیا

پھر کوئی انگڑائی لے کر مسکرایا باغ میں
چاک پھر ہر پھول نے اپنا گریباں کر دیا

اُس نے پھر جمعیتِ خاطر کی دی مجھ کو نوید
پھر مرے شانوں پہ زلفوں کو پریشاں کر دیا

ہو گیا پھر فطرتِ آدم سے قائم حسنِ ظن
اُس نے پھر مجھ کو رفیقِ نوعِ انساں کر دیا

پھر دکھا کر حُسن نے جلوے مآلِ عشق کے
نشترِ غم کو مرے حق میں رگِ جاں کر دیا

پھر نویدِ جانفزا دی کھُل کے زلفِ یار نے
کافری نے تازہ پھر اِک بار ایماں کر دیا

دردِ دل میں بھر کے پھر اُس کے تبسم نے مزہ
خار کو منجملۂ گلہائے خنداں کر دیا

پھر دیا ظالم نے پائے ناز پر اذنِ سجود
پھر سکونِ عزمِ پابوسی کو رقصاں کر دیا

دل میں پھر روشن ہوئے بجھتی امیدوں کے چراغ
پھر کسی ماتھے کی افشاں نے چراغاں کر دیا

پھر اُلٹ دی رُخ سے بازارِ محبت میں نقاب
حُسن نے پھر جنسِ برنائی کو ارزاں کر دیا

التفاتِ خاص سے دیکھا پھر اُس نے اِس طرف
ہم نے پھر کون و مکاں کو اُس پہ قرباں کر دیا

جور پھر حد سے گزر کر بن گیا لطف و کرم
مشکلوں نے بڑھ کے پھر اپنے کو آساں کر دیا

آج پھر آیا وہ ہنستا۔ مُسکراتا جھومتا
آج پھر اُس نے گلستاں کو گلستاں کر دیا

عشق کی خاموشیوں کا پھر ہوا اتنا اثر
حُسن نے خود ہی محبت کو نمایاں کر دیا

پھر مری امید سے بڑھ کر کیا اُس نے سلوک
پھر مری مایوسیوں کو وصل! حیراں کر دیا

تصورِ یار

(از جناب محمود صاحب اسرائیلی)

(۱) ریاضِ چرخ سے قوسِ قزح کو توڑا ہے
بہارِ خلد سے حسنِ ازل نچوڑا ہے
چراغِ طور کو کچھ ٹمٹماتا چھوڑا ہے
جمالِ یار کے منظر دکھا رہا ہوں میں

(۲) کبھی ہے آئینۂ ماہتاب پیشِ نظر
کبھی ہے حسنِ رخِ آفتاب پیشِ نظر
کبھی ہے گلکدۂ لاجواب پیشِ نظر
رخِ حبیب سے پردے اٹھا رہا ہوں میں

(۳) میں پہلے مژہ سے نقش و نگار تو کرلوں
وفا کا رنگ بھروں پائیدار تو کرلوں
میں چشمِ شوق کو اس پر نثار تو کرلوں
شبیہِ یار تو دل میں جما رہا ہوں میں

(۴) وہ بزمِ دل میں ذرا دیر تو ٹھہر جاتے
خیال ہی کی طرح آتے اور گذر جاتے
وہ میری حسرتِ مُردہ تو زندہ کر جاتے
کہ پھر چراغِ محبت جلا رہا ہوں میں

(۵) فلک کے جورِ جہاں کے عتاب دیکھ چکا
میں غم پرستِ قیامت کا خواب دیکھ چکا
وہاں کا رنگ عذاب و ثواب دیکھ چکا
اب اُن کو چھیڑ کے فتنے جگا رہا ہوں میں

(۶) بہارِ خلد کی آتش کو سرد کرنا ہے
جمالِ حور کے غازہ کو گرد کرنا ہے
اُنہی کو جملہ حسینوں میں فرد کرنا ہے
زمیں پہ چھوٹی سی جنت بنا رہا ہوں میں

قدیم یونان کا ایک دلچسپ ڈرامہ

انسان اور پتھر کی جنگ

انسان کی خود غرضی اور مجسمہ کی قربانی

(انسانی تخلیق کی کارفرمائی اور اُس کے خوفناک نتائج)

افراد

پگمیلین .... ایتھنس کا مجسمہ ساز (فن کار)

لیوسی پس .... ایک فوجی سپاہی

کرائٹس .... ایک رئیس اور علوم و فنون کا سرپرست

اگیماس .... کرائٹس کا غلام

میموس .... پگمیلین کا غلام

گلیشیا .... ایک پتھر کا مجسمہ جو بعد کو زندہ ہو گیا۔

سائنکا .... پگمیلین کی بیوی

ڈیفنی .... کرائٹس کی بیوی

مائرین .... پگمیلین کی بہن

جائے وقوع۔ قدیم یونان۔

سین

[دارالخلافہ میں پگمیلین کا اسٹوڈیو۔ کمرے میں ہر چہار طرف سنگین مجسموں کے بہترین نمونے رکھے ہوئے ہیں جن میں وینس کا قدآدم مجسمہ بھی شامل ہے۔ کمرے کے ایک حصّے میں "گلیشیا" کا ایک بت ایستادہ ہے جس کو حاضرین کی نگاہوں سے پردہ کے ذریعہ پوشیدہ کر دیا گیا ہے؛

میموس غلام ایک ناکمل مجسمہ کو درست کرنے میں مصروف ہے۔

"اگیماس" دہنی طرف سے بھڑک دار لباس پہنے ہوئے داخل ہوتا ہے]

اگیماس۔ (مغرورانہ انداز سے) پگمیلین کا اسٹوڈیو یہی ہے؟

میموس۔ جی ہاں۔ فرمائیے۔

اگیماس۔ تم پگمیلین ہو؟

میموس۔ جی میں اُن کا غلام ہوں۔

اگیماس۔ ہوں۔ پگمیلین کے پاس غلام بھی ہیں۔

ایک سنگتراش کے گرد غلام گردش کریں، اور اس کے اشاروں پہ رقص۔ اُس کے کوڑوں کے سامنے اپنی پشت پیش کریں۔ اور اُس کی آواز پر سرِ تسلیم خم۔

دنیا میں کیسا انقلاب آ گیا۔!!

میموس۔ کیا حکم ہے جناب!

اگیماس۔ آج پگمیلین کو کرائٹس نے طلب کیا ہے۔

[illegible]

میموس۔ کیا آپ ہی کرائسس ہیں؟

اگیماس۔ میں! نہیں میں کرائسس تو نہیں ہوں۔

میموس۔ ان کے بھائی ہیں۔

اگیماس۔ نہیں۔ دراصل میں ان کا غلام ہوں۔

میموس۔ (خوش ہو کر) غلام!

اگیماس (فخریہ) میرا نام اگیماس ہے۔

میموس۔ (قہقہ لگا کر) اگیماس کی پیشانی پر بھی غلامی کا داغ ہے۔
وہ بھی اپنے آقا کے گرد گردش کرتا ہے۔
اور اس کے اشاروں پر رقص۔
اس کے کوڑوں کے سامنے اپنی پشت پیش کرتا ہے
اور اس کی آواز پر سر تسلیم خم [خوب ہنستا ہے]

اگیماس۔ جاہل۔ بے وقوف۔ کرائسس کی غلامی حکومت کرنے سے
ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس کے کوڑوں کی ضربیں میری پشت پر
پھولوں کی بدھیاں بنجاتی ہیں۔ اور اس کا غیظ و غضب چاندی
اور سونے کے سکے۔ بتا اب کیا کہتا ہے؟

میموس۔ مولا تو آپ کو یہی توفیق دے۔ مگر یہ کرائسس ہے کون؟

اگیماس۔ او۔ کرائسس کو نہیں جانتا۔ کیا ایتھنس میں رہ کر بھاڑ جھونکا ہے؟

میموس۔ ایتھنس میں کرائسس جیسے ہزاروں چیتھڑے ہیں۔

اگیماس۔ کم عقل۔ کرائسس اسوقت ایتھنس کا چراغ ہے اور علوم و
فنون کا سرپرست۔ غریبوں کا مددگار۔ اور دولت و امارت کا
واحد اجارہ دار۔ جس کے دسترخوان کے بچے ہوئے ٹکڑوں پر
پگمیلین جیسے ہزاروں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ سمجھا!
[پگمیلین بائیں جانب سے داخل ہوتا ہے]

پگمیلین۔ تم کون ہو؟

اگیماس۔ (بیٹھے ہی ہوئے) میں کرائسس کا خادم ہوں (فخریہ) اور
میرا نام اگیماس ہے۔ سرکار نے تمہارے حالِ زار پر توجہ فرمائی ہے
وہ تمہارے ہنر کی داد دیتے ہیں اور تم کو اپنی حضوری میں طلب
[illegible] تمہاری تقدیر [illegible] ہے۔ جاؤ اور سر کے بل جاؤ کیونکہ
[illegible] سکتا ہے۔ لیکن اس کے حضور میں
ذرا عقل سے کام لینا۔ کیونکہ اس کی ایک آنکھ میں رحم ہے اور
دوسری میں قہر۔

پگمیلین۔ تیرے الفاظ تیرے آقا کی کم ظرف طبیعت کا آئینہ ہیں۔ بدتمیز
[اگیماس اٹھ کھڑا ہوتا ہے]
میری طرف سے جا کر کہدے کہ تیری دولت و ثروت کو دور ہی سے
سلام ہے۔ کیونکہ اس مقدس فن کا پرستار دولت سے مستغنی ہے
اور بے نیاز۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ آرٹ ایک سرمایہ دار کی
دسترس سے باہر ہے۔ اور اس کی گردن چاندی کے طوق سے
آزاد۔ دنیا کی حکمت کا تاج دراصل اسی کے سر پہ ہے۔
اس لئے دولت کا فرض ہے کہ وہ خود آ کر حق غلامی ادا کرے

اگیماس۔ کیا یہ ایک سنگتراش بول رہا ہے؟

پگمیلین۔ (غصہ میں) ہاں جو غیظ و غضب سے بپھرا ہوا ہے۔
[اگیماس پیچھے ہٹتا ہے]
دور ہو جا میرے سامنے سے اور اپنے مالک سے یہی کہدے کمبخت!
[اگیماس دہنی جانب سے نکل جاتا ہے]
[میموس اس کے جانے تک کام میں مصروف ہے]
جاہل اور بدتمیز۔ (سائنسکا بائیں جانب سے داخل ہوتی ہے)

سائنسکا۔ خیر تو ہے پگمیلین!

پگمیلین۔ کرائسس نے اپنے غلام کو بھیجا تھا تاکہ تہی دست فن کار خود
پسند دولتمند کا طوق غلامی پہن لے۔

سائنسکا۔ ایک ادنےٰ غلام کی فطری زبان درازی کا گلہ بالکل فضول ہے
اس خیال کو دماغ سے نکال ڈالو۔ آخر اپنی چھینی اٹھا کر اپنے کام
میں کیوں نہیں مصروف ہوتے۔ تم کو معلوم ہے کہ آج کے لئے
میں تم سے رخصت ہو رہی ہوں۔ اس لئے اس آدھ گھنٹہ کو
جو میری روانگی میں باقی ہے۔ بہترین مصرف میں کیوں نہیں
لاتے۔ دیکھو میں اس انداز سے کھڑی ہوتی ہوں۔ ٹھیک
ہے نا!

پگمیلین۔ میرے ہاتھوں میں رعشہ ہے اور دل پر بوجھ۔
میں آرام چاہتا ہوں۔

سائنسکا ۔ بہتر ہے آرام کرو ۔ اور اتنی دیر اپنے شاہکار مجسمے کو دیکھو تاکہ سکونِ قلب میسر ہو ـــــ لو

[پردہ ہٹاتی ہے ۔ گلیشیا کا مجسمہ نظر آتا ہے ۔]

پگمیلین ۔ ضرور ۔ اس کے دیدار سے مجھے کیوں نہ سکونِ قلب حاصل ہو کیونکہ در اصل میرا شاہکار نقل ہے ۔ دستِ قدرت کے شاہکار یعنی "سائنسکا" کی ۔

سائنسکا ۔ افسوس کہ یہ مجسمہ تیرا شاہکار ہونے کے باوجود بھی اعتراضات کی زد سے محفوظ نہ رہ سکا ۔ تیرے سرپرست حسبِ دستور اس میں بھی عیب ہی نکالتے ہیں ۔

پگمیلین ۔ کیا ؟

سائنسکا ۔ ان کا خیال ہے کہ پگمیلین کے تمام مجسموں کے شانوں پر سر ایک ہی ہے

[بیچ میں آتے ہوئے]

اور وہ سائنسکا کا ہے ۔

پگمیلین ۔ بس یہی نقص ہے ۔ واہ

دیوتاؤں نے جس مسرت کا تنہا مالک میری خوش نصیب ذات کو قرار دیا ہے ۔ میرا احسان ہے کہ میں اُس کا پرتو اپنے فن میں تحلیل کر کے دنیا کے سامنے پیش کرتا ہوں ۔ تاکہ وہ بھی اس سے لطف اندوز ہو سکے ۔ [اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر]

اگر تیرے چہرے سے ارفع و اعلیٰ مرقع مجھ کو نظر آئے گا تو میں اُس کو پیش کرونگا ۔

سائنسکا ۔ (مضطرب ہو کر) معاف کیجئے ! کسی دوسرے سر کی تلاش خواہ وہ حسنِ مجسم ہی کیوں نہ ہو مجھے گوارہ نہیں ۔ کسی اجنبی ماڈل سے تم کو مطلب ہی کیا ۔ جبکہ میں تمہاری خدمت کے لئے حاضر ہوں اور میرے خط و خال تمہارے فن کے لئے وقف ۔ اس لئے جس طرح چاہو اُن کی عکاسی کرو ۔ [مجسمہ کے دہنی جانب جا کر]

حالانکہ اس حسین بت کو اپنی شبیہ خیال کرنا میری عین حماقت ہے بھلا میری صورت میں وہ دلکشی کہاں جو اس نقلی مورت میں ہے

پگمیلین ۔ [بیٹھے ہی ہوئے] واہ ۔ ہو بہو تیری نقل ہے سرِ مو فرق نہیں

سائنسکا ۔ نہیں ۔ اس کے چہرے کے خطوط کی دلکشی اور اس کے اُبھرے ہوئے نقوش کی نرمی ۔ اس کی خمیدہ ابرو ۔ مستِ شباب آنکھیں ۔ اور مصفا پیشانی البتہ یادگار کہی جا سکتی ہیں ۔ میرے گذشتہ حسن و جمال کی جبکہ اب سے دس برس قبل میں آتھس کے ایک محفوظ گوشۂ چمن میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی ۔ اور میرا پگمیلین مجھ کو دعوتِ عشق دے رہا تھا ۔ یہ ابروؤں کا بل ۔ تھر تھراتے ہوئے ہونٹ اور شرم و حجاب سے جھکا ہوا چہرہ اسی منظر کی یاد دلا رہا ہے آہ مجھ میں اور اس مجسمہ میں یہی فرق ہے کہ مجھ میں انقلاب آگیا اور یہ اس کی زد سے محفوظ ہے ۔

پگمیلین ۔ وقت کی پرواز کا گلہ کرنا لاحاصل ہے ۔ وہ چشم زدن میں تیری منزل سے گذر چکا اور اب اُس کا پلٹنا محال ہے ۔

کیا تو اس کے پروں کو کترنا چاہتی ہے ؟ یا اس امر سے ناراض ہے کہ وہ تیرے قریب سے گذرا اور ایسے حسین چہرے پر اپنے بوسوں کے نشانات کیوں چھوڑ گیا

[سائنسکا بیٹھ جاتی ہے]

[مائرین دہنی جانب سے دوڑتی ہوئی آتی ہے]

مائرین ۔ پگمیلین ۔ تجھے ایک خوشخبری سناؤں ؟

پگمیلین ۔ ہاں سنا میری بہن ۔

مائرین ۔ (لجاتے ہوئے) پہلے میموس کو ہٹا دے ۔

پگمیلین ۔ [میموس کو اشارہ سے ہٹا دیتا ہے] اب تو کہے گی ؟

مائرین ۔ "لیوسی پس" . . . .

سائنسکا ۔ کہو ۔

مائرین ۔ (پگمیلین سے) جو کبھی تیرا ہم مکتب تھا اور تجھ کو ایک دوست کی طرح سے چاہتا تھا ۔ اب ایک حقیقی بھائی کی طرح سے چاہنے لگا ہے ۔

پگمیلین ۔ یہ تو کوئی نئی بات نہیں ۔ شاید تیرا مدعا کچھ اور ہے ۔

مائرین ۔ ہاں ۔ (شرمیلے انداز سے) وہ تیری بہن کا خواستگار ہے

پگمیلین ۔ (اچھل کر) خوشخبری !

مرحبا میں [illegible]

تاکہ میں تجھے پیار کروں۔

[اس کا بوسہ لیتا ہے]

[وہ سائنسکا کے سامنے جھکتی ہے اور وہ بھی اس کا بوسہ لیتی ہے]

ائنسکا۔ ذرا تفصیل سے بیان کرو میرین! کہ یہ شرمیلا لجیلا اکھڑ سپاہی اقرار محبت کرنے پر کس طرح قادر ہو سکا۔

[لیوسی پس دہنی جانب سے نمودار ہوتا ہے]

رین۔ کیوں۔ لو وہ آگئے۔ [خود جاکر ساتھ لاتی ہے] یہ آپ بیتی خود ہی بیان کریں گے۔

سی لپس۔ (جھینپتے ہوئے) حقیقت یہ ہے کہ میں اس فن سے ناواقف ہوں اور اس منزل سے ناآشنا میری تعریف یہی ہے کہ میں ایک اجڈ سپاہی ہوں۔ اور بس۔ اگر میں ایک حسین دوشیزہ کے دل پر فتح پاسکا تو محض حسن اتفاق ہے۔ کیونکہ میں خوش قسمت ہوں۔ خوش تدبیر نہیں۔ میں کیا جانوں چہرے کو حسب ارادہ مغموم بنانا۔ بات بات پر آہ کرنا۔ قدم قدم پر اشعار پڑھنا۔ آنکھوں کو اشک آلود کرنا اور اپنے محبوب کو الفاظ کے جال میں اس طرح جکڑنا کہ وہ بے بس ہوجائے۔ شروع میں کوشش کی تھی۔ لیکن آواز گلوگیر ہوگئی۔ الفاظ ذہن سے محو ہوگئے۔ پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ چہرے پر شرم کی سرخی دوڑ گئی اور لبوں پر مہر لگ گئی۔ "میرین" نے میری بے بسی پر قہقہے لگائے۔ لیکن اس کی صفائی قلب کی داد دیتا ہوں۔ وہ میرا مطلب سمجھ چکی تھی اس لئے خود ہی اس نے میری مشکل کشائی کر دی۔

رین۔ سچ کہتی ہوں پگمیلین۔ میں خود نہیں کہہ سکتی کہ اتنی کڑی منزل کس طرح طے ہوگئی۔ ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور میں ان کی بے بسی کا مذاق اڑا رہی تھی جب میں نے دیکھا کہ میرا بہادر سپاہی لیوسی پس ایک طفل مکتب کی طرح اس وقت شرم و حجاب کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ میرا بھی دل بھر آیا۔ اور جذبات امنڈ امنڈ کر آنکھوں کی راہ بہنے لگے۔ اس کے بعد میں خود فراموش ہوگئی۔ یہاں تک کہ جب میں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو وہ برف کی دیوار جو ہمارے درمیان حائل تھی پگھل چکی تھی اور ہم دونوں ———

لیوسی پس۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے سے ہم آغوش تھے

[اسے گلے لگاتے ہوئے]

بتاؤ میرے دوست تم اس رشتہ سے ناراض تو نہیں ہو۔

[اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے]

پگمیلین۔ [ہاتھ کو دباتے ہوئے]

کمال کرتے ہو! میری خوشی کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ کاش میں مخفی طور سے اس مقام پر موجود ہوتا اور تم دونوں کے جذبات کی کشمکش کا تماشہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھتا۔ تاکہ میں اس معصوم محبت کے ان لاثانی مناظر کو پتھر پر نقش کرکے لازوال بنا سکتا۔

لیوسی پس۔ ہم دونوں اب بھی حاضر ہیں۔ ماٹرین! میری جان! آؤ ہم گذشتہ منظر کی تجدید کریں۔ پگمیلین! تم اپنی مٹی منگاؤ۔ ہم تم کو یقین دلاتے ہیں کہ ہماری نشست میں سر مو فرق نہ ہوگا۔

[دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں آتے ہیں]

سائنسکا۔ وہ جذبات تمہارے چہروں پر دوبارہ نمودار نہیں ہوسکتے۔ بتاؤ۔ ماٹرین کو دیکھتے ہی تمہارے گالوں پر جو معصومیت کی سرخی دوڑ گئی تھی اب وہ کہاں گئی۔

لیوسی پس۔ اس کا رنگ ہلکا تھا۔ اس لئے ہم نے اسے ہمیشہ کے لئے دھو ڈالا۔

[ماٹرین کا بوسہ لیتا ہے اور اس کو اپنے دہنی طرف بٹھا لیتا ہے]

پگمیلین۔ [مجسمہ کو بناتے ہوئے] اپنے شوہر کی نگرانی کرتی رہنا۔ ماٹرین کیونکہ تو اس قدر خوش قسمت نہیں ہے جسقدر کہ تیری بھاوج۔

[سائنسکا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو بائیں طرف بیٹھی ہے]

ماٹرین۔ [دہنی جانب بیٹھی ہوئی ہے اور لیوسی پس اس کی پشت پر ہے]

یعنی؟

سائنسکا ۔ یہ ایک افسانہ ہے عجیب و غریب ۔ اُس وقت کا جبکہ میں آرٹمس کے مقدس مندر کی راہبہ تھی اور ایسی راہبہ جو مدت العمر دوشیزہ رہنے کا عہد کر چکی تھی۔

لیوسی پس ۔ تعجب ہے ۔

مائرین ۔ جس کے محض خیال سے میری روح کانپتی ہے ۔

سائنسکا ۔ مگر میری روح کو سرور تھا۔

عہد کرنے سے قبل ہفتوں میں اس کی نوعیت پر غور کرتی رہی تھی میری راتیں بیداری میں کٹتی تھیں اور دن بے چینی میں نظروں کے سامنے بس یہی خیال تھا۔ اور اس خیال کے مختلف پہلو۔ اور ان پہلوؤں کے مختلف نتائج آخر کار میں کمربستہ ہوگئی اس عہد پر قائم رہنے کے لئے جس کے محض خیال سے مائرین کی روح کانپتی ہے

[لیوسی پس مائرین سے سرگوشی کرتا ہے]

مائرین ۔ اس وقت کیا عمر تھی آپ کی؟

سائنسکا ۔ [قہقہہ لگا کر] میں دس سال کی تھی ۔ [سب ہنستے ہیں]

خیر میں نے اپنی عمر کی گیارھویں منزل میں قدم رکھا۔ لیکن میرا عہد بدستور قائم رہا۔ بارھویں تیرھویں اور چودھویں سال بھی مجھ میں کوئی انقلاب نہیں دیکھا۔ لیکن پندرھویں سال یکایک مجھ پر ایک روز [illegible] ایک لازمی عذاب ہے ۔ جس کا نازل ہونا ہم کنواریوں پر برحق [illegible] جس سے بچنے کی کوشش کرنا گناہ عظیم ۔ سولھویں سال یہ خیال عقیدہ میں تبدیل ہوگیا۔ اور سترھویں سال یہ عقیدہ راسخ ہوگیا۔

ہگمیلین ۔ اس پر ستم یہ کہ اُسی دوران میں ہگمیلین سے ملاقات بھی ہو چکی تھی۔

مائرین ۔ اور تم نے اس کو اپنے شک کا رازدار بھی بنا لیا تھا۔

سائنسکا ۔ ہاں ۔ انہوں نے میرے خیالات کی تائید کی ۔ اور ہم دونوں نے اس مسئلہ کو اپنی معلمہ آرٹمس کے سامنے پیش کیا۔ ہم نے اس کے اعتراضات [illegible] ذکر اس وقت غیر ضروری ہے

بہر حال شد و مد سے بحث ہوئی اور ہمارا مقصد حاصل ہوگیا۔ آرٹمس جس کا دل برف کی ایک مجسم قاش تھا میری مسکینوں کی گرمی سے پگھل گئی۔ آخر کار اس نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھ کو خطاب کیا ـــــ جا اے حسین دوشیزہ ہگمیلین کے ساتھ تجھے شادی کرنا مبارک ہو۔ لیکن میرے یہ الفاظ یاد رکھ ۔

[اُٹھ کھڑی ہوتی ہے]

کہ تم دونوں میں سے کوئی فریق بھی ۔ تو یا وہ ۔ اگر جادۂ عفت و عصمت سے ہٹ کر ازدواجی قانون کو توڑنے کا مجرم ہوگا تو وہ فریق جس کی اس حرکت ناشائستہ سے دلآزاری ہوگی اُس کو اختیار کلی حاصل ہوگا کہ وہ دوسرے فریق کے حق میں اندھے ہو جانے کی بد دعا دے ۔

دیوتاؤں کی قدرت سے اُس کی زبان میں تاثیر پیدا ہو جائیگی فریق ثانی کی آنکھوں کا نور فی الفور غائب ہو جائے گا ۔ اور وہ اسی حالت میں رہے گا جب تک کہ فریق اول اُس کو علانیہ معاف نہ کر دے ۔

لیوسی پس ۔ شکر ہے کہ یہ طاقت تم ہی تک محدود ہے ۔ اگر عام ہوتی تو آج دُنیا کے نصف مرد اور نصف عورتیں اندھیری رات کی طرح اندھے ہوتے ۔ باقیماندہ لوگ جن کی آنکھیں صحیح سلامت رہتیں ۔ صرف ایک دوسرے ہی کو دیکھا کرتے ۔

[ہیموس بائیں جانب سے داخل ہوتا ہے اور ہگمیلین کے ہاتھ میں ایک پرچہ دیتا ہے ۔ جس کے پڑھنے میں وہ مشغول ہو جاتا ہے ۔ اسی اثنا میں ہیموس واپس جاتا ہے]

مائرین ۔ سائنسکا میں جانتی ہوں کہ گو تیری زبان مختار ہے ۔ لیکن دل مجبور ہے ۔

مجھے یقین ہے کہ تو اُس کی بیوفائی کا جواب بے دردی سے نہ دے گی اور میرے بھائی کو آنکھوں جیسی نعمت سے محروم نہ کرے گی۔

سائنسکا ۔ میں ہگمیلین کی وفا پر مرتی ہوں ۔ جس روز اس کی یہ خصوصیت جاتی رہے گی اُسی دن میرا عشق بھی مردہ ہو جائے گا

مائرین۔ لیکن اندھا بنا دینا کس قدر ظلم ہے۔

سائنسکا۔ اور بیوفائی کا مرتکب ہونا کس قدر ظلم ہے۔ میں پگمیلین کے نقشِ قدم پر چلتی ہوں۔ جب تک وہ معصوم رہے گا میں اس کو دیوتا سمجھ کر سجدہ کرتی رہوں گی۔ اور جس وقت اس کا دامن معصیت سے آلودہ ہو جائے گا میں اس پر لعنت کروں گی۔ میں انتہا پسند ہوں۔ مجسم محبت یا مجسم نفرت۔ درمیانی جذبات سے میرا سینہ خالی ہے۔

مائرین۔ (لیوسی پس سے) کہو تم کیا کہتے ہو؟

لیوسی پس۔ میں خوش ہوں کہ تم آرٹس کی راہبہ نہیں ہو۔ بس چلو۔

[مائرین اور لیوسی پس دہنی جانب سے باہر جاتے ہیں]

پگمیلین۔ میں نے اس کا غرور توڑ دیا۔ اس لئے میرا مربی مجبور ہو کر خود ہی زحمت قدم رنجہ فرما رہا تھا۔ بے چارہ مجبور رہے میری عزت اور اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے۔

سائنسکا۔ اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے۔ کیسے؟ بھلا اتنے بڑے رئیس کو تجارت سے کیا مطلب!

پگمیلین۔ مطلب کیوں نہیں۔ فنونِ لطیفہ کی سرپرستی بھی ایک قسم کی تجارت ہی ہے جس میں اس کو ہزاروں درہم مل جاتے ہیں۔

سائنسکا۔ کس طرح۔

پگمیلین۔ یوں تو وہ جاہلِ مطلق ہے اور محض کندۂ ناتراش۔ لیکن روپے کی تھیلیاں دماغ سے زیادہ وزنی ہوتی ہیں۔ وہ بڑا دولتمند ہے اس لئے جس جگہ اس کے قدم جاتے ہیں۔ وہیں چھوٹے دولتمند بھی ناک رگڑتے ہیں۔ مفلس فنکار اس کی نگاہِ کرم کے امیدوار رہتے ہیں۔ اور اپنے قیمتی شاہکار برائے نام قیمت پر فروخت کرنے کے متمنی تاکہ دنیا کے سامنے اپنے کمالِ فن کی سند پیش کر سکیں اور اس کی جھوٹی سرپرستی کو اپنی شہرت کا پیش خیمہ بنا سکیں۔ غرضکہ اس کے مذاقِ فن کی تقلید آج کل فیشن ہے۔ جس سے وہ پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور قیمت طے کرتے وقت اس بات کو مدنظر بھی رکھتا ہے۔ اسی لئے وہ نادر مجسموں کو بھی وزن اور حجم کے حساب سے خریدتا ہے۔ یہ ہے حقیقت اس شخص کی جو اس فنِ لطیف کی سرپرستی کا دعویدار ہے۔

سائنسکا۔ افسوس ایسے سفلہ پرور شخص کے ہاتھوں ہمارے اس مقدس فن کی مٹی برباد ہو رہی ہے۔

پگمیلین۔ (طنزاً) دولت ہمارے فن سے زیادہ مقدس ہے۔ آخر میں بھی حصولِ زر ہی کے لئے محنت کرتا ہوں۔

سائنسکا۔ میری جان تو شہرتِ دوام کے لئے محنت کرتا ہے۔

پگمیلین۔ مگر شہرت بھی دولت پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ افسوس کس قدر ذلیل خیال ہے۔ لیکن میں مزدوری اور غلامی کے علاوہ کر ہی کیا سکتا ہوں۔

سائنسکا۔ آہ ایسے پست ہمت الفاظ اُس کے منہ سے اچھے نہیں معلوم ہوتے جو اپنے اعجازِ فن سے پتھر میں جان ڈال دیتا ہو۔

پگمیلین۔ جان! گویا یہ تی کی مورت زندہ ہے۔

سائنسکا۔ بے شک۔ بس بولنے کی کسر ہے۔

پگمیلین۔ (طنزاً) بس بولنے کی کسر ہے۔ اسی لئے وہ تجھ سے گفتگو کرتی ہے۔ نقل و حرکت کی دیر ہے۔ اسی لئے وہ چلتی پھرتی نظر آتی ہے صرف روح کی کسر ہے۔ اسی لئے وہ زندہ ہے۔ نہیں میری جان۔ وہ دراصل سرد اور بے جان پتھر ہی ہے جس کو تراش تراش کر ایک مجسمہ کی شکل دے دی گئی ہے۔

[مجسمہ کو دیکھتے ہوئے]

جیتی جاگتی عورت کی ایک ساکت و صامت نقل ہے۔ تخلیق کا سہرا دیوتاؤں کے سر اور تخریب کا داغ میری پیشانی پر۔

[پردے گرا کر پیچھے آ جاتا ہے]

سائنسکا۔ خاموش پگمیلین! شکر کر دیوتاؤں کا جنہوں نے تیرے ہاتھوں میں تخلیق کا معجزہ دیا اور دوسروں کی بہ نسبت تجھ کو زیادہ نوازا ناشکری کر کے ان کے غیظ و غضب کا مستحق نہ بن۔ اچھا میں رخصت ہوتی ہوں۔

[دہنی طرف ہو کر اپنے مجسمے پر نقاب ڈالتی رہے]

پگمیلین۔ آہ رخصت اسقدر جلد اور فراق اسقدر طویل۔

سائنسکا۔ ایک دن آنکھ بند کرتے گذر جائے گا۔

پگمیلین۔ البتہ ان کے لئے جو آفتاب کے طلوع و غروب کے فاصلہ کو ایک دن کہتے ہیں۔ اس کے لئے نہیں جو تیری چشم سحر ساز کے نور کو دن خیال کرے۔ اور تیری فرقت کو رات۔

سائنسکا۔ اسے سو کر کاٹ دے۔ پگمیلین! لیکن ٹھہر۔ تو ہجر و فراق کی کٹھن گھڑیاں تنہا کیوں بسر کرے۔ ذرا اس طرف دیکھ لے میں اپنی واپسی تک۔ اپنی جگہ اس مجسمہ کو چھوڑے جاتی ہوں

[گلیتیا کی طرف اشارہ کرکے پردوں کو ہٹا دیتی ہے]

یہ میری نیابت کرے گی۔ میں اس کو تجھے سونپتی ہوں۔ مگر خبردار اس کی دلدہی اسی طرح کرنا جس طرح کہ میری۔ اس کے خاموش اور گوش بر آواز سامعہ میں اپنے متلاطم جذبات کی ترجمانی کرنا۔ اس کے شرم و حجاب سے جھکی ہوئی آنکھوں کے سامنے ہجر و فراق سے تپتے ہوئے کلیجے کو چیر کر رکھنا اس کے سنگین دل کو اپنی شیریں زبانی سے موم کرنے کی کوشش کرنا تاکہ تیری زبان خانۂ دہن میں بیکار رہ کر اپنی فصاحت و بلاغت کے جوہر کو فراموش نہ کر جائے۔ اور اس طرح میری عدم موجودگی میں بھی اس پر جلا ہوتی رہے [اس کے قریب جا کر]

میرے مایۂ حیات! میں تجھ کو بخوشی اجازت دیتی ہوں۔ اگر تو سرمستی عاشقی میں جذبات کی فراوانی سے مجبور ہو جائے تو اسی کو سائنسکا سمجھ لے۔ یہ تیرے کلام کو سکون قلب سے سنے گی۔

[پگمیلین بے صبری کا اظہار کرتا ہے]

واہ یہ تیری ناانصافی ہے اور ظلم۔ گو یہ میرا نقش ثانی ہے لیکن مجھ سے بدرجہا حسین بے حد سرد مزاج اور بالکل بے زبان تو قوت گویائی رکھتا ہے۔ پھر تکلف کی وجہ کیا۔ جبکہ میں تجھ کو اجازت بھی دے چکی ہوں۔ حالانکہ میں اس پر ابھی سے رشک کرنے لگی ہوں۔

[مجسمہ کو دیکھتے ہوئے]

اس پر!

[پردے گرا کر مجسمے کو پوشیدہ کر دیتی ہے]

لو میرے سامنے سے دور ہو گئی۔

لیکن پتھر کا ساکت و سامت مجسمہ ہے آخر کار۔ اس لئے تم دونوں کو تنہا چھوڑنے میں مجھے کوئی اندیشہ نہیں۔

اچھا رخصت پگمیلین۔

واپسی تک

[اس کا بوسہ لیتی ہے اور دہنی جانب سے چلی جاتی ہے]

پگمیلین۔ (جوش میں) "پتھر کا ساکت و سامت مجسمہ ہے آخر کار" سائنسکا کو کیا معلوم کہ اس نے میرے زخموں پر نمک پاشی کی ہے واقعی میرے ہاتھوں میں وہ اثر ہے کہ جو دوسروں کو میسر نہیں مجھے بے جان پتھر کا ایک ٹکڑا دیدو اور بس۔

پھر دیکھو میرا جادو۔ میں جس سانچے میں جی چاہے اسے ڈھال دوں ایک سڈول مرد بنا دوں۔ حسین عورت کی شکل دیدوں یا ایک معصوم بچہ کی تخلیق کر دوں۔ ایک ہی پر موقوف نہیں۔ چاہوں تو وحدت میں کثرت کا جلوہ دکھا دوں۔ یہاں تک تو میں تخلیق کے میدان میں دیوتاؤں کے شانہ بہ شانہ چل رہا ہوں نہیں بلکہ میں ان سے اس صناعی میں گوئے سبقت لے گیا ہوں۔ کیونکہ میں ان کی طرح ایک کھوبڑ کاریگر نہیں ہوں۔ جتنے مرد آج تک میں نے بنائے ہیں سب متناسب الاعضا ہیں۔ اور مردانہ حسن میں اُن کا ہر ایک فرد اپنی آپ نظیر۔ میں خمیدہ پشت مردوں کی تخلیق کرتا ہی نہیں۔ میں تو دیوتا بناتا ہوں مردوں میں اور دیویاں پیدا کرتا ہوں عورتوں میں جہاں تک کہ ظاہر اشکل و صورت کا تعلق ہے۔ اور یہی میری حد پرواز ہے۔ کیونکہ یہیں تک میری قدرت میرا ساتھ دیتی ہے اس سے آگے دیوتاؤں کی سرحد ہے۔ جس میں داخل ہونا میرے حد امکان سے باہر۔ آہ میری بندشیں ٹوٹتی بھی نہیں۔ دیوتاؤں کی اس ستم ظریفی سے میں بیزاری کا اظہار کرتا ہوں کہ مجھ کو بڑا بنا کر بھی چھوٹا ہی رکھا۔

گلیتیا۔ (پردہ کے پیچھے سے) پگمیلین!

پگمیلین۔ (خاموش ہو کر، ماتھے کو، ذرا کان ...

گلیشیا۔ پگملین!

[پگملین بائیں طرف دیکھتا ہے - پھر دہنی طرف نظر دوڑاتا ہے۔ پھر وسط میں جاتا ہے - اور وہاں پردے کو ہٹاتا ہے۔ اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی جبکہ وہ گلیشیا کی مورت کو زندہ پاتا ہے - وہ مجسمہ کے بائیں طرف دو زانو بیٹھ کر سجدہ میں گر جاتا ہے]

پگملین۔ ارے یہ تو زندہ ہے۔

گلیشیا۔ پگملین!

پگملین۔ یہ بولتی بھی ہے۔

میری دعا مستجاب ہوئی۔

ارے میری گلیشیا سانس لے رہی ہے۔

گلیشیا۔ میں کہاں ہوں؟ مجھ سے بات کرو پگملین!

مجھے اپنا ہاتھ دو - دونوں ہاتھ لاؤ۔

اوفوہ کسقدر نرم ہیں اور کتنے گرم۔

[زینہ پر سے نیچے اُترتی ہے - پگملین اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ وسط میں لاتا ہے]

میں کہاں سے آ رہی ہوں؟

پگملین۔ اسی ستون پر سے

گلیشیا۔ اُس ستون پر سے - ہاں مجھے یاد آیا -

ایک وقت تھا کہ وہ میرے جسم کا ایک حصہ تھا۔

پگملین۔ مگر وہ وقت اب ہمیشہ کے لئے گذر چکا۔

اب تو ایک جیتی جاگتی مورت ہے اور تمام نسوانی خصوصیات کی حامل۔

گلیشیا۔ میں کہاں ہوں اس وقت؟

پگملین۔ تو اس دُنیا میں پیدا ہوئی ہے معجزہ سے۔

گلیشیا۔ کیا یہی دنیا ہے؟

پگملین۔ ہاں یہی۔

گلیشیا۔ یہی کرہ۔

پگملین۔ یہ کرہ تمام عمارت کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے - اور یہ عمارت ایک بڑے باغ کے وسط میں بنی ہوئی ہے - اور ایسے باغ ایتھنس میں ہزاروں ہیں۔

گلیشیا۔ تو ایتھنس ہی دنیا ہے۔

پگملین۔ ہاں ایتھنس کے باشندوں کی نظروں میں ضرور ——

گلیشیا۔ اور کیا میں بھی ایتھنس کی باشندہ ہوں۔

پگملین۔ ہاں پیدائش کے لحاظ سے ضرور۔ لیکن نسلی اعتبار سے نہیں۔

گلیشیا۔ مگر میں کس طرح پیدا ہوئی؟

پگملین۔ میں تجھ کو بتاتا ہوں —— تجھ کو ایک غار میں سے کھود کر نکالا گیا۔ مٹی کی شکل میں میں نے اُس سے تیرا ایک پیکر تیار کیا۔ اور میرے کاریگروں نے اُس کو جلا دے کر سنگ مرمر کی طرح بنایا اور جب میری باری آئی تو میں نے تیرے مجسمے پر اپنی صناعی کا کمال صرف کر دیا - اور تجھ کو یہ روپ دیا جس میں تو اس وقت موجود ہے۔ مگر بے روح دیوتاؤں نے اس کام کی تکمیل فرمائی جس کی کہ میں نے ابتدا کی تھی - اور تجھ کو وہ زندگی بخشی جو میرے قبضۂ اختیار سے باہر تھی۔

گلیشیا۔ کیا یہی زندگی ہے؟

پگملین۔ ہاں یہی۔

گلیشیا۔ اور اب سے کچھ دیر قبل میں سرد بے جان پتھر تھی - مجھے اس وقت یاد آ رہا ہے کہ میں اپنی سنگینی کو کسی غیر معلوم طریقہ سے محسوس کرنے لگی تھی اور یہیں سے میرے ذہنی شعور کی دھندلی سی ابتدا ہوتی ہے - اس کے بعد مجھے احساس ہونے لگا اپنی سرد حقیقت کا اور ایک غیر متحرک ٹھنڈے جسم کا - اس کے علاوہ میں اپنی حقیقت سے قطعی بے خبر تھی - اس کے بعد میرے حسیات آہستہ آہستہ انگڑائی لینے لگے - یہاں تک کہ تمام خارجی اشیا کا ہلکا سا خاکہ میرے سامنے نظر آنے لگا - تاریک اور غیر مکمل خط و خال مگر تھے ضرور - مجھ کو تیرے کمرے کی دیواریں ہر چہار طرف سے حلقہ کئے ہوئے تھیں اور میں تن تنہا تھی - وہ ستون کہ جس پر میں نصب تھی میرے سامنے کا وہ پردہ جس سے کہ میں پوشیدہ تھی مجھے یاد ہے پھر ایک

[redacted]

آواز جس نے "گلیشیا" کہہ کر پکارا۔ اور اس لفظ پر جس نے میرے میرے سنگین مجسمہ کو سر سے پاؤں تک لرزاں کر دیا۔
مجھ پر یکبارگی سارے دھندلے نقوش روشن ہو گئے اور تمام حقیقت مجسم آشکار۔ وہ آوازیں جو مجھے سنائی دے رہی تھیں بالکل بے ربط اور بے معنی اب خود بخود منسلک ہونے لگیں ایسی زبان میں جس کا مفہوم میں سمجھ سکتی تھی۔ پھر میں نے اپنے تمام پیکر میں ایک حرارت سی محسوس کی۔ ایسی حرارت جس نے میری سنگینی کو پگھلا کر نرمی میں تبدیل کر دیا۔ میرے سخت اور سرد جسم میں زندگی کی برقی رَو دوڑ گئی۔ میرے اعضا میں لچک پیدا ہو گئی اور ان کے تاروں میں حرکت۔ حتیٰ کہ میں زندہ ہو گئی۔ میرا تمام بدن حیات تازہ کی شگفتگیوں سے معمور ہو گیا۔
میرا دل اپنے خالق کی یاد میں دھڑکنے لگا۔ اور حسرتوں امیدوں اور آرزوؤں کی جولانگاہ بن گیا۔ سودائے عشق آرزوئے وصال۔ حسرتِ دیدار اور جذبۂ تشکر و امتنان سب سمٹ سمٹا کر ایک نام میں سما گئے اور وہ نام "پگمیلین" کا ہے۔

[گھٹنوں کے بل کھڑی ہو جاتی ہے]

پگمیلین۔ اے عورت! تو جو حسن مجسم کی تکمیل ہے۔ میرے پاس الفاظ ہی نہیں کہ اس وقت اپنی مسرت کا اظہار کر سکوں۔

گلیشیا۔ تو نے کیا کہا۔ "عورت!" کیا میں عورت ہوں؟

پگمیلین۔ ہاں تو عورت ہے!

گلیشیا۔ تو بھی عورت ہے؟

پگمیلین۔ نہیں میں مرد ہوں۔

گلیشیا۔ اور مرد کیا شے ہے؟

پگمیلین۔ مرد ـــــ وہ جس کی تخلیق میں جسامت اور توانائی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ جس کی منشاء تخلیق عورت کی خدمت اور اُس کی حفاظت ہے تمام ان خطرات سے جو قوت و جرأت سے باز رکھی جا سکتی ہیں۔ اُس کا فرض محنت و مشقت ہے عورت کو مسرت و اطمینان دینے کے لئے اور گریہ و زاری عورت کے پیٹ میں گدگدی پیدا کرنے کے لئے اور جنگ و جدال عورت کے دشمنوں کو ہلاک کرنے کے لئے۔ اور موت۔ اس پر سے قربان ہونے کے لئے تاکہ عورت زندہ رہ سکے۔ اور بس۔

[اُس کو بٹھا کر خود اُس کے بائیں طرف بیٹھ جاتا ہے]

گلیشیا۔ (توقف کے بعد) میں خوش ہوں کہ میں عورت ہوں۔

پگمیلین۔ مجھے بھی اس بات کی خوشی ہے۔

گلیشیا۔ کیونکہ میں ان کا تمام خطرات سے محفوظ ہوں جن کا تجھ کو سامنا کرنا پڑے گا۔

پگمیلین۔ اس طرح تیری خدمت کرنے کا فخر حاصل کر سکوں گا۔

گلیشیا۔ میرے لئے تو کس کس سے جنگ کرے گا؟

پگمیلین۔ ہر اس مرد سے جو میری گلیشیا کے لئے موجب تکلیف ہو خواہ الفاظ سے یا عمل سے۔

[اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا ہے]

گلیشیا۔ کیا! اس دنیا میں تیرے علاوہ دوسرے مرد بھی ہیں؟

پگمیلین۔ ہاں کیوں نہیں۔

گلیشیا۔ اور میرے سوا دوسری عورتیں بھی۔

پگمیلین۔ (اپنا ہاتھ اس کی کمر سے کھینچتے ہوئے) ہاں ہیں۔ اگرچہ میں اس حقیقت کو تھوڑی دیر کے لئے بھول گیا تھا۔ ہاں دوسری عورتیں بھی ہیں۔

گلیشیا۔ کیا ان سب کے لئے مردوں کی خدمت کرنا۔ جنگ و جدال کرنا اور گریہ زاری کرنا فرض ہے۔

پگمیلین۔ ہاں یہ ایک مرد کا فرض منصبی ہے کہ وہ بہ وقتِ ضرورت ان سب کے لئے جنگ کرے۔ لیکن دراصل انہیں کی خدمت کرتا ہے۔ جن سے اُسے کچھ محبت ہوتی ہے۔

[اپنا ہاتھ پھر اُس کی کمر کے گرد لے آتا ہے]

گلیشیا۔ تیری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تو مجھ سے محبت کرتا ہے۔ کیوں؟

پگمیلین۔ ہاں میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ [اس کو گلے لگا لیتا ہے]

گلیشیا- کیسی محبت؟

پگملین- میں تجھ سے ایسی محبت کرتا ہوں۔ (کچھ سوچتا ہے اور یکبارگی سرک کر بیٹھ جاتا ہے) جیسی ایک بت ساز کو اپنے بنائے ہوئے بت سے ہوتی ہے۔

[علیحدہ] میرا یہ جواب حقیقت پر مبنی نہیں۔

گلیشیا- لیکن میری محبت کی کیفیت کچھ اور ہی ہے۔ تیری محبت سے بالکل مختلف- میں تو بت ساز نہیں ہوں اور نہ میں نے کبھی مجسمے تراشے ہیں تاہم اتنا میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ مجھ تجھ سے محبت ہے۔ بتا یہ کس قسم کی محبت ہے؟

پگملین- مجھے اپنی محبت کی نشانیاں بتا۔ اس کے بعد میں تیرے سوال کا جواب دے سکونگا۔

گلیشیا- اس کی نشانیاں احساس۔

اس امر کا احساس کہ تو ہی میرا خالق ہے اور میں تیری مخلوق مجھ کو کوئی اختیار ہی نہیں تیری مرضی کے خلاف میری امیدوں تمناؤں اور آرزوؤں کا وجود ہی نہیں۔ اگر ان کا مرکز سوائے تیرے کوئی دوسری ذات ہو۔

[قدموں پر جھک جاتی ہے]

اور یہ کہ میں زندہ ہوں۔ کیونکہ تجھے میری ضرورت ہے۔
میں تو تیری ہی ہوں کیونکہ میں اور تو در اصل ایک ہی ہیں۔

[اس سے لپٹ جاتی ہے اور جب وہ اس کے جوش سے گھبرا جاتا ہے تو اس سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔ لیکن قدموں پر سے سر نہیں ہٹاتی]

بتا یہ کس قسم کی محبت ہے؟

پگملین- یہ اس قسم کی محبت ہے کہ جو خصوصیت سے میرے لئے مصیبتوں کا ایک عظیم پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

گلیشیا- کیوں؟ میرے پگملین۔

پگملین- ایسی محبت جیسی کہ تیری ہے۔ کسی مرد کو قبول کرنا نازیبا ہے سوائے اس کے کہ اس کی ابتدا اس کی بیوی کی طرف سے ہو۔

گلیشیا- اگر یہی شرط ہے تو میں تیری بیوی بننے کے لئے تیار ہوں۔

[پھر لپٹ جاتی ہے]

پگملین- [اس کو علیحدہ ہٹاتے ہوئے]

ناممکن ہے۔ کیونکہ میں شادی شدہ ہوں۔ اور دیوتا صرف ایک ہی بیوی کی اجازت دیتے ہیں۔

گلیشیا- پھر بتا کہ دیوتاؤں نے مجھے کس لئے پیدا کیا؟

پگملین- میں کیا بتاؤں؟ [اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ گلیشیا بدستور جھکی ہوئی ہے]

سوائے اس کے کہ مجھے سزا دینی مقصود تھی۔ کیونکہ میں نے بلا سوچے سمجھے دعا مانگی تھی۔ کہ تو زندہ ہو جائے اور وہ بدقسمتی سے قبول بھی کر لی گئی۔ مگر اب اس کے خوفناک نتائج میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

گلیشیا- [اٹھ کر اس کے بائیں طرف آ جاتی ہے] اس کے باوجود بھی تجھے مجھ سے محبت ہے؟

پگملین- کس کی مجال ہے کہ تجھے دیکھے اور محبت کرنے سے باز رہ سکے

گلیشیا- کیا میں اتنی خوبصورت ہوں؟

پگملین- اس میں شک نہیں کہ تو بہت حسین ہے۔

گلیشیا- کاش میں خود کو دیکھ سکتی۔ جو ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

پگملین- اس حد تک تو نہیں۔ لے یہ آئینہ!
اس میں تیرے جمال کا عکس دکھائی دے گا۔
دیکھ۔ [آئینہ دیتا ہے]

گلیشیا- اوفوہ- میں کس قدر حسین ہوں! مجھے خوشی ہوئی کہ ہم دونوں کا مذاق طبیعت ایک ہی ہے۔ کیونکہ اے میرے آرام — میں تو خیال بھی نہیں کر سکتی تھی کہ دنیا میں تجھ سے زیادہ حسین شے کا وجود بھی ہو سکتا ہے۔ جب تک کہ میں نے خود کو نہیں دیکھا تھا جان من یقین کر!

دل چاہتا ہے کہ آئینہ ہاتھ میں لئے اپنے روئے زیبا کا عکس دیکھا ہی کروں۔

عورت اس قدر حسین شے ہے!

پگمیلین۔ ہاں!

گلیشیا۔ میں خود کو مبارکباد دیتی ہوں۔ اپنی خوش نصیبی پر کہ دنیا کا تمام حسن و جمال میری ہی قسمت میں لکھا تھا۔ لیکن تو تو مجھ سے زیادہ خوش نصیب ہے۔ کیونکہ تو ہر وقت میرے حسین چہرے کی زیارت کر سکتا ہے۔

پگمیلین۔ خاموش گلیشیا! تو اپنی معصومیت میں وہ کہہ جاتی ہے۔ جو نہ کہنا چاہئے۔ [آئینہ اس کے ہاتھ سے لے لیتا ہے]

گلیشیا۔ ہاں ۔ کیا خود کو حسین و جمیل خیال کرنا نامناسب ہے۔

پگمیلین۔ یوں تو دنیا کی ہر عورت خود کو پیکر حسن و جمال خیال کرتی ہے لیکن اس کا احساس دل کی گہرائیوں میں رہتا ہے۔ زبان پر نہیں لایا جاتا۔

گلیشیا۔ اچھا بتا کیا تیری بیوی میری ہی طرح حسین ہے۔

پگمیلین۔ نہیں۔ گو کہ میں نے تجھے بناتے وقت اس کے حسین چہرے ہی کو اپنے پیش نظر رکھا تھا لیکن نقل اصل سے سبقت لے گئی ——

گلیشیا۔ [نا امید ہو کر] آہ میری بدقسمتی کہ میں نقش اول نہیں ہوں۔ بلکہ میرا حسن کسی دوسری ذات سے مستعار لیا گیا ہے۔

پگمیلین۔ ہاں —— ایک طرح سے تو ضرور نقش ثانی کہی جا سکتی ہے۔ جہانتک کہ پتھر کا تعلق ہے۔ لیکن زندگی کی حالت میں تو ایسا نمونہ ہے کہ جس کی اصل ممکن ہے اور نہ نقل۔

گلیشیا۔ خیر میں مطمئن ہوں کہ میں اس سے زیادہ حسین ہوں۔ [بیٹھ جاتی ہے] کیا میں اُس سے زیادہ نیک بھی ہوں؟

پگمیلین۔ (گھبرا ہو جاتا ہے) مجھے نہیں معلوم۔

گلیشیا۔ کیا اس میں عیب بھی ہیں؟

ہیں۔ مگر اسی قسم کے ہیں۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میں اور وہ طبیعت اور مزاج میں ہم رنگ ہیں۔

پگمیلین۔ لیکن میری نظروں میں اس کے یہ عیب بھی حسین ہیں۔

گلیشیا۔ [توقف کے بعد] مجھے بھی کچھ حسین عیب بتا میری جان۔ تاکہ میں ان کو سیکھ لوں۔

پگمیلین۔ جلدی نہ کر۔ رفتہ رفتہ تجھ کو خود بخود آ جائیں گے۔ اس کی ابتدا آج ہی سے شروع ہو گئی ہے۔ کیونکہ اس طرح پہلو بہ پہلو بیٹھ کر محبت کی چھیڑ چھاڑ کر کے ہم اسوقت بھی ایک گناہ کبیرہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

گلیشیا۔ کیا گناہ بھی اس قدر حسین ہے اور اس کا ذائقہ اسقدر لذیذ اگر ہمارا باہم مل بیٹھنا اور ایک دوسرے سے گفتگو کرنا ہی گناہ ہے تو میری تمنا ہے کہ اس کا ارتکاب تمام عمر کرتی رہوں۔ لیکن اے میرے محبوب مجھے بتا دے کہ یہ گناہ عظیم جو مجھ سے اس وقت سرزد ہو رہا ہے۔ کیا اُسی قسم کا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہو کہ میں اور تو طبیعت اور مزاج میں ہم رنگ ہیں۔

پگمیلین۔ ہاں حقیقت کچھ ایسی ہی نظر آتی ہے۔

گلیشیا۔ اور کیا اس عیب نے مجھ کو تیری نظروں میں اور بھی حسین بنا دیا ہے

پگمیلین۔ کون سا فانی کا پتلا ایسا ہے کہ "نہیں" کہہ سکے۔

گلیشیا۔ [گردن سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے] تیرے اس جواب سے میں مطمئن ہو گئی پگمیلین! کیونکہ اب میں اور تیری بیوی تجھ پر برابر کا حق رکھتے ہیں۔ کیا وہ بھی تجھ سے محبت کرتی ہے؟

پگمیلین۔ ہاں بہت۔

گلیشیا۔ خوب۔ تب تو میں بھی اس سے محبت کروں گی۔

پگمیلین۔ اور کس لئے؟

گلیشیا۔ [سوال پر متعجب ہو کر] کیونکہ ہم دونوں ہم مذاق ہیں اور ہم رنگ۔ ہم دونوں اپنے پیارے پگمیلین کو پیار کرتے ہیں اور پگمیلین ہم دونوں سے برابر کی محبت کرتا ہے۔ اس لئے میں تیری بیوی کو بھی پسند کرتی ہوں۔ میں یقین کرتی ہوں کہ ہم ایک ہو کر رہیں گے۔

پگمیلین۔ [علیحدہ] مجھے یہ بات ناممکن معلوم ہوتی ہے۔

گلیشیا۔ کیا وہ اندر ہے؟

پگمیلین۔ نہیں۔ اندر تو نہیں ہے۔

گلیشیا۔ لیکن واپس آئے گی۔

پگمیلین ۔ [اٹھتے ہوئے] ہاں وہ ضرور واپس آئے گی۔

گلیشیا ۔ [اٹھتی ہے اور اپنے دونوں ہاتھ پگمیلین کی گردن میں حمائل کر دیتی ہے]

وہ واپسی پر یہ دیکھ کر کسقدر مسرور ہوگی۔ کہ میں تیرے پہلو میں بیٹھی ہوئی اس کے فرائض انجام دے رہی ہوں۔

پگمیلین ۔ (طنزاً) ہاں کیوں نہیں! وہ بے حد مسرور ہوگی۔

گلیشیا ۔ واہ تمہارا لہجہ کیوں بدل گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تم مذاق کر رہے ہو۔ کیا یہ بھی ممکن ہے کہ زبان پر کچھ ہو اور دل میں کچھ اور؟

پگمیلین ۔ ہاں! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔

گلیشیا ۔ مجھے بڑا تعجب معلوم ہوتا ہے۔ بڑی ہوشیاری کی بات ہے۔

پگمیلین ۔ ہاں مفید بھی بہت ہے۔

گلیشیا ۔ ہاں ۔ یہ فن مجھے بھی سکھا دو۔

پگمیلین ۔ یہ فن تو خود بخود سیکھ جاؤ گی۔

حقیقت یہ ہے کہ میری بیوی تم کو یہاں دیکھ کر مسرور نہ ہوگی

گلیشیا ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں بھی اسے یہاں دیکھ کر مسرور نہ ہونگی ۔۔ مجھے اس کے متعلق کچھ اور بتاؤ۔

پگمیلین ۔ کیا بتاؤں؟

گلیشیا ۔ وہ کیا کہکر گئی تھی۔ جاتے وقت

پگمیلین ۔ ہونہہ ۔ وہ کیا کہہ کر گئی تھی۔

ٹھیک ہے۔ وہ مجھے میری زوجیت میں دے کر گئی تھی ۔ اپنا خاموش نمائندہ بنا کر (فرط محبت سے)

وہ اپنی عدم موجودگی میں میری تنہائی سے دلگیر تھی۔ اس لئے مجھے مشورہ دے گئی تھی کہ اگر میرے دل میں جذبات محبت پیدا ہوں۔ تو میں ان کا اعادہ تجھ سے کروں۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ میں اس سے کرتا۔ (اس کو گلے لگا لیتا ہے)

گلیشیا ۔ ہاں ٹھیک ہے۔

پگمیلین ۔ (اس کو ہٹاتے ہوئے) لیکن اس وقت تو پتھر کی ایک بے حس و حرکت مورت تھی اور اب گوشت و پوست کا جیتا جاگتا مجسمہ ۔

اس لئے حالات کے ساتھ احکامات بھی بدلنا ضروری ہیں۔

گلیشیا ۔ دنیا بھی عجیب معمہ ہے!

ایک عورت اپنے شوہر کی پرستار ہے۔ لیکن میرے لئے اس کی پرستش گناہ سمجھتی ہے۔ وہ اپنی عدم موجودگی میں اس کی تنہائی سے دلگیر ہوتی ہے۔ لیکن میری دلبستگی کی کوششوں کو جرم خیال کرتی ہے۔ وہ اس کو حکم دیتی ہے کہ اپنے جذبات محبت کا اعادہ پتھر کے مجسمہ سے کرتا رہے۔ لیکن جب وہ مجسمہ زندہ ہو جائے تو ۔۔ گناہ بن جائے

یہ اجتماع ضدین سمجھنا میری عقل سے باہر ہے۔

پگمیلین ۔ (علیحدہ) مجھے جرأت و استقلال سے اس قصہ کو ابھی ختم کرنا چاہئے۔

[باآواز] گلیشیا ادھر آ۔۔ میری بیوی کی واپسی تک میری بہن تجھ کو اپنے مکان میں پناہ دے گی۔ جو یہاں سے قریب ہی ہے

گلیشیا ۔ [متعجب اور خوفزدہ ہو کر] میں تجھ سے منت کرتی ہوں کہ مجھے اپنے قدموں سے جدا نہ کر۔ پگمیلین مجھے یہیں رہنے دے۔

پگمیلین ۔ ناممکن ہے۔ گلیشیا اٹھ! ہم پھر ملیں گے۔

گلیشیا ۔ [صبر کر کے] میری کیا مجال کہ میں تیرے حکم کی مخالفت کر سکوں لیکن اتنا تو بتا دے کہ قسمت ہمیں پھر بھی ملائے گی؟

اور یہ عرصہ فراق طویل تو نہ ہوگا ۔

پگمیلین ۔ نہیں بہت مختصر۔

گلیشیا ۔ اور تیری بیوی اپنی واپسی کے بعد ۔ مجھے تیری خدمت میں رہنے کی اجازت دے گی۔

پگمیلین ۔ میں اس کا وعدہ نہیں کر سکتا۔

[علیحدہ] میں حقیقت کو کیوں چھپاؤں

[باآواز] افسوس ہے کہ آئندہ ملاقات کی کوئی امید نہیں۔

گلیشیا ۔ [بے اختیار ہو کر] پگمیلین ۔ آہ میں کیا سن رہی ہوں؟

ارے ظالم تیرے الفاظ کسقدر وحشت انگیز ہیں ۔

پگمیلین ۔ ہاں حقیقت تلخ ہوتی ہے۔ میرا تجھ سے محبت کرنا ناممکن ہے

اس لئے یہاں سے تیری دوری ہی بہتر ہے۔

[بیٹھ جاتا ہے]

گلیشیا۔ اپنے اُن الفاظ کو یاد کر پگمیلین۔ اے میرے محبوب کیا اسی لئے میں عدم سے وجود میں آئی ہوں۔ دیوتاؤں کے لئے مجھ پر رحم کر رحم۔ دیکھ میرے جسم کا ذرہ ذرہ تیرا احسانمند ہے۔ کیونکہ تو ہی میرا خالق ہے۔ اور دیوتاؤں نے مجھ کو تیرے ہی لئے زندگی بخشی ہے میں تیری ہی ملکیت ہوں۔ صرف تیری اور تیری ہی رہونگی۔ میری روح کی گہرائیوں میں یہی خیالات موجزن ہیں۔ اب تو مجھ سے ایسی ذات کا تذکرہ کرتا ہے کہ جو تیری محبت پر دعویٰ حق رکھتی ہے۔ اور یہ کہ تیری محبت بھی اُسی کے لئے محفوظ ہے۔ آہ مجھے ان باتوں کا کیا علم۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ دیوتاؤں نے مجھ کو صرف تیری ہی خدمت کے لئے بھیجا ہے۔

[جھک جاتی ہے]

تو مجھ سے اپنی بیوی کے حقوق کا تذکرہ کرتا ہے اور اُن قسموں کا کہ تو اسی کا والہ و شیدا رہے گا۔ افسوس مجھے ان باتوں کا کیا علم میں تو یہی جانتی ہوں کہ اس آسمانی دیوتا نے جس نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ میرا [illegible] ایک ہی مقصدِ حیات قرار دیا ہے کہ میں تیری ہستی میں وصل ہو جاؤں اور تجھ کو اپنی ہستی میں وصل کر لوں

[اپنے ہاتھ اس کی گردن میں حمائل کر لیتی ہے]

[اسی دوران میں پگمیلین حالت تذبذب میں پڑا رہتا ہے۔ تقریر ختم ہونے کے بعد وہ اس کو اپنی گود میں اٹھا لیتا ہے۔ اور بھینچ بھینچ کر پیار کرتا ہے]

دوسرا ایکٹ

[پہلا ایکٹ کے مثل۔ پگمیلین ایک نامکمل مجسمہ کو درست کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے]

پگمیلین۔ کل میری پیاری سانتھکا اپنے روئے زیبا سے اس خانہ تاریک کو منور کرے گی۔ اے کاش کہ وہ یہاں سے گئی نہ ہوتی افسوس کہ اس کی غیبت میں دیوتاؤں کی ستم ظریفی نے معجزہ کی شکل اختیار کی جس نے میرے پائے ثبات کو ڈگمگا دیا۔ مگر اس کے باوجود میری خیانت صرف خیال ہی تک محدود رہی۔ ایک رقیق القلب بیوی شاید ایسی صورت میں چشم پوشی کر جائے لیکن پگمیلین خود کو کس طرح معاف کر سکتا ہے۔ کہ اُسی کی نیت میں فتور آئے۔ اور اس کے خیالات میں فساد۔

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا ——— خواہ عشق کا دیوتا کیوپڈ اپنے تمام ترکش کو خالی کر ڈالے اور فلک الافلاک کے دوسرے دیوتا اپنی سطوت و جبروت سمیت میرے ثبات قدم کو متزلزل کرنے میں انتہائی زور صرف کر ڈالیں۔

[مائرین غیظ و غضب میں بھری ہوئی دہنی جانب سے داخل ہوتی ہے]

مائرین۔ پگمیلین!

پگمیلین۔ مائرین!

مائرین۔ [اس سے اظہارِ نفرت کرتے ہوئے] خبردار مجھے ہاتھ نہ لگانا! تو نے مجھے اور اپنی بیوی دونوں کو فریب دیا ہے۔ بتا یہ کون عورت ہے جسے تو نے کل رات میرے گھر میں پناہ لینے کو بھیجا تھا

پگمیلین۔ ہم دونوں کو ملزم ٹھہرانے میں جلدی نہ کر۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پارسائی اور بے گناہی میں تیری مثال ہے۔

مائرین۔ کمبخت! اقبالِ جرم کیوں نہیں کر لیتا۔ اُس حقیقت پر پردہ ڈالنے سے کیا حاصل جس کا وہ فخریہ اعلان کر رہی ہے۔

مائرین۔ اُسے طوطے کی طرح رٹا ہوا ایک فقرہ یاد ہے۔ جسے وہ انتہائی بےشرمی سے ہر ایک کے سامنے دُہرا دیتی ہے کہ میں پگمیلین پر مرتی ہوں۔ اور جان دیتی ہوں۔ اور جب یہ سنتے سنتے میرا خون جوش کھاتا ہے تو میں اس سے تیری بدنصیب اور مظلوم بیوی کا تذکرہ کرتی ہوں۔ مگر اس پر مطلق اثر نہیں ہوتا بس کہے جاتی ہے کہ میں پگمیلین پر مرتی ہوں اور جان دیتی ہوں اور یہ کہ میرا تن من سب اسی کا ہے۔ آخر یہ ننگِ خاندان ہے کون؟ کہتا کیوں نہیں۔

پگمیلین۔ مائرین میں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ دیوتاؤں نے چند کلمات نازیبا کی بنا پر جو میری زبان سے بے ساختہ نکل گئے تھے۔ مجھ پہ ایک عذاب عظیم نازل کیا ہے [illegible]

بت گلیشیا" کو زندہ کر دیا ہے۔

ماثرین ۔ [حالت تذبذب میں] مجھ کو یقین نہیں آتا۔

پگمیلین ۔ حرف بحرف سچ کہہ رہا ہوں۔

[ماثرین پردوں کے پیچھے جا کر مجسمہ کی تلاش کرتی ہے۔ لیکن وہاں خالی ستون دیکھتی ہے]

ارے سچ! مجسمہ غائب ہے!

[گلیشیا دہنی طرف کے دروازے سے داخل ہوتی ہے]

پگمیلین ۔ دیکھ! جس مجسمہ کی تو تلاش کر رہی ہے وہ یہاں کھڑا ہے

[ماثرین گلیشیا کو حیرت و استعجاب سے دیکھتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتی ہے]

گلیشیا ۔ [دوڑ کر اس سے لپٹ جاتی ہے] میرے پیارے پگمیلین! میں نے تجھے ڈھونڈھ لیا۔

آہ تیری جدائی کے بعد مجھ پر عجیب و غریب واردات گذر چکی ہیں۔

پگمیلین ۔ کیوں؟ آخر کیا ہوا۔

گلیشیا ۔ خیال کر کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

[ماثرین سے مخاطب ہو کر] میں جو تیرے گھر میں گئی ——

ماثرین ۔ پھر۔

گلیشیا ۔ وہاں تن تنہا بیٹھ کر روتی رہی بس روتی رہی۔ سسکیاں لے لے کر۔ اپنے پگمیلین کی جدائی میں۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ خوفناک طریقہ سے آہستہ آہستہ وہ نور وہ درفشاں نور۔ وہ دیوتاؤں کا فرستادہ نور میں نے دیکھا کہ ڈوب رہا ہے۔ سمٹ رہا ہے اور دنیا کے پیچھے جا کر چھپ رہا ہے۔ یہانتک کہ ہر چہار طرف تاریکی کا دور دورہ ہو گیا۔

اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں سرد ہو رہی ہوں اور اس طرح منجمد جیسی کہ پہلے تھی۔ اس حالت میں جس وقت تک کہ میرے پگمیلین نے مجھے زندگی نہیں بخشی تھی۔ میں لرزہ براندام ہو گئی اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں پھر مجسمہ میں تبدیل ہو رہی ہوں۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور دیوتاؤں سے گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگی کہ ایسا نہ ہو ——

"دیوتاؤ مجھ پر رحم کرو" — "مجھے اسی حالت میں رہنے دو" ——

"میرے پگمیلین کی خاطر مجھے اور جینے دو"۔ میں نے چیخ چیخ کر کہا اور میرے محبوب سے مجھے اتنی جلد کیوں جدا کرتے ہو۔ بس ایک بار اور مجھے اس حسین چہرے کی زیارت کر لینے دو۔ صرف ایکبار!

لیکن نہیں۔ شاید میری یہ دعا ان کے کانوں تک نہیں پہونچی کیونکہ اگر ان تک پہونچ جاتی تو ضرور مستجاب ہوتی۔ اس کے علاوہ انہوں نے تیرے حسن و جمال کا مشاہدہ ہی کب کیا ہے۔ ان کو کیا معلوم کہ تجھ سے جدا ہونا کتنا بڑا قہر ہے اور تیرا وصال کتنی بڑی نعمت۔

میں تیرے بستر پر گر گئی [ماثرین سے] اور میرے پپوٹے بھاری ہو کر بند ہو گئے۔ میرے تمام حواسوں نے ایک ایک کر کے میرا ساتھ چھوڑ دیا اس کے بعد مجھے کچھ نہیں معلوم یہانتک کہ ایک عجیب تاریک وقفہ کے بعد میں نے خود کو اپنے منحوس ستون پر نصب پایا۔ ایک بت کی صورت میں بالکل بے حس و حرکت اس کے بعد میں نے متبرک دیوتاؤں کو بارگاہ آسمانی سے نیچے اترتے دیکھا۔ اس کمرہ میں یہانتک کہ وہ چاروں طرف چھا گئے۔ وہ پگمیلین کے سرہانے تشریف لائے اور اس کے روئے زیبا کی زیارت کرنے لگے۔ اس کو غور سے دیکھتے جاتے تھے اور اس کے حسین رخساروں کو چومتے جاتے تھے اس کے بعد مجھے زندگی بخشتے ہوئے فرمانے لگے کہ

"ہم تجھ کو ایسی مسرت سے محروم نہ کریں گے۔"

"گلیشیا تو اپنے معشوق کی خاطر زندہ رہے گی۔"

بس اتنی ہی دیر میں وہ آسمانی نور جو میرے سامنے سے غائب ہو گیا تھا واپس آ گیا۔

وہی ماثرین کا کمرہ تھا۔ اور وہی اس کا بستر۔ وہی سورج افق آسمان پر آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ خوبصورت اور حسین چڑیاں لہلہاتے ہوئے درختوں پر اسی طرح گا رہی تھیں۔ جس طرح پہلے گا چکی تھیں۔ میں نے دوبارہ زندگی پائی۔ تاکہ اپنے معشوق کو جی بھر کر دیکھ سکوں۔

ماثرین ۔ تو نے ایک خواب دیکھا تھا۔ ہم پر ہر روز ایسی موت طاری ہوتی ہے

یہانتک کہ ہم اور تو اور تمام لوگ جو اس دنیا پر رہتے ہیں۔ اس طرح سولیں گے کہ پھر بیدار نہوں گے۔

گلیشیا۔ [خوفزدہ ہو کر مائرین کا ہاتھ تھام لیتی ہے] کہ پھر کبھی بیدار نہ ہوں گے!

پگمیلین۔ اس خاص وقت کا آنا برحق ہے جلد یا بدیر۔ لیکن وہ معین گھڑی ٹل نہیں سکتی جبکہ ہم سب ساکنانِ ارض اسی سونٹی کی طرف واپس کردیئے جائیں گے۔ جہاں سے کھود کر تجھ کو نکالا گیا ہے

گلیشیا۔ آہ۔ حیاتِ تازہ۔ تمام وعدوں کا سنہری جال کس طرح ٹوٹ رہا ہے اور زندگی کی خیالی آرزوؤں کی تصویر کس طرح مٹتی جا رہی ہے

پگمیلین سے اظہارِ عشق ایک ناقابلِ عفو گناہ جس سے احتراز واجب

پگمیلین کا اظہارِ عشق ایک ناقابلِ تلافی جرم جس کا اخفا واجب

خواب پتھر کی طرح سرد۔ اور ہوش و حواس کی نبنہ ہماری فطری کیفیت اور زندگی اس حالت سے پیدا شدہ چلتا پھرتا خواب افسوس۔ امیدوں کی دلفریب شکلیں ایک ایک کرکے فنا ہوئی جاتی ہیں۔

مائرین۔ دنیا میں محبت کرنے کے لئے دوسرے مردوں کی کمی نہیں سوائے پگمیلین کے جس کی محبت کرنے والی ابھی زندہ ہے۔

گلیشیا۔ کیا کسی دوسرے کو اس سے محبت کرنے کا حق نہیں ہے۔

مائرین۔ کیوں نہیں! میں کرتی ہوں۔ وہ میرا بھائی ہے

گلیشیا۔ کیا تو اس کی مخلوق ہے؟

مائرین۔ نہیں! لیکن ——

گلیشیا۔ واہ۔ باوجود اس کے کہ وہ تیرا خالق نہیں ہے تو اس سے محبت کرتی ہے۔ پھر مجھے کیوں باز رکھتی ہے جس کا تمام وجود اس کا احسانمند ہے۔ [اس کی طرف مڑتی ہے]

پگمیلین۔ خیر۔ تو مجھ سے محبت کر سکتی ہے۔ باپ سمجھ کر۔

مائرین۔ ہاں۔ تجھ کو زندگی بخشنے والا تیرا باپ ہی ہو سکتا ہے۔

گلیشیا۔ خیر تیری مرضی۔ میرے لئے یہی خیال غنیمت ہے کہ میں تجھ سے محبت کر سکتی ہوں۔ کیا تو بھی میری محبت کا جواب دے گا؟

پگمیلین۔ ہاں میں بھی تجھ سے محبت کروں گا۔ مگر بیٹی سمجھ کر۔

اس کا خیال رہے۔

گلیشیا۔ اب میرے دل کو تسکین ہو گئی۔ [اس کے ہاتھ کا بوسہ لیتی ہے]

مائرین۔ (علیحدہ) شکر ہے۔ اب سائنس کا بھی مطمئن ہو جائے گی۔ [جاتی ہے]

گلیشیا۔ [پگمیلین سے جو اس کے دہنی طرف سے گذر رہا ہے] مجھے تنہا چھوڑ کر تو کہاں چلا؟

پگمیلین۔ ابھی آتا ہوں۔

گلیشیا۔ میں تیرے ہمراہ رہوں گی۔

میری گذشتہ حالت کی سرد یادگاروں کے درمیان مجھے تنہا نہ چھوڑ اُن کو دیکھ کر خوف معلوم ہوتا ہے۔ [مجسموں کی طرف اشارہ کرکے]

پگمیلین۔ [باہر کی طرف دیکھتے ہوئے] دیکھ! لیوسی پس آرہا ہے۔ وہ میری واپسی تک تیرا دل بہلائے گا۔ میں جلد آؤنگا۔

گلیشیا۔ لیوسی پس! یہ کون ہے؟

پگمیلین۔ ایک بہادر سپاہی۔

گلیشیا۔ یعنی۔

پگمیلین۔ وہ شخص جو اپنے ملک کے دشمنوں کو ہلاک کرنے کی خدمت پر مامور کیا جاتا ہے۔

گلیشیا۔ (خوفزدہ ہو کر) ایک تنخواہ دار خونی!

پگمیلین۔ خونی! واہ۔

یہ تیری کوتاہ دماغی اور جہالت کا ثبوت ہے۔ دہقانوں اور وحشیوں کی نظروں میں تیرے اس طرز خیال کی وقعت ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک مہذب اور متمدن ملک اپنے سپاہیوں پر فخر کرتا ہے۔ ایتھنس کے اندر جو تہذیب میں شہرۂ آفاق ہے۔ فوجی پیشہ شرافت اور حکومت کی بہترین نشانی ہے۔

گلیشیا۔ وہ خون کرتا ہے اور خون کرنے کا معاوضہ پاتا ہے۔

پگمیلین۔ بے شک۔

لیکن وہ اپنے اہلِ وطن کی سلامتی کے لئے خون کرتا ہے۔

گلیشیا۔ خواہ اس کے اہل [illegible]

بلیین- اس کی ذمہ داری اس کی گردن پر نہیں۔ اس کے لئے یہی عذر کافی ہے۔ کہ وہ دشمن ہیں اور ان کا قتل واجب۔ وہ حکام بالا دست کے احکام کو بجا لاتا ہے اور اپنے فرض منصبی سے سبکدوش ہوتا ہے۔

شیا- ظلم کی انتہا ہے۔ مجھے تعجب ہے گمیلین! کہ تیرے منہ سے ایسی خوفناک باتیں کس طرح نکلتی ہیں۔ تو نے مجھ سے موت کا تذکرہ کیا۔ کہ جو تمام ساکنانِ ارض کو چشم زدن میں فنا کر دے گی۔ اب تو مجھ سے ایسے شخص کا تذکرہ کر رہا ہے کہ جس کا فرض خون کرنا ہے۔ زندگی کی وہ نعمت کہ جو تو نے کمال مہربانی سے مجھ کو بخشی۔ اس کو دوسرے آدمیوں سے زبردستی چھین لینا کتنا بڑا ظلم ہے۔ اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ تو اس کی طرفداری بھی کر رہا ہے۔

لمین- میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ ان مسئلوں کو حل کر سکوں۔
دیکھ وہ آپہونچا۔ اُس سے گفتگو کر
اُس کے خوفناک پیشے کے باوجود تو اُسے نیک اور رحمدل پائیگی۔

شیا- [بے حد خوفزدہ ہو کر] نہیں گمیلین!
مجھے اُس کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ۔ وہ قاتل اور خونی ہے۔

یلین- بے وقوف!
آخر کیوں خوف کھاتی ہے۔ وہ تجھے نگل تو نہ لے گا۔ وہ جتنا بہادر ہے اتنا ہی نیک اور بے ضرر بھی ہے۔ اور میں ہمیشہ کے لئے رخصت بھی نہیں ہوتا۔ میں ابھی واپس آؤنگا

[دہنی جانب سے جاتا ہے]

بشیا- بہتر ہے۔ میں تیری مرضی پر شاکر ہوں۔
لیکن ایک قاتل کی ہمنشینی کے خیال سے میں کانپ رہی ہوں۔

[لیوسی پس ہاتھوں میں ایک مردہ ہرن کا بچہ اُٹھائے داخل ہوتا ہے]

وسی پس- وہ کیا بے خطا نشانہ تھا۔ ایسا کہ تمام عمر میں دوبارہ ناممکن ہے۔

[ہرن کے بچے کو ایک طرف ڈال دیتا ہے]

... غزال ... نے ... خیر ... سے ... پاس آیا۔

[اس کے سامنے سے ہٹتے ہوئے]

لیوسی پس- ارے یہ کون ہے؟
خاتون! مجھ سے کیوں ڈرتی ہے۔ میں تجھے کوئی نقصان نہ پہونچاؤنگا

گلیشیا- مجھ پر رحم کر! میں نے تیرے وطن کا کیا بگاڑا ہے۔
جناب میں آپ کی دشمن نہیں ہوں!

لیوسی پس- میں قسم کھا کر اس کی گواہی دے سکتا ہوں!
کاش کہ میرے وطن کے ایسے ہی حسین دشمن ہوتے۔ تو آج اُسکی فوج میں سپاہیوں کی کمی نہ ہوتی۔

گلیشیا- [آگے بڑھتے ہوئے] بدنصیب! جلد توبہ کر لے۔ ورنہ یہ سخت پتھر تیرے جسم پر دوبارہ قابض ہو جائے گا۔

[مجسموں کی طرف اشارہ کر کے]

لیوسی پس- نہ معلوم کیا کہہ رہی ہے ــــ

گلیشیا- جناب! میں آپ کو یاد دلاتی ہوں کہ جس سنگ تراش نے آپ کے جسم کو بنایا تھا۔ اُس نے دیوتاؤں سے آپ کو زندہ کرنے کی دعا مانگتے وقت یہ نہ خیال کیا کہ وہ اس دنیا پر ایک بلا نازل کر رہا ہے۔
دیکھ! تیرے ظالم ہاتھ خون میں رنگے ہوئے ہیں!
مجھ سے الگ ہٹ کر کھڑا ہو اور مجھے چھونے کی جرأت نہ کر۔

لیوسی پس- [علیحدہ] دیوانی لڑکی!
آخر مجھ سے کیوں ڈرتی ہے۔ میں تجھے آزار پہونچانے کی کب ہمت کر سکتا ہوں؟
میرے رنگین ہاتھوں کا سبب یہ ہے [ہرن کے بچے کو اُٹھاتے ہوئے]

گلیشیا- یہ کیا ہے؟

لیوسی پس- ننھا غزال- [اس کو گلیشیا کے قدموں کے پاس ڈال دیتا ہے]

گلیشیا- (جھک کر) یہ خاموش کیوں ہے؟

لیوسی پس- کیونکہ میں نے اسے زخمی کر دیا ہے۔

گلیشیا- ظالم!

لیوسی پس- مجھے اس کا خود افسوس ہے۔ لیکن یہ محض اتفاق تھا۔ میں ایک درخت کے سایہ میں لیٹا ہوا۔ وقت گذارنے کے لئے گنگنا رہا تھا کہ میں نے اس کو دور میدان میں کلیلیں کرتے ہوئے دیکھا۔ میری کمان

ہاتھ کے قریب ہی رکھی ہوئی تھی۔ کہ میں نے دفعتہً تیر جوڑ کر اس پر
شست باندھی۔ مجھے اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ میرا نشانہ اتنے
فاصلہ کے باوجود بھی ٹھیک بیٹھے گا۔
لیکن اس کی قسمت کا چکر کہ اس آسانی سے شکار ہو گئی۔
[اس پر جھکتے ہوئے]
دیکھو! بیچاری تڑپ رہی ہے۔ لو مر گئی۔

گلیشیا- ارے ظالم خونی درندے! یہ تو نے کیا کر دیا!
[ہرن کے بچے کو اپنی گود میں اٹھاتی ہے۔]
ارے تو نے اس کا کام تمام کر دیا۔
اے حسین مخلوق! میں تجھے نہیں پہچانتی کہ تو کون ہے۔ تیری شکل و
صورت میرے لئے اجنبی ہے۔ لیکن اتنا جانتی ہوں کہ تو جاندار تھی
اور اس درندے نے تجھے زندگی سے زبردستی محروم کر دیا۔
[ہرن کے بچے کے جسم پر رومال پھیرتی ہے اور اس کو اٹھا کر
لیوسی پس کو دے دیتی ہے]
یہاں سے دور ہو جا!
پیشتر اس کے کہ تجھ پر کوئی بلا نازل ہو۔

لیوسی پس- حقیقت یہ ہے کہ میں اس بنا پر خود خوف کھا رہا ہوں۔ کیونکہ
یہ ماٹرین کی ملکیت تھی جس کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔ اسے یہ معلوم کر کے
بے حد افسوس ہوگا کہ یہ مر گئی۔
اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ تو اس راز کو اس سے پوشیدہ رکھے گی
اس وقت تک کہ میں اس کی جگہ دوسری نہ لے آؤں۔
[لیوسی پس ہرن کے بچے کے ساتھ جاتا ہے]

گلیشیا- دور ہو جا میرے سامنے سے۔ میں خونی کے راز پوشیدہ نہیں رکھ سکتی
[ماٹرین داخل ہوتی ہے]

ماٹرین- (مضطرب ہو کر) کیوں گلیشیا! تو کیوں کانپ رہی ہے۔

گلیشیا- ماٹرین! تو اپنے قلب کو مضبوط کر کے میری بات کو سننے کے لئے
تیار ہو جا!
وہ آدمی جس سے تو محبت کرتی ہے۔ خونی ہے!

ماٹرین- [اطمینان کا سانس لے کر] بیوقوف لڑکی! مجھے معلوم ہے
بگمیلین جاتے وقت مجھ سے تذکرہ کر چکا ہے کہ تو ہمارے ملک کے سب
بہادر سپاہی کو اس نام سے یاد کرتی ہے۔
وہ خونی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک سپاہی ہے۔

گلیشیا- اور خونی کسے کہتے ہیں۔

ماٹرین- اُسے جو صرف بے بسوں۔ کمزوروں اور نہتوں سے جنگ کرتا ہے
اور جس کا کام دوسروں پر اچانک حملہ آور ہو کر قتل کرنا ہے۔
میرا بہادر لیوسی پس خونی نہیں ہے۔

گلیشیا- تیرا بہادر لیوسی پس اپنی بہادری سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ وہ تیرے
بیان کے مطابق محض خونی ہی ہے۔ کیونکہ میں نے مقتول کو اس کی
گود میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔
اس مظلوم کے خون میں اُن کے دونوں ہاتھ رنگے ہوئے تھے۔
اس جگہ اس کا سرد اور بے جان جسم پڑا ہوا تھا۔ اور اس کی
خوبصورت سیاہ پتلیوں پر موت کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اُس نے
صرف ایک ہی بار حرکت کی۔ اُس نے اپنا سر اس کی طرف گھمایا
اور کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن پیشتر اس کے کہ وہ ایک لفظ بھی
اپنی زبان سے کہتی اُس کی گردن ڈھلک گئی اور وہ مردہ ہو کر گر گئی

ماٹرین- دیوانی ہو گئی ہے کیا۔ تجھ سے کس نے کہا؟

گلیشیا- خود اس نے اپنی زبان سے اقبال کیا۔ اور اپنے فعل پر بہت
دیر تک فخر کرتا رہا۔ اس نے کہا کہ اس نے محض مذاق ہی میں
اپنی کمان کو اٹھا کر تیر جوڑا اور اس طرح نشانہ لگایا کہ اس کے
دل کو توڑتا ہوا نکل گیا۔

ماٹرین- لیوسی پس نے ایسا کیا؟ —— ناممکن ہے۔
تو خواب دیکھی ہے کیا؟

گلیشیا- اپنی جان کی قسم کھاتی ہوں کہ یہ سچ ہے۔ دیکھ یہ رومال موجود ہے
جو ابتک اس کے خون میں رنگا ہوا ہے۔

ماٹرین- (خوفزدہ ہو کر) اس نے کس کو قتل کر ڈالا۔

گلیشیا- مجھے یہ نہیں معلوم۔
اس کی شکل و صورت میرے لئے بالکل اجنبی تھی۔ دیکھ وہ پھر
آ رہا ہے۔ مجھے اس ظالم خونی درندہ سے پناہ دے۔

[بائیں طرف جاتی ہے]

[لیوسی پس دہنی جانب سے داخل ہوتا ہے]

...ین - لیوسی پس! کیا یہ خوفناک واقعہ صحیح ہے؟

...ی پس - [گلیشیا سے علیحدہ] تجھ کو میرا راز افشا کرکے کیا ملا! بھولی لڑکی! تونے اس کو کسقدر رنج پہنچایا ہے!

[ماٹرین سے] ہاں صحیح ہے!

لیکن گلیشیا کا فرض تھا کہ خاموش رہتی۔ اور اس حادثہ کی اطلاع دے کر تجھ کو پریشانی میں مبتلا نہ کرتی۔

...ن - [اس کے اطمینان پر متعجب ہوکر] معلوم ہوتا ہے کہ تیرے دماغ پر کوئی خبیث روح مسلط ہوگئی ہے ورنہ یہ ناممکن تھا کہ تیرے ہاتھوں سے ایسی حرکت سرزد ہوتی۔

...پس - بے شک میں ہی خطاکار ہوں!

میں نے اس کو اپنی نظر کے سامنے رقص کرتے ہوئے دیکھا کہ دفعتہً میرا ہاتھ قریب رکھی ہوئی کمان پر پڑا۔ اور تقریباً سو گز کے فاصلے سے میں نے شست باندھ کر اپنے تیر کو اس کے جگر میں اتار دیا

ایسے صحیح نشانہ باز دنیا میں کم پیدا ہوتے ہیں!

...ین - (کانپ کر) بہتر ہوتا کہ بالکل ہی ناپید ہوتے۔

آہ قسی القلب انسان۔　　[رونے لگتی ہے]

...ی پس - میرا پیمانۂ صبر لبریز نہ کرو!

میں تو مبارکباد کا مستحق ہوں۔ کیونکہ میں نے تیراندازی کا معجزہ دکھایا ہے۔ اگر ایک جان ضائع ہوگئی تو کونسا نقصان ہوگیا۔ دنیا میں ایک معمولی ہستی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اور ایک کم یا زیادہ ہوجانے سے مخلوق کی تعداد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ابھی بہت باقی ہیں۔

[گلیشیا کی طرف دیکھتا ہے جو خائف ہوکر چیخ مارتی ہے اور بائیں طرف جاکر پناہ گزیں ہوتی ہے]

ذرا خیال تو کرو کہ میں قتل عمد کے جرم سے بری الذمہ ہوں۔ کیونکہ اس قدر فاصلے سے نشانہ صحیح بیٹھنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا لیکن میرا نشانہ میرے خیال سے زیادہ صحیح ثابت ہوا اور وہ بیچاری ہلاک

ڈھیر ہوگئی۔

ماٹرین - (متحیر ہوکر) افسوس! تیری بےحسی اور سنگدلی ثبوت ہے تیری دیوانگی کا۔ آہ میں کیا کروں۔ جا اپنے نجس وجود کو کسی محفوظ جگہ میں پناہ دے۔

لیوسی پس - لیکن ——

ماٹرین - بس خاموش - میں ایک لفظ بھی نہ سنونگی۔ اور نہ آج سے تیرا منہ دیکھنا پسند کرونگی۔ دور ہوجا میرے سامنے سے!

[لیوسی پس گلیشیا کی طرف مڑتا ہے]

گلیشیا - جناب فوراً تشریف لے جائیے۔ ورنہ مچاتی ہوں شور۔

لیوسی پس - واہ دونوں عقل سے خارج معلوم ہوتے ہیں عورتوں کی منطق ہی دنیا سے نرالی ہے۔ جس کا سمجھنا مردوں کی عقل سے باہر ہے بہتر ہے۔ میں اتھینس کو روانہ ہوتا ہوں۔ جب تمہاری عقل درست ہوجائے اور میری ضرورت محسوس ہو تو طلب کرلینا ——

—— اس وقت تک رخصت!

[غصہ میں دہنی جانب سے جاتا ہے]

ماٹرین - اے کاش کہ یہ ڈراؤنا خواب ثابت ہو۔ اور بیداری پر حقیقت عریاں نظر آئے۔ تاکہ میں اپنا کھویا ہوا آرام دوبارہ حاصل کرسکوں

گلیشیا - [خیال آنے پر اچھلتے ہوئے] خواب!

[ماٹرین کے پاس آکر]

ہاں ہم دونوں خواب ہی دیکھ رہے ہیں جس کا مضمون بھی یک ہی ہے۔ لیکن یہ کس طرح معلوم ہو کہ خواب کیا ہے اور حقیقت کیا؟

ماٹرین - کچھ باتیں اس قسم کی ہیں کہ جنکی حقیقت بہت خوفناک ہوتی ہے

—— چنانچہ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

[پگمیلین ہرن کا بچہ اٹھائے ہوئے داخل ہوتا ہے]

پگمیلین - کیوں ماٹرین۔ آج لیوسی پس کو کیا ہوگیا —— میں نے دیکھا کہ مکان سے نکلتے وقت اس کے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار تھے۔ اور گھوڑے پر بیٹھتے وقت اس کے اعصاب کانپ رہے تھے۔ کیا ماجرا ہے؟

ماٹرین - کیا بتاؤں۔ غضب ہوگیا۔

وہ دیوانہ ہوگیا اور اسی عالم میں اُسنے ایسے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔
کہ جس کے بیان سے دل تھراتا ہے۔ تونے بھی اس کی زبان سے
کچھ سنا؟

پگمیلین۔ ہاں۔ جب میں نے اُسکی ناراضگی کا سبب دریافت کیا تو اُسنے
میرے سامنے اس کو ڈالدیا۔ [ہرن کے بچے کو دکھا کر]

گلیشیا۔ (بے حد خوفزدہ ہو کر) ہاں یہی ہے وہ مظلوم۔ اس کو میرے
سامنے سے ہٹاؤ۔ اس کو دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

مائرین۔ کیوں۔ یہ کیا ہے؟

گلیشیا۔ وہ ہی جس کا خون اس نے اس بے دردی سے کیا ہے۔ اور
دیوتاؤں کی بخشی ہوئی زندگی سے اس غریب کو زبردستی محروم کیا
اس کو میرے سامنے سے ہٹالو۔ میں موت کی ڈراؤنی شکل کو کس
طرح دیکھ سکتی ہوں؟

مائرین۔ کیا لیوسی پس نے فقط اسی کو قتل کیا تھا؟

گلیشیا۔ (متعجب ہو کر) ہاں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے۔

مائرین۔ لڑکی تو دیوانی ہوگئی ہے۔ پگمیلین! یہ مجھ سے برابر یہی کہے جاتی
ہے کہ لیوسی پس نے کسی کو قتل کر ڈالا۔

پگمیلین۔ (غصہ ہو کر) یہ چھوکری ہم سب کو دیوانہ بنا دے گی۔
لاؤ میرا گھوڑا تیار کراؤ۔ میں خود اسے منا کر لاؤنگا۔

[مائرین بائیں جانب جاتی ہے]

گلیشیا۔ مجھ سے قصور ہوا۔ سچ مجھے اس بات کا علم نہ تھا!
کیا تو مجھ سے ناراض ہوگیا

پگمیلین۔ ہاں۔
میں تجھ سے بے حد ناراض ہوں۔ اپنے علانیہ عشق کے اظہار سے
تونے مجھے خوب رسوا کیا۔ اور اب لیوسی پس کو اس کے محبوب سے
جدا کرا دیا۔ تیری بیوقوفی ناقابل برداشت ہوگئی ہے۔

[میموس داہنی جانب سے داخل ہوتا ہے]

میموس۔ جناب! کرائسس اور انکی بیگم باہر تشریف رکھتے ہیں۔

پگمیلین۔ میں اس وقت نہیں مل سکتا (ٹھہر کر) اچھا ٹھہرو۔ اندر
بلا لاؤ۔ [میموس جاتا ہے]

[گلیشیا سے] جا تو وہاں بیٹھ کر میرا انتظار کر۔

[گلیشیا جاتی ہے]

[پگمیلین ایک نامکمل مجسمہ کو بنانے میں مصروف ہوجاتا ہے۔ ڈیفنی
دہنی جانب سے داخل ہوتی ہے]

ڈیفنی۔ پگمیلین کہاں ہے؟

پگمیلین۔ (کام کرتے ہوئے) پگمیلین یہاں ہے۔

ڈیفنی۔ ہم چند روز قبل تمہارے مکان پر آئے تھے۔ لیکن تم موجود نہ تھے۔
چونکہ اندر داخل ہوگئے تھے اس لئے ہم نے تمہارے اسٹوڈیو کی دل
بھر کر سیر کی۔ اور اس سلسلہ میں ہم نے تمہارے پتھر کو بھی دیکھ لیا۔
جسے تم پردوں کے پیچھے بڑی احتیاط سے چھپا کر رکھتے ہو۔

پگمیلین۔ (انکی طرف مڑ کر) آپ نے بڑی ناشائستہ حرکت کی۔

ڈیفنی۔ جناب آپ مجھ کو پہچانتے ہیں کہ میں کون ہوں۔

پگمیلین۔ ہاں جانتا ہوں۔ تم کرائسس کی بیوی ہو۔ آپ کے ساتھ
آپ کے شوہر بھی آئے ہیں؟

ڈیفنی۔ ہاں وہ باہر تشریف رکھتے ہیں۔ میں ان کی نقیب بن کر آئی ہوں
تاکہ تمہیں ان کے شایانِ شان استقبال کے لئے تیار کر دوں۔
ان کے حضور میں ادب سے گفتگو کرنا تاکہ وہ تمہارا بت خریدنے پر
رضامند ہو جائیں۔ کیونکہ ان کی ایک ہی نگاہِ کرم پر تمہاری قسمت
پلٹ جائے گی۔

پگمیلین۔ (میموس سے) تم ان سے اندر آنے کو کہو۔

[کرائسس دہنی جانب سے داخل ہوتا ہے]

کرائسس۔ کیا یہ سنگتراش راضی ہوگیا۔

[میموس باہر جاتا ہے]

ڈیفنی۔ ہاں۔
اس وقت مزاج درست معلوم ہوتا ہے۔ بس روپیہ نکال کر اس کے
ہاتھ پر رکھ دو۔ میں نے اس بت کے متعلق سنا ہے کہ بے نظیر اور
لاجواب شے ہے۔ لیکن اس کے منہ پر اس پتھر کی وقعت گھٹانے
میں کمی نہ کرنا اور اس میں ہزار عیب نکال کر خریدنا۔

کرائسس۔ (پگمیلین سے) تمہارا وہ مجسمہ کہاں ہے جسے ہم نے گذشتہ ہفتہ

دیکھا تھا۔

پگمیلین ۔ (گھبرا کر) جناب وہ ابھی نامکمل ہے اور اس کے علاوہ بصورت بھی۔ مجھے اُس کو پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

کرائیسس ۔ ہاں یہی میرا بھی خیال ہے۔ اُس کا رنگ و روغن پھیکا ہے اور چمک بالکل غائب۔ دھوپ چھاؤں کا کوئی فرق ہی نہیں۔ مطلع تمام تاریک نظر آتا ہے۔ اس کی سطح پر کچھ بدنما داغ بھی ہیں جس نے اس کی وقعت کو اور بھی گھٹا دیا ہے۔ اس کے علاوہ تصویر کے چہرے پر جذبات کا نام و نشان ہی نہیں۔ بالکل اندھی۔ گونگی۔ اور بہری معلوم ہوتی ہے۔

ڈیفنی ۔ (اس سے علیحدہ) ذرا سوچ کر بات کرو۔ تم روغنی تصویر کے متعلق بات کر رہے ہو یا سنگین مجسمہ کی نسبت۔

کرائیسس ۔ واہ۔ تم کیا جانو ــــ دونوں کا اصول ایک ہی ہے اچھا کیا دام لگاؤ گی۔ ذرا اس کے وزن کا تخمینہ تو کرو۔

[ڈیفنی سے علیحدہ]

ڈیفنی ۔ (علیحدہ) ایک ٹن کے لگ بھگ ہوگا۔

کرائیسس ۔ (باآواز) اچھا ہزار درہم لوگے؟ بولو۔

پگمیلین ۔ نہیں جناب۔ آپ نے بہت دام لگا دیئے۔ تصویر بالکل اندھی۔ گونگی اور بہری ہے۔ اور نہ اُس پر دھوپ ہے نہ چھاؤں

کرائیسس ۔ ہاں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے عیب ہیں۔ لیکن کوئی حرج نہیں۔ ہم مٹی کا ایک کھلونا خرید رہے ہیں۔ جو ہمارے کمرے میں چراغ رکھنے کے ڈیوٹ کا کام دے گا۔

پگمیلین ۔ معاف کیجئے جناب۔ آپ کے لئے وہ بیکار سی شے ہے۔ لیکن میں اُس کو کسی قیمت پر بھی جدا نہ کرونگا۔

کرائیسس ۔ میں جس پتھر کے ایک ہزار درہم لگا رہا ہوں۔ اس کے بازار میں کوئی پانسو بھی نہ دے گا۔

ڈیفنی ۔ میاں ذرا ہوش کی دوا کرو۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ ہم نے ایک اپولو خریدا تھا۔ جس کا قد تمہارے پتھر سے دگنا تھا۔ اور ہم نے اس کے صرف پندرہ سو درہم دیئے تھے۔

پگمیلین ۔ لیکن خطا معاف۔ ایک صناع اپنے مجسموں کے حسن کا اندازہ انکے زن

اور حجم کے لحاظ سے نہیں کرتا۔

کرائیسس ۔ وہ نہ کرے مگر ہم تو کرتے ہیں۔

ڈیفنی ۔ میاں گستاخ صاحبزادے! کرائیسس کو ناراض کرنے کی ہمت نہ کرو۔

[دہنی جانب سے جاتی ہے]

کرائیسس ۔ اور ہماری بیگم کی بات کا لحاظ کرو [جاتے ہوئے]

پگمیلین ۔ جناب آپ کا غصہ میرے سر اور آنکھوں پر۔ لیکن میں آخری بار عرض کرتا ہوں کہ وہ مجسمہ برائے فروخت نہیں۔

[بائیں جانب سے جاتا ہے]

کرائیسس ۔ جناب میں بھی آخری بار عرض کرتا ہوں کہ میں خالی ہاتھ واپس نہ جاؤں گا۔ فنونِ لطیفہ کا سرپرست آرٹ کا محکوم نہیں بن سکتا میں تجھے ابھی دکھا دونگا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔

کہاں ہے وہ مجسمہ؟

[ستون پر جا کر پردوں کو ہٹا کر دیکھتا ہے]

ارے غائب ہو گیا!

[وہ مجسمہ کو چاروں طرف دیکھتا ہے۔ یکایک اس کی نظر گلیشیا پر پڑتی ہے جو بائیں طرف سے آرہی ہے۔ وہ اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر حیرت سے دیکھتا ہے]

ہائیں یہ کون ہے؟

گلیشیا ۔ ذرا ہوش کی دوا کرو۔

کرائیسس ۔ نہیں معاف کرنا۔ مجھے شک ہوا کہ کہیں ــــ اوفوہ! بڑی غلطی ہوئی۔

(علیحدہ) ظالم ہو بہو وہی ہے۔

[باآواز] میں تم کو پہچانتا ہوں۔ میں نے تم کو کہیں دیکھا ہے۔

[سر کھجا کر]

گلیشیا ۔ شاید پتھر کی شکل میں۔ بہت ممکن ہے۔

کرائیسس ۔ (خود پر قابو پا کر) ہاں میں سمجھ گیا ــــ ہو نہ ہو یہ پگمیلین کی ماڈل ہے۔ بیشک وہی ہے۔ لیکن بڑی دیدہ دلیر معلوم ہوتی ہے۔ آنکھوں کا پانی ڈھل چکا ہے۔ اس پیشہ کی تمام عورتیں اسی قماش کی ہوتی ہیں۔ لیکن بلا کی حسین ہے جسم کی

[redacted]

یہ کون عورت ہے؟

اگر تو ایک لفظ بھی غلط کہے گا تو میں تیری کھال کھچوا دونگی۔

میموس ۔ حضور غلام کی کیا مجال کہ غلط کہے۔ یہ عورت وہی بت ہے جس میں جان پڑگئی ہے۔

کرائیس ۔ (میموس سے علیحدہ) میں تمہارا بے حد ممنون ہوں۔

[اس کو کچھ انعام دیتا ہے اور اُس سے ہاتھ ملاتا ہے]

[میموس دہنی جانب سے جاتا ہے]

[ماٹرین بائیں جانب سے داخل ہوتی ہے]

ماٹرین ۔ کیا معاملہ ہے؟ کوئی خاص بات؟

ڈیفنی ۔ ہاں ــــ یہ عورت ۔

ماٹرین ۔ وہی بت ہے جس میں جان پڑگئی ہے۔

کرائیس ۔ میں تمہارا بے حد ممنون ہوں ۔

[اس سے ہاتھ ملاتا ہے]

[پگمیلین دہنی جانب سے داخل ہوتا ہے]

پگمیلین ۔ کہئے جناب کیا ہو رہا ہے۔

کرائیس ۔ وہ مجسمہ ــــ

ڈیفنی ۔ خبردار ۔

کرائیس ۔ مجھے کہنے دو۔

وہ مجسمہ جو کہ میں نے خریدا تھا ــــ

ڈیفنی ۔ مجھے کہنے دو۔

مجھے سب نے دیوانہ بنا لیا ہے۔

کرائیس یہ لڑکی. ماٹرین اور تمہارا غلام سب کا متفقہ بیان ہو کہ ــ

پگمیلین ۔ گلیشیا کا مجسمہ زندہ ہو گیا ہے ۔ بیشک یہی بات ہے ۔

کرائیس ۔ یہی بات ہے۔

میں سب کا بے حد ممنون ہوں اور آن کی اس عنایت کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرتا ہوں۔

[پگمیلین ہاتھ ملا کر ڈیفنی کے پاس جاتا ہے]

[سائنسکا دہنی جانب سے داخل ہوتی ہے]

سائنسکا ۔ پگمیلین ۔ میری جان ۔

پگمیلین ۔ میری پیاری سائنسکا ۔

سائنسکا ۔ تیری فرقت نے چین نہ لینے دیا ۔ اور میں وقت سے پہلے آگئی ۔ [علیحدہ] یہ کون لوگ ہیں؟

[باآواز] جناب مجھے معاف کیجئے ۔

میں نے خیال کیا کہ میرا شوہر تنہا ہے۔

ڈیفنی ۔ (طنزاً) بے شک ۔

میں نے بھی اپنے شوہر کو تنہا ہی خیال کیا تھا مشکل یہ ہے کہ عورتیں اپنے شوہروں پر جلد ایمان لے آتی ہیں۔

سائنسکا ۔ [پگمیلین سے علیحدہ] یہ لوگ کون ہیں؟

پگمیلین ۔ آپ کرائیس ہیں ۔ اور آپ اُن کی بیگم ڈیفنی ۔ یہ لوگ اس لئے آئے ہیں کہ ــــ

ڈیفنی ۔ نہیں ہم دونوں مختلف اغراض کے ماتحت آئے ہیں ۔

[گلیشیا سے] کرائیس اس لڑکی کی خاطر آئے ہیں اور میں پیچھے آئی ہوں۔

کرائیس ۔ واقعات کی ترتیب اگر اسی طرح ہے۔ تو اس راز کو کیا چھپا گئیں کہ پگمیلین تمہارے پیچھے آئے ہیں ۔

سائنسکا ۔ [گلیشیا کی طرف اشارہ کر کے جو بائیں طرف بیٹھی ہے] یہ خاتون کون ہے؟ کیا میری آنکھیں مجھے فریب دے رہی ہیں؟

ڈیفنی ۔ بالکل نہیں ۔ حقیقت ہی حقیقت نظر آ رہی ہے ۔

سائنسکا ۔ [ستون کی طرف رخ کر کے] اور مجسمہ بھی غائب ہے

پگمیلین ۔ سائنسکا! دیوتاؤں نے اپنی قدرت سے گلیشیا کو زندہ کیا

سائنسکا ۔ دیوتاؤں میں بڑی قدرت ہے ۔ کیا واقعی یہ وہی ہے جس کو میرے پگمیلین نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے؟

[گلیشیا کے قریب جا کر اس کو بے حد اشتیاق سے دیکھتی ہے]

پگمیلین ۔ ہاں وہی ہے ۔

سائنسکا ۔ ٹھہرو ۔ مجھے تو دیکھنے دو ۔

[گلیشیا کے دہنی جانب جھکتی ہے]

ہاں ہاں یہ وہی حسین چہرہ ہے ۔ اور وہی گداز جسم جو اسی دلفریب لباس میں اسی طرح ملبوس ہے

کیا تو نے مجھے پہچان لیا۔

ا۔ لو سنو۔ وہ بولتی بھی ہے۔

میری گلیشیا کی آواز کسقدر میٹھی ہے۔ کہتی ہے کہ "پہچان لیا؟"

واہ میں نے گھنٹوں ایک ہی نشست سے بیٹھ کر تجھے نشو ونما پاتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں بھی تیری ہی بے حس و حرکت اس کے کام میں ہمہ تن مشغول اور اس کی صناعی میں بالکل محو۔ البتہ جو وقت فرطِ عقیدت سے بے چین ہو جاتی تھی تو کبھی کبھی اپنا پہلو بدل کر اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔ اور اُن مبارک انگلیوں کو بے اختیار جا کر چوم لیتی تھی۔ جن کی کمال تخلیق کا نتیجہ تو مجسم موجود ہے۔

آ ـــــ تاکہ میں تجھے بہن کی طرح پیار کروں اور اپنے سینہ سے لگاؤں۔ [بوسہ لیتی ہے]

دیکھو وہ بوسہ بھی لے سکتی ہے۔

۔ ہاں وہ اس ہنر میں بڑی مشاق معلوم ہوتی ہے۔

کا۔ کیوں پگمیلین۔ ایسی حالت میں جبکہ دیوتاؤں نے تیرے کمال کا خود اعتراف کیا ہے۔ تیرے چہرے پر خوشی اور مسرت کے آثار کیوں نہیں نمودار ہوتے۔

ں۔ (پگمیلین سے) دیکھو گھبرا کر اصل واقعہ نہ کہدینا۔ بس اسی بیان پر ڈٹے رہو۔ [گلیشیا کی طرف اشارہ کر کے]

ابھی بچہ ہے۔ لیکن غلط روی اور دروغ گوئی میں طاق ہے۔ افسوس ہے کہ تمہاری دروغگوئی کا باعث یہ ہوئی۔ لیکن مصلحت یہی ہے کہ اب اس جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھو۔ [دہنی جانب سے جاتا ہے]

کا۔ (ناراض ہو کر) ہاں اب مجھ معلوم ہوا۔ میں قبل از وقت واپس آگئی۔

۔ نہیں مجھے خوف ہے کہ تم بعد از وقت واپس آئی ہو۔ سائنسکا! آئندہ سے اسے کبھی تنہا نہ چھوڑنا یا چھوڑو تو بالکل ہی چھوڑ دو۔ [دہنی جانب سے جاتی ہے]

کا۔ (متحیر ہو کر) آہ کیا ہو گیا۔

(پگمیلین سے) کیا تو نے ان تمام باتوں کو پس پشت ڈالدیا۔ جو میں وقتِ رخصت تجھ سے کہہ گئی تھی۔

گلیشیا۔ خاتون اُس پر ناراض نہ ہو۔ اور اُس کو ملزم ٹھہرانے میں جلدی نہ کرو۔ اُس نے تیرے تمام احکامات کی حرف بحرف تعمیل کی ہے تو نے حکم دیا تھا کہ مجھ سے اسی طرح محبت کرے جس طرح تجھ سے کرتا ہے سچ کہتی ہوں کہ ہم دونوں اُسی طرح ایک دوسرے کی آغوش میں بیٹھے ہوئے عشق و محبت کی داستان دُہرایا کئے ہیں۔

[پگمیلین کے قریب آ کر]

گویا تو وہاں خود بیٹھی ہوئی دیکھ رہی تھی کہ تیرے احکامات کی پابندی کس طرح ہوتی ہے۔

سائنسکا۔ پگمیلین۔ کچھ سنا!

پگمیلین۔ (گلیشیا سے) دور ہو جا میرے سامنے سے۔ تجھے کیا معلوم کہ تیری بے لگام زبان کیا قیامت برپا کر رہی ہے۔

گلیشیا۔ اُس کو ملزم ٹھہرانے میں جلدی نہ کر۔ کیونکہ وہ صرف تیری ہی موجودگی میں مجھ سے بدزبانی کر رہا ہے۔ ورنہ تنہائی میں وہ مجھ سے بے حد الطاف و محبت سے پیش آتا ہے۔ دراصل اس کی دو آوازیں ہیں اور دو چہرے۔ ایک دنیا کے لئے اور دوسرا میرے اور خود کے لئے۔

[سائنسکا غیظ و غضب میں بھری ہوئی پگمیلین کے پاس جاتی ہے گلیشیا خوفزدہ ہو کر درمیان سے ہٹ آتی ہے]

سائنسکا۔ تیری بیوی۔ تیری آنکھیں جیت چکی۔ یہ تو جوے کی بازی تھی۔ تو اپنی چال چل چکا اور محبت کا میدان تیرے ہاتھ سے جاتا رہا۔

پگمیلین۔ سائنسکا ٹھہر۔

آہ وہ کیسی منحوس گھڑی تھی جبکہ میں نے دیوتاؤں کی ہمسری کا دعوے کیا تھا اور خود کے لئے قوتِ تخلیق کی دعا مانگی تھی۔

دیوتاؤں نے میری خودی غرور اور تکبر کا چیلنج قبول کر لیا۔ اب وہی میرے حکم ہیں اور میری قسمت کا فیصلہ انہیں کے ہاتھ ہے۔ میں اُنہیں کا گنہگار بھی ہوں ـ تیرا مجرم نہیں ہوں۔ اس لئے مجھ پر رحم کر۔

سائنسکا۔ محبت کے تاجر! نفع تو اٹھائے اور نقصان دوسرا برداشت کرے

رعنائی اور گدازی بھی قیامت کی ہے۔

(باآواز) ذرا ادھر تشریف لائیے خاتون!

گلیشیا - [اس کو بہت حیرت سے دیکھ رہی ہے] مجھے بتاؤ تم کیا ہو؟

گرائیس - میں کیا ہوں؟

گلیشیا - میں یہ دریافت کرتی ہوں کہ کیا تم مرد ہو؟

گرائیس - ہاں - کہتے تو یہی ہیں -

گلیشیا - تو غلط کہتے ہیں - تم ابھی تک مغالطہ میں مبتلا ہو -

گرائیس - واقعہ ہے -

گلیشیا - مرد ہمیشہ طویل القامت سیدھا اور مضبوط ہوتا ہے - اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے بہادری ٹپکتی ہے - اس کے چہرے پر حسن کا نور برستا ہے - اور آواز میں کشش اور نرمی ہوتی ہے -

میں نے ایک ایسا مرد دیکھا ہے -

گرائیس - واقعی!

گلیشیا - (اس کو بغور دیکھتے ہوئے) ہاں - مجھے یقین ہے کہ تم مرد نہیں ہو

گرائیس - کیا میں عورت نظر آتا ہوں؟

گلیشیا - عورت؟ نہیں -

ایک عورت نرم نازک گوری اور بے انتہا حسین ہوتی ہے -

میں عورت ہوں - تم میرے مثل نہیں -

گرائیس - دیوتاؤں کی مرضی نہیں کہ میں تمہارے مثل بنوں اور اپنے حسن کو گھنٹوں کے حساب سے فروخت کروں -

گلیشیا - میں اس کے باوجود بھی تمہیں پسند کرتی ہوں - کیونکہ تمہیں دیکھکر مجھے ہنسی آتی ہے -

گول گول جسم پر لال لال رنگت اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں -

بڑا سا دہانہ اور جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ - ٹھنگنا سا قد اور پھولی ہوئی توند ـــــ نے تمہیں بہت دلچسپ بنا دیا ہے -

گرائیس - (علیحدہ) بڑی شوخ اور طرار معلوم ہوتی ہے -

گلیشیا - ہاں میں سمجھ گئی -

پگمیلین بہت کہنہ مشق اور ہوشیار کاریگر ہے - لیکن وہ آدمی جس نے تمہیں تراشا ہے - شاید بالکل ہی مبتدی تھا -

گرائیس - (حیران ہوکر) اتنی کم عمری کے باوجود اسقدر دلیر ہو؟

گلیشیا - دلیر نہیں ہوں ـــ معصوم ہوں - میرے متعلق پگمیلین کا یہی خیال ہے -

گرائیس - درست ہے - لیکن میں کل کا بچہ نہیں ہوں -

[بائیں جانب بیٹھتا ہے

گلیشیا - لیکن میں تو ہوں -

[وہ اس سے اپنے قریب بیٹھنے کی فرمائش کرتا ہے - وہ اس کے داہنی جانب بیٹھتی ہے اور اس طرف بہت حیرت سے دیکھتی رہتی ہے جس کا سبب اس کی سمجھ میں نہیں آتا]

تمہارے بیٹھنے کا انداز کتنا بھونڈا ہے!

گرائیس - مجھے اس بات کا علم نہیں کہ میری صورت کی طرح میری نشست بھی نرالی ہے - میں تو یہی جانتا ہوں کہ سب کے بیٹھنے کا انداز ایک ہی ہے -

گلیشیا - میرا پگمیلین کبھی اس طرح نہیں بیٹھتا -

گرائیس - کیا وہ کسی خاص ادا سے بیٹھتا ہے -

گلیشیا - ہاں - اس کا ہاتھ ہمیشہ میری کمر کے گرد رہتا ہے -

گرائیس - بڑے ذات شریف معلوم ہوتے ہیں - آرٹ کے تمام طریقوں سے واقف ہیں -

گلیشیا - تم اس طرح نہیں بیٹھتے - شاید تمہیں ان باتوں کا علم نہیں -

گرائیس - کیوں نہیں - میں بھی ان اندازوں سے بخوبی واقف ہوں

گلیشیا - پھر کیا وجہ ہے کہ تم اس طرح نہیں بیٹھتے -

گرائیس - (علیحدہ) میں کس مصیبت میں پھنس گیا -

[اس کی کمر کے گرد اپنا ہاتھ لے آتا ہے]

بہرحال مردوں کا فرض ہے کہ عورتوں کی دلدہی کریں کیا واقعی معصوم ہو؟

گلیشیا - ہاں واقعی - میں تم کو بتا چکی ہوں کہ میں کل ہی پیدا ہوئی ہوں

گرائیس - تمہاری ماں کون ہے -

گلیشیا - ماں - اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

میں تو کسی کو نہیں جانتی - مجھے اتنا ہی علم ہے کہ میں پگمیلین کی

ہوں۔
کیا لوگوں کے مائیں بھی ہوتی ہیں؟
ائیس۔ ہاں۔ ابتک تو دنیا کا یہی اصول ہے۔
بیشیا۔ لیکن پگمیلین میں دوسرے لوگوں سے زیادہ قدرت ہے۔ اس لئے اُس نے اس اصول کو توڑ دیا ہے۔
رائیس۔ ہاں میں نے بھی یہی سنا ہے کہ اس کے ہاتھوں میں اعجاز ہے جسپر مجھے بھی یقین ہو چلا ہے [علیحدہ]
[ڈیفنی دہنی جانب سے داخل ہوتی ہے]
یفنی۔ ارے۔ یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟
[کرائیس ڈیفنی کو دیکھتے ہی گلیشیا سے دور سرک جاتا ہے]
رائیس۔ ——— بیگم!
یفنی۔ کیا میں اپنی آنکھوں پر اعتبار کروں؟
[گلیشیا کھڑی ہو جاتی ہے]
یہ کون عورت ہے؟
کسقدر مشابہت ہے۔ ہو بہو وہی ———
ائیس۔ کس سے مشابہت ہے؟
یفنی۔ اُسی مجسمہ سے جسے ہم خریدنا چاہتے تھے۔ وہی چہرہ ہے اور وہی لباس۔ بال برابر بھی فرق نہیں ہے۔ بس اس کو اٹھاؤ اور اُس کو بٹھاؤ۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پگمیلین نے کسی غیبی طاقت کے ماتحت اس مجسمہ میں جان ڈال دی ہے۔ دونوں کے خط و خال میں بلا کی مشابہت ہے۔
کرائیس۔ (علیحدہ) بیگم کے خیال کی نزاکت کی داد دیتا ہوں۔ بہتر ہو کہ میں بھی اس کی تائید کروں اور اُس کے خیال کو تقویت دوں۔ گو میرا یہ طرز عمل بے حد لچر اور مہمل ہوگا۔ لیکن اس صورت حال کا یہی بہترین علاج ہے۔
(بآواز) واہ بیگم تمہاری نازک خیالی کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ تمہارا خیال لفظاً بلفظاً صحیح معلوم ہوتا ہے۔ واقعی اس لڑکی میں اور اُس مجسمہ میں سرمو فرق نہیں ہے۔ دیوتاؤں کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ انہوں نے ایک کرشمہ دکھایا ہو۔ اور اس مردہ پتھر میں جان ڈال دی ہو۔

ڈیفنی۔ چلو ہٹو۔ کیا تم میرا مذاق اُڑا رہے ہو؟ یا مجھے بالکل ہی دیوانہ سمجھتے ہو؟
گلیشیا۔ یہ واقعہ بالکل صحیح ہے کہ میں سرد اور بے حس و حرکت پتھر کا مجسمہ تھی جذبات اور ہوش و حواس سے بالکل معرّا۔ یہانتک کہ پگمیلین نے اپنی ریاضت اور عبادت کی گرمی سے میرے جسم میں زندگی کی دہکتی ہوئی چنگاری پیدا کر دی اور مجھ کو وہی بنا دیا جو اسوقت میں نظر آ رہی ہوں۔
کرائیس۔ (گلیشیا سے علیحدہ) شاباش لڑکی۔ تو بڑی حاضر جواب اور وقت شناس ہے۔ لیکن اپنے بیان پر قائم رہنا۔ بدل نہ جانا
ڈیفنی۔ او باش لڑکی!
تو نہیں جانتی کہ میں اُس کی بیوی ہوں۔
گلیشیا۔ اُس کی بیوی (کرائیس سے) میرے پاس سے چلے جاؤ۔ میں تمہاری بیوی کے سامنے تم سے محبت نہیں کر سکتی۔
(وہاں سے جاتی ہے)
ڈیفنی۔ کیسی بے شرم اور گستاخ لڑکی ہے۔
کرائیس۔ یہ گستاخی معصومیت کی ہے۔ اُس کے اخلاق کو اپنے اخلاق کی کسوٹی پر مت جانچو۔ کیونکہ وہ کل پیدا ہوئی ہے اور تمہاری پیدائش کو ایک عرصہ گزر چکا ہے۔
[میموس دہنی جانب سے داخل ہوتا ہے]
میموس۔ حضور پگمیلین حاضر ہے۔
کرائیس۔ (علیحدہ) یہ تو بُرا ہوا۔ وہ بنا بنایا کھیل بگاڑ دے گا۔
ڈیفنی۔ (میموس سے) بتا یہ کون عورت ہے؟
کرائیس۔ میں بتا چکا ہوں کہ وہ ———
ڈیفنی۔ بس خاموش۔ مجھے تمہارا اعتبار نہیں۔ میں خود اُس کی زبان سے سننا چاہتی ہوں۔
گلیشیا۔ اس سے کیوں پوچھتی ہے جبکہ میں خود بتا چکی ہوں۔
ڈیفنی۔ اپنی زبان بند کر۔ [میموس سے]

[redacted]

دیکھ! میں تجھ سے زیادہ بدقسمت ہوں۔ لیکن اس کے باوجود تجھ سے زیادہ جری۔ میں مصیبتوں کے ہجوم میں یکہ و تنہا ہوں۔ لیکن تیرا شریک غم تیرے سنگین معشوق کی شکل میں موجود ہے۔

آہ۔ [انتہائی غیظ و غضب میں]

اے میری مقدس معلمہ آرٹمس کی روح!

بیشتر اس کے کہ میری فطری کمزوری میرے جذبۂ انتقام پر غالب آجائے اور اس بے وفا کا عشق میرے وقتی جوش و خروش کو سرد کر دے۔ میں تجھ سے فریاد کرتی ہوں۔ کہ اگر اس کی نیت میں فتور آیا ہو۔ یا اس کا قدم جادۂ عفت و عصمت سے ڈگمگایا ہو تو از روئے انصاف اس کو واجب سزا دے۔

[پگمیلین ایک چیخ مار کر اپنی آنکھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپا لیتا ہے]

گلیشیا۔ سائنسکا! اس پر رحم کر۔

[سائنسکا کے پاس آکر گھٹنے ٹیک کر کھڑی ہو جاتی ہے]

سائنسکا۔ اے عورت۔ میرا دل رحم سے خالی ہے۔ کیونکہ جس دمانے تیرے جسم کی سنگینی کو پگھلا کر نرم کیا ہے۔ اسی نے میرے جسم کی نرمی کو سخت کر کے پتھر میں تبدیل کر دیا ہے۔ ہم نے ایک دوسرے سے اپنی قسمتوں کو بدل لیا ہے۔ آج سے تو اس کی شریک حیات ہے اور میں ایک بے حس و حرکت سنگین مجسمہ۔

[گلیشیا کو دھکا دے کر علیحدہ کرتی ہے وہ بے ہوش ہو کر اس کے قدموں پر گر جاتی ہے۔ پردہ فوراً گر جاتا ہے]

ایکٹ تیسرا

سین حسب سابق

[ڈیفنی دہنی جانب سے داخل ہوتی ہے]

ڈیفنی۔ واقعی پگمیلین کے ہاتھوں میں پتھر کو زندہ کرنے کی خوفناک طاقت موجود ہے۔ لیکن یہ امر دریافت طلب ہے کہ اس طاقت کا کس حد تک استعمال کیا جا سکتا ہے۔

[مائرین بائیں جانب سے روتی ہوئی داخل ہوتی ہے]

مائرین! کہو خیر تو ہے؟

مائرین۔ آہ ہم کل تک کس قدر خوش تھے اور کتنے مطمئن۔ لیکن ان منحوس گھڑیوں میں ہمارے اوپر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا! پگمیلین موت کی طرح اندھا ہو گیا۔ سائنسکا آج ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہی ہے۔ لیوسی پس مجھ سے قطع تعلق کر چکا ہے۔ یقیناً میں رنج والم بار سے دیوانی ہو جاؤنگی۔

ڈیفنی۔ اور یہ سب گلیشیا کی کرتوت ہیں۔

مائرین۔ (روتے ہوئے) ہاں سب!

ڈیفنی۔ کیا اس کو ان حرکتوں سے باز رکھنا ناممکن ہے؟ کسی مردار کو قید کر دو۔ کسی کے ہاتھ فروخت کر ڈالو۔ یا اس کیا اب وہ پتھر کی طرح ٹوٹ بھی نہیں سکتی۔

مائرین۔ نہیں اس کے ٹکڑے تو نہیں ہو سکتے البتہ قیمہ کیا جا سکتا

ڈیفنی۔ آہ میں اگر پگمیلین کی بیوی ہوتی تو اس زہریلی ناگ کچل دیتی۔ یا اس کی خوبصورتی میں ایسا داغ لگاتی کہ کیجا ہونا ناممکن ہو جاتا۔

مائرین۔ اب اس کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ کیونکہ میرا بھ بصارت سے ہاتھ دھو چکا ہے۔

ڈیفنی۔ تب بھی کوئی خاص فرق نہیں ہوا۔ کیونکہ انسان پا مالک ہے اگر ان میں سے ایک ضائع ہو جاتا ہے تو وہ اس کے استعمال میں آتی تھی۔ بقیہ چار حواسوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ یوں سمجھو کہ اس کے ترکش میں پانچ جن میں سے ایک کام میں آگیا اور چار ابھی باقی ہیں میری بہن! اس دشمن کو نہتا کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ ج ہتھیاروں میں سے صرف ایک ہی ضبط کر لیا گیا ہو۔

مائرین۔ بہرحال اس کی بیوی کا دل ٹھنڈا ہو گیا۔

ڈیفنی۔ ہاں اس کی خوش قسمتی میں کوئی شک نہیں۔

مائرین۔ خوش قسمتی؟

ڈیفنی۔ ہاں خوش قسمتی! کیونکہ پگمیلین نے جسقدر اس کا دل دکھا

اس کا بدلہ اُسے مل گیا۔ ایک عورت کے دل میں اس کے علاوہ اور کونسی آرزو پیدا ہوگی؟

[سائنسکا بائیں جانب سے داخل ہوتی ہے]

سائنسکا ۔ خوب! اس کے علاوہ اور کونسی آرزو پیدا ہوگی؟ سُن! اس طاقت کی آرزو کہ جس کے زور سے میں اپنی زبان پر قابو حاصل کروں اور اُن الفاظ کا اعادہ کرسکوں جن کے اثر سے اس کی بصارت واپس آ جائے اس طاقت کی آرزو جو میرے سرکش اور خوفناک نفس کو قابو میں لے آئے اور قلب میں انتقام اُمنڈتے ہوئے جذبات کو فنا کر دے۔ اور محبت کی دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دے کر بھڑکا دے۔ اُس طاقت کی آرزو جو میرے منہ سے یہ کہلوا دے کہ اے میرے آرام جان اور راحت روح! میری محبت صرف تیرے ہی لئے ہے۔ خواہ اس کو قبول کر یا رد کر دے۔ تو مختار ہے۔ لیکن یہ جذبہ فنا نہیں ہوسکتا۔ آہ میں اپنی بدنصیب زندگی کی نصف ساعتیں دینے کے لئے تیار ہوں۔ اگر میری زبان ان سچے جذبات کی ترجمانی کرنے کیلئے تیار ہوجائے۔

ماٹرین ۔ دیوتاؤں کا شکر کہ ابھی کچھ امید باقی ہے۔

سائنسکا ۔ نہیں۔ در اصل تمام اُمیدیں منقطع ہوچکی ہیں۔ آج ہی میں اس مکان سے رخصت ہو جاؤنگی۔ اور ایسی جگہ جا کر پناہ لونگی جہاں اطمینان سے بیٹھ کر اپنی مایوسیوں کا ماتم کرسکوں میں رقابت کی سلگتی ہوئی آگ کو ہوا دونگی۔ یہانتک کہ وہ ایک بھڑکتا ہوا شعلہ بن جائے گی۔ جس میں میں اپنے بیکار وجود کو فنا کر دونگی۔

ڈیفنی ۔ آفرین ہے تیری ہمت پر! سائنسکا! لیکن تو فکر نہ کر۔ تیری رقابت کی آگ سرد ہونے کا نام نہ لے گی کیونکہ ٹمپلین اُس کو بھڑکانے کے لئے پنکھے کا کام دے گا۔

سائنسکا ۔ (مغلوب الغضب ہو کر) مجھے کسی پنکھے کی احتیاج نہیں۔ کیونکہ میرا دل سلگتی ہوئی بھٹی بھی ہے اور تیز رفتار دھونکنی بھی آہ میں [illegible]

دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے کے آغوش میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے اس کے فن کی شیطانی طاقت کا پورا علم ہے۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ اس کے نفس کی ناپاک خواہشیں کس طرح مجسم اور متشکل ہو جاتی ہیں۔ میں اس کے جذبات کے اُبلتے ہوئے سوتوں کو دیکھ رہی ہوں کہ بھنور کی شکل میں گھوم گھوم کر ایک خطرناک سمندر بن رہے ہیں۔ جس میں وہ آفت نصیب لڑکی ڈوبتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ ٹھیک اسی جگہ جہاں میں ڈوبی تھی میں اس کے چہرے پر لحظہ بہ لحظہ تبدیل ہونے والی رنگتوں کے قیامت انگیز تاثرات کا بغور معائنہ کر رہی ہوں کیونکہ میں ایکبار ان کے سامنے اظہار شکست کر چکی ہوں۔ میں اپنے کانوں سے سُن رہی ہوں۔ کہ وہ ہماری پارینہ محبت کے استعمال شدہ جملوں سے اب اُس کے سامعہ کی ضیافت کر رہا ہے۔ الفاظ کا وہ سنہری جال کہ جس میں مجھ کو جکڑا گیا تھا۔ اب میں دیکھ رہی ہوں کہ نئے شکار پر پھینکا گیا ہے۔

میں اُس کے مزاج کی انقلابی فطرت سے بخوبی واقف ہوں۔ کبھی آگ کا بھڑکتا ہوا شعلہ۔ کبھی پانی کا اُچھلتا ہوا فوارہ کبھی آنسوؤں کی جھڑیوں میں ساون بھادوں کا آسمان اور کبھی شاعرانہ لطافتوں اور نزاکتوں کا سرچشمہ۔ جس پر طرہ یہ کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی سحر آفریں زبان انہیں نغموں کی تخلیق بھی کرتی جاتی ہے کہ جو اُس لڑکی کے دل میں پیدا ہونے والے جذبات سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ آہ کیا اس کے باوجود بھی میری آتش انتقام سرد پڑ جائے گی؟ جب رقابت میرے دل میں پناہ گزیں ہو جاتی ہے۔ تو میں حق میزبانی ادا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی۔

ڈیفنی ۔ میرا مکان تیرے لئے حاضر ہے جہاں اطمینان سے بیٹھ کر [illegible] جذبۂ رقابت کو ہوا دے۔

ہم دونوں ساتھ مل کر رنڈاپے کی زندگی بسر کریں گے اور [illegible] عمر کے بقیہ سال مردوں کی جفاشعاری پر لعنت کرنے میں۔

سائنسکا ۔ لیکن کہاں [illegible]؟



خواجہ سرا — ایک فرانسیسی مصور کا شاہکار

A FEW MOST POPULAR SPECIMENS

— OF —

THE KARNAL SHOP FOOT WE

ROYAL INDIAN BRAND.

GENT'S SHOES.



[illegible] Leather, Single Sole. Very durable.
Black or Brown
Price 3 - 12 - 0

BIMA BRAND SHOES.



Our Own Make [illegible] rome Leather Single Sole.
Quality No. 400
Rs. [illegible]
Same Quality [illegible] Sole very strong
Quality No. [illegible] Rs. 5

KARNAL SPECIAL SHOES.



Quality
No. 555

Our Wellknown Brand of Shoes. A Shoe we always recommend to our patrons.

SUMMER SHO

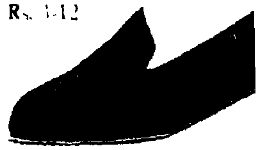


White Canvas Sh
Leather Lining Single Sole

BIMA BRAND

FULL SLIPPER

Rs. 3-12



Chrome Leather Black o

PUMP SHOE.

Rs. 4



Chrome Leather Black o

SLAIM SHOE



Chrome Leather Black or

TERMS CASH OR V. P. P.

POS

KARNAL SHOP

ڈیفنی - کرائیس؟ اُس کی مجال نہیں کہ وہاں قدم کبھی رکھ سکے۔

سائنکا - کیسے؟

ڈیفنی - کیسے؟ میں نے اُس کو گھر سے نکال دیا ہے۔ واہ کیا تو خیال کرتی ہے کہ جذبۂ رقابت کی تو ہی واحد اجارہ دار ہے؟ تو نے پگمیلین سے اس کی بے وفائی کا بدلہ لے لیا۔ اور اب وہ تیرے حسین چہرے کی زیارت سے قطعی محروم ہے۔ بالکل اسی طرح کرائیس میرے چہرے کی زیارت سے محروم ہے۔ میں اُس کو نابینا تو نہیں بنا سکتی۔ کاش مجھ میں ایسی قدرت ہوتی۔ البتہ یہ کر سکتی ہوں کہ خود اپنے گرد دیوار کا ایک حلقہ بنا لوں۔

سائنکا - خاتون - میں آپ کی ہمدردی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں اور آپ کے ہمراہ چلنے کے لئے تیار ہوں۔

[دہنی طرف کے دروازے کی طرف بڑھتی ہے لیکن ماٹرین حائل ہو جاتی ہے]

ماٹرین - نہیں نہیں۔ تو پگمیلین کو تنہا چھوڑ کر نہ جا - وہ تیری جدائی کے بعد زندہ نہ رہ سکے گا۔ اُس کی مصیبتوں میں اضافہ نہ کر۔ کیونکہ یہ نیا غم اس کام کو خاتمہ تک پہونچا دے گا۔ جس کی ابتدا تو کر ہی چکی ہے۔

سائنکا - نہیں۔ مجھے جانے دے۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھونگی کیونکہ اس پر نظر پڑتے ہی میری فطری کمزوری مجھ پر غالب آجائے گی۔ اس لئے مجھ کو میرے حال ہی پر چھوڑ دے - اچھا ماٹرین رخصت!

دیوتا تجھ کو اچھے دن دیکھنا نصیب کریں -

[دہنی طرف سے جاتی ہے۔ ماٹرین اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتی ہے]

ڈیفنی - واہ اگر اسی طرح پتھر کے بت حسب ارادہ زندہ ہونے لگے تو ایتھنس میں روز فساد برپا ہوں گے اور روز نئے تماشے -

[کرائیس آنکھ بچا کر دہنی جانب سے داخل ہو جاتا ہے]

خصوصیت سے میرے لئے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ کیونکہ میری کئی لڑکیاں ہیں۔ جن کی شادیوں کے دن قریب آرہے ہیں۔ ایسی نوجوان شریف زادیوں کی کیا قدر و قیمت رہے گی۔ جبکہ ہر آدمی پتھر کا ایک حقیر ٹکڑا لے کر اپنی مرضی کے مطابق حسین و جمیل عورتیں تراش لیا کرے گا۔ بڑا ہی سہل نسخہ ہے۔

کرائیس - میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر دنیا کی ہر عورت ڈیفنی جیسی ہو جائے تو کوئی آدمی سنگین خاتونوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔

(آہ بھر کر) آہ ڈیفنی - میری جان!

ڈیفنی - ظالم درندے - یہاں سے دور ہو جا۔ خبردار جو مجھ سے بات کی ورنہ شامت آجائے گی - چل دور ہو۔

(علیحدہ) کاش میرے منہ میں سائنکا کی زبان ہوتی تو میں اسکو خوب جلاتی۔

[سائنکا کی نقل اُتارتی ہے۔ جسپر کرائیس کو بے حد حیرت اور تشویش پیدا ہوتی ہے]

آہ میں اپنی نظروں کے سامنے اس منظر کی تخلیق کر سکتی ہوں۔ جبکہ تم دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے سے ہم آغوش تھے - یہ یاد رکھو کہ میرے دل میں لگی ہوئی آگ بجھنے والی نہیں۔ جب رقابت میرے دل میں آکر مہمان ہوتی ہے تو میں حق میزبانی ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتی۔

کرائیس - مجھے اس بات کا یقین ہے۔

آپ کی مہماں نوازی کا ڈنکا تمام عالم میں بج رہا ہے - مجھے بھی مہمان ہی سمجھ لو۔ میری جان - اور مکان میں داخل ہونے کی اجازت دیدو۔

ڈیفنی - نہیں۔ مکان کا نام بھی زبان پر مت لاؤ۔ کیونکہ وہ تمام دیویوں کے بتوں سے سجا ہوا ہے - جنکی تعداد پچاس سے زیادہ ہی ہوگی۔ اس کے علاوہ نیم برہنہ پریوں اور جل پریوں کا کوئی شمار ہی نہیں ہے فرض کر لو کہ آج میں تم کو مکان لے جاؤں اور اگر آج ہی ان تمام بتوں کے دلوں میں متفقہ طور سے زندہ ہونے کی آرزو پیدا ہو جائے تو کیسی قیامت برپا ہو جائے گی۔ تمہاری رنگین مزاجی کے ہاتھوں ان سب کا اور ان کے ساتھ میرا بھی کیا حشر ہوگا۔ یہ سنگین بت اس صورت میں بھی کچھ کم خطرناک نہیں ہیں۔ لیکن زندہ ہو جانیکے بعد ایک قیامت مجسم اور فتنۂ مستقل بن جائیں گے۔ لہٰذا اس

بلاءِ ناگہانی سے محفوظ رہنے کے لئے میں نے مستقل ارادہ کر لیا ہے
کہ ان تمام شوخ چشم پتھروں میں سے ہر ایک کو فروخت کر ڈالوں
اور اُس وقت تک کہ میں یہ انتظام نہ کر لوں تم مکان میں داخل
نہیں ہو سکتے۔ بس میں کہہ چکی۔

کرائیس۔ آخر میں نے کونسا قصور کیا ہے؟

ڈیفنی۔ یوں کہئے جناب کہ آپ نے کونسا قصور نہیں کیا ہے؟

کرائیس۔ اس کے شمار کرنے میں بہت وقت صرف ہوگا۔

ڈیفنی۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے تمہیں اس سنگین بلا کے ساتھ اس
طرح بیٹھے دیکھا ہے۔ کہ تمہارا ہاتھ اس کی کمر کے گرد حلقہ کئے
ہوئے تھا۔ اس کی وجہ بتائیے جناب!

کرائیس۔ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ میں فنونِ لطیفہ کا مربی ہوں
اور خصوصیت سے سنگین مجسموں کا دلدادہ۔

ڈیفنی۔ واہ۔ میں بھی فنونِ لطیفہ کی اُتنی ہی شائق ہوں اور سنگین مجسموں کی
اُسی قدر دلدادہ جتنے کہ تم۔ لیکن اس کے باوجود تم نے مجھے کبھی نہ دیکھا
ہوگا کہ میں ایک حسین اپولو کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بیٹھی ہوں۔
نہ ہوا یہ بُت اسوقت میرے سامنے۔ ورنہ تمہارا شوق اُس کے
جسم کے ٹکڑوں سے پورا کرتی۔

کرائیس۔ اُس غریب کو الزام نہ دو۔ وہ ابھی بہت کمسن ہے۔
اور بے حد معصوم۔ وہ بیچاری تم سے رحم کی درخواست کرتی ہے

ڈیفنی۔ سچ کہتے ہو۔

کرائیس۔ ہاں بالکل سچ۔
میں اگر اپنی ڈیفنی کو اس حالت میں دیکھوں کہ وہ اپولو کی کمر
میں ہاتھ ڈالے بیٹھی ہوئی ہے۔ تو بقسم کہتا ہوں کہ کوئی باز
پرس نہ کروں۔ [اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے]

ڈیفنی۔ (نرم ہو کر) سچ کہتے ہو؟

کرائیس۔ سچ بالکل سچ۔

ڈیفنی۔ اچھا جاؤ۔ میں تم معاف کرتا ہوں۔ [اُس سے لپٹ جاتی ہے]
انصاف تو یہ ہے کہ واقعات بہت ہی نازک صورت اختیار
کر چکے تھے۔

کرائیس۔ (علیحدہ) میری بدقسمتی نے گلیشیا کی شکل اختیار کی تھی

ڈیفنی۔ اچھا چلو۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ میں اپنے تمام بت آج ہی فرو[خت]
کر ڈالونگی۔ کیونکہ پتھر زندہ ہو جانے کے بعد بہت آفت برپا [کرتے]
ہیں۔

کرائیس۔ بُرا نہ مانو تو میں کچھ عرض کروں۔ دنیا کے تمام ذی روح
اجسام مٹی اور پتھر ہی سے تخلیق کئے گئے ہیں۔

ڈیفنی۔ لیکن وہ اتنے خطرناک نہیں ہوتے کیونکہ ان کی تخلیق دیوتاؤں [کے]
مبارک ہاتھوں سے ہوئی ہے۔ انسانوں اور شیطانوں کے
اعمال اس کے برعکس نتائج پیدا کرتے ہیں۔

کرائیس۔ چلو اس تمام جھگڑے کو ہم پگمیلین کے سر دے ماریں۔

ڈیفنی۔ [کرائیس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر] چلو۔

[مائرین عالمِ اضطراب میں دہنی جانب سے داخل ہوتی ہے]

مائرین۔ پگمیلین کو سائنسکا کے ارادہ کا علم ہو گیا ہے۔ یہ خبر اس [کے]
ہوش و حواس پر بجلی کی طرح گری ہے۔ وہ دیوتاؤں [کی]
ہیبت و جلال کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ اگر سائنسکا اس وقت
چلی گئی تو وہ اپنی جان دیدے گا۔ آہ میں کیا کروں ——

[گلیشیا بائیں جانب سے داخل ہوتی ہے]

گلیشیا۔ مائرین! پگمیلین کہاں ہے؟

مائرین۔ منحوس لڑکی!
تیری بے لگام زبان نے جو کچھ قیامت برپا کی ہے۔ کیا اب
ابتک تیرا دل ٹھنڈا نہیں ہوا۔ جو ابھو اس تم خود دیکھنے
آئی ہے۔ خیر اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔

گلیشیا۔ میں تیرا مطلب نہیں سمجھی۔

مائرین۔ تو اب سمجھ لے کہ سائنسکا کی جدائی میں پگمیلین کا زندہ [رہنا]
محال ہے۔ کمبخت اُس کا خون تیری ہی گردن پر ہوگا۔

گلیشیا۔ آہ یہ میں کیا سُن رہی ہوں۔ پگمیلین مر جائے اور میں کہ[وں]
اس کی موت کا باعث بنوں۔ ہائے کیا کروں۔

مائرین۔ میں کیا جانوں ——
ہاں ایک ترکیب ہے۔ بس آخری۔ میں اس سے جا کہتی

کہ تیری بیوی تجھ سے جدا ہونا نہیں چاہتی۔ اور وہ تیری ملاقات کی منتظر ہے۔ جسپر وہ تجھ کو آواز دے گا۔ بس تو اس سے اسی طرح بات کرنا جیسے تو اس کی بیوی سائنسکا ہی ہے۔

گلیشیا۔ ہاں ہاں میں سمجھ گئی۔

مائرین۔ اچھا میں جاتی ہوں۔ دیوتا تیری مشکل آسان کریں۔

[مائرین دہنی جانب سے چلی جاتی ہے]

گلیشیا۔ میرے دیوتا مشکل ضرور آسان کریں گے۔ کیونکہ وہ بڑے مہربان ہیں۔ اے آسمانی دیوتا۔ اس نازک موقع پر مجھ کو تیرا ہی آسرا ہے اور میں تجھ ہی سے مدد کی طلبگار ہوں۔ کہ میری آواز گفتار اور رفتار وہی صورت اختیار کرلے کہ جس سے مجھ میں اور سائنسکا میں فرق مٹ جائے۔ مجھ کو وہی لہجہ بخش دے کہ جو میرے پیدا ہونے سے قبل سائنسکا کا تھا مجھ کو ہمت وجسارت عطا کر کہ میں پگمیلین سے اسی بے تکلفی سے گفتگو کروں کہ جس طرح اس کی بیوی سائنسکا کرتی۔ تاکہ وہ زندہ رہ سکے۔ خوش قسمت سائنسکا کے لئے مجھ کمبخت کے لئے نہیں۔ ہاں وہ زندہ و سلامت رہے۔ کیونکہ میں ہی ان تمام مصیبتوں کا سرچشمہ ہوں۔

[گلیشیا کی لاعلمی میں پگمیلین، مائرین کا ہاتھ پکڑے اندر داخل ہوتا ہے]

کہ جو اس کو ہر چہار طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ میں اس کا عوض اسی صورت میں ادا کرسکتی ہوں کہ اس مصیبت کے پہاڑ کو خود اپنے شانوں پر اٹھالوں۔ آہ قبول کرلے میرے پاک دیوتا اپنی ذلیل بندی کی پہلی اور آخری دعا کہ میں پگمیلین کے دل کی طلبگار رہوں۔ تو جانتا ہے کہ میں اس کی زندگی کی طالب ہوں۔

[مائرین اس کو لے جاکر بائیں طرف بٹھاتی ہے اور پھر وہنی طرف سے باہر نکل جاتی ہے۔ پگمیلین فرط مسرت سے چیخ اٹھتا ہے۔ گلیشیا اس کی طرف لپکتی ہے اور خود کو اس کے پیروں پر گرادیتی ہے]

پگمیلین!

پگمیلین۔ میں نے تیری تمام دعا سنی۔ میرے پاس الفاظ ہی نہیں کہ اپنی مسرت کا اظہار کرسکوں۔ ہاں میری جان۔ تو نے مجھے بھینچ کر اپنے سینہ سے لپٹالے تاکہ میرا احساس قوی تر ہوجائے۔ کہ میں نے تیرے ملکوتی حسن اور دیوتاؤں کی فرستادہ محبت کو ٹھکرا کر کتنی بڑی ناشکرگذاری کا ثبوت دیا ہے۔

گلیشیا۔ [اس مغالطہ میں مبتلا ہوکر کہ پگمیلین کا مطلب اسی کی ذات سے ہے] پگمیلین! میری جان! میری روح! ذرا پھر وہی الفاظ کہدے۔ ہاں ذرا ان کو دہرادے۔ میرے دل کو اطمینان بخشنے کے لئے پھر کہدے کہ تو نے مجھے ان تمام قصوروں سے معاف کیا کہ جو مجھ سے لاعلمی میں سرزد ہوگئے تھے

پگمیلین۔ میں تجھے معاف کروں۔ واہ میری معصوم سائنسکا!

[گلیشیا کے حواسوں پر بجلی گرتی ہے]

میں خود تیرا مجرم ہوں۔ لیکن میں تجھ سے صرف اس لئے معافی نہ مانگ سکا کہ مجھ میں تیرے سامنے لب کشائی کی ہمت نہ ہوئی اس کے علاوہ تیری معلمہ آرٹمس کی شرط کی رو سے تو حق بجانب تھی۔ کہ میری لغزشوں پر مقررہ سزا دے۔ اور اب میں دیوتاؤں کی فرستادہ مصیبتوں کو صبر و سکون سے برداشت کرنا بھی سیکھ گیا ہوں

گلیشیا۔ [کوشش کرنے کے بعد] لیکن یہ عورت۔ گلیشیا۔

پگمیلین۔ کیا؟

گلیشیا۔ کیا اس کی محبت تیرے دل میں مردہ ہوگئی۔

پگمیلین۔ کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔

گلیشیا۔ کیا تو نے کبھی اس سے محبت کی ہی نہیں۔

پگمیلین۔ کبھی نہیں۔ ہاں البتہ۔ اس مافوق الفطرت واقعہ پر کہ جس نے میرے کمالِ فن پر مہر صداقت ثبت کردی تھی اور اور میرے شاہکار کرجات کی دلاویزیاں [illegible] میرے ہوش حواس پر حیرت واستعجاب [illegible] میں اس کے ملکوتی حسن [illegible] [illegible] میں صرف کی

جبکہ وہ صرف ایک سنگین مجسمہ تھی۔ اس لئے کہ اس کے چہرے کے خدو خال میں مجھے سائنسکا کا جلوہ نظر آتا تھا۔ لیکن جب وقت کہ وہ زندہ ہو کر میری محبت کی طلبگار ہوئی۔ میرا جذبۂ عشق تمام وکمال مردہ ہو گیا۔

گلیشیا۔ [بے حد ضبط کے بعد] مرحبا۔ گویا اب تم اُس سے محبت نہیں کرتے اور اب تمہاری نظروں میں وہ بے جان پتھر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی؟

[جواب کے انتظار میں امید و بیم کی حالت]

پگمیلین۔ میرے سامنے اُس منحوس کا تذکرہ نہ کر۔ سائنسکا کیونکہ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ میری نظروں میں سڑک پر پڑے ہوئے بے ہنگم اور ناتراشیدہ پتھروں کی زیادہ وقعت ہے اور اس حسین و جمیل مجسمہ کی کہ جس میں نسوانی تناسب اور کشش کی انتہا ہو گئی ہے کوئی وقعت نہیں۔

گلیشیا۔ (انتہائی ضبط کے ساتھ) مجھے یہ سُن کر بے حد خوشی ہوئی۔ تیرا قصور معاف کیا گیا۔

[اس کے ماتھے کا بوسہ لیتی ہے اور اُٹھ کر روتی ہوئی دہنی جانب آتی ہے]

پگمیلین۔ (بیٹھے ہی ہوئے) تو نے مجھے معاف کر دیا۔ اور باوجود اس کے کہ آرٹس کے قانون کی رو سے میری آنکھوں کا وہ نور جو تیری نا راضگی کے باعث غائب ہو گیا تھا۔ فی الفور واپس آجانا چاہئے۔ لیکن میں دست بد عا ہوں کہ میری آنکھیں بند ہی رہیں۔ تاکہ وہ اس سبز قدم مجسمہ پر نہ ٹھہر جائیں کہ جو میری بربادی کا باعث بنا۔

گلیشیا۔ ہاں پگمیلین ٹھیک کہتے ہو ——
یوں بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم گلیشیا کو ابھی دیکھ لو تو ممکن ہے کہ تمہارے دل میں محبت کی دبی ہوئی چنگاری پھر بھڑک اُٹھے۔

پگمیلین۔ کبھی ہرگز نہیں۔

گلیشیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُس پر رنج و الم کا اسقدر بار ہے کہ الفاظ اُس کی کیفیت بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

پگمیلین۔ اگر یہ اصلیت ہے تو میں بے حد خوش ہوں۔

گلیشیا۔ (آگے بڑھ کر التجا کے لہجہ میں) کیا تیرے دل میں اُس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔

[سائنسکا دہنی جانب سے اس طرح داخل ہوتی ہے کہ ان دونوں کو اس کی موجودگی کا علم نہیں ہوتا۔ وہ دروازے میں کھڑے ہو کر ان دونوں کی گفتگو کو کان لگا کر سنتی ہے]

پگمیلین۔ بالکل نہیں۔
وہ مصیبتیں کہ جو اُس نے تجھ پر۔ مجھ پر اور مائرین پر نازل کی ہیں بس اُن کا خیال کر کے ہم حق بجانب ہیں۔ کہ اُس منحوس گھڑی کو کوسیں جبکہ وہ پتھر سے انسان بنی تھی۔ کاشکہ اُس کا نشان اِس صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔ کیونکہ وہ اس دنیا میں رہنے کے قابل نہیں۔

گلیشیا۔ (انتہائی مایوسی میں) ہاں تم ٹھیک کہتے ہو — وہ اس مبارک دنیا میں رہنے کے قابل نہیں۔ بہتر ہے اب تم اس کی صورت نہ دیکھو گے۔

[سائنسکا کا ہاتھ پکڑ کر اُس کو پگمیلین کے پاس لے جاتی ہے]

مبارک ہو تیری بیوی۔ تیرے سامنے کھڑی ہے۔

[سائنسکا پگمیلین کے دہنی جانب گھٹنے ٹیک کر کھڑی ہو جاتی ہے گلیشیا اُلٹے قدموں دہنی طرف واپس جاتی ہے۔ سائنسکا اُسی عالم میں گلیشیا کی طرف مڑتی ہے اور اُس سے بات کرنے کو منہ کھولتی ہے مگر گلیشیا اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہے۔ اور خود زار و قطار روتی ہوئی باہر چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد سائنسکا پگمیلین سے لپٹ جاتی ہے۔ جس پر اس کی آنکھوں کا نور فوراً واپس آجاتا ہے]

پگمیلین۔ (کھڑے ہوتے ہوئے) سائنسکا دیکھ! صبح کا نور اب کس کی ملکیت ہے۔ تیرے حسین چہرے کی دوبارہ زیارت کر رہا ہوں

[مائرین اور لیوسی پس دہنی جانب سے داخل ہوتے ہیں]

لیوسی پس۔ پگمیلین! مبارک ہو تیری آنکھوں کا نور۔ تیرے خفتہ نصیب۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیدار ہو گئے۔

پگمیلین۔ اور تیرے نصیب! کیا مائرین نے تجھے خود طلب کیا۔

لیوسی پس۔ نہیں میں خود ہی واپس آگیا۔ پشیمان ہیں بلکہ مغموم اور نجیدہ

کیونکہ میرا دل پتھر ہے اور ہاتھ خونی۔
میرا خیال تھا کہ وہ مجھے مجرم بنا کر عدالت تک لے جائیگی۔ لیکن
وقت نے خود اس کے مزاج میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا
وہی لڑکی کہ جو چند گھنٹے قبل مجھ کو سنگدل خونی سمجھ کر بد دعائیں
دے رہی تھی۔ اب اس نے نہ صرف میرا سنگین جرم معاف کر دیا۔
بلکہ فرط جوش و مسرت سے مجھے بھینچ بھینچ کر پیار کیا۔ اور میرے
شکار کو آگ میں جھلستے دیکھ کر للچائی ہوئی نظروں سے دریافت
بھی کیا کہ وہ کب تک پک جائے گا۔ ننھی سی آدم خور!——

[گلیشیا بائیں جانب سے داخل ہوتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اسٹیج کے
وسط میں آتی ہے اور پگمیلین کی پشت پر جا کر اس کے دامن کو
بے اختیار ہو کر چومتی ہے]

[...]رین۔ [تھوڑے توقف کے بعد] پگمیلین!
دیکھ گلیشیا تیرے قریب ہے۔

[...]ملین۔ [سائنکا کی طرف سے نظریں ہٹا کر اپنے چہرے کو موڑتا ہے۔
اور گلیشیا کی طرف دیکھ کر کہتا ہے]
تجھے عورت کہوں یا پتھر۔ بس دور ہو جا میرے سامنے سے۔

[وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیتی ہے]

میرے خرمن محبت کے لئے تو ایک بجلی بن کر گری۔ جس نے نہ صرف
مجھ ہی کو برباد کیا۔ بلکہ ہر اس شخص کو مبتلائے درد کیا کہ جو تیرے
دائرۂ اثر میں آگیا۔

[...]ئنکا۔ نہیں نہیں پگمیلین۔ ان الفاظ کو واپس لو۔ تمہیں تمام حقیقت کی
اطلاع نہیں۔

[...]یشیا۔ (واپس جاتے ہوئے) نہیں اب مجھے جانے ہی دو۔ اس کی
زبان سے نکلی ہوئی بد دعا میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اب
اس کے بعد زندگی میرے لئے موت سے زیادہ سخت ہو گئی ہے

[وہ ستون کے زینہ پر قدم رکھتی ہے]

آہ رخصت پگمیلین! رخصت۔
کیونکہ میں اس دنیا میں زندہ رہنے کے قابل نہیں۔
ہاں تمہاری اس مبارک دنیا میں میرا منحوس وجود بیکار ہے
مبارک ہوں تم کو تمہاری مسرتیں۔
رخصت۔ پگمیلین۔ رخصت! رخصت!

[پردے اس کو چھپا لیتے ہیں]

سائنکا۔ تو نے اس پر اتنا ہی ظلم کیا ہے جتنا کہ میں نے تجھ پر کیا تھا۔ وہ
آواز کہ جس نے تجھے معاف کیا تھا۔ در اصل میری نہ تھی۔
بلکہ اسی کی تھی۔
کیونکہ میں اس وقت تک جذبۂ رحم سے قطعی ناآشنا تھی۔ یہانتک
کہ اس نے مجھے ایک زریں سبق دیا۔
اس کے حلق سے نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں سے ٹکرائے اور
دل کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ جہاں انہوں نے غیر ارادی طور پر
ایک لرزاں گونج پیدا کر دی۔ میری زبان پر بے ساختہ طور سے
وہی الفاظ جاری ہو گئے۔ جنہوں نے تجھ کو دوبارہ بصارت بخشی
اس لئے تیرے شکریہ کی وہ مستحق ہے نہ کہ میں۔

پگمیلین۔ (متحیر ہو کر) سائنکا! کیا تو سچ کہہ رہی ہے۔

سائنکا۔ حرف بحرف۔

گلیشیا۔ (پردوں کے پیچھے سے) رخصت پگمیلین رخصت! رخصت!!
رخصت!!!

[پگمیلین ستون کی طرف بے اختیار ہو کر لپکتا ہے اور پردوں کو
چیر کر اندر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں دیکھتا ہے کہ گلیشیا بدستور سابق پتھر کا
ساکت و صامت مجسمہ بنی کھڑی ہوئی ہے۔ لیوسی پس اور مائرین
کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مائرین اپنا منہ لیوسی پس کے سینہ سے
لگا کر چھپا لیتی ہے۔ سائنکا دور غم سے اپنی جگہ سے گر جاتی ہے پگمیلین
پچھاڑ کھا کر مجسمہ کے دہنی جانب گر جاتا ہے پردے آہستہ آہستہ گرنے لگتے ہیں]

(ڈراپ)

(ابو طاہر۔ بی۔ ایس۔ سی۔ بی ٹی۔ [illegible])

غزل

(سحبان الہند حضرت علامہ کیفی چریاکوٹی)

نظر حسرت کی ہے اور وسعتِ شامِ بیاباں ہے — بتا اے نیرِ محشر تو کس پردے میں پنہاں ہے
جنونِ خانہ برانداز میرا کیسے بہلے گا — نہ وہ دامن کے ٹکڑے ہیں نہ وہ تارِ گریباں ہے
مری پابندیاں جذبِ محبت کی ہیں آزادی — قفس میں میں ہوں اور آغوشِ دیدہ میں گلستاں ہے
کنارہ بحرِ غم کا ہے جسے سب زیست کہتے ہیں — مرا دل نام ہے جس کا وہ امیدوں کا طوفاں ہے
نظر آیا وہ گیسو خواب میں ہے میرے شانوں پر — کھلی جب آنکھ دیکھا ہاتھ میں اپنا گریباں ہے
یہی ہے اتحادِ باہمی ذریا کا سرمایہ — کبھی طوفاں میں موجیں ہیں کبھی موجوں میں طوفاں ہے
دم آیا ہے لبوں پر دیکھ لے اے جان کے دشمن — کہ میری زندگی بھی مجھ سے فرقت میں گریزاں ہے
فریبِ دید ہے بالکل لباسِ ظاہری اُس کا — حقیقت میں وگرنہ وہ تو پردے میں بھی عریاں ہے
نمودِ عشق کی صورت ہے پردے میں نہیں رہتی — مرا ہر داغِ دل میں کم سے کم خورشیدِ تاباں ہے
تجھے پردے میں بھی حسنِ نظر نے صاف پہچانا — تبسم تیرا غنچہ اور گلشن روئے خنداں ہے
خدا رکھے امیدوں کو کہ ان کا دم غنیمت ہے — وگرنہ وقتِ آخر اور میرا کون پرساں ہے
جھکائے سر کو بیٹھا ہوں کہ وحشت میں کہاں جاؤں — تصور کی عنایت سے گریباں میں بیاباں ہے
بتاؤں کیا اسے؟ یہ پوچھتا ہے مجھ سے دل میرا — کہ آئینے میں کیوں عکسِ جمالِ روئے جاناں ہے
کھٹک دل کی بنی ہے نغمہ میرے سازِ ہستی کا — جسے پیکاں میں سمجھا تھا وہی تارِ رگِ جاں ہے

یہ جو کچھ حوصلہ ہے منحصر ہے ظرف پر کیفی
کرمِ ساقی کا ہو تو میری مستی درسِ عرفاں ہے

ایک سٹیج ڈرامہ

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

تگڈم

(از جناب سید طالب علی صاحب عابد ایم اے۔ الہ آباد)

موسم .... برسات   وقت ..... ایک ہفتہ

سین

داخلی۔ مکان۔ تھانہ۔ چترگھر۔ ملاقات۔ اور سونے کے کمرے ..... نہانے کا کمرہ۔ سیمنٹ کے ٹب۔ .... خارجی۔ باغ۔ شہر۔ سڑک۔ موٹر۔ جھولا۔ سرنگ۔ بڑے درخت

افراد افسانہ

خاص مرد

سروپ۔ کالج کا گبرو جوان۔ پہلوان حسین بھکیت شریف ہنوٹیا۔

سلامت۔ سروپ کا ساتھی وفا کا پتلہ

کھلاون۔ بگڑا شریف چالیا۔ موالی بے دھرم۔ لُچا بےشرم۔ شرابی۔

خاص عورتیں

۱۔ رتن۔ رام لال کی حسین لڑکی۔ سروپ کی پریمنی

۲۔ چندا کھلاون کی سگنی شریر سندری نردوش

۳۔ رادھا کھلاون کی دھرم پتنی۔ دیوی۔

عام مرد

شیولودہ۔ چترکار سروپ اور سلامت کا ساتھی

رام لال۔ موٹا بوڑھا۔ بیوقوف رتن کا پتا

سداہٹ۔ گنڈوں کے جتھے کا سردار

عام عورتیں

۱۔ کامنی۔ بال ودھوا سندری۔ سلامت کی پریمنی کھلاون کی ...

۲۔ سداما۔ رام لال کی بیوی ہکلی

۳۔ موتی۔ رتن کی سندر الھڑ گنوار داسی۔

متفرق

جوکھوا اور پھکن } جتھے والے۔ شرابی موالی لٹھ باز۔ بھجالئے۔ داروغہ جی۔ توند ملئے۔ زیٹئے۔ ایک مولوی صاحب۔ بہت سے بہت سے گنڈے۔ گھاردالے لٹھیت۔ بہت سے شرابی۔ نوکرانیاں۔ ایک بازاری عورت اور بہت سی معمولی عورتیں۔

سروپ اور رتن لگنیا جوڑے ہوئے جھول رہے ہیں۔ آم کی ڈال میں ور پڑی ہوئی ہے۔ ساون کی رات ہے۔ کبھی ڈھلی ہوئی چاندنی ہے۔ کبھی بادل کے مہین ٹکڑے چندرماں پر آجاتے ہیں۔ ہوا ر پڑ رہی ہے۔ بلبلوں کا ایک جوڑا تیر رہا ہے۔ مور کا ایک ٹہوکر پر پھیلائے ناچ رہا ہے۔ ... رتن پریم رس میں کھوئے ہوئے گا رہے ہیں:-

پریم ہی تن ہے پریم ہی من ہے۔ پریم ہی ہے سنسار
پریم ہی بالم پریم ہی بالم پریم ہی ہے منجدھار
پریم ہی دھن ہے پریم چلن ہے پریم ہی ہے بیوہار
پریم ہی ڈالی پریم ہی مالی پریم ہی ہے گلزار
پریم ہی راج ہے پریم ہی تاج ہے پریم ہی ہے سوار
پینگ لینے میں ادھر بھیگی مہین ساری سے رتن کا ...

بناوٹ سب معلوم ہوتی ہے۔ آنکھ ملتی ہے تو ایک طرف کا منا اور
دوسری طرف تجا بڑھ جاتی ہے۔ دونوں جھولے سے اتر کر ایک
سفید بنچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ چاندنی کھلتی ہے۔

سروپ۔ کتنی سندر ہو رتن! رتن چپ رہتی ہے۔

سروپ۔ کب تک لجاؤ گی پیاری۔ بولو (دونوں ہاتھ پکڑ لئے)

رتن۔ (مسکرا کر) دیکھئے۔ ہاتھ چھوڑ دیجئے۔ نہیں تو ـــــــ

سروپ۔ (ہاتھ چھوڑ کر) نہیں تو کیا ہوگا۔ شوق کے ہاتھ رُک نہیں
سکتے۔ ہاتھ ٹوٹیں کیا کرے کوئی۔

رتن۔ تو آپ اپنے کالج کب سدھاریں گے۔

سروپ۔ کل سویرے۔

رتن۔ (رُک رُک کر) سجن سکارے جائیں گے نین مریں گے روئے
بدھنا یہ رین ایسی کرو کہ بھور کبھو نا ہوئے
(ایک ایک شبد الگ الگ کر کے کہتی ہے)

سروپ۔ ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ (ذرا اور پاس آکر) میں
آپ کو پران سے چاہتا ہوں رتن۔

رتن۔ اور میں؟

سروپ۔ وہی تو پوچھتا ہوں؟

رتن۔ جو کہئے کہہ دوں؟

سروپ۔ کہہ دیجئے میں آپ پر مرتا ہوں۔

رتن۔ میں آپ پر مرتا ہوں۔

سروپ۔ مرتا نہیں مرتی ہوں۔

رتن۔ مرتا نہیں مرتی ہوں۔

سروپ۔ جو کچھ میں کہوں اسے نہ دہرائیے۔ اپنے من کی کہئے۔

رتن۔ (رتن رُک رُک کر) ؎

کر بچھڑ جائے جات ہو دربل جان کے موئے
ہردے میں سے جائیو تو مرد بکھانوں توئے

سروپ۔ آج تو آپ کبیر داس ہو رہی ہیں (اور پاس ہو جاتا ہے)

رتن۔ چلتے چلتے میں آپ کے من کی بات جان گئی۔

سروپ۔ کیا جان گئیں رتن۔

رتن۔ یہی کہ آپ اُس کو مجھ سے بھی ادھک چاہتے ہیں۔

سروپ۔ (گھبرا کر) کس کو؟

رتن۔ اپنے پاٹ شالے کو۔

سروپ۔ (ہنس کر) مار ڈالا ظالم۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے

رتن۔ (چھیڑ کر) لو اب میں جاتی ہوں۔ انگڑائی لے کر اٹھتی ہے۔

سروپ بے بس ہو کر کھینچ کر گود میں بٹھا لیتا ہے۔ دونوں پریم
میں کھو جاتے ہیں ــ رتن دھیرے دھیرے الگ ہوتی ہے

سروپ۔ (دوزانو ہو کر) چھما کیجئے دیوی!

رتن۔ (مسکرا کر) تم بڑے وہ ہو تمہیں کاٹ کے ٹکڑے کر دیں۔

سروپ۔ دیوی ہو رتن۔

زور کی بارش ہوتی ہے۔ بجلی چمکتی ہے۔ بادل گرجتا ہے۔ اندھیرا
ہو جاتا ہے۔

رتن۔ اچھا اب وداع کیجئے۔

سروپ۔ چلئے کمرے تک پہونچا دوں۔

کمرے تک سروپ اپنی آڑ میں چھپائے ہوئے لایا۔ پھر بھی رتن
بھیگ گئی۔ دونوں آگ سے کپڑے سکھانے لگے ـــــــ

سروپ گاتا ہے۔ ؎

ہم اپنے دل پہ لئے غم کا داغ جاتے ہیں
اندھیرے گھر کا یہ ہوگا چراغ جاتے ہیں

(رتن بھی گانے میں شریک ہو جاتی ہے) ؎

کل مجھ سے جو پوچھا یہ کسی نے کہ بتا تو
کیا حال ہے اے بسمل صمصام جدائی
کیوں دل پہ ترا ہاتھ ہے کیوں آنکھ ہے پرنم
ہے تجھ سے جدا کون سا آرام جدائی
آغاز جدائی کو جدائی نہ سمجھ تو
ہوتا ہے وصال ایک دن انجام جدائی
تب میں نے کہا ہائے نہ پوچھو یہ نہ پوچھو
کچھ اور کرو ذکر نہ لو نام جدائی
اللہ نہ دے گردش ایام جدائی کو کم صبح قیامت سے نہیں شام

سروپ جاتا ہے۔ رتن سونے والی حسین ساری بدل کر اپنے
بستر پر لیٹ جاتی ہے۔
{موتی ۔ رتن کی داسی جوان ہے حسین ہے۔ الھڑ ہے۔ گنوار ہے
سناٹا دیکھ کر رتن کے حوض میں نہاتی ہے چاہتی ہے کہ اٹھے
مگر بار بار پھسل جاتی ہے}
ہائے رے کر گئی۔ اوہ میں مر گئی۔ مر گئی۔ مر گئی۔ کہتی ہوئی نکلتی
ہے۔ ایک دوسری ساری پہن کر سنگار دان کے سامنے کھڑی
کھڑی ہو کر بال جھاڑتی ہے۔ مانگ نکالتی ہے۔ سرمہ لگاتی
ہے۔ اور گاتی ہے۔

میری مچلتی پھولتی جوبن کی ڈالی اسے رکھوں گی کیسے سنبھال کے
اسے رکھوں گی کیسے سنبھال کے
الٹی ری جوانی دیوانی اسے رکھوں گی کیسے سنبھال کے
اسے رکھوں گی کیسے سنبھال کے

{کھلاون نشہ میں چور۔ لڑکھڑاتا ہوا۔ کلّے میں پان دبائے۔ بانکا
چھیلا بنا ہوا آتا ہے}
ہائے ظالم مار ڈالا آج تو جوبن پھٹا پڑتا ہے۔ پری لگتی ہو موتی پری
موتی۔ کھلاون بابو اس نہ گھورو۔ لگ جیہیں جوبنا پہ چوٹ راجہ لگ جیہیں
کھلاون۔ تورا اُمکارے جوبنوا گوریا کاہے کرت ناہیں دان گوریا کاہے
(بڑھ کر ہاتھ تھامتا ہے)
موتی۔ رام موری کلیاں مرک جیہیے۔ موکا چھانڈو ناہیں تو گرِیائے دیبے
(تن جاتی ہے)
چھوو نہ مورا جوبنا پھٹے گاری دیبے ہو چھوو نہ مورا جوبنا۔
الھڑپنے سے ناچتی ہے اور بھاؤ بتاتی ہے۔
کھلاون۔ تمہارے منہ سے گالی بھی پھول کی چھڑی بن جائے گی۔۔۔
لاؤ ایک گرما گرم تو دلاؤ۔
موتی۔ (مٹک کر) گرما گرم چاہئے کے لیو کونو رنڈی پتریا کے ۔۔۔ مورے
جوبنا پہ نتھیا کلیل کرے رے۔
کھلاون۔ (بڑھ کر ایک بوسہ لیتا ہے۔ موتی ایک تھاپڑ ہلکے سے مارتی ہے)
دیکھو بابوجی ہم جات رہی۔

کھلاون۔ کہاں۔
موتی۔ تھانے میں۔ رپٹ لکھوائے دیبے۔
کھلاون۔ ابھی تو موری چھوٹی سی موتی رے۔ موتی تم تھانے مت جانا
دروگا تم کو موہ لے گا رے۔ دروگا۔
موتی۔ نکھول نیک ناہیں لاگت بابو۔ ہاں ہم سب ٹھیک کو دیا ہے
مُدا سو روپیہ سے ایکو ڈبل کم نہ لیبے۔
کھلاون۔ جانی۔ سو کیا۔ تمہارے اوپر سے ہزاروں نثار ہیں۔ مگر
اسوقت دس روپے نقد انقد لے لو۔ کام ہو جانے پہ۔ تمہارا
منہ بھر دیں گے۔
موتی۔ جھوٹ نہ بولو۔
کھلاون۔ جھوٹ کہتا ہوں تو سامنے کی دونوں آنکھیں پھوٹ جائیں
موتی۔ ہمری آنکھ۔
کھلاون۔ پیاری تمہاری ان مدھ بھری انکھڑیوں کو کوئی ترچھی
نظر سے دیکھے تو آنکھیں نکال لوں۔
(ہونٹ چھو کر) ان ہونٹوں کو کوئی چھوئے تو انگلیاں کاٹ لوں
آؤ پیاری گلے تو لگ جاؤ۔ پیاس تو بجھاؤ ــــــ
موتی۔ (کمر مٹکا کر) اوہ جون بابوجی پر شیطان چڑھا ہے۔ میں جاتی ہوں
کھلاون۔ (ہاتھ بڑھاتا ہے۔ آنکھ بند کر لیتا ہے) ایک دو ــــ
دیکھو تین نہ کہوں کہ مجھ سے آکر لپٹ جاؤ اور میں اسے لپٹا لوں
(موتی ناز سے بھاگتی ہے کھلاون آدھی آنکھ کھول کر آنچل
پکڑ لیتا ہے۔ ساری آدھی کھل جاتی ہے۔ چپت کرتی دکھائی
دیتی ہے۔ موتی لجا کر پھر گھوم پڑتی ہے اور ساری پھر
لپٹ جاتی ہے)
کھلاون۔ تم تو ست بچنا گھومنے لگیں۔
موتی۔ (بگڑ کر) بابو کھلاون تم ہو گھن چکر۔
کھلاون۔ ہاں تو پھر میں اپنے آدمیوں سے کہہ دوں کہ جسوقت تم
سبز روشنی دکھاؤ۔ میدان صاف سمجھیں۔
موتی۔ ہاں۔
کھلاون۔ تم نے دھوکہ دیا تو یاد رکھنا کہ (اشارہ کرتا ہے)

موتی ۔ (چھپ کر) رتن ہوئی پڑی سوت ہیں۔ ماں جی جاگت آہیں۔ بابوجی ابھیں سوئے ناہیں۔ بڈھا بڈھی سوئے جائیں تب ماملہ ٹھیک۔

[کھلاون دس روپے دے کر جاتا ہے]

رتن کے سامنے والے مکان کا اندھیرا کمرہ۔ سواہٹ۔ جوکھو اور پھکن تینوں موالی دھندھلکے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ پہلو میں اک ہتھی ڈنڈے اور بھالیاں ہیں۔

سداہٹ ۔ یار میرے (سوتی ہوئی رتن کو انگلی سے دکھا کر) بڑا بانکا مال ہے۔ کیسا گدرایا جوبن ہے۔ ہائے رام۔

پھکن ۔ ہے تو مگر ہیں کیا۔

جوکھو ۔ پٹاخہ ہے پٹاخہ ——— ہائے ہائے۔

پھکن ۔ چوزہ ہے چوزہ ———

سداہٹ ۔ ہم تو اپنی جان جوکھم میں ڈال کر لڑکیاں اڑا لاتے ہیں اور بابوجی ہم کو دور ہی سے ٹھینگا دکھاتے ہیں۔ پکڑ جائیں تو گت الگ بنے اور کال کوٹھری الگ ہو۔ کھلاون بابو کبھی ہمکو اپنا اگلا نوالہ بھی نہیں دیتے۔

پھکن ۔ سردار جی۔ اُگلی گٹھلی آپ ہی چاٹیئے۔ ہم تو کوری سینکل کھاتے ہیں۔ کھلاون بابو کو ہوا بھی نہیں دیتے۔

سداہٹ ۔ دیکھو پھکن۔ وہ تو ہمیں بھاڑ میں جھونک دیتے ہیں۔ بس میں چنگی چھوڑ جالو دور کھڑی۔ مگر ہم رتن کو مانگ لیں گے۔

جوکھو ۔ ساجھے کی ہانڈی بزار میں پھوٹے۔ اب وہ دن نہیں کہ (مونچھوں پر تاؤ دے کر) ایک استری کے دو پتی ہوں۔

سداہٹ ۔ یار میں تو لٹ گیا۔ اس چھوکری رتن نے مجھے لوٹ لیا۔ ابتو جان جائے مگر اس کو ہاتھ سے جانے نہ دونگا۔

جوکھو ۔ گلا نہ پھاڑیئے سردار جی۔ کہیں بابو نے سن لیا تو الٹی آنتیں گلے پڑیں گی۔

سداہٹ ۔ (مونچھوں پر تاؤ دے کر) ہم کیا کسی سے کم ہیں۔ وہ سیر تو ہم سوا سیر اور بھولا بھالا تر مال روز روز تو ملتا نہیں۔ ہائے جانی۔

(چپ چاپ اندر آ کر سنتا ہے) کیا کہہ رہے ہو سداہٹ۔

سداہٹ ۔ (گھبراہٹ) کچھ نہیں۔ پاس لگی تھی۔ پوچھ رہا تھا۔ لائے پانی۔

کھلاون ۔ مجھ سے اڑتے ہو۔ بولو۔ میں اڑتی چڑیا۔

سداہٹ ۔ آپ سے کہتے شرم آتی ہے ——— مالک کی چیز پر آنکھ ڈالنا نمک حرامی ہے مگر بابوجی۔ (ہاتھ جوڑ کر) رتن مجھے نہ ملی تو مر جاؤنگا۔

کھلاون ۔ (روشنی جلا کر) نمک حرام کمینے۔ اس خیال کو اپنے سر سے نکال دے ورنہ کچل ڈالوں گا۔ میرے کاٹے کا مرہم نہیں۔

جوکھو ۔ سردار جی آج ذرا النبی چڑھا گئے ہیں دل لگی کر رہے تھے۔

کھلاون ۔ مجھ سے دل لگی۔

پھکن ۔ ترنگ میں ہیں۔ آپ کو ہم سمجھ رہے ہیں۔ اپنی جان میں ہم کو بنا رہے تھے۔

سداہٹ ۔ چھما کیجئے بابوجی۔ غصہ کو تھوک دیجئے۔

جوکھو ۔ گولی ماریئے جانے دیجئے۔

(سب کے سب ہنس پڑتے ہیں)

کھلاون ۔ یہ لو رومال اور یہ لو کلوروفارم کی شیشی دیکھو نتھنے کے پاس لیجانا اور ایک منٹ تک رکھنا جوانی کی نیند سے زور سے سانس لے گی تو بس کام بن جائے گا۔ مگر تم لوگ اپنا منہ اور اپنی ناک بند رکھنا تمہارے نتھنے کا کوئی سوراخ کھلا رہ گیا تو الٹ جاؤ گے۔ سمجھے؟

جوکھو ۔ سمجھ گئے بابو سب سوراخ بند کر دینگے۔

کھلاون ۔ میں جاتا ہوں۔ تم لوگ موتی کی سبز روشنی دیکھتے ہی پہونچ جانا۔ موتی دروازہ کھلا رکھے گی اور وہیں جنگل والے اڈے میں لانا۔

کھلاون مارواڑی کے بھیس میں ایک طرف روانہ ہوگیا۔ اس کے اوجھل ہوتے ہی موتی نے سبز ٹارچ دکھائی۔ تینوں چوکنے ہوگئے۔

سداہٹ۔ جوکھو اور پھکن ڈھاٹے باندھ کر ڈنڈے اور بھالی سنبھال کر چلتے ہیں۔ پانی موسلادھار برس رہا ہے۔ ہاتھ کو

ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا بجلی کی چمک میں دیکھ دیکھ کر راستہ
چل رہے ہیں۔

رتن بائی اپنے مہین کپڑوں میں سو رہی ہے۔ سگبگاتی ہے گویا
کچھ سوپن دیکھ رہی ہے۔ اس نے دیکھا کہ ایک بڑا سا کالا
ناگ آکر گلے سے لپٹ گیا۔ دم گھٹنے لگا تو دھیرے سے کہا ماتاجی
پھر بولی۔ پران ناتھ سروپ۔ سروپ نے آکر کالے کو پھن کے
پاس سے پکڑ لیا اور رگڑ رگڑ کر مار ڈالا۔ رتن چونک پڑی
روشنی میں ادھر ادھر دیکھا پھر سوگئی۔

تی۔ (کانپتے ہوئے) دیکھو جُز کو آہٹ نہ ہوئے۔

اہٹ۔ کھڑکیاں اور دروازہ کھلے ہیں نا؟

تی۔ ہاں (مسکرا کر) سب کھلے ہیں۔ سدا اہٹ آگے بڑھ جاتا ہے۔
جوکھو چلتے چلتے موتی کا منہ ایک ہاتھ سے بند کرکے لپٹا لیتا ہے۔
اور ایک بوسہ لے لیتا ہے۔

ن۔ (دھیرے سے) ہائے۔

ھو۔ ہائے وائے کروگی تو.......... ہا ہا ہا ہا

تینوں اندر آتے ہیں۔ سدا آہٹ شیشی ناک کے پاس لے جاتا ہے
مگر رتن چونک پڑتی ہے اور چیخنا چاہتی ہے۔ سدا آہٹ فوراً رومال
منہ میں ٹھونس دیتا ہے اور دونوں ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ پھر کہتا ہے
جوکھو تم دونوں ہاتھ پکڑ لو۔ پھکن تم پاؤں سے خبردار رہو۔ مچھلی ہے
مچھلی۔ تھوڑی دیر تڑپے گی کھیلے گی پھر چپ ہو جائے گی۔
بھلا ہماری کٹیا میں پھنس کر کون نکل سکتا ہے۔

رتن تڑپتی ہے مگر نہیں چھوٹتی جوکھو۔ چنچل ندیا منسی ڈوبت ناہیں

اہٹ۔ چپ چاپ لے چلو۔ کوئی سن نہ لے۔

تینوں لے چلے رتن تڑپتی ہوئی چلی۔ تڑپنے میں بدن کا جو حصہ
کھل جاتا تھا۔ کوئی نہ کوئی اسکو ڈھانک دیتا تھا۔

لھو۔ اچھا ودع کرد موتی۔

تی۔ (انگلیاں چٹاچٹ توڑ کے) نرک میں جاؤ جوکھو۔
تینوں کے جاتے ہی لگی چیخ چیخ کر رونے۔ ہائے دوا رے۔
ہائے بتا رے۔ ہائے متا رے۔ موری بھوجی۔ ہائے جوئی۔

دہائی ہے بابوجی دوڑو۔ مہارانی جی دوڑو۔
رام لال آنکھ ملتے ہوئے اٹھتے ہیں۔ اپنی بیوی کو جگاتے ہیں۔
دیکھو تو رادھا۔ موتی کہیں گر گئی ہے۔ میں بھی اٹھتا ہوں تو
سسری کو ٹھیک کرتا ہوں۔

رادھا۔ (نیند میں) ٹھ ٹھی ٹھیک (ہکلانے کی عادت ہے)

رام لال۔ اس سے ہکلانے سے کام نہ چلے گا۔ پھر چیخ کی آواز سنکر
صرف دھوتی پہنے توند نکالے۔ غصے میں بھرے ہوئے چلے آتے
ہیں۔

کیا ہوا جنم جلی آدھی رات کو کان کھا گئی رہ تو جا دماسنے کو
دوڑتے ہیں)

موتی۔ بابوجی سن لو تو مارو۔ بہوئی کا کہیں پتہ نہیں ہے۔
رادھا چونکتی ہے۔ دیکھتی ہے بستر خالی ہے۔ غصے میں اٹھ کر
آتی ہے۔ موتی کے پاس بابوجی کو دیکھ کر آگ بگولا ہوجاتی ہے
لو۔ لو۔ بوڑھے بوڑھوتی میں یہ لچھن۔ لج لجا کرو۔

رام لال۔ آئیں وہاں سے لجا لجاتی ہوئی۔ دیکھو تو رتن اپنے بچھونے پر
نہیں ہے۔

اب تینوں نے مل کر ڈھونڈھنا شروع کیا۔ کمرے۔ باغ، غسل خانہ
برآمدہ۔ پلنگ کے نیچے سب جگہ ڈھونڈھ ڈالا۔ ہوتی تو ملتی
بڑے صندوق اور الماریاں بھی ڈھونڈھی گئیں۔

موتی۔ (رو رو کر) ہائے موا بہوئی۔ ہائے موکا ناگ کس ناڈس لین
ہائے مور بہوئی۔ تلاش کرتے کرتے ایک جگہ ساری کا ایک ٹکڑا
اور ایک بجھالی ملی۔ رام لال نے فوراً ٹیلیفون پر تھانہ میں
خبر دی۔

سب انسپکٹر صاحب۔ اگر۔ دیکھئے میری تلاشی وہ قتل ہوگیا
ذرا سی جوں کی تو میں بھی چالان یا حوالات میں
یہ کہکر انہوں نے بھی تمام چھان مارا۔ پاؤں
فوٹو لیا۔ بجھالی اور ساڑی کا ٹکڑا
کہنے لگے جیسے ہوئے

(پھر آنکھ ماری) حوالات کی ہوا کھا۔ طبیعت ہو جائے گی
موتی کو بھی لے کر چلے گئے۔

رام لال منہ کھولے دیکھتے رہے رادھا ہکلا کر کچھ کہنے والی تھی
پر مو مو مو کے سوا کوئی شبد نہیں نکلا۔

شیلو لودھ ۔ سروپ اور سلامت بیٹھے ہیں۔
شیلو لودھ کو اپنی بھی خبر نہیں۔ اپنی خیالی محبوبہ کی تصویر بنا رہا ہے
آدھا جسم مکمل ہو چکا ہے۔

سلامت ۔ اب بہت رات گئی۔ کل تم کو جانا بھی ہے۔ آؤ اب سو رہیں
شیلو تو تصویر بنالیں گے تب ہی سوئیں گے۔

سروپ ۔ پتے الگ رکھ کر ۔ یہ بازی تمہاری ہو گئی ۔ (شیلو لودھ سے)
ابھی مہاشے ایک بج گیا ہے۔

شیلو لودھ ۔ (چونک کر دیکھتا ہے رنگ کا قلم تصویر کی چھاتی پر چل جاتا ہے
ــــ بگڑ جاتا ہے) دیکھو ایسی دل لگی اچھی نہیں۔ دو گھنٹے کی
محنت خاک میں مل گئی۔

سلامت ۔ جانے بھی دو شیلو۔ صبح کو ٹھیک کر لینا (تصویر دیکھ کر)
یہ تو کامنی کی تصویر ہے۔

شیلو ۔ کون کامنی ۔

سلامت ۔ وہ میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ ہم دونوں نے
ایک ساتھ بی اے پاس کیا تھا۔

شیلو ۔ سچ کہو سلامت! میں تو سمجھتا تھا کہ ایسی سندری جیتے جی نہیں
مل سکتی ۔ وہ کہاں ہے۔ کیا کرتی ہے۔ کہاں رہتی ہے؟

سلامت ۔ رکو تو ۔ اس کی منگنی بالے پن میں ہو گئی تھی اب بیاہ ہوتا ہے
نہ جانے کہاں ہے اور اب منش ہے اس کو نفرت سی ــــ

شیلو ۔ (پریشان ہو کر) تم مجھے چھیڑ رہے ہو۔ میں تو مر جاؤں گا۔
ٹیلیفون کی گھنٹی ہوتی ہے۔

سلامت ۔ ہلو ۔ کون ۔ کامنی ۔ کہاں سے ۔ اچھا ۔ انند کٹی سے ۔ انند منا
ہیں ــــ ہائیں کیا کہا مر گئے ۔ کب ۔ زور سے کہو ــــ
[illegible] مجھے میرے

میرے پاس آیئے۔ گھبرایئے نہیں۔ میں آپ کو اپنا بھائی سمجھتی
ہوں ایک بڑا کٹھن کام ہے ـــ کٹھن ـــ کٹھن کام ہے۔
سلامت فوراً جانے کے لئے اٹھتا ہے۔

شیلو لودھ ۔ میں بھی چلوں۔

سلامت ۔ آج نہیں (مسکرا کر) یہ جوش ۔ ایسی گرمی۔
اتنے میں پھر گھنٹی ہوتی ہے۔

سروپ ۔ ہلو ۔ کون؟ بابوجی ۔ کہئے ۔ کیا ہوا ۔ ڈاکہ پڑا!؟ ــــ

رام لال ۔ (اپنے کمرے سے ، توند پر ہاتھ پھیر کر ڈکار لیتے ہیں۔ فون کا
دستہ ہاتھ میں ہے۔

سروپ ۔ میں نہیں سمجھا صاف کہئے۔

رام لال ۔ ڈاکو میری پتری کو اٹھا لے گئے۔ داروغہ جی آئے تھے
موتی کو پکڑ لے گئے۔

سروپ ۔ میں ابھی آتا ہوں ــــ

کھلاون ۔ تم نے (مسکرا کر) میری محبت کا کرشمہ دیکھا۔ پیاری رتن
میں تم پر دل و جان سے فدا ہوں۔ مرتا ہوں۔
رتن چپ رہتی ہے۔

کھلاون ۔ بولو ۔ میرے دل کی گرہ کھولو ۔ ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

رتن ۔ (ہاتھ جھٹک کر) مجھے دربل جان کر بہت نہ پڑھئے بابو کھلاون
میں دکھی ہوں ۔ بے بس ہوں ۔ مگر ایشور سب کچھ دیکھتا ہے
اسی کے چرنوں میں شرن لونگی۔

کھلاون ۔ پیاری بہت تڑپا چکیں ۔ اب آؤ کلیجے سے لگ جاؤ چھاتی
ٹھنڈی ہو۔ مہینوں سے گھٹ رہا ہوں۔ تن من کی سدھ
نہیں رتن۔

رتن ۔ رہے پران ناتھ ۔ کہاں ہو پربھو سروپ۔

کھلاون ۔ (قہقہہ لگا کر ، سروپ مروپ یہاں کوئی نہیں یہاں تو
(مونچھوں کو تاؤ دے کر) میں موجود ہوں ۔ یہ ڈیل دیکھو
یہ ڈیلے دیکھو یہ سینہ دیکھو (تن کر) سچ کہتا ہوں حسین نہیں ہو
پیاری رتن وشواس کرو ۔ استریاں مجھے دیکھتے ہی گھائل
ہو جاتی ہیں ۔ اور جو ایک بار ــــ

ن ۔ اپنے گھونے شبد کسی اور کو سانا ۔ ہے پربھو ۔

ون ۔ (اکڑ کر) پربھو مرکھو آج کوئی تجھے میرے پنجے سے نہیں
بچا سکتا ۔ (آگے بڑھتا ہے)

ن ۔ تو بڑا ڈرپوک ہے ۔

اون ۔ (بگڑ کر) سر چڑھی ڈومنی گاوے تال بے تال ۔

ن ۔ تو نام کا مرد ہے ۔ میری چھاتی میں دربل استری کا ہردے
ہے ۔ چوری چھپے کسی کی بہو بیٹی کو لانا اور بے کسی میں آنکھ
دکھانا منش کا کام نہیں ۔

اون ۔ لے اب سنبھل جا ۔

ن ۔ (گڑگڑا کر) دیکھو تم اپنا دھرم اتنے سستے داموں میں نہ بیچو
میری ست کا نشٹ کرو گے تو اس لوک میں بھی اور اُس
لوک میں بھی پچھتاؤ گے ۔

اون ۔ (ہنس کر) بڑی آئیں کہیں کی پنڈتائن ۔
آج تو چین سے گزرتی ہے ۔ عاقبت کی خبر خدا جانے

ن ۔ میرے کوئی بھائی نہیں کھلاون ۔ میں آج سے تم کو بھائی
بناتی ہوں ۔

اون ۔ بھائی کو جھونک دو چولہے بھاڑ میں آج تو میرا پہلو گرم ہو

ن ۔ (رو کر) ہے پرمیشر ۔ ہے پران ناتھ ۔

اون ۔ میں راون کا بھائی ہوں اور اس سے پانچ جوتے بڑھ کر
میں آج تجھے اس سنسار کا سب سے میٹھا رس پلاؤں گا ۔
اور پریم ومان پر اڑا لیجاؤں گا ۔

ن ۔ تو راون کا بھائی ہے تو میں بھی سیتا کی داسی ہوں ۔

اون ۔ رہ تو جا سیتا کی داسی ۔ دیکھوں تو (قہقہہ لگا کر) اس سمے
تجھ کو میرے ہاتھ سے کون بچاتا ہے ۔

ن ۔ بہت نہ اکڑ ٹھوکر کھائے گا ۔

اون ۔ گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں
وہ طفل کیا گریں گے جو گھٹنوں کے بل چلے

یہ کہہ کر جھپٹتا ہے رتن بھاگتی ہے ۔ جو چیز ملتی ہے اٹھا اٹھا کر
پھینکتی ہے ۔ مگر ایک کونے میں پکڑ جاتی ہے ۔ ناخون سے چہرہ
نوچتی ہے ۔ طمانچے مارتی ہے پر کھلاون بھی [illegible]
دونوں ہاتھ پاؤں قابو کر کے بوسہ لینا چاہتا ہے [illegible]
پہونچتا ہے کہ یکایک کھڑکی سے کود کر اس کی دھرم پتنی آ [illegible]
ہے ۔ اور پیچھے سے چوٹی پکڑ کر کھینچ لیتی ہے ۔
(رتن سے) بہن جب تک میرے اس سریر میں آتما بسی ہوئی ہے
تم پر کوئی آنچ نہیں آسکتی ۔

کھلاون ۔ دشٹ ملیچھ مجھے مرگھٹ پر پہونچا لے تب ایسے نیچ کام ۔۔۔

کھلاون ۔ میں ۔ میں تو اپنی جان بچا رہا تھا ۔ یہ آپ بھیگی بلی بن گئی ہے
دیکھو تمام گھر لوٹ لیا ہے ۔

رتن ۔ میں جیتے جی تمہاری داسی رہونگی تم نے یہ نیا جیون مجھے بھیک
دیا ہے ۔ ست نہ رہے ۔ تو جینے پر دھکار ہے ۔

دیوی ۔ تم میری بہن سمان ہو دیوی ۔ یہ راکشس ہے تم سیتا ہو ۔ اور
میں تمہاری داسی ہوں ۔

کھلاون ۔ اور میں تم دونوں کا غلام ہوں ۔ بھائی ہوں (منہ پر
طمانچہ مار کر) بھائی ان کا غلام تمہارا (پھر کان پکڑ کر کہتا ہے)
غلام ان کا بھائی تمہارا (سب ہنس پڑتے ہیں) رتن دیوی
مجھے چھما کر دو ۔

رتن چپ رہتی ہے ۔

دیوی ۔ بہن ۔ ملیچھ سہی ۔ راکشس سہی ۔ پر وہ میرا پتی دیو ہے میرے
کہنے سے تم اس کو چھما دیدو ۔ میں تم سے پریم کی بھکشا مانگتی
ہوں رتن ۔

رتن ۔ میں تمہاری بات کاٹ نہیں سکتی بہن ۔ میں ان کو چھما کرتی
ہوں ۔

رادھا دیوی ۔ تو مجھے بھی آگیان دو کہ میں انکو ان کے ماتا پتا کے پاس
پہونچا دوں ۔

کھلاون ۔ تم جانتی ہو دیوی ۔ میں اپنی بات کا [illegible]
بچن دیتا ہوں کہ فرصت پاتے ہی ان کو [illegible]
تم ان کو پہرے سے دیکھو [illegible]

... ماتا بیاکل ہوں گے۔

... کے پاس جاتا ہوں۔ اُن سے چھا اور اُن

... سروپ بھائی سے مل کر ان کو بھی بلا لاؤنگا۔

... (کر) دیکھو سداآہٹ آج تو رتن راد دھا دیوی کی چ...

... پھندے سے نکل گئی۔ مگر میں موم کا بنا نہیں کہ ایسی جلدی

... جاؤں۔ جس پر نظر ڈالی اس کو نشٹ ہی کر کے چھوڑتا ہوں

دیکھو ہی رادھا ہوں یا رتن اس اڈے اور اس سرنگ سے

باہر جانے نہ پائیں۔

... ہٹ۔ اور اگر چلی گئی تو۔

... ون۔ (ٹھوکر مار کر) تو تمہاری بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلا دونگا

... ہٹ۔ (غصے سے ہونٹ چاٹ کر) میں نے جوتے کھانے کے لئے

نوکری نہیں کی بابو جی۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔

... ون۔ دور ہو مردود یہاں سے۔ نکل ابھی نکل۔ گردنی دے کر

نکال دیتا ہے۔

سداآہٹ کے جانے کے بعد کھلاون لنگڑی بڑھیا بن کر گٹھری

لئے ہوئے باہر جاتا ہے۔

... ت۔ (کامنی کے دروازے پر پہونچ کر) سروپ آؤ تھوڑی دیر

... میں یہاں سے نپٹ کر رام لال صاحب کے یہاں چلتے ہیں۔

... بھائی سلامت میری تو بدھی ٹھیک نہیں ہے۔ تم جاؤ میں

... آتا ہوں۔ پھر ملیں گے (جاتا ہے)

... نک دے کر) کھولئے۔

...) کون ہے باہر۔

... تم بھائی صاحب براجئے۔

... ہوں

سلامت۔ تو بتایئے کچھ آپکا رہ سکے گا تو اشانہ رکھوں گا۔

کامنی۔ آج میں ایک بڑی سنگین بات آپ سے کہنا چاہتی ہوں بھگی...

دیکھئے کہ آپ اس کو گپت رکھیں گے۔

سلامت۔ میں سمجھونگا کہ اس کا ظاہر کرنا انوچیت ہے تو ضرور گپت

رکھوں گا۔

کامنی۔ بی اے کے بعد میرا گونہ ہونے والا تھا مگر بہار کی بھوئیں ڈول

میں میرا میکا اور سسرال دونوں تباہ ہو گئے۔ پتی دیو کا تو

مکھ بھی میں نے نہیں دیکھا۔ اب اس بھری پوری دنیا میں میرا

کوئی نہیں جس کے گھر میں ہوں یہ میرے پتا جی کے ایک متر ہیں

یہی رکھ دیکھ سکتے ہیں۔

سلامت۔ جب میں نے بہن بنا لیا ہے تو ہر طرح مدد کے لئے تیار ہوں

کامنی۔ آپ جانتے ہیں ہندو سماج دوسری شادی کو بہت بری ترشنا

دیکھتا ہے۔

سلامت۔ جانتا ہوں۔

کامنی۔ پرش پنڈت بوڑھے ہو کر ناتی پوتے ہوتے ہوئے بھی بارہ

برس کی کنیا سیج سکھ کے لئے لائیں اور بال بدھوا ———

سلامت۔ دیکھو بہن کامنی۔ کوٹھی ایک دن میں نہیں بنتی۔ جنگل ایک

روز میں نہیں صاف ہوتا۔ چمن ایک رات میں نہیں کھلتا۔

کامنی۔ میں سمجھتی ہوں بھائی جی۔

سلامت۔ دستور نہیں ہے۔ اب سماجیوں کی چیخ پکار سے کچھ ہو چلا ہے

کامنی۔ دستور — کہنے کی بات ہے۔ مرد جو کچھ کریں وہی دستور ہے جو

ہم استری نان کریں وہ دستور نہیں ہے۔ لوگ وید شاستر جانتے

تو ہیں نہیں مگر دہائی تہائی دینے لگتے ہیں۔

سلامت۔ بہن کامنی سنا ... ہی ہے۔

کامنی ... بھائی ... اور رتا رانے دودھ

... تھا کہ نہیں ... پورن دواہ نہیں

... تی میں ٹھیک ہوگا۔ یہ تو بتائیے کہ اس سے

آپ نے کیوں بلایا ہے۔

منی۔ ہاں وہ تو میں باتوں میں بھول ہی گئی تھی۔ سچ ہے کونپل سے کونپل پھوٹنے لگتی ہے۔

سلامت۔ تو اب بتایئے۔

منی۔ آپ کو یاد ہے یا بھول گئے۔

سلامت۔ کیا۔

منی۔ ایف اے میں ——— (رک گئی)

سلامت۔ کہئے۔

منی۔ ہمارے ساتھ ایک لڑکا تھا کھلاون۔ اس کو پرنسپل صاحب نے برے چال چلن کا پاکر کالج سے نکال دیا تھا۔

سلامت۔ ہاں یاد آگیا۔

منی۔ وہ آج کل شہر کے موالیوں کا سردار ہو رہا ہے پورا گنڈا بن گیا ہے تین مہینے کی جیل بھی بھوگ آیا ہے۔

سلامت۔ تو پھر۔

منی۔ جب ہی سے وہ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑا ہے — یہ دیکھئے۔

"آج رات کو میں سناٹے میں آؤنگا۔ کامنی تم میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتیں۔ یا مجھے دس ہزار روپے آج ہی گن دو یا میری پیاس اپنے امرت جل سے بجھا دو۔ نہیں تو شیو بودھ والے تمام پتر اخباروں میں چھپوا دوں گا"

"تم مجھے جانتی ہو"

سلامت۔ کامنی آج سے پہلے تم نے کبھی نہیں بتایا تھا۔ یہ بات کیا ہے؟

کامنی۔ بشواس کیجئے بھائی صاحب۔ کوئی نیچ بات نہیں ہے۔ جوانی اور کالج کی آزادی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے پریم کرنے لگے تھے۔ باتی پتر بھی بھیجتے تھے پریم رس میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شیو بودھ کو تو آپ جانتے ہی ہیں کتنا شریف۔ دیالو۔ اور ہنس مکھ سجن تھا۔

سلامت۔ سچ؟

کامنی۔ (شرما کر) بھائی صاحب میں سچ نہ بولتی ہوں تو ابھی دھرتی ماتا پھٹ جائیں اور میں سما جاؤں۔

(رو کر) آپ بھی سندیہہ کرتے ہیں۔

سلامت۔ میں سندیہہ نہیں کرتا بہن۔

دروازے پر کھٹ کھٹ ہوتی ہے۔ سلامت ... میں چھپ جاتا ہے۔ کھلاون لنگڑی بوڑھی بنا ہوا ... بولو کامنی۔ آج پریم کروگی کہ دس ہزار دوگی۔

کامنی۔ اتنی جلدی نہ کیجئے۔ سوچ سمجھ لینے دیجئے تو اپنے من کی ...

کھلاون۔ تیرے نخرے میں گرم مسالہ — (اکڑ کر) دو میں سے ... ہوگی اور ابھی ہوگی۔ نہیں تو (بھجالی کمر سے نکال کر) ... کر جاؤں گا۔

کامنی کانپنے لگی۔

کھلاون۔ سنو جی۔ ادھر دیکھو۔ میرا تاؤ چڑھ رہا ہے۔ بولو۔

کامنی چپ رہی۔

کھلاون نے بھجالی سندری کے گلے پر رکھدی۔ سلامت نے ... نکل کر ڈانٹا۔ کھلاون نے مڑ کر دیکھا تو پستول کی نال بالکل پیٹھ پر تھی۔ ہاتھ اوپر کر لئے بھجالی چھوٹ گئی۔

سلامت۔ کھلاون۔

کھلاون۔ سلامت۔

سلامت۔ ہاتھ اور اوپر کرو۔ پیچھے ہٹو۔ وہیں کھڑے ہو جاؤ۔ دیکھو اپنی جان کی خیر چاہو تو آج سے میری بہن کامنی کا پنڈ چھوڑ دو نہیں تو جانتے ہو میرا نام سلامت ہے۔ کچا ہی چبا ڈالوں گا۔

کھلاون۔ (ہنس کر) یہ آپ کی سگی بہن ہیں کہ سوتیلی۔ یار سلامت ... گھٹے ہوئے ہو۔ تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہا کہ مال ہمارا ہے۔

سلامت۔ شیطان۔ ملیچھ۔ راکشس تو اپنے ہی سمان سارے ... سمجھتا ہے۔

کھلاون۔ دیکھو دوست ٹھیٹھرے ٹھیٹھرے بدلتے نہیں ہوتی ... بھی دنیا دیکھی ہے اچھا اب چاہتے کیا ہو؟

سلامت۔ شیو بودھ والے خط ابھی نکال دو اور چپ چاپ ... ابھی چھوڑے دیتا ہوں۔

کھلاون۔ چلا تو جاؤنگا۔ پر کون مائی کا لال ایسا ہے جو ہم سے ... لے سکے۔

سلامت نے بڑھ کر نال چھاتی پر رکھدی۔ ... اور بائیں ہاتھ سے سینے پر ...

... کردو۔ کامنی نے کاٹ پھینکا ہو تو

جلا دیا۔

...ا دن ... تو بازی تمہارے ہاتھ رہی سلامت! اگر یاد رکھنا میں

بھی کھلاڑی نہیں اگر تم سے اس کا بھرپور بدلہ نہ لے لوں۔

سلامت۔ (مسکرا کر) دیکھا جائے گا۔

—— کھلاڑی ہارے کھلاڑی کی طرح وہاں سے نکل گیا۔

کامنی۔ میں یہاں اکیلے نہیں رہ سکتی بھائی صاحب۔

سلامت۔ تو چلو میں اپنی ماتا جی کے پاس پہونچا دوں۔

کامنی۔ کہیں لے چلئے بھائی —— (مرضی پا کر ایک خط چھپا بسا دن کو لکھتی ہے)

"میں اپنے بھائی کے ساتھ جاتی ہوں۔ کسی سمے آ کر سب باتیں بتاؤنگی" آپ کی داسی کامنی

[دونوں چلتے ہیں]

رام لال کا مکان۔

انسپکٹر۔ دروازہ کھولو۔

رام لال۔ (اندر سے توند پر ہاتھ پھیر کر) کون ہے۔

انسپکٹر۔ میں ہوں۔

سدا ما۔ تو تو تو تم ک ک ک کون ہو۔

انسپکٹر۔ میں ہوں۔

سدا ما۔ ل ل ل لاٹ ص ص ص صاحب کے نیچے۔ نہ نہ نا نام بتاؤ۔

انسپکٹر۔ میں ہوں داروغہ جی۔

رام لال صاحب گھبرا کر اٹھے۔ دروازہ کھولا۔ دونوں توندیلے تھے۔ ہاتھ ملانے بڑھے تو توندوں کی ٹکر لگی۔ دونوں پیچھے ہٹ گئے۔

رام لال نے جھٹ سے اندر لا کر بٹھایا۔ کہئے کچھ پتہ چلا۔

... کان میں زور سے یہ بات کھل گئی

رام لال۔ جلدی بتائیے۔

انسپکٹر۔ مٹھی گرم کیجئے تو بتاؤں۔

رام لال۔ بتائیے تو بھلا ہم آپ سے باہر جا سکتے ہیں (گدے کے نیچے کئی نوٹ نکال کر دیتے ہیں)

انسپکٹر۔ (لے کر جیب میں رکھتے ہوئے) نہیں اس کی کیا ضرورت تھی میں نے تو یونہی ہنسی سے کہدیا تھا۔ خیر آپ دیتے ہیں تو پرشاد سمجھ کر لئے لیتا ہوں۔

سدا ما۔ ہہ ہہ ہاں ب ب بت بتائیے تو

رام لال۔ (بے چین ہو کر) کیا آپ یہاں ہی کے بھوکے ہیں داروغہ جی

داروغہ جی۔ بڑی چھان بین کے بعد پتہ لگا ہے۔ دوسرا کوئی ہوتا تو ایک ہزار سے کم میں نہ بتاتا۔ مگر میں تو آپ کو اپنا پتر ارے پتا سمجھتا ہوں۔

سدا ما۔ بت بتا پتر رہ رہ رہنے دیجئے۔ بت بت بت بتائیے جلدی۔

رام لال۔ (تڑپ کر) دیکھئے داروغہ جی اب ٹال مٹول نہ کیجئے۔

داروغہ جی۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے تب پتہ۔ —— (رک گئے)

سدا ما اور رام لال دونوں بیچین ہو کر قریب آ گئے۔

داروغہ جی۔ تو بنا پوچھے نہ مانئے گا۔

رام لال۔ اب تو پران نکس جائے گا داروغہ جی۔

داروغہ جی۔ (کھڑے ہو کر) تو بچن دیجئے کہ یہ بات گپت رہے گی۔ نہیں تو میری دال روٹی کا سہارا جاتا رہے گا۔ اور آپ بھی سنکٹ میں پڑ جائیں گے۔

رام لال۔ دیتا ہوں —— بچن ——

سدا ما۔ مے مے مے میں بھی دے دے دے دے دیتی ہوں۔

بچ بچ بچن۔

داروغہ جی۔ (اکڑ کر) میری پیٹھ ٹھونک دیجئے۔

رام لال۔ (بڑی زور سے پیٹھ ٹھونکتے ہیں) جلدی بتائیے۔

داروغہ جی۔ باپ رے آپ نے تو مرمت ہی کر دی۔ رتن کو ڈاک

لے گئے۔

ام لال ۔ کون ڈاکو۔

اروغہ جی ۔ بس اب اتنا ہی تو معلوم کرنا رہ گیا اور سب کچھ ۔

مدا ما ۔ رہ گئی کسر تھوڑے کی زین لگام اور گھوڑے کی

ام لال ۔ (کھسیا کر) اسی رائی کا آپ پربت بنا رہے تھے۔

اروغہ جی ۔ سچ ہے سنسار میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ مہینے دو مہینے میں یہ بھی پتہ چل جائے گا۔ کہ ڈاکو کا نام کیا ہے۔

ام لال ۔ اچھا اب تم چپ لے زبر چل اور دو پیش دو۔ نہیں تو اچھا نہ ہو گا۔

داروغہ جی اکڑتے ہوئے جاتے ہیں۔

مدا ما ۔ او او اور مومو مو موتی کہاں ہے۔

روغہ جی ۔ (رک کر، بڑے آنند سے ہے۔ سب کشل منگل ہے سپاہی سیاں بیٹے کو توال اب ڈر کاہے کا۔

م لال ۔ (دبگڑ کر) کشل منگل کے بچے۔ جاتا ہے کہ نہیں۔

[داروغہ جی جاتے ہیں]

رادھا دیوی اور رتن بیٹھی ہوئی ہیں۔ کھلاون کے جنگل والے اڈے میں ایک دو محلا مکان ہے۔ کھڑکی سے باہر کا سماں دیکھ رہی ہیں۔ دن ڈوبنے کو ہے۔ شفق پھیلی ہوئی ہے۔ اور ہلکی ہلکی پھواریں پڑ رہی ہیں۔ بادل گھر رہے ہیں۔

رتن گاتی ہے۔ گھر آئیں بدری ———

ناہیں آئے دھن شیام گھر آئیں بدری ——— گھر آئیں بدری

آئی ساون کی بہار اٹھے موریلا پکار — گھر آئیں بدری۔ گھر آئیں بدری

پڑے بوندن پھوہار ——— گھر آئیں بدری۔ گھر آئیں بدری

کہو سکھیا جائے لائے پیا کو منائے ——— گھر آئیں بدری

جیا لگک مٹائے ——— گھر آئیں بدری

ادھا دیوی ۔ ایسی سندرتا اور ایسے گن! جب میں استری ہو کر بہت ہو گئی تو پرش پرش ٹھہرے کیوں نہ ریجھیں۔

تن ۔ (لجا کر) مجھے نہ چھیڑو نہیں تو رو دونگی۔

دھا دیوی ۔ (گدگدا کر) رو دو تو جانوں ...

دونوں ہنسنے لگتی ہیں۔

رتن ۔ دیکھو بہن دیوی آج تین دن ہوگئے۔ نہ میں ... آسکے نہ اُنکی کچھ سدھ بدھ ملی۔

رادھا دیوی ۔ اُن کی کس کی؟

رتن ۔ (جھینپ کر) سروپ کی۔ امتحان سر پہ ہے ... باتیں معلوم نہ ہوئیں تو ٹھیک نہ ہوگا۔

رادھا دیوی ۔ اور ہردے میں بھی تو کسک ہوتی ہوگی۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔

رتن ۔ آپ کو تو ہر سمے ہری ہی ہری سوجھتی ہے۔

رادھا دیوی ۔ میں نے بہنوئی صاحب کو کبھی نہیں دیکھا ... آپ کیوں دکھانے لگیں۔

رتن ۔ کیوں نہ دکھاؤنگی۔

رادھا دیوی ۔ ابھی تو میرا چھوٹا سا نو لیا رے۔ ابھی تو میرا چھوٹا سا ...

(ناچتی ہے)

سیاں تم بھاگ نہ جانا۔ ملنیا تم کو موہ لیگی رے۔ ابھی تو میرا چھوٹا ...

پیا تم سوتن نہ جانا۔ سوتیا تم کو موہ لیگی رے۔ ابھی ...

راجہ تم ہاڑ نہ جانا۔ پتریا تم کو موہ لیگی رے۔ ابھی ...

رتن ۔ واہ بہن۔ تم بڑی گنوان ہو میں مر جاؤں تو بھی ...

رادھا دیوی ۔ رتن پیاری! میں پرش ہوتا۔ ہوتی۔ تو تمہیں ... ناچ نچا دیتی۔ اچھا دیکھو میں پرش بنتا ہوں اور تم ... ہوں۔ ارے بنتی ہوں اور پریم کرتی ہوں۔ رادھا دیوی مرد بن کر ایک پرکار سے چھیڑتی ہے اور پریشان کرتی ہے رتن بہت تنگ آتی ہے تو بھاگتی ہے تالاب میں ... تالاب میں پانی بھرا ہوا ہے۔ دونوں ... اسی میں گر جاتی ہیں۔ اور شرابور ہو کر ...

سروپ راستے میں چلا جا رہا ہے ...

تب لگا آپ کے گھر پہونچا دوں۔

بڑھیا۔ بیٹا تم بڑے دیالو ہو۔

سروپ۔ نہیں ماتا یہ تو بھارت ورش کے ہر پتر کا کرم ہونا چاہئے

بڑھیا۔ بڑے دین دیال ہو بیٹا۔ تم کشٹ نہ اٹھاؤ میری جھونپڑی پاس ہی ہے چلی جاؤنگی۔ (نظر بھر کر دیکھتی ہے)

سروپ۔ (کھلاون کو کچھ پہچان کر) تو کیا ہوا ماتا میں بھی چلتا ہوں۔

بوڑھیا۔ چلتے ہو تو چلو بیٹا۔ پر میری گلی بہت تنگ ہے۔ کہیں ٹھوکر نہ لگے۔ میں ابھی گھر سے پھر نکلوں گی۔

سروپ۔ نہیں تو — میں بھی بچہ نہیں ہوں۔

راستے میں اکّا دکّا آدمی ملتے تھے نہیں تو سروپ وہیں نپٹ لیتا۔ بوڑھیا ایک مکان میں پہونچ کر کھٹ کھٹ اوپر چلی گئی سروپ وداع ہو کر چلدیئے مگر تھوڑی ہی دور جاکر ایک کھمبے کی آڑ میں چھپ رہے — دو ہی منٹ کے بعد ایک عورت نکلی مگر دبلی پتلی تھی اور لنگڑی بھی نہ تھی۔ سروپ نے پیچھا کیا۔ وہ عورت چوکنی ہو کر بار بار ادھر ادھر دیکھتی تھی اب بالکل سناٹا تھا۔ اپنے گلی سے نکل کر سڑک پر ایک ٹیکسی ٹھہرالی۔ اور کچھ کہکر بیٹھ گئی۔ موٹر اسٹارٹ ہو رہی تھی کہ سروپ نے بھی دوسری ٹیکسی کی اور اس سے کہدیا کہ اگلی ٹیکسی کے پیچھے ہی پیچھے رہے مگر ایسا نہ ہو کہ اگلی ٹیکسی والے کو معلوم ہو سکے۔

ٹیکسی پل کے پار پہنچ کر ایک سنسان جگہ میں رکی پہلے وہ عورت اتری پھر سروپ۔

استری۔ (ایک املی کے پیڑ کے نیچے ٹھہر کر) کون ہو تم؟

سروپ۔ آدمی ہوں۔ کیوں؟

استری۔ تم یہاں کیوں آئے۔ نہیں جانتے۔ جتنی دو حوائیں گھر سے نکل جاتی ہیں وہ یہیں کہیں آکر بستی ہیں۔ تم کس کے گھر کیوں آئے؟

سروپ۔ (جھک بک ہو کر) یونہی۔

استری۔ اڑائی وکائی نہ کرو۔ سچ سچ کہو میں سندری ہوں یا نہیں؟

سروپ۔ تم سندری ہو۔ اپروپ سندری ہو پر مجھے کیا۔

استری۔ (ناز سے) تم مجھ سے پریم نہ کروگے!

سروپ۔ میں کسی اور سے پریم کرتا ہوں۔

استری۔ پر کسی اور کے پیچھے پیچھے چلتے ہو۔ (مسکرا کر) تو تم جس کے پریمی ہو وہ مجھ سے ادھک سندری ہے۔

سروپ۔ نہیں تم سے ادھک سندری تو سنسار میں شاید ہی کوئی ہو

استری۔ تمہیں لجا نہیں آتی۔ میں آپ پریم کے لئے کہتی ہوں اور تم

سروپ۔ میرے پاس ایسی باتوں کا کوئی جواب نہیں۔

استری۔ میں سمجھ گئی پر یہ تو بتائیے مہاشے میرے پیچھے آپ دو گھنٹے سے کیوں پڑے ہیں۔

سروپ۔ (جھیپ کر) چھما کیجئے دیوی — ایک طرف چلتا ہے

استری زور سے ہنسکر تالی بجاتی ہے۔ تالی بجتے ہی تین سنڈے مسنڈے لاٹھیاں لئے آجاتے ہیں۔ مگر سروپ سروپ ہی ہے پینترا بدل کر پہلا وار خالی دیتا ہے اور گردنی لگا کر لٹھ چھین لیتا ہے۔ پھر تو کاٹا کھٹ ہونے لگتی ہے۔ آخر تینوں کو مار بھگاتا ہے۔ جب میدان خالی ہوتا ہے تو دیکھتا ہے۔ سندری استری کھڑی مسکرا رہی ہے۔

سروپ۔ (اچنبھے سے) ارے تم بھاگی نہیں یہاں سے؟

استری۔ تم سے گبرو جوان کو ایسی بپت میں چھوڑ کر میں کیسے جاتی میں نقلی پریمنی نہیں سجن۔ ایسی کٹھور نہیں بیر۔

سروپ۔ تم ایک پہیلی ہو سندری۔ چاہتی کیا ہو؟

استری۔ کہہ تو چکی کھول کر۔ تمہارے منموہک روپ پر مرتی ہوں۔

سروپ۔ مگر میں تم سے پریم نہیں کرسکتا۔ پریم لڑکوں کا کھیل نہیں۔

استری۔ اچھا میں کھلاون کو گرفتار کرا دوں اور رتن کو تم سے

ملا دو ل تب پریم کرو گے۔

سروپ۔ ہاں تب تو تجھے پریم کروں گا۔

ستری۔ ٹھیک بچن دیتے ہو۔

سروپ۔ ہاں ہاں ٹھیک بچن ہے۔

ستری۔ اچھا میری کلائی پکڑ کر بچن دو۔

اب تو سروپ بغلیں جھانکنے لگے۔ کانپتے ہاتھوں سے نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہاتھ پکڑا۔ بجلی کی لہر رگوں میں دوڑ گئی۔ میں بچن دیتا ہوں۔ اچھا بتاؤ رتن کہاں ہے۔ کھلاون کہاں ہے

ستری۔ اب تو تم بچن دے چکے۔ میں کیا جانوں۔

سروپ۔ دگا کر۔ تو پھر میرا بھی بچن وچن کچھ نہیں۔

ستری۔ اتنے ہی میں ڈھیلے ہو گئے۔ واہ ری مردانگی —— میں تمہارے پریم میں شرابور نہ ہوتی تو اس پیچھا کرنے والے ہاتھوں تماشے کا مزا چکھا دیتی۔ کیا کروں۔ اپنے بروے سے مجبور ہوں۔ بڑے بنتے ہو وہ۔ جس بوڑھیا کو تم ماتا بنا کر پہونچانے لے گئے تھے۔ وہی تو کھلاون تھا۔ جب وہ اوپر پہونچا۔ ہم دونوں نے بچار کر یہ ترکیب نکالی۔ اب وہ اپنے اڈے پہونچ گیا ہوگا۔ رتن بھی وہیں ہے۔ کھلاون کی دھرم بہن دیوی نے رتن کی ست بچالی۔ اور اپنی منہ بولی بہن بنالیا نہیں تو دھنکر۔ آج تم صرف میرے ہی پریمی ہوتے۔ رتن کی موتی سی آبرو مٹی میں مل گئی ہوتی۔

سلامت شاہ صاحب کا روپ بدل کر چلے۔ بڑی بڑی زلفیں۔ ہاتھ میں لوہے کا چمٹا۔ گلے میں مالا۔ گیروا لمبا کرتہ آنکھوں میں سرمہ۔ اکڑتے ہوئے جاتے تھے۔

ایک ہوٹل کے پاس پہونچے تو دیکھا جوکھو کھلن اور سداہٹ بھی موجود ہیں اندر جا کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ ٹھہرے والے مست تھے۔ کوئی ناچ رہا تھا۔

جوکھو۔ ہاں یار سداہٹ سنتے ہو۔ اس دن تو کھلاون بالو نے بڑی جیاستی کی۔

سداہٹ۔ تم لوگ بھی پکے نامرد ہو۔ کھلاون نے مجھے ٹھوکر ماری اور تم دیکھتے رہ گئے۔ (اور چڑھا کر) یہ دیکھو رتن بائی اس بوتل میں کھڑی مسکرا رہی ہے۔ وہ مجھ سے پریم کرتی ہے۔ ناچ رہی ہے۔ اگر کھلاون کو خاک میں نہ ملا دوں اور —— اور —— رتن سے اپنا پہلو گرم نہ کروں تو میرا نام بھی سداہٹ نہیں چمارہے۔

چھیکو۔ نہ روک ہاتھ ساقیا پلائے جا پلائے جا
پلائے جا پلائے جا
دو آتشہ کھنچی ہوئی لنڈھائے جا لنڈھائے جا
ترے نثار اور دے پلائے جا پلائے جا
نہ ہو خمار اور دے لنڈھائے جا لنڈھائے جا

بہت سی آوازیں۔ پلائے جا پلائے جا پلائے جا پلائے جا

اور آوازیں۔ لنڈھائے جا لنڈھائے جا لنڈھائے جا لنڈھائے جا

بہت سے لوگ ناچنے لگتے ہیں
ہلڑ ہو جاتا ہے

دوکاندار۔ دیکھو شور مچاؤ گے تو ہم پولیس کو بلالیں گے۔

شرابی۔ سیاں ہم تو تمہاری کتیاں ہیں ——
ون ون ون ون ون ون ون ون
دوسرے۔ راجہ ہم تو تمہارے کتے ہیں ——
ؤون ؤون ؤون ؤون ؤون ؤون ؤون

شرابی۔ سیاں ہم تو تمہاری گدھی ہیں۔
چیں چیں چیں چیں چیں چیں چیں چیں
دوسرے۔ راجہ ہم بھی تمہارے گدھے ہیں۔
پوں پوں پوں پوں پوں پوں پوں پوں

شرابی۔ سیاں ہم تمہاری بکری ہیں ——
اُم میں اَم میں اُم میں اَم میں
دوسرے۔ راجہ ہم بھی تمہارے بکرے ہیں ——
اون اون اون اون اون اون اون

سداہٹ۔ (شاہ صاحب کی طرف اشارہ کرکے) ایں یہ تو بابا جی

سیانے ہیں یا نرے گاؤدی۔

(سلامت سے) آؤ بھائی تم بھی تو ۔ انڈیلیاؤ ــــــ

ایک بازاری عورت۔ ادھ کھلی۔ بال بکھرے ہوئے۔ شاہ صاحب کے پہلو سے لگ کر

سیاں بہت دن بعد درس دکھلایو
درس دکھلایو جیا ترڑ پایو
توری برہ میں ترڑپوں دن رین
آؤ گلے لگ جاؤ درس دکھلایو

پھر تمام ہلڑ ہوتا ہے۔ شاہ صاحب زور سے ڈھکیل دیتے ہیں۔

عورت ایک طرف گرتی ہے۔ بڑبڑاتی ہے۔

پیا پیارے نہ اب ترڑپاو
آؤ گلے لگ جاؤ درس دکھلایو

ایک مولوی صاحب لمبی داڑھی میں کنگھی کرتے ہیں۔ بازاری عورت کو ہنکہ مارتے ہیں اور ہاتھ کی آڑ کرکے ایک بوتل اڑا دیتے ہیں ڈکار آتی ہے تو کہتے ہیں۔ لعنت نعوذ۔

شاہ صاحب۔ (سداہٹ سے) بھائی جب سے فقیر ہوا توبہ کرلی ہاں ایک لت البتہ ابھی باقی ہے۔

کہیں آڑ میں چلو تو بتاؤں

تینوں بدمعاش کچھ بھانپ کر ہنستے ہوئے اٹھے اور پاس آئے

شاہ صاحب۔ سولی کی عادت نہیں جاتی۔ جب تک پھڑ پر دو چار داؤں نہ لگیں نیند نہیں آتی۔ (جیب میں روپے کھنکا کر) کہیں چلو تو چلیں۔

چاروں آدمی ساتھ ساتھ گئے اس املی کے نیچے پہونچ کر پھڑ بچھ گیا۔ شاہ صاحب دوسو کا داؤں ہارے تو بگڑ کر پانچ سو نوٹ اور نکال لئے بس پھر کیا تھا۔ تینوں کے منہ میں پانی بھر آیا املی کے نیچے سے سرنگ کا رستہ ایک پتھر سے ڈھکا ہوا تھا۔ سیڑھیوں پر چٹان اور چٹان پر گھاس تھی ۔ دونوں نے دو طرف سے ہاتھ تھاما اور سداہٹ کے منہ میں رومال دے کر ہاتھ پاؤں جکڑ لیا۔

تینوں بدمعاش سرنگ سے لے چلے جب جنگل کے دہانے پر دہانے پر پہونچے تو نوٹ نکال لئے اب پانچ سو باقی تھے۔

سداہٹ۔ چار سو مجھے دیدو۔ پچاس پچاس تم لوگ لے لو۔ اور اسے بابو کے پاس لیجاؤ۔

جوکھو۔ بڑے آئے کہیں کے گنڈے۔ تین سو مجھے ادھر دہنے ہاتھ سے دیدو نہیں تو وہ دونگا۔ کہ کھوپڑی بھنا جائے گی۔

پھکّن۔ ہاں اور دو سو جو پہلے جیتے ہو اس میں سے سو ملا کر تین سو ادھر بھی حوالے کرو نہیں تو ہم دونوں تمہیں چٹنی کردیں گے کیوں بھائی جوکھو۔

جوکھو۔ ہاں بھائی پھکّن۔

تینوں میں لٹھ چلنے لگا۔ ساتوں سو روپیہ زمین پر رکھ دیا گیا۔ سلامت نے موقعہ پاکر دانت سے ہاتھ کھول لیا۔ اور روپے لے کر نو دو گیارہ۔

ادھر جب تینوں نے لہو لہان ہو کر مڑ کر دیکھا تو شکار جمع بہت غائب تھا۔ ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہوئے سرنگ سے نکلے۔

ادھر سلامت سرنگ سے نکلا ہی تھا کہ پاس ہی آواز سن کر جھٹ درخت پر چڑھ گیا اور گھنے پتوں میں بیٹھ گیا۔

باہر آکر جوکھو اور پھکّن ایک طرف تلاش میں چلے۔ سداہٹ دوسری طرف گیا۔ اور سلامت مسکراتا ہوا درخت سے اتر کر تیسری طرف چل دیا۔

شیو لودھا اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا ہے۔ طرح طرح کی تصویریں ٹنگی ہوئی ہیں۔ بہت سے ماڈل رکھے ہوئے ہیں شیو لودھ کامنی والی تصویر بنانے میں محو ہے۔

کامنی آتی ہے ٹھٹک کر واپس جانا چاہتی ہے۔ بھائی سلامت یہاں نہیں ہیں۔

شیولودھ۔ (چونک کر) کامنی۔

کامنی۔ (لجاکر) شیو۔

شیو۔ (اٹھ کر پاس آتا ہے۔ انگلیوں سے اشارہ کرتا جاتا ہے) وہ

نکھیں - وہی ہونٹ - وہی رنگ - وہی مسکراہٹ -
کامنی ——— کامنی -
وہی جوش - وہی شرافت - وہی سنجیدگی - وہی سندرتا -
شیو ——— شیو -
ں اے کے بعد سے آپ ایسی کھوئیں کہ آج ملیں - یہی وفا تھی کامنی
شیو! میں اسوقت پرائی تھی -
لیسے ؟
- گونا نہیں ہوا تھا پر بواہ ہو چکا تھا -
وراب ؟ کامنی - ابتو میں اپنی آپ مالک ہوں - گونے سے پہلے ہی بدھوا ہو گئی - دونوں تصویریں دیکھتے ہیں اور چپکے چپکے باتیں کرتے جاتے ہیں -
یہ دیکھو - (ابی چتر بنا رہا تھا - ہزاروں تصویریں کھینچیں مگر تسلی نہ ہوئی - جو چاہتا تھا وہ بات پیدا ہی نہیں ہو سکی -
جان کیسے جاتا کامنی -
ہم دونوں کو کوئی دیکھ لے تو پہچان نہ سکے (تصویر کی طرف اشارہ کر کے)
میری آنکھوں سے دیکھے تو فوراً جان لے -
- تو کیا میں ایسی ابھاگنی ہوں کہ میری تصویر نہیں کھنچ سکتی -
کھنچ کیوں نہیں سکتی کامنی! پر ——— ایک بات کہوں برا تو نہ مانوگی -
- (ہنس کر) آپ کی بات اور میں برا مانوں شیو!
میں اب بھی اتنا ہی پریم کرتا ہوں - میں نے کبھی اور کسی دوسرے سے پریت نہیں کی -
- نہ میں نے -
کیا کہا کامنی - پھر تو کہدو (قریب آگیا)
- صاف سننا چاہتے ہو شیو - میں نے تمہیں سے پریم کیا اور اب بھی کر ———
شیو نے چاہا کہ گلے لگا لے مگر کامنی دو قدم پیچھے ہٹ گئی -
ٹھہرو شیو اب میں تمہارے لائق نہیں رہی -
(درد سے) وہ کیسے کامنی -

کامنی - (کچھ سندیہ نہ کرنا شیو - پرماتما جانتا ہے کہ میں بال بدھوا ہوں - پر سماج کی آنکھ میں ———
شیو - (مسکرا کر) بھول ہو کامنی ——— دھرم اور سماج ست کے داسی ہیں - ست ہی ست ہے اور کچھ نہیں -
کامنی - کیا کہتے ہو شیو! -
شیو - کامنی - دیوی کامنی - میرا پریم اب تو اور ادھک ہو گیا سنتی ہو اگر تمہیں مجھ سے کچھ پریم اب بھی ہے تو بچن دو کہ اسی ستپاہ میں مجھ سے بواہ کر لو گی -

کامنی شرما کر سر جھکا لیتی ہے -
شیو بڑھ کر گلے سے لگا لیتا اور کہتا ہے - کہو! بولو!!
کامنی - (دھیرے سے) بھائی سلامت سے پوچھ لوں تو -
شیو - سلامت سے (مسکرا کر) میں نپٹ لوں گا - انکی چنتا تم کرو -
کامنی - تو پھر ——— میں ——— تمہا ——— ری ——— ہوں

شیو ایک گہرا پیار لیتا ہے ——— لو پران پیاری کامنی تم بھی اپنے بچن پر سہی کر دو مہر لگا دو - ———
کامنی پریم انند میں کھو کر دیکھتی ہے ——— کھٹ کھٹ ہوتی ہے دونوں الگ ہو جاتے ہیں -

شیو - آیئے!

ایک چھوکرا کسی کا کارڈ تشتری میں لاتا ہے -

شیو - (نوکر سے) کہدو گھر میں نہیں ہیں ——— (کامنی کو کارڈ دیکر) اتنے لمبے چوڑے خطاب ہیں - روپیہ بھی بہت ہے مگر سدھی نام کو نہیں -
کامنی - کیوں -
شیو - دیکھو نہ سمے دیکھا نہ گھڑی اور آ دھمکے -
کامنی - (لچک کر) اور میں ؟
شیو - تم تو پران ہو پیاری - بواہ دھرم کا ایک پردہ ہے سماج کی آڑ ہے اور کچھ نہیں - جب ہم تم راضی ہو گئے تو بیڑا پار ہے کامنی سچ کہنا آج سے میں تمہیں اپنا سمجھوں -
کامنی - ادھیکار ہے تم کو شیو!

شیو۔ اچھا تو کر دکھاؤ۔

کامنی۔ وہ کیا؟

شیو۔ تم جانتی ہو سارے سنسار میں تمہیں چھوڑ کر مجھے سب سے ادھک جو چیز پیاری ہے وہ یہی چتر کھینچنا ہے۔

کامنی۔ جانتی ہوں شیو۔

شیو۔ تو اپنی تصویر کے لئے موڈل بن جاؤ۔ مجھ پر پورا وشواس کرو کامنی اگر میرے ہردے میں نیچتا ہو تو بھگوان مجھ سے سمجھ لیں۔ بس یہی کامنا ہے کامنی کہ ایک چتر اب بناؤں کہ تم بھی پرسن ہو جاؤ۔

کامنی۔ لو بیٹھی جاتی ہوں شیو۔ یہ کیا بڑی بات ہے۔

شیو۔ (مسکرا کر) ایسے نہیں کامنی۔ میری نگاہ اور تمہارے بیچ میں کوئی ہلکا سا پردہ بھی نہ رہے۔

دیکھو جیسے یہ ہے پیاری (ایک برہنہ مجسمہ کو دکھاتا ہے)

کامنی۔ (غصہ سے) یہ تو نہ ہوگا (مسکرا کر) انگلی دیتے ہو نچا پکڑنے لگے۔

شیو۔ (روٹھ کر) بات بھی کھوئی التجا کرکے ـــ تم نرے نیچ سمجھتی ہو کامنی ـــ

کامنی۔ میں تم کو دیوتا سمجھتی ہوں شیو! کرا ٹھو نہیں میں ابھی آتی ہوں

قریب کے پردے میں جاکر سب کپڑے اتارتی ہے اور ایک چادر دونوں ہاتھ سے گلے کے پاس تھامے ہوئے دروازہ میں کھڑی ہوتی ہے۔

کامنی۔ بس۔

شیو۔ داہنا ہاتھ کھول دو۔ (تصویر پر جھکتا ہے)

کامنی۔ (سیدھا ہاتھ کھول کر) بس! (ناز بھی ہے شرارت بھی شرم بھی)

شیو۔ بایاں پاؤں بھی۔

کامنی۔ (کھول کر) بس!

شیو۔ داہنا پاؤں بھی۔

کامنی۔ (دھیرے دھیرے کھول کر) بس

شیو۔ بایاں ہاتھ بھی۔

کامنی بے خیالی میں بایاں ہاتھ کھولتی ہے۔ کھلتے ہی چادر سرک جاتی ہے۔ فوراً ہی چیخ کر بیٹھ جاتی ہے ـــــــ

شیو گھبرا کر دوڑتا ہے۔

سروپ اور سلامت لکڑہاروں کا بھیس بدلے ہوئے ہیں گو لوگ بھی بہروپ میں ہیں۔ کوئی کچھ بنا ہے کوئی کچھ۔

سروپ اور سلامت سرنگ کے پاس پہونچے تو سداہٹ کو پایا۔

سلامت۔ سداہٹ خبردار ہو جاؤ آج تم ہمارے پنجے سے نہیں بچ سکتے

سداہٹ۔ بر نام ہے بابو جی (مسکرا کر) آپ جس کام سے جا رہے ہیں میں بھی اسی کام سے جا رہا ہوں۔

سروپ۔ کیا کام ہے؟

سداہٹ۔ یہی کہ رتن دیوی کو ہیتا سے چھڑائیں۔ اور کھلاون کو نرگ کی ہوا کھلائیں۔

سلامت۔ دیکھو دھوکا نہ دینا۔

سداہٹ۔ میں نیچ نہیں ہوں بابو جی۔ مرہٹہ ہوں۔ تلوار اور چوٹ بھول سکتا ہوں پر زبان کی نہیں۔

سروپ۔ ہوا کیا۔

سداہٹ۔ شاہ صاحب جانتے ہیں۔

سلامت۔ یہ بھی رتن بہن کے عاشق ہیں۔ کھلاون نے ٹھوکر مار کر نکال دیا۔ کیوں سداہٹ۔

سداہٹ۔ میری کایا پلٹ ہو گئی ہے بابو۔ رات کو سپنے میں سورگ باشی ماتا جی نے آکر مجھے پاپ سے نکال کر پن کے مارگ پر کر دیا ہے۔ میں آج سے رتن دیوی کو اپنی بہن سمجھتا ہوں

سروپ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دو طرف سے دربان آتے دکھلائی دیئے۔ تینوں نے پینترہ بدل کر خالی دیا۔ پھر تو چاروں طرف سے بانوں کی برشا ہونے لگی۔

سداہٹ نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا مگر سروپ نے روک لیا

بھائی کہاں جاتے ہو۔ گھبراؤ نہیں۔ سیٹی بجائی —— گنہار اکٹھا ہوگئے —— چاروں طرف لوگ چونک گئے۔ تیر بند ہوگئے ڈھیلے چلے۔ وہ بھی موقوف ہوگئے —————— اب یہ لوگ سرنگ سے پار ہوکر —— گھنے جنگل اور جھاڑیوں میں ہوتے ہوئے اڈے کی طرف چلے۔

سروپ ۔ کتنی دور ہے سداآہٹ۔

سداآہٹ ۔ ابھی آدھا راستہ طے کر آئے ہیں۔ آگے رستہ اتنا کٹھن نہیں ہے

سلامت ۔ اڈے پر کتنے آدمی ہوں گے۔

سداآہٹ ۔ چوبیس پچیس ہوں گے۔

سروپ ۔ اور ہمارے ساتھ پچاس ہوں گے (لوگوں سے) دیکھو کمند اور جال سے کام لینا۔ سب کو زندہ پکڑنا۔ کوئی بھاگے نہیں۔ اور گھائل بھی نہ ہو۔ دشمن سب برابر ہیں۔

ایک سپاہی ۔ اور وہ وار کریں تو!

سلامت ۔ بہتر یہی ہے کہ ان کا وار روکو اور مرے ہوئے کو نہ مارو تم دو ہو وہ ایک۔

سداآہٹ ۔ یہ کام اتنا سرل نہیں بابو جی۔

سروپ ۔ بھگوان کی کرپا چاہیئے —— ساری مشکل آسان ہوجاتی ہے چلے جارہے ہیں۔

رتن اور رادھا سو رہی ہیں۔ جوانی کی نیند —— کھلاون دبے پاؤں جاتا ہے۔ کلیجہ پکڑ لیتا ہے۔ پہلے رادھا کے دونوں ہاتھ باندھ دیتا ہے۔ پھر رتن کی چارپائی پر بیٹھنا چاہتا ہے۔ رتن جاگتی ہے اور تڑپ کر الگ کھڑی ہوجاتی ہے۔

"رادھا دیوی۔ رادھا دیوی"۔

رادھا دیوی کی آنکھ کھلتی ہے اٹھنے کی کوشش کرتی ہے مگر اٹھ نہیں سکتی۔ ہائے رام کلائیاں دکھ رہی ہیں۔ پتی دیو کہاں ہو؟

رتن ۔ بھائی کھلاون۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ ہٹئے تو میں اپنی بہن کو کھول دوں۔

کھلاون ایک طرف ہوجاتا ہے۔ جب رتن بڑھتی ہے تو چاہتا ہے کہ پکڑ لے مگر رتن بجلی کے سمان تڑپ کر کترا جاتی ہے۔

رتن ۔ کیسے ہو رہے ہیں بھائی۔ کیا آج بہت پی گئے ہیں آپ؟

کھلاون ۔ (قہقہہ لگاکر) ہاں پیاری۔ پران پیاری رتن۔ پریم سے مستانہ ہو رہا ہوں۔

رتن ۔ بہن کو ایسے کہتے ہو بھائی۔

کھلاون ۔ ارے بس رے بھولی بھالی بہت نخرے نہ دکھا چھوکری آج تو سارے دیوی دیوتا آجائیں تو بھی تجھے نہ چھوڑوں گا۔

غم کے جگر پہ چھالے پڑے ہیں ٭ جل جل کے اس دل میں چھالے پڑے ہیں

گردن میں پریم کے مالے پڑے ہیں

بھاؤ بتا بتا کر ناچتا ہے۔

رادھا ۔ کیسے ہو رہے ہو سوامی!

کھلاون ۔ چپ رہ سوامی کی خالہ۔ تو نے ہی اس دن اس ترمال کو میرے پنجے سے چھڑا لیا تھا۔

رتن ۔ ہائے رام کہاں جاؤں (چاروں طرف دیکھ کر) سارے کواڑ بند ہیں۔

رادھا ۔ اور میں بندھی ہوئی ہوں۔ کھلاون پیارے تم ہوش میں نہیں ہو۔

کھلاون ۔ چپ رہ لنگورنی۔

رادھا ۔ میں تمہاری دھرم پتنی ہوں۔

کھلاون ۔ اور میں تمہارا دھرم پتنا ہوں۔

رادھا ۔ میری بہن کو چھیڑو گے تو میرا رواں رواں۔

کھلاون ۔ بکے ہی جاتی ہے۔ چپ ہوجا نہیں تو۔

رادھا ۔ نہیں تو کیا ہوگا سوامی۔

کھلاون ۔ تیری ہڈیاں کچل ڈالوں گا۔

رادھا ۔ (زور سے ہنسکر) ؎

بال نہ بیکا کر سکے جو جگ بیری ہوئے ٭ باکو کبھیں سائیاں مار نہ سکتے کوئے

کھلاون تو سہی کہ ان گورے گالوں پر نیل نہ بنادوں۔

رادھا ۔ (قہقہہ لگاکر) تم مجھے چھو بھی نہیں سکتے پتی۔

کھلاون ۔ رہ تو بہادر من۔

کھلاون جوش میں چارپائی کے پاس پہونچتا ہے اور طمانچہ مارتا ہے
رادھا کے منہ میں ایک انگلی آجاتی ہے وہ زور سے دبالیتی ہے۔
کھلاون ہائے ہائے کرکے تڑپ اُٹھتا ہے پھر بائیں ہاتھ سے رادھا کا
گلا دباتا ہے۔ انگلی چھوٹتی ہے مگر خون بہہ رہا ہے۔
اتنے میں رتن نے موقعہ پاکر بھالی کی نوک کھلاون کی پیٹھ پر
رکھدی۔ دیکھیے بھائی کھلاون آپ ہلیں گے تو میں نہیں جانتی
بھالی پیٹھ سے پار ہو جائے گی۔
کھلاون پہلے تو سن ہوگیا پھر بڑی پھرتی سے روم گھوم کر سامنے آگیا
رتن ہکا بکا ہوگئی۔ کھلاون نے بائیں ہتھیلی سے داہنا ہاتھ
تھام کر مروڑ دیا بھالی چھوٹ گئی۔

کھلاون۔ (قہقہہ لگاکر) اب کہو رتن۔ اب بولو رادھا۔ ہا ہا ہا۔
کتنی سندر ہو رتن۔ کیا جوبن ہے۔ او ہو ہو۔ ابھی ابھی اس
میٹھے رس کو جی بھر کے پیتا ہوں۔

رادھا نے دونوں ہاتھ کھول لئے تھے۔ تڑپ کر اُٹھی اور
کھلاون کی لانبی چوٹی پکڑ کر کھینچ لی۔ رتن چھوٹ گئی۔ اب
سارے کمرے میں آفت مچ گئی۔ کھلاون ایک طرف جاتا تھا
تو دوسری طرف سے کوئی نہ کوئی چیز کبھی سر پر پڑتی تھی کبھی
کہیں۔ پھر بھی حرامزادے کی رتّی درانہ ہے اس نے دونوں
چاروں کلائیاں ایک ایک ہاتھ سے پکڑ لیں۔ مگر خون بہنے سے
مرنیپت ہوگیا۔
کمرے کے باہر بڑی جنگ ہو رہی تھی ایک طرف گاؤں کی گوہار
اور دوسری طرف سنڈے منڈے موالی۔ بڑی دیر کے بعد
سب لوگ گرفتار ہوگئے۔
کھلاون کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ہاتھ پاؤں بندھے ہیں۔ رتن
سروپ کی گود میں بیہوش پڑی ہے۔ سداآہٹ کھڑا مسکرا رہا ہے
سلامت چپ چاپ ہے۔ رادھا اپنی گود میں پتی کا سر لئے
بیٹھی ہے۔

(رتن چونک کر اٹھ بیٹھتی ہے۔ پرمیشر میں سوپن دیکھ رہی ہوں
بڑی انند ہے پران ناتھ۔ کیا سچ مچ میں جاگ رہی ہوں۔
(آنکھ ملتی ہے)

سروپ۔ (کلیجے سے لپٹا کر) تم جاگ رہی ہو رتن! یہ پرلوک نہیں پران
پیاری۔

رتن۔ (دکھی ہو کر) مجھے وشواس نہیں ہوتا۔

سروپ۔ (ایک بوسہ لے کر) وشواس کرو رتن۔

رادھا۔ (رتن کے پاؤں پڑ کر) دیوی اپنی دکھی بہن کی لاج رکھ لو۔
میرے سوامی کو چھوڑ دو۔

رتن۔ پران ناتھ یہ استری نہیں دیوی ہے۔ میری آتما میری جان
میری آبرو سب اسی دیوی نے بچائی ہے سروپ۔ کھلاون کو
چھوڑ دیدو۔

کھلاون (رو کر) میں چھوٹنا نہیں چاہتا۔

سداآہٹ۔ تو پھر کیا چاہتے ہو بابو جی۔ لڈو۔ پیڑا۔ برفی۔ بالوشاہی
سلیم شاہی۔

کھلاون۔ تیرے پاپی راکشس اور ملچھ کو اب موت چھوڑ کر کسی کی کامنا
نہیں۔ سداآہٹ میں نے مورکھتا کی تھی۔ تم میرے بس میں
تھے۔ میں نے ایک ٹھوکر لگائی تھی اب میں تمہارے بس میں ہوں
تم تین ٹھوکریں لگا لو۔

سداآہٹ۔ (کانپ کر) کیا کہتے ہیں بابو جی۔ میں نے آپ کا نمک کھایا ہے
اگر آپ اپنے پاپوں سے توبہ کرتے ہیں تو میں اب بھی آپ کا
داسی ہوں۔

کھلاون۔ اور پران پیاری رادھا تم بھی چھما کرتی ہو۔

رادھا۔ مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو پیارے۔

سلامت سروپ کا اشارہ پاتے ہی ہاتھ پاؤں کھول دیتا ہے
کھلاون اُٹھتے ہی سروپ کے پاؤں پر گرتا ہے۔ یہ سر آج تک
کسی کے سامنے نہیں جھکا تھا شے سروپ۔ آپ دیوتا ہو۔
رتن دیوی آج سے میری بہن ہیں۔
سروپ پاؤں سے اٹھالیتا ہے۔ رتن کیا کہتی ہو۔

رادھا۔ کہو سوامی۔
کھلاون شرماکر منہ پھیر لیتا ہے
کاسی۔ (دھیرے دھیرے ھوں ل . . ں

[illegible]





(4) کیرن دھار کے قلم کا نمونہ - پیر مرد -



[illegible] کے قلم کا نمونہ

رتن - پران ناتھ اگر آپ چھما کریں تو میں بھی۔
سروپ - اگر آپ کریں تو میں بھی۔
رتن - پہلے آپ۔
سروپ - پہلے آپ۔
سلامت - یہ تو لکھنؤ کا تکلف ہے۔ آپ آپ میں ریل چھوٹ جائیگی
رتن - میں چھما کرتی ہوں (مسکراتی ہے)
سروپ - اور میں بھی۔
سلامت - کیوں بھائی کھلاون ہم سے چھما نہیں مانگتے۔
کھلاون - (ہاتھ جوڑکر) آپ بھی چھما کیجئے۔
سلامت - (ہاتھ کھول کر گلے لگا لیتا ہے) مگر ایک شرط سے۔
کھلاون - وہ کیا۔
سلامت - ہنس دو۔
کھلاون - دانت نکال دیتا ہے۔
سلامت - (قہقہہ لگاکر) ایسے نہیں ایسے۔
کھلاون - (ہنسکر) اس سماں۔
سلامت - اسی سماں۔ کیا کالج والی ہنسی کی گھوڑ دوڑ یاد نہیں۔

. . . .

. . . .

کھلاون اور سلامت بے اختیار قہقہے لگاتے ہیں جیسے نوجوانوں میں ہنسی کا مقابلہ ہوتا ہے۔ سروپ اور سدا اہٹ بھی ہنستے ہیں۔ مگر کم آواز سے۔ رتن اور رادھا بھی ہنستی ہیں مگر بے آواز۔

وہی برسات اور چاندنی رات مگر باغ میں بہت سے جھولے پڑے ہیں۔ لط اور موسک کے بہت سے جوڑے مست ہیں۔ چھ جھولے پڑے ہوئے ہیں۔

جوان چھوکریاں اور جوان چھوکرے جھلا رہے ہیں۔

جھولا نمبر (۱) سروپ اور رتن۔ دولہا اور دولھن بنے ہوئے۔
" (۲) سلامت اور چندا " " " " "
" (۳) شیولوبدھ اور کامنی " " " " "
" (۴) کھلاون اور رادھا " " " " "
" (۵) رام لال اور سدا ما
" (۶) انسپکٹر صاحب اور موتی " " " " "

کلیوں اور پھولوں کے گجرے پڑے ہیں۔ سروپ اور رتن گاتے ہیں سب ساتھ دیتے ہیں۔ کہیں کہیں سدا ما ہکلاتی ہے یا موتی غلط شبد استعمال کرتی ہے۔ تو لوگ مسکرا دیتے ہیں۔ پریم ہی تن ہے پریم ہی من ہے رام لال اور دار وغہ جی کو گانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے بار بار توند پر ہاتھ پھیرتے ہیں ؛

(سید طالب علی۔ عابد)

زورِ بیان

(اثر جناب فراقؔ گورکھپوری)

ابھی تک عندلیبِ زار کی حسرت نہیں نکلی ۔۔۔ سرِ گلشن لہو میں تر گلوں کی آستیں نکلی
بہارِ گل نے آنکھیں پھیر لی ہیں ہم اسیروں سے ۔۔۔ ہر اک موجِ ہوا گلزار سے چیں بر جبیں نکلی
یہ مستوں میں شورِ ہر چہ بادا باد ہے ساقی ۔۔۔ چھری کھینچے ہوئے موجِ شرابِ آتشیں نکلی
دلِ عشاق پر پیہم گرا کیں بجلیاں لیکن ۔۔۔ ہزاروں میں کروڑوں میں نگاہِ شرمگیں نکلی
دیارِ کفر و ایماں سے تو زاہد جی اچٹتا ہے ۔۔۔ جو دل کھینچے وہ ملکِ عشق ہی کی سرزمیں نکلی
فریبِ دید پر مارے خوشی کے جان دے بیٹھے ۔۔۔ محبت وہ کہ دنیا کہہ اٹھے حسرت نہیں نکلی
دبے تھے جو شرارے میں وہ دوزخ میں نہیں ملتے ۔۔۔ زمیں دل کی بھی یارب کس قیامت کی زمیں نکلی
جو ہوش آیا تو کثرت گاہ عالم کا بھرم ٹوٹا ۔۔۔ وہ غفلت تھی کہ جس سے ہر تمیزِ آن و ایں نکلی
نمودِ شاہدِ دنیا بھی تھی جاتی ہوئی دنیا ۔۔۔ نگاہِ حسنِ عالم بھی نگاہِ واپسیں نکلی
حریمِ نازِ دل نے کر دیا ہے بزمِ عالم کو ۔۔۔ کہ جو صورت نظر میں کھب گئی خلوت نشیں نکلی
وہ ہم تھے جس نے بارِ عشق اٹھایا وقت آنے پر ۔۔۔ فرشتے تیرے نکلے آسماں نکلا زمیں نکلی
بہارِ جلوۂ صبحِ ازل کو دل نہیں بھولا ۔۔۔ پڑی جس کی نگہ اس پر نگاہِ اولیں نکلی
گلوں کا زخمِ پنہاں پیرہن در پیرہن نکلا ۔۔۔ صبا کی موج لرزاں تیغ کیں در تیغ کیں نکلی

فراقؔ اب تو دلِ بے مدعا بھی مٹ چکا کب کا
کہے جاتی ہے چشمِ شوخ ابھی حسرت نہیں نکلی

(فراقؔ)

اُردو زبان پر ایک خطبہ

(از جناب محمد مشیر احمد علوی ناظر کاکوروی بی اے علیگ)

خدا رکھے زباں ہم نے سُنی ہے میر و میرزا سے
کہیں کس مُنہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ شعر مصحفی نے کس سن میں کہا ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ وہ ۱۷۷۰ء میں ایک مستند شاعر تسلیم کئے جاتے تھے۔ ڈاکٹر جان بی گلکرائسٹ نے ۱۷۹۶ء میں لکھا ہے کہ "مخلوط زبان اردو[1] کہلاتی ہے۔ جو دربار کی مہذب زبان ہے اور جو بفضلہ آج بھی ہندوستان کے وسیع صوبجات میں رائج ہے۔"

چونکہ ہم کو مصحفی کے شعر کا سن نہیں معلوم ہو سکا اس لئے ڈاکٹر گریم بیلی کے قول کے مطابق گلکرائسٹ کو اس افضلیت کا شرف حاصل ہے کہ اسنے ادبیات میں اردو کو ایک زبان کے نام کی حیثیت سے استعمال کیا۔ جولیس بلاخ[2] نے ایک عجیب و غریب بات لکھی ہے وہ یہ کہ اردو کا نام یورپین مستشرقین کا رہین منت ہے لیکن اس دلیل کی کوئی سند نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں یہ قابل غور مسئلہ ہو کہ اردو گلکرائسٹ کے خیال میں ایک مشہور زبان کا نام تھا جس کا استحکام بھی ہو چکا تھا۔ اس بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی اردو کا لفظ استعمال کرتے تھے گلکرائسٹ خود اس زبان کو ہندوستانی کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ ڈبلیو ایچ بیلی نے (انگریزی میں) "ہندوستانی" تعلیم میں ۱۸۰۲ء جو اب بھی سلطنت برطانیہ میں موجود ہے اور شائقین اس سے مستفید ہو سکتے ہیں لکھا ہے کہ جس زبان کو میں نے ہندوستانی لکھا ہے وہ کبھی کبھی ہندی۔ اردو مسلمانی اور ریختہ بھی کہلاتی ہے۔ سید انشا نے بھی دریائے لطافت میں لکھا ہے[3] کہ خوش بیانان آنجا متفق شدہ (زبان سے متعدد الفاظ دلچسپ جدا نمودہ و در بعض عبارت بکار بردہ زبان تازہ سوا زبان ملے دیگر درسانیدہ و بہ اردو ماسوم ساختند۔

باغ و بہار میں میر امن نے بھی اردو کی پیدائش پر مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔ گو وہ اردو کو علیحدہ استعمال نہیں کرتے ہیں بلکہ ہر جگہ اردو کی زبان استعمال کرتے ہیں:-

"حقیقت اردو زبان کی بزرگوں کی زبان سے یوں سُنی ہے کہ دلّی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے انہیں کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکھا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا۔ پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے۔ اس آمدورفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ آخر امیر تیمور نے (جنکے گھرانے میں اب تک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے) ہندوستان کو لیا۔ انکے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا اسواسطے شہر کا بازار اردو کہلایا۔ جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سنکر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی اکٹھے ہونے سے آپس میں

---

[1] ہندوستانی زبان کی قواعد صفحہ ۲۶۱
[2] اردو نام ہندوستان شکر ... [illegible]
[3] میوزیم۔

لین دین۔ سود اسلف۔ سوال جواب کرتے ایک زبان
اردو کی مقرر ہوئی۔

جب حضرت شاہجہاں صاحب قران نے قلعۂ مبارک
اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا..........
تب سے شاہجہاں آباد مشہور ہوا (اگرچہ دلّی جدی ہے
اور وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے اور وہاں کے
بازار کو اردوے معلّے خطاب دیا۔"

سیاق کی عبارت سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی خاص نام کے فکر میں ضرور مستغرق ہیں اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ فارسی۔ ہندی۔ اسم معرفہ کی حثیت سے بہت قبل سے مشہور ہیں۔ لیکن لفظ اردو کو غیر معمولی ہردلعزیزی و مقبولیت اٹھارھویں صدی کے آغاز سے قبل نہ ہوسکی۔ ہم د میر تقی میر کے نکات الشعرا میں سب سے پہلی بار زبان اردوئے معلے نظر آتا ہے جو ۱۷۵۲ء کی تالیف ہے۔ چنانچہ ذکر میر (صفحہ ۳) میں یہ عبارت موجود

پوشیدہ نماند کہ در فن ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اردو معلے شاہجہاں آباد دہلی کتابے تاحال تصنیف نہ شدہ۔

یہاں ڈاکٹر گرہیم بیلی کا خیال ہے کہ اردوے معلّے سے مفہوم میر کا اسی زبان سے ہے جو بامحاورہ ہو اور دہلی کی مستند اور فصیح اردو ہو۔

مخزن نکات میں قائم نے دو برس بعد لکھا ہے کہ

"اکثر از ترکیبات فرس کہ موافق محاورہ اردوے معلّے مانوس گوش می یابند منجملہ جواز البیان می دانند۔"

یہاں بھی بیلی کے خیال میں اردوے معلّے سے مفہوم "صحیح اردو محاورہ ہے" اور مصنف کو فوج کا خیال بھی نہ ہوگا۔ لیکن چونکہ میر اور قائم اس جدید زبان کو ہندی یا ریختہ ہی کے نام سے یاد کرتے ہیں تو غالباً اس عبارت کا مفہوم "زبان یا محاورہ فوج" ہوگا۔ میر کے بیٹے عرش جو انیسویں صدی میں حیات تھے۔ کہا ہے کہ

> ہم ہیں اردوے معلّے کے زباندان اے عرش
> مستند ہے جو کچھ ارشاد کیا کرتے ہیں

اس شعر کا بھی سن نامعلوم ہے۔ شاعر کے باپ کا انتقال ۱۸۱۰ء میں ۸۶ کی عمر میں ہوا۔[1]

محمد عطا حسین نے نوطرز مرصع میں جو ۱۷۹۰ء کی تصنیف ہے "زبان اردوئے معلّے" استعمال کیا ہے۔ اور تذکرہ گلزار ابراہیم میں (جسکو علی ابراہیم خاں نے ۱۷۸۳ء میں مرتب کیا تھا) وہ مالت خاں ثابت کے حالات میں لکھا ہے کہ تتبع زبان اردو نمودہ۔ اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ وہ اردو زبان کا اتباع کرتا تھا۔ یا اردو کی زبان یا اپنی توجہ اس طرف منعطف کی تھی۔ مصحفی کے تذکرہ شعرائے ہندی میں (جو ۱۷۹۳ء میں مرتب ہوا تھا) محمد امان نثار کے حالات میں لکھا ہے کہ ادائے زبان اردو اس کا مفہوم یا تو طرز اردو زبان ہے یا زبان اردو ہوسکتا ہے۔

یہ ہمیشہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس زبان کا آغاز فوج یا چھاؤنی کی گفتگو سے ہوتا ہے (زبان اردو) اور ارتقائی حیثیت میں لفظ زبان حذف کر دیا گیا اور کثرت استعمال سے محض اردو ہی باقی رہ گیا۔ ہم کو یہ معلوم ہے کہ شعر میں مصحفی نے لفظ اردو پہلی بار استعمال کیا تو ہم نے قرائن سے یہ طے کر سکتے ہیں کہ مصحفی کے اس شعر کا کیا سن ہوسکتا ہے تو ہمارے خیال میں مصحفی نے یہ شعر ۱۷۹۷ء کے لگ بھگ میں کہا ہوگا۔ جب شاعر کی عمر ۴۰ سال کی ہوگی۔ اب ہمارے سامنے یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ یہ لفظ پہلی بار ۲۰۰ سال مغل قائد افواج لاہور میں استعمال کیا گیا یا تقریباً ۔۔ سال بعد افواج کے مستقر ہونے کے بعد دہلی میں یا ۱۰۰ سال مابعد بابر نے اپنی چھاؤنی کا نام اردوئے معلے رکھا۔ اردو زبان ۵۰ سال قبل سے اس نام سے تحریرات میں عالم وجود میں آئی جس نام سے یہ آجکل یاد کی جاتی ہے اور اگر ہم اولین تاریخ ۱۷۵۲ء تسلیم کرلیں جب میر نے اس زبان کو شاہی چھاؤنی کی زبان استعمال کیا ہے ہم اعداد میں سے [illegible] کر دیتے ہیں۔ دور مغلیہ کے کسی مورخ نے لفظ اردو استعمال نہیں کیا۔ ہم کو حسب ذیل سوالات کے جوابات بھی دینا ہے۔

(۱) اردو کا نام صدیوں بعد کیوں دیا گیا؟

(۲) اگر اٹھارھویں صدی میں یہ نام وضع کیا گیا ہے تو اس زبان کے لئے یہ نام کیوں منتخب کیا گیا جبکہ سالہا سال قبل یہ نام فوج کا تھا۔

[1] ڈاکٹر گرہیم بیلی نے اپنی جدید تحقیقات کی بنا پر یہ لکھا ہے کہ میر کا سن وفات ۱۷۹۹ء ہے ۱۸۱۰ء غلط ہے۔

(۳) اگر فوج کا نام ۱۵۳۶ء تک (عہد بابری تک) اردو نہیں تھا تو وہ زبان جو ۵۰۰ سال سے قبل سے رائج تھی اس کا نام ضرور کچھ ہوگا۔ تو پھر وہ نام کیوں دور ہوگیا؟

اس مسئلہ کو بیان کردینا حل کردینے سے زیادہ آسان ہے میرے نزدیک اس کے سوا اس عقدہ کا دوسرا حل نہیں ہے کہ کوئی نام باصفت مثلاً زبان اردو عام بول چال کی گفتگو میں ضرور تھا۔ اس وقت سے پہلے بھی جبکہ فوج کو اردو کا نام دیا گیا اور وہی تدریجاً سالہا کے مابعد میں کتابوں میں داخل ہوگیا اور غالباً اس (تعین) وقت سے قبل جس کا ہم کو علم نہیں۔ کیونکہ لفظ اردو کا استعمال عہد مابعد میں ہو ڈاکٹر گریرسن جیسا کہتے ہیں کہ یہ ثبوت شرمندہ دلیل ضرور ہے۔ لیکن پھر بھی یہ خیال خضر راہ ضرور ثابت ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ہم کو یہ ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے۔ کہ عہد آغاز میں اردو ادب روزمرہ کی گفتگو زندگی کا مکمل آئینہ نہیں تھا۔ اور بہت کچھ بول چال میں زبان مستعمل تھی جن کی صدائے بازگشت کتابوں میں مفقود تھی۔

اٹھارھویں صدی اور اس سے قبل ہندی، ہندوی، عام نام اس زبان کا تھا جو ہندوستان میں عجمی و ہندی سماج کے امتزاج سے بن رہی تھی۔ اور ریختہ اس زبان کو کہتے تھے جو ادبی و شاعرانہ کی حیثیت کی حامل تھی۔

جعفر زٹلی (۱۶۵۹ - ۱۷۱۳) نے ایک شعر لکھا ہے۔ ؎

اگرچہ سخن کوڑہ کرکٹ است ؛ بہ ہندی و ہندی زبان اٹپٹ است

فضلی نے دہ مجلس میں (جو ۱۷۳۲ء کی تصنیف ہے) لکھا ہے۔ اور ابتک ترجمہ فارسی بہ عبارت ہندی نثر نہیں ہوا۔

اثر نے خواب وخیال (جو ۱۷۴۷ء کی تصنیف ہے) میں لکھا ہے کہ

ریختہ نے تب یہ شرف پایا ؛ جبکہ حضرت[1] نے اس کو فرمایا

خواب وخیال میں صفحہ پر فہرست تصانیف میں اردو کو ہندوی بھی کہا ہے

فارسی سو ہے ہندوی سو ہے ؛ باقی اشعار مثنوی سو ہے

افضل بیگ نے اپنے تذکرہ تحفۃ الشعرا میں (جو ۱۷۵۲ء کی تالیف ہے اور زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا ہے) مطلقاً انہیں شعرا کا تذکرہ ہے جو فارسی کے شاعر تھے۔ لیکن جہاں اردو کا تذکرہ ہے اسکو ہندی لکھا ہے چنانچہ میر عبدالحی وقار کے حالات میں لکھا ہے کہ اشعار فارسی و ہندی تاب درست دارد

چمنستان شعرا[3] میں صفحہ ۱۵۲ پر یہ عبارت موجود ہے

شاہ حاتم نے (اپنے متعلق) اپنے دیوان زادہ میں (جو ۱۷۵۶ء کی تالیف ہے) میں لکھا ہے کہ

درشعر فارسی پیرو میرزا صائب است و در ریختہ۔

ولی را استاد میداند۔

میر حسن (جن کی وفات ۱۷۸۶ء میں ہوئی ہے) ہمیشہ ہندی اور ریختہ استعمال کیا ہے اور اردو کو استعمال نہیں کرتے اور اپنی بیاض میں (جو ۱۷۷۸ء کی تالیف ہے) تذکرہ سخن آفرینیاں ہندی استعمال کیا ہے۔

شاہ عبدالقادر نے اپنے مشہور ترجمہ کلام مجید میں لفظ ہندی ہی استعمال کیا ہے۔

"اس میں زبان ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف کہ عوام کو بے تکلف دریافت ہو"

میر (۱۷۱۳-۹۹) سودا (۱۷۱۳ - ۸۱) اور قائم (۱۷۹۰) نے ریختہ میں استعمال کیا۔

میر نے لکھا ہے کہ

منعم کیسے کیسے کہے ریختہ ملے ؛ سمجھا نہ کوئی میری زبان اس دیار میں

لفظ ہندی پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے ابتدائے عہد میں قدرتاً یہی لفظ مستعمل تھا۔ بہت سے وجوہ ریختہ کے دیئے گئے ہیں۔ مثلاً ریختہ فارسی لفظ ہے جس کے معنی گرا ہوا یا ڈھالا ہوا اور اصطلاحاً ریختہ کا اطلاق ایسے کلام پر ہوتا ہے جو دو زبانوں (عربی و فارسی) پر مشتمل ہو۔ (۲) ریختہ کے معنی گرا ہوا ہیں چونکہ اردو کو ذلیل وحقیر تصور کیا جاتا تھا اس لئے اس کو ریختہ کہا گیا۔ (۳) اردو کو ریختہ اس لئے کہتے تھے کہ اس کے اندر ہندی عربی و فارسی الفاظ شامل کئے گئے تھے۔ (۴) ریختہ امیر خسرو کی

[1] حضرت سے مفہوم درد ہے جو استاد بھائی تھے۔

[2] آب حیات ایڈیشن ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۱۵ - محمد حسین آزاد۔

[3] تذکرہ چمنستان شعرا لچھمی نرائن شفیق۔ یہ تذکرہ انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہوچکا ہے۔

. روزمرہ ان کو بھی ایک اصطلاح ہے۔ کیونکہ ہندی الفاظ فارسی سخن میں لگانے سے زیادہ پیارے معلوم ہوتے ہیں (۵) ریختہ کے معنی ہیں مختلف مسالوں کی ایک پختہ اور مستحکم تعمیر کے۔ ناسخ کے بعد (المتوفی ۱۲۵۴ھ) شعرائے لکھنؤ نے لفظ ریختہ ترک کیا اور اس کے بجائے اردو استعمال کرنے لگے۔ مگر دہلی میں ۱۲۷۵ھ تک ریختہ مستعمل رہا۔

خضر بلگرامی نے جلوہ خضر میں لکھا ہے کہ ریختہ شاہجہاں کے عہد سے مستعمل ہے اس کے لئے ڈاکٹر گراہم بیلی کے الفاظ میں "ثبوت کی ضرورت ہے"

امیر خسرو نے اس جدید زبان کو زبانِ دہلوی لکھا ہے اور آئینۂ اکبری میں ابوالفضل نے بھی زبان دہلوی لکھا ہے۔

شاہ حاتم نے اپنے دیوان زادہ کے دیباچہ میں روزمرہ دہلی لکھا ہے

"روزمرہ دلی کہ مرزایان ہند در محاورہ آرند منظور دارد"

اور دوبارہ لکھا ہے کہ

"روزمرہ راکہ عام فہم وخاص پسند باشد اختیار نمود"

دکنی مصنفین میں شاہ میراجی (المتوفی ۱۴۹۶) نے جو مشہور مذہبی مصنف گزرے ہیں جو مبلغ بھی تھے۔ اردو ہی میں تبلیغ کیا کرتے تھے لکھا ہے کہ

یہ بولو ہندی سب اس ارتو کے سبب

ان کے بیٹے شاہ برہان الدین (المتوفی ۱۵۸۲) نے ارشاد نامہ میں لکھا ہے کہ

اب نہ ہندی بول۔

انہوں نے اس جدید زبان کا نام حجتہ البقائی گجری بھی استعمال کیا ہے۔

جے ہوے گیان بیکاری دیکھے بھاؤ گجری
جو لوگ عقلمند ہیں جو گجری کو ذلیل نہ سمجھیں گے۔ یہاں گجری سے اردو ہی مقصود ہے۔ اور ارشاد نامہ میں ہے کہ۔

یہ سب کیا گجری زبان

میں نے یہ سب گجری زبان میں لکھا ہے یہاں بھی گجری سے اردو ہی مقصود ہے۔

ملا وجہی نے قطب مشتری میں (جو ۱۶۰۹ء کی تصنیف ہے) جو ہندوستانی دفتر کی فہرست میں گمنام اور مختلف ناموں کے موجود ہے ۔ ۱۶۳۴ء میں ایک نثر کی کتاب سب رس تصنیف کی اور حمد وثنا کے بعد لکھا ہو کہ

[illegible] کی عرض میں ہوا پیلہ

آغاز داستان بہ زبان ہندوستان

یہاں سے دکھنی اور دہلوی اردو کا لطیف فرق [illegible]

دکھن کی زبان دکنی یا دکھنی کہلاتی تھی جیسے رستمی کے خاور نامہ (۱۶۴۹ء کی تصنیف ہے) لکھا ہے کہ "خاور نامہ دکنی کہتا ہو اس کا نام دکنی خاور نامہ لکھا ہے۔ شاہ ملک کے شریعت نامہ (جو ۱۶۶۷ء کی تصنیف ہے) لکھا ہے کہ "دکھنی میں بولیا ہے کہ یہ صاف دکھنی میں ہے۔ ہندوستانی دفتر کی فہرست میں غلطی سے مصنف کا نام شاہ ملک لکھ گیا ہے۔

ڈاکٹر بیلی نے اسی سلسلہ میں ایک یہ بھی تحقیقات کی ہے کہ زبان کا لفظ ہے جس کے معنی لشکر یا چھاؤنی (کیمپ) میں اور زبان کا لفظ ہورڈ (HORD) اسی سے مشتق ہے۔ ۱۱۹۳ء کے بعد دہلی میں جو اسلامی افواج تعینات رہیں انکو اردو یا اردو کہتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے فی الحقیقت اردو معلی کی بنیاد اس سے ۲۰۰ سال قبل یعنی ۱۰۱۰ء میں رکھی جا چکی تھی زندہ دلانِ پنجاب اس پر بجا طور سے فخر کر سکتے ہیں کہ جب سلطانی افواج کی چھاؤنی لاہور میں قائم ہوئی تھی اور وہ ولایتی سپاہیوں اور پنجاب لوگوں کی گفت وشنید اور داد وستد اور شادی وبیاہ واختلاط کے سلسلہ میں ایک جدید زبان بننا شروع ہوئی جو آئندہ چل کر اردو کہلائی۔ گویا زبان اردو کا سب سے پہلا پودا وہ تھا جو پرانی [illegible] زمین میں فارسی و ترکی الفاظ کی تخم ریزی سے اس سرزمین میں پیدا [illegible] اور اس کے بعد جب ۱۱۹۳ء میں مسلمان افواج کی چھاؤنی دہلی [illegible] قائم ہوئی تو وہ پودا [illegible] اور لوچ دار کھڑی بولی [illegible] جدید زبان کا مورث اعلےٰ بن گیا۔

تاریخ بیہقی سے پتہ چلتا ہے کہ جب سبکتگین نے اپنی نئی سلطنت کا پتلا بنا کر کھڑا کیا اور ہندوستان کی بولیوں میں عربی و فارسی کے ترد میل کا وقت آیا اسوقت پشاور۔ پنجاب اور غزنین میں صلح اور لڑائی کے تعلقات قائم تھے۔ آمد ورفت۔ جنگ۔ صلح وآشتی کے لئے دونوں قوموں کی زبانوں میں اختلاط کا موقع موقع آگیا تھا۔ اس وقت

میں ہزار ہا ہندوستانی موجود تھے جو یہاں سے نوکری کے لئے اور دوسرے طریقوں سے یہی گئے تھے اور امیر سبکتگین کی فوج میں دوسری اقوام کے دوش ہندو بھی داخل تھے۔

"ولشکر خواستن گرفت و بسیار مردم جمع شد از ہندو خلیج و از ہر دستی"[1]

محمود کے دربار میں ہندی کا مترجم تلک تھا جو فارسی جانتا تھا اور نامہ و پیام کی خدمت اس کے سپرد تھی۔

"خطے نیکو ہندوی فارسی و مدتے دراز بکشمیر رفتہ بود و شاگردی کردہ — دبیری و مترجمی کردی با ہندوان"[2]۔

آل سبکتگین میں (جو آل مسعود کے عہد میں مرتب ہوئی تھی) بھی ایک ہندو بیربل کا ذکر موجود ہے جس کا تعلق دفتر انشا سے تھا۔

"ہمچناں بیربل بدیوان ما"

محمود کے دربار میں جہاں عرب و عجم کے اہل علم تھے وہاں ہندوستان کے بھی شریک بزم تھے۔

کالنجر کے راجہ نندا نے ۴۱۴ھ میں سلطان کی مدح میں ایک ہندی شعر بھیجا۔ تو اس کی دربار خسروی میں بڑی قدر ہوئی۔ یہ واقعہ فرشتہ میں ہے۔

"نندا بزبان ہندی در مدح سلطان شعرے گفتہ نزد او فرستاد و سلطان بعلمائے ہند و عرب و عجم کہ در ملازمت او بودند نمودہ ہمگی تحسین و آفرین کردند"

یہ وہ عہد تھا جب لاہور بھی فتح نہیں ہوا تھا۔ اس زمانہ میں بھی سلطان کے ہاں عرب و عجم اور ہند کے فضلا پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے اور سب استاد ذوق رکھتے تھے کہ شعر کو سمجھ لیں اور مزہ لیں اس عہد کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان جو لاہور کا رہنے والا تھا اس نے عربی و فارسی اور ہندی کا دیوان یادگار چھوڑا ہے۔

"گہے بہ تازی وگہے بہ پارسی وگہے بہ ہندی"[3]

یہ شوق روز بروز ترقی کرتا گیا۔ حتیٰ کہ ایک ترک خاندان جو دہلی میں رہتا تھا امیر خسرو جیسا ہمہ داں شاعر پیدا ہوا جس نے عربی فارسی ہندی میں علیحدہ علیحدہ بھی اور زبانوں کے مصرعوں کو بھی ملا کر بھی شاعری کی چنانچہ انہوں نے خود بھی اپنے دیوان غرۃ الکمال کے خاتمہ میں اس پر فخر کیا ہے۔ یہی میل جول سے جو زبان بنی اس کا پہلا نمونہ ہم کو ۷۱۶ھ میں خسرو تغلق کے عہد میں ملتا ہے سنہ مذکور میں سلطان ٹھٹھہ ناکام حملہ کر کے گجرات چلا گیا۔ تو ٹھٹھہ والوں نے اسکو اپنے شیخ کی کرامت سمجھ کر کہا۔ "برکت شیخ تھیا اک مواک تھا" یعنی شیخ کی برکت سے ایک حملہ اور (محمد تغلق نے ۷۵۲ھ میں حملہ کیا تھا) اور دوسرا (فیروز تغلق) ناکام رہا۔ ۱۱۹۳ھ میں دہلی پر قبضہ کر کے بحیثیت سلطان کے (اپنے آقا کی وفات کے بعد) حکومت شروع کر دی۔ اس کی فوجوں نے لاہوری افواج کو مغلوب کر کے بعض سپاہیوں سے دوستی پیدا کی اور دونوں افواج دہلی گئیں اور رسل و رسائل کے ذرائع قائم رکھنے کے لئے بہت کافی فوج لاہور میں بھی چھوڑی گئی۔ اور ایبک کے لئے یہ ضروری بھی تھا کہ وہ سب مغلوب سپاہ کو دہلی لے جائے تاکہ لاہور میں بغاوت کا کوئی خدشہ باقی نہ رہ جائے۔ لہٰذا ایک بہت بڑی جماعت جو قطب الدین ایبک کے ساتھ دار الخلافت میں داخل ہوئی وہ یقیناً سی زبان (اردو) بولتی تھی جو نتیجہ بھی اس امتزاج و اختلاط کا ہندی و افغانی سماج کے معاشرتی جذبات کی پذیرائی کا اور یہ فوج ظفر موج جب دہلی آئی تو یہاں بھی اس نے قدیم کھڑی بولی کو متاثر کیا اور یہی آگے چل کر اردوئے معلیٰ بن گئی۔

ان ابتدائی حالات پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اردو کا وطن اصلی لاہور ہے نہ کہ دہلی اور ابتدائی پنجابی اس کے اجداد میں شمار ہو سکتی ہے اور برج بھاشا کو اس سے کوئی دور کا بھی علاقہ نہیں ہے۔ بدنصیبی سے اس دور کی کوئی مستند کتاب ہم کو نہ مل سکی جس سے ہم یہ طے کر سکتے کہ قدیم ابتدائی پنجابی کی شکل کیا تھی لیکن یہ یقینی ہے کہ وہ قدیم کھڑی سے زیادہ مختلف نہ ہوگی برج بھاشا کا کوئی سوال ہی نہیں ہے یہ مابعد کی غلط تحقیقات کا نتیجہ ہے جو ممالک متحدہ والوں کی طبعزاد ہے۔ ۱۳۲۲ھ میں جب

---

[1] تاریخ بیہقی صفحہ ۲۲۱ و صفحہ ۵۰۹ کلکتہ ۔ [2] تاریخ بیہقی صفحہ ۱۰۴ کلکتہ ۔ معارف ا ۔ جلد ۳۲ صفحہ ۱ ۔ [3] لباب الالباب ۔ صوفی جلد ۲ صفحہ ۲۴۴ گب اڈیشن ... جلد ۲ صفحہ ۔ [4] حکیم صاحب کو خوش ہونا چاہئیے اور حاسدان ادب کو جلنا چاہئیے اگر آج اردو کی ترویج و اشاعت میں پنجاب آگے ہے تو اس کا حق ہے ۔ [5] اس خطبہ میں بہت سی کتابوں سے امداد لی گئی ہے ۔ اور سب سے زیادہ ڈاکٹر گریہم بیلی کے ایک مضمون سے ۔

پریم ساگر کی ایک رات

(از جناب خورشید اقبال حیا میرٹھی)

نظر تاروں کی جھپکی جا رہی ہے
فضائے دہر کو نیند آ رہی ہے

سکوتِ شب سکوں بردوش آیا
درختوں پر خموشی چھا رہی ہے

شگوفے نرم و نازک کھل چلے ہیں
ہوا سرد اور پُر نم آ رہی ہے

اُفق سے چاند چپکے چپکے نکلا
تجلی اُس کی بڑھتی آ رہی ہے

منوّر چاند کے میٹھے اثر سے
فضا پُر نور ہوتی جا رہی ہے

ستاروں کی یہ ہلکی مسکراہٹ
فضا میں جس سے تابش آ رہی ہے

سریلے راگ پریم اور پریت کے گیت
کہیں پھولوں پہ بلبل گا رہی ہے

ہواؤں میں ہیں ہلکے ہلکے نغمے
سکون بنکر مسرت چھا رہی ہے

کسی نے بانسری میں راگ چھیڑا
صدا کچھ دھیمی دھیمی آ رہی ہے

نہ جاگ اُٹھیں کہیں خوابیدہ کلیاں
ہوا دھیمے سروں میں گا رہی ہے

رواں ندی کی موجیں ہیں سکوں سے
لطافت موج پر لہرا رہی ہے

یہ خاموشی یہ دلآویزیٔ شب
نگاہوں پر سکوں برسا رہی ہے

وہ روز و شب جو تھے اک خواب شیریں
تصور میں انہیں یہ لا رہی ہے

وہ دن جب زندگی تھی کیف یکسر
انہیں کی یاد پھر تڑپا رہی ہے

تصور پھر وہی دل آزما ہے
طبیعت ہے کہ مچلی جا رہی ہے

مری تخئیل میں پھر آ گئے وہ
نظر جن سے تجلی پا رہی ہے

تصور اُن کا کتنا کیف زا ہے
ابھی سے بیخودی سی چھا رہی ہے

نہ آؤں یاد جن کو بھول کر میں
مجھے کیوں یاد ان کی آ رہی ہے

محبت چھا گئی ہے میرے دل پر
محبت میرے دل پر چھا رہی ہے

ہلائے یاس ہے دل پر مسلط
گھٹا سی بن کے چھائی جا رہی ہے

پتہ ساحل کا کوسوں تک نہیں ہے
محبت کس طرف لے جا رہی ہے

اگر دلکش ہے ساحل تو مجھے کیا
میری کشتی تو ڈوبی جا رہی ہے

(خورشید اقبال حیا)

آہ۔ وہ عہدِ کیف بار!

(از جناب گوہر اقبال حورؔ)

آہ، وہ عہدِ کیف بار جب تھیں مسرتیں نصیب
میرا خیال میری یاد۔ دل سے کسی کے تھی قریب
چھایا ہوا تھا اک سکون اس دلِ ناشکیب پر — روح تھی میری مطمئن، وعدۂ پُر فریب پر
کھیل رہی تھیں عشرتیں، ذہن کے صبح زار میں — ڈوبا ہوا تھا ہر نفس کیفیتِ خمار میں
ایسی چلی ہوائے غم — شمعِ سکوں بجھا گئی
ٹوٹ پڑی بلائے غم — یاس کچھ ایسی چھا گئی
جلوۂ صبحِ کیف زا
شامِ الم میں چھپ گیا
چھا گئی تیرگیٔ شام — سو گیا بختِ خفتہ کام
مٹ گئی لمحہ بھر میں آس — رہ گیا میرا جی نراس
وہ تھی خوشی کی ابتدا
یہ ہے الم کی انتہا

یہ ہے الم کی انتہا۔ ٹوٹا پڑا ہے دلِ غریب
غم ہی مرا نصیب تھا، غم سے گھرا ہوا ہے دل
سیلِ ملال و یاس میں ڈوبتا جا رہا ہے دل
بیتی خوشی کی ساعتیں ہو گئیں اس طرح تمام — خواب میں بھی نہیں نصیب ایسا مٹا خوشی کا نام
زخمِ جگر میں ہے خلش نشترِ غم کی چھیڑ سے — آنکھ جراحت آشنا اشکِ الم کی چھیڑ سے
ختم ہوئیں مسرتیں — کیفِ حیات کھو گیا
خواب ہیں اب وہ راحتیں — میرا نصیب سو گیا
نقشِ محبت و وفا
دل سے کسی کے مٹ چکا
مٹ گئیں ساری حسرتیں — آہ! میری م[illegible]
دل ہے فگار و مضمـ[illegible]
[illegible]

کوہسار شملہ

(از نتیجۂ فکر مصورِ فطرت - ڈاکٹر تاج زبیری میرٹھ)

دیکھ اے حیرت نگر! شملے کا یہ کہسار دیکھ ۔ رفعت و رنگینیٔ و عظمت کا اک انبار دیکھ
نغمہ سنجانِ فرازِ کوہ کے نغمات سن ۔ دُور تک چوٹی پہ رقصِ ابرِ گوہر بار دیکھ
دیکھ یہ اونچے درختوں کی خموشی استادگی ۔ یہ شفق کے سائے میں رنگ نہفتہ زار دیکھ
رہ گذر ہیں جن سے چکراتا تھا رہرو کا دماغ ۔ سب وہ ناہمواریاں پھر ہو گئیں ہموار دیکھ
دیکھ آثارِ نمو کی یہ مسلسل شوخیاں ۔ آ، عروسِ رنگ و بو کو مستقل بیدار دیکھ
منکشف قدرت کا ہر رازِ نہفتہ ہے یہاں ۔ خاطرِ فطرت یہ ہر لحظہ شگفتہ ہے یہاں
دیکھ غیر آبادیوں میں دُور تک آبادیاں ۔ زندگی کے شور سے گونجی ہوئی ہیں وادیاں
ہر نفس مستی سے صد میخانہ در آغوش ہے ۔ یعنی حاصل ہیں نگاہ و ذہن کو آزادیاں
پتھروں کے ڈھیر اور ان میں بہر سو زندگی ۔ دیکھ یہ انسانِ ناقص کی جہاں ایجادیاں
یہ فضا یہ ہستیٔ غم آشنا کی عید گاہ ۔ مل رہی ہیں شادکامی سے گلے ناشادیاں
یہ ثریا خام کلیاں نازنینانِ بہار ۔ یہ حسین و مہ جبین کہسار کی شہزادیاں

سیر کر شملے کی ہر اندوہِ ہستی بھول جا
رفعتوں کا چاند بن جا رنجِ پستی بھول جا

غزل

(از جناب مصور قلم ماسٹر ...سط - بسوانی)

جو آئے ہو یہاں - آتش بیانی دیکھتے جاؤ ۔ لحد پر شمع کی شعلہ زبانی دیکھتے جاؤ
بُتو شانِ خدا ابھی تم کو کہکر جی نہیں بھرتا ۔ ابھی کیا ہے - ہماری حق بیانی دیکھتے جاؤ
سراپا سوز مثلِ شمع ہوں پر اُف نہیں کرتا ۔ زباں ہونے پہ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ
ذرا سنبھلے ہوئے اے عاشقو بحرِ محبت میں ۔ کہیں سر سے گزر جائے نہ پانی دیکھتے جاؤ
جو تم چاہو وہی اچھا - جو تم کہدو وہی بہتر ۔ ہماری ہمنوائی - ہم زبانی دیکھتے جاؤ
خلاصہ ہے نگاہِ واپسیں افسانۂ غم کا ۔ مرے جذباتِ دل کی ترجمانی دیکھتے جاؤ
کہاں پر پاؤں رکھتے ہو - کہاں پر پاؤں پڑتا ہے ۔ ذرا تم لغزشِ کیفِ جوانی دیکھتے جاؤ
تمہارا نام سب لیتے ہیں اور آنکھیں نہیں کھلتیں ۔ ذرا بیمارِ غم کی ناتوانی دیکھتے جاؤ
ابھی آغاز ہے افسانۂ اُلفت کا ہنستے ہو ۔ رُلائے گی تمہیں میری کہانی دیکھتے جاؤ

نہ پوچھو اس کی حقیقت ہے نہ باسطؔ اعتبار اس کا

ایران میں اقتصادی ارتقا کی ابتدا

رضا شاہ کا دہ سالہ کارنامہ

(از مفتی غلام جعفر بی اے صحیفہ نگار لاہور)

تاثرات مغرب ایک مدت سے دنیا پر موثر ہو رہے ہیں۔ امریکہ اور آسٹریلیا کی گرمیٔ حیات یورپ کے ہی نو آبادکاروں کے دم سے ہے۔ وہاں تاثراتِ مغرب تو بجائے خود مغربیت بلکہ مغربی زندگی کا عمل دخل ایک امر لازم تھا اور ہے۔ بلکہ مغربیت میں امریکہ تو مادر یورپ سے بھی پیش پیش ہے علیٰ ہٰذا القیاس افریقہ کے وہ قطعات جہاں سفید فام مغربیوں کا عنصر غالب ہے۔ خواہ بلحاظ کثرتِ آبادی و فوقیت و آزادی اور خواہ بلحاظ غصب و تصرف اقتصادی سحر مغرب سے مسحور ہیں اور ہونا بھی چاہئے تھا۔

رہا ایشیا۔ یہاں چین و جاپان اور ہند و افغانستان۔ گو نسبتاً بیش و کم مگر سب کے سب کچھ نہ کچھ بہرحال۔ زبانِ حال و قال سے مغرب کے مداح اور مغربیت کے مقلد بننے میں جد و جہد کی داد دیتے نظر آتے ہیں۔ کم سے کم معاشرہ کے بعض طبقے۔ بالخصوص پڑھے لکھے اور روپے پیسے والے تو مغرب زدہ ہوئے جاتے ہیں۔ پھر جاپان سا شاگرد رشید تو استاد سے بھی گوئے سبقت لیجانے میں کوشاں ہے بلکہ بعض صورتوں میں لے جا چکا ہے۔

ان سب سے قطع نظر اسوقت ہمارے خیالات اور تحقیقات کا مرکز شعاعی ایرآن ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں دو دمان زار کے روس اور انگلستان۔ ان دو دول یورپ کی رقابتوں اور فوقیتوں کے ہاتھوں ایران کی نکبت انتہا تک پہنچ چکی تھی اور بقول بعضے از مدبرین فرنگ ایران کی گردن کے ساتھ مغربی استعمار کی تسمہ بازی اپنا ہلاکت آفریں کھیل رہی تھی کہ اتنے میں۔ ع

"مردے از غیب بروں آمد و کارے کرد"

رضا شاہ پہلوی کی شخصیت حرکت و عمل کی علمبردار بن کر میدان میں نکلی اس نے جہاں قدیم قاچاری ملوکیت کا تار و پود بکھیرا۔ وہاں اس کے بجائے جمہوریت اور آمریت کے بظاہر اجتماع ضدین سے ایک جدید طرز حکومت قائم کیا۔ پارلیمانی مجلس کا قیام عمل میں آیا۔ مگر شخصی پنجۂ آہنی سے اس کا استحکام ہوا۔

اب اس جوہر قابل نے مغربیوں اور مغرب زدگیوں دونو کو راہ فرار دکھائی اور حریف و حلیف سب سے پہلوی خاندان کی حکمرانی منوائی مگر ساتھ ہی وہ شے بھی قبول کی جسے "تاثراتِ مغرب" یا بالفاظ صحیح تر "تاثراتِ عصرِ حاضر" کہنا چاہئے۔

آغازِ اصلاح

نکتہ جو اور نکتہ رس نگاہوں سے دیکھنے والے محققین اور ماضی حال و استقبال کا موازنہ کرنیوالے مدبرین کے نزدیک ایران نے آخری قاچاریوں کے عہد میں تاثراتِ مغرب اور مقتضیاتِ عصرِ حاضر کو بہت کم قبول کیا۔ اور اگر کچھ کیا بھی تو اس کی رفتار سست ہی رہی۔ اور کیوں نہ رہتی جبکہ اصل حقیقت میں اغیار بر سر کار تھے۔ روس اور انگلستان کو اپنے اپنے حلقۂ اثر یعنی شمالی اور جنوبی ایرآن میں اپنی اپنی ملک ساما مد سیاوسعا

سیاحت اور تاجرانہ منفعت سے سروکار تھا۔ اور بس۔ ان مغربیوں کو کیا پڑی تھی کہ اصلاحِ ایران کا دردِ سر بیکار مول لیتے۔ اُدھر آخری قاچاری سلطان ماشاء اللہ کجکلاہِ ایران ان کا یہ حال تھا کہ آئے دن ارضِ فرنگ کی سیاحت و سیر کا سودا ضرور ان کے سر میں سماتا۔ وہ یورپ کو اپنے قدوم مفتخر فرماتے۔ حسنِ فرنگ کی پرستاری اور تعیشِ فرنگ کی پاسداری میں خوب خوب انہماک دکھاتے۔ لاکھوں لٹاتے۔ مگر جب واپس آتے۔ تو فرنگستانیوں کے سیاسی۔ اقتصادی اور معاشری اطوارِ شائستہ میں سے کوئی سی شے ہمراہ نہ لاتے۔ ان کی سیاحتِ یورپ ایک گراں قیمت امیرانہ مشغلے اور شخصی تفریح و تفنن کے مشغلے سے بڑھ کر ثابت نہ ہوتی۔ اگر یہ عیش کے بندے ایک آدھ کام کی بات بھی سیکھ آتے اور اسے اپنے ہاں رائج کرتے تو غیر جانب دار مفکر و مورخ ان کے اسراف کو ایک حد تک حق بجانب قرار دیتے۔ اگر قسامِ ازل نے تقاضائے اصلاح رضا شاہ کو قسمت کیا تھا۔ جن کی آمد تک ایران وہ ولایت تھی کہ تاثراتِ عصرِ حاضر سے اثر پذیر ہونے میں باقی سب ایشیائی مملکتوں سے پیچھے ہی رہی تھی۔

غرض رضا شاہ کا دورِ جدید کا آغاز ہوگیا۔ اب پہلوی خاندان کے پہلے حکمراں نے فیصلہ کیا کہ تاثراتِ عہدِ حاضر تو ضرور درکار فرما ہوں مگر غلط کارانہ مغربیت سے گریز اور مغرب زدگی سے قطعاً پرہیز کیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب سے اب تک (یعنی سنہ ۱۹۲۵ء سے جب رضا شاہ تخت نشین ہوا آج تک) جہاں تک متعلق ہے اس کی اس حکمتِ عملی پر ایران برابر عمل پیرا ہے۔ اور اس نے عصرِ حاضر کے تقاضوں اور مطالبوں کے سامنے سرِ نیاز جھکا رکھا ہے۔

زمانۂ حالیہ میں ایران کی مادی ترقی اور نشوونما کے وسائل قدرتی کی تفصیل ایک بیان طویل ہے۔ اس لئے صرف چند نسبتاً زیادہ اہم امور کی کیفیت تحریر کی جاتی ہے۔

آج کل قاچاری جمود و خمود کی جگہ عمل و حرکت نے لے لی ہے۔ گزشتہ اور موجودہ کوائف میں بُعدِ عظیم رونما ہو گیا ہے۔

ترقی کی مختصر کیفیت

ایران کو حریفانِ فرنگ کا کچھ ایسا تلخ تجربہ ہو چکا ہے کہ آج وہ اغیار کو خوش [illegible] پہلے جب مسافر آتے تو ایرانی ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ ان میں تجارتی مراعات کے طلبگار فنونِ لطیفہ کے مشتاق اور اور لوگ ہوتے اور سب کچھ نہ کچھ لے مرتے۔ لیکن اب پہلے کی سی بات نہیں۔ ایرانی سرحد سے گزرنے کے بعد ہر نووارد سے پہلا مطالبہ یہ کیا جاتا ہے کہ بندہ پرور ذرا شفاخانے تک چلئے اور صحت کی سندات دکھائیے اور اگر آپ ان اسلحہ سے مسلح نہیں تو ہم نے متعدی امراض کے ٹیکوں کا بندوبست کر رکھا ہے۔ بازو بڑھائیے اور ٹیکہ لگوائیے اس پر اکثر اہلِ فرنگ بہت گھبراتے ہیں۔ چنانچہ باخبر تاجر اور سیاح گھر سے ہی ٹیکہ لگوا کر چلتے ہیں اس حقیقت سے یہ ثابت ہوا کہ اب ایران اولیں مغربی تاثر کا خوگر ہو گیا ہے اُسے بھی یورپ والوں کی طرح یہ منظور نہیں کہ ہر احمق بلا باز پرس سیدھا دراتا چلا آئے۔ بلکہ پہلے اپنی صلاحیت دکھائے۔

مٹی کا تیل

حفظِ صحت کا یہ اصول مالیاتِ ایران پر بھی عائد کر دیا گیا ہے۔ جیلے حوالے سے یا زور و جبر سے جیسا کہ پہلے ہوا کرتا تھا اور بغیر کامل تحقیقات اور معقول شرائط کے تجارتی حقوق اور معدنی پیداواروں کی اجارہ داری اغیار کے حوالے نہیں کی جاتی۔ مٹی کا تیل ایران کا ایک مدفون خزانہ ہے۔ اور وہی آج کل حکومتِ مرکزیہ کی آمدنی کا سب سے بڑا منبع و ماخذ ہے لیکن اس کی بہمرسانی کا انتظام عین مغربی اصولوں کے مطابق کیا گیا ہے۔ گو "اینگلو ایرانین کمپنی" واحد اجارہ دار ہے مگر اس کے اجازت نامے میں حکومتِ ایران نے اپنے حقوق نہایت عمدگی سے محفوظ کر لئے ہیں اور اس میں ایرانی سرمایہ شامل ہے۔

کسی زمانے میں کرمان شاہ متعدد تجارتی راستوں کا مرکز تھا جب دورِ انحطاط آیا تو کرمان شاہ کی قدیمی اہمیت رخصت ہو گئی۔ مگر اب مٹی کے تیل نے اُسے رونقِ تازہ بخشی ہے۔ پچھلے سال اس میں اضافہ ہوا یعنی شمالی اور مغربی ایران کو پٹرول مہیا کرنے کے لئے یہاں مٹی کا تیل صاف کرنے کا ایک عظیم الشان کارخانہ تعمیر کیا گیا۔ لوہے کے متعدد حوض سطحِ زمین سے بلند بنائے گئے ہیں۔ ان پر ایلومینیم کا غلاف چڑھایا گیا ہے۔ حوضوں میں چالیس لاکھ گیلن (ایک گیلن۔ قریباً پانچ سیر) تیل سما سکتا ہے جو ایک سو پینتالیس میل کے فاصلے سے تیل کے چشموں میں سے نکال کر یہاں

اجاتا ہے۔ چشمے نفت شاہ میں واقع ہیں۔ لوہے کے نل جو تین انچ
چادر سے بنائے گئے ہیں۔ اور اس لئے ان کا ہر ایک مربع انچ
رہ آنیس من دباؤ برداشت کرسکتا ہے۔ جس تیل کو چشموں سے کرمان
کے کارخانے میں لاتے ہیں دنیا بھر میں معدنی تیل کے چشموں اور
مالوں کا اہتمام و انصرام اعلیٰ درجہ کی مہارت اور کثیر سرمایہ کے
کا مرہون منت ہے۔ اور اس معاملہ میں ایران کی کارکردگی
اروائی حریفوں سے کسی صورت میں کم نہیں۔ دور رضا شاہی کے
میں حکومت ایران کی مالیات کا حال ناگفتہ بہ تھا۔ اب حالات
اصلاح ہیں۔ بلکہ ایک بڑی حد تک ہو چکے ہیں۔ اس میں مٹی کے
کی پیداوار اور آمدنی کو بہت بڑا دخل ہے۔ چنانچہ انتظام مذکور کو
شاہ کے دہ سالہ کارنامے کا ایک شاندار جزو قرار دینا چاہئے۔ یہ
نل اس راستہ سے لایا گیا ہے جو قدیم زمانے میں ایران کی ایک بڑی
راہ تھی۔ اور بغداد سے چل کر شمال مشرقی ایران میں گزرتی ہوئی
ند تک پہنچتی تھی۔

...رکار اور لاری کا رواج

پہلے جب اس سڑک پر مسافروں کے کاروان گزرتے تو کہیں کہیں
ں کے خیمے پلتے۔ مگر آج کل موٹر کاروں کے "کھنڈر" اور لاریوں کے
ہوئے ذریات نظر آتے ہیں۔ ایران میں موٹریں اکثر و بیشتر بلکہ
تمامتر امریکہ کی مسافت استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ موٹروں کی
ت بجائے خود ایرانی دولت میں نسبتاً فراوانی کی مظہر ہے اور یہ
بتاتی ہے کہ وسائل آمد و رفت ترقی پر ہیں جو ظاہر ہے کہ تجارتی صنعتی
زراعتی ترقی کی شرط اولے ہے۔ اس سے عصر حاضر کے دوسرے تاثر کا
پتا چلتا ہے۔

...ن کے کنستروں کا کارخانہ

تیل کی گرم بازاری سے ایک ضمنی صنعت بھی قائم
ہو گئی ہے۔ یعنی ہر سال پچاس لاکھ ٹین کے کنستروں کی ضرورت لاحق
نے کے سبب ان کی ساخت کا کارخانہ بھی بنایا گیا ہے۔ یہ بھی
ن شاہ میں ہے۔ خالی کنستروں سے کئی طرح کے کام لئے جاتے ہیں۔
مثلاً دیہات میں گھروں کی چھتیں اور ایک جگہ تو مسجد کے گنبد کو روپہلی
چمک دمک کا آئینہ دار بنانے کے لئے انہی کنستروں کے ٹین کا غلاف
بنا ہے۔

سفر میں آسانیاں اور رہزنی کا سدّباب

قدیم ایران میں سفری
مشکلات بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ علاوہ ازیں مسافت طے کرنے میں سخت
دیر و وقت پیش آتی تھی۔ چنانچہ اونٹوں کا کاروان بغداد چل کر پورے پانچ
ہفتوں میں طہران پہنچتا تھا۔ اب موٹر کاریں یہ فاصلہ اڑتالیس گھنٹے میں
طے کرتی ہیں۔ رضا شاہ سے پہلے بلکہ عین ۱۹۲۵ء میں جب وہ تخت نشین ہوئے
یہ امر معمولات سفر میں شامل تھا کہ کاروانوں پر رہزن حملہ کریں۔ چنانچہ یہ
لوگ مختلف علاقوں کے سرداروں کو محصول جان بخشی ادا کرتے اور جان و
مال سلامت لے جاتے تھے۔ لیکن آج شہنشاہ دولت ایران کا اسی ہزار
سپاہیوں کا لشکر نظم و ضبط کا ضامن ہے اور کرد جو خصوصیت سے رہزن واقع
ہوئے تھے رعب سلطانی تسلیم کرتے ہیں اور اسے موثر کرنے والی مشین گنوں کا
لوہا مانتے ہیں۔

ایران میں ریلوے

اکرمان شاہ کے شمال مشرق کی جانب وہ ریلوے لائن زیر تعمیر ہے جس کا مقصد ارض
ایران کی شمالی اور جنوبی حدود کو آپس میں ملانا ہے یہ لائن بے حد پیچ و خم
کھاتی چلی آتی ہے۔ اور تین سال تک تکمیل کو پہنچے گی۔ کم از کم تعمیر کا
پروگرام یہی ہے کہ موسم گرما ۱۹۳۶ء میں ایک حصہ شمال کی طرف سے آتا
ہوا اور دوسرا جنوب کی سمت سے جاتا ہوا۔ طہران میں آکر مل جائے۔
ساری لائن کا طول نو سو میل ہے۔ یعنی شمالی سٹیشن جو بحیرہ کیسپئین کی بندرگاہ
"بندر شاہ" پر واقع ہے۔ اس سے لے کر جنوبی سٹیشن تک جو خلیج فارس کے
ساحل پر بنایا جا چکا ہے۔ ہر دو حصص میں اس لائن پر ریل گاڑی کی
آمد و رفت جاری ہے۔ یعنی ان ٹکڑوں میں جہاں تعمیر ہر طرح سے
مکمل ہو چکی ہے۔ ایران کی اس ریلوے لائن کو بہت سی قدرتی
رکاوٹوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ بالخصوص وہ جغرافیائی مشکلات جو
ایران کے سلسلۂ کوہستان کے باعث پیدا ہوتی ہیں۔

رجحان مشرق سے مغرب کی جانب ہے اور ریلوے لائن کا راستہ شمال سے جنوب کی طرف ہے۔ اس لئے بہت سے مقامات پر پہاڑوں میں سرنگیں بنانی پڑتی ہیں۔ اور اکثر و بیشتر یہ لائن سیدھی نہیں چلتی بلکہ سانپ کی طرح پیچ و خم کھاتی ہے۔ اس ریلوے لائن کو استعمال میں لانے کے لئے خود لائن سٹیشن گاڑیاں انجن وغیرہ وغیرہ کل سامان پر دو سو لاکھ پونڈ یعنی قریبًا تین ہزار لاکھ روپیہ (تیس کروڑ) صرف ہوگا۔

بعض یورپی ماہرین کہتے ہیں کہ اقتصادی نقطۂ نگاہ سے یہ ریلوے ایک منفعت بخش کاروبار ثابت نہ ہوگی۔ مگر حال میں ایران نے روس کے ساتھ ایک تجارتی معاہدہ کیا ہے۔ اس کی رو سے قرار پایا ہے کہ وہ روسی مال جسے شمال سے جنوب کو لانا ہوگا۔ اسی ریلوے کی خدمات سے فائدہ اٹھائیگا۔ یہ ہے ایک صورت اس لائن کو ایک کامیاب کاروبار بنانیکی دوسری صورت اور ماہرین مالیات کی رائے میں نہایت کارگر وسیلۂ کامیابی یہ ہے کہ ریلوے حکومت ایران کی ملکیت ہے۔ اس میں سرمایہ دار تاجروں کی مالی بازی گری کو کام نہیں۔ حکومت حسب ضرورت کرایہ کی تعین کرے گی اور کرتی ہے۔ رہا تعمیر کے لئے سرمایہ تو اس کے لئے حکومت رضا شاہ نے "کھانڈ" اور "چائے" کی درآمد پر گرانقدر محصول لگا رکھا ہے اور وہ سب ریلوے پر خرچ کیا جاتا ہے۔ بایں ہمہ ریلوے کو ابھی سے موٹر کاروں سے مقابلہ کرنے کی ضرورت پیش آنے لگی ہے۔ کیونکہ بحیرہ کیسپین سے طہران تک موٹروں کے لئے سڑک موجود ہے مگر عہد حاضر نے جو سبیل موٹر اور ریلوے کے غیر اقتصادی مقابلے بلکہ مجادلے سے عہدہ برآ ہونیکے لئے

....

نکالی ہے۔ رضا شاہی حکومت اس سے پورا کام لے گی۔ یعنی دونوں تعاون کی راہ بذریعہ قانون نکالے گی۔ اور مادی ترقی کے ان عظیم الشان وسائل سے مغرب کے نقش قدم پر چل کر مملکت ایران کو بحیثیت مجموعی پہنچائے گی۔

افیون مٹی کے تیل سے دوسرے درجے پر

حکومت مرکزیہ [illegible] وسیلہ آمدنی [illegible] افیون ہے۔ ایران کے اندر متعدد زرخیز وادیوں میں اور بالخصوص کرمان شاہ کے مضافات میں کوکنار (پوست) کی کاشت کثرت سے کی جاتی ہے اور افیون کی ساخت کا ایک عظیم الشان کارخانہ کرمان شاہ میں ہے۔ شخصی طور پر کسی ایرانی کو افیون بنانے کی اجازت نہیں۔ یہ سارا کام سرکاری اجارہ داری سے کیا جاتا ہے۔ اور ہزاروں من افیون ہر برس چین کو بھیجی جاتی ہے۔ افیون کی باربرداری کے لئے "اینگلو ایرانیئن" کے اپنے جہاز ہیں۔ اور ان کی بندرگاہ آبادان ہے۔ افیون سے حکومت ایران کو گرانبہا مالی منافع حاصل ہوتا ہے اور جیسا کہ ہم نے لکھا تیل کے بعد یہ دوسرا وسیلۂ آمدنی ہے۔

خاتمۂ کلام

الغرض رضا شاہ کی بالغ نظری کاردانی اور کارکردگی نے دس برس کی قلیل مدت میں ایران کی کایا پلٹ دی ہے وہ مملکت جو دس برس پہلے صحیح معنی میں ایک آزاد دولت کہلانیکا استحقاق کھو بیٹھی تھی۔ روس اور انگریز کی قید و بند میں ہی ہلاکت سے ہم آغوش تھی۔ ایک مجلس اقوام عالم میں ایک بلند نشست پر متمکن ہے اور ایشیا کیلئے بالعموم اور ہندو افغانستان اور عالم اسلامیہ کے لئے بالخصوص سرمایہ صد افتخار بن گئی ہے۔

(مفتی غلام جعفر بی اے)

رُباعی

دنیا دیکھی! دنیا کی بے رَوانی دیکھی! اپنوں کی غیروں پہ مہربانی دیکھی!
اے کاش! کوئی لمحہ تو ہنستے جاتا خوشیوں میں یہاں شادمانی دیکھی!

(مطلوب حسن منصور (بدخشی)

[redacted]

مقالہ

مسلمانوں کے عہد میں فنِ موسیقی کا عروج

(ازجناب ظفر قریشی بی اے دہلوی)

{ہندوستان کے لئے تو موسیقی "برہما ندا" "ندائے الٰہی" کے مترادف ہے۔ کرشن کی بانسری کے نغمات اسرارِ الٰہی۔ شیو کا ڈمرا و دنیا پر زندگی کے راز منکشف کرنے والے راگوں کا پیدا ہونا۔ اس کی سوتی ہوئی استری پاروتی کا شیو کی وینا (بین) پر رقص کرنا دراصل مظاہر تھے۔ اس روحانی مسرت و بہجت کے اس ذہنی ارتفاع کے جنہیں روحانی و جسمانی مسرتوں کا ماحصل سمجھا جاتا ہے۔ وہ کیفیت جسے فیثاغورث "اجرامِ فلکی اور کائنات کی ہم آہنگی" اور فلاطون کے نزدیک "جو ذہنی ترنم" تھا وہ ان مظاہراتِ اصنامی۔ ان باطنی تمثیلوں اور تعبیروں میں مضمر تھا ——— ؟ بانسری کی سریلی تانیں ہوں یا پکھاوج کی بھاری آواز۔ وینا کی نرم و نازک تڑپ ہو یا ستار کی کپکپاہٹ سب کا مقصد وحید انسان میں روحانی و جسمانی مسرت کا اجتماع پیدا کرنا تھا۔ رومان اور مذہب کا ایسا پر زور و موثر امتزاج جسے روحانی و جسمانی سرخوشی و ہم آہنگی کا نام دے سکیں ——— ایک وہ حالت جو نصب العین تھا یونانِ اہلِ فلسفہ کا ——— !! ظفر}

ہندوؤں کے بعض کمالات کے مسلمان بھی معترف تھے۔ صدیوں پہلے مسلمانوں کا ہندوستان کے ساتھ تجارتی تعلق قائم ہو گیا تھا اور ذاتی میل جول کی وجہ سے تمدنی آمیزش بھی ترقی پا رہی تھی ایک دوسرے کو سمجھنے کے ذرائع بھی وسیع ہو رہے تھے۔ نویں صدی عیسوی میں بغداد میں ایک زبردست بحث چل رہی تھی کہ سفید اقوام زیادہ تمدن و شائستہ اور کمالات سے آراستہ ہیں یا کالے رنگ کی قومیں اور دونوں کے کمالات کا توازن کیا ہے۔ اس بحث میں بڑے بڑے علما و فضلا حصہ لے رہے تھے اور یہ بحث عرصہ سے جاری تھی۔ اس بحث کی تفصیلات کا ہمیں علم نہیں مگر جاحظ نے جو اس عہد کا ایک باوصف اور صاحب طرز مصنف تھا ایک رسالہ لکھا تھا۔ "کالی قوموں کا گوری قوموں پر تفوق" اس سے ہمیں اس دلچسپ تنازع کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ جاحظ نے لکھا ہے کہ تمام کالی اقوام میں ہندوستانی اپنی غیر معمولی دماغی قوت اور کسب کمال کے باعث ممتاز ہیں جاحظ کے اس رسالہ کو اگر اہلِ ہند کے فنی و علمی کمالات کا مبالغہ آمیز ڈھنڈورا کہیں تو بجا ہے کیونکہ سارا رسالہ انہیں باتوں سے لبریز ہے۔ وہ لکھتا ہے:—

"مجسمہ سازی۔ سنگتراشی۔ رنگوں کی تصویریں بنانا اور اسی قسم کے فنون میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان لوگوں نے شطرنج نامی ایک کھیل ایسا بنایا ہے جسے دماغی ورزش کہیں تو بجا ہے۔ ان لوگوں کو تلواریں بنانے اور ان کو گھڑنے میں کیا ہی کمال حاصل ہے۔ ان کی موسیقی بھی سحر طراز ہے ...."

اسی قسم کے الفاظ میں ایک عرب نقاد و مصنف نے اہلِ ہند کے فوقانی و فنی و ذہنی عروج و کمال کا اعتراف کیا ہے۔ اور اس وقت کی تہذیب ہند کے روشن پہلو نمایاں کئے ہیں۔

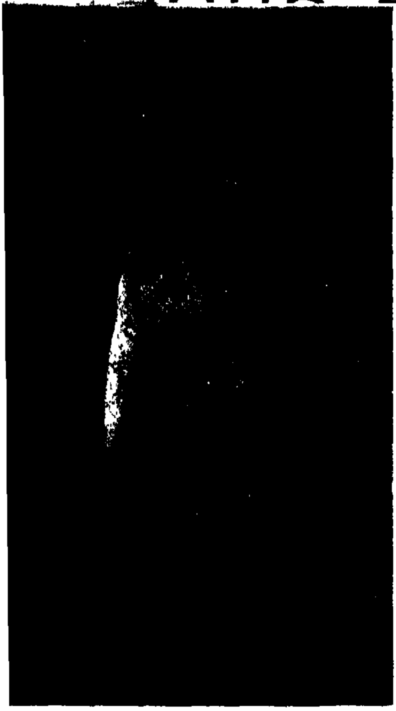
جب جانب شمال مغرب سے ہندوستان میں مسلمان آئے تو اپنے ساتھ اور کمالات کے ساتھ موسیقی کا بھی ایک بڑا اچھا ذوق لائے اور موسیقی ان کی کیا تھی عرب اور ایران کی موسیقی کا ایک نیا امتزاج جس نے ہندوستان کے ترنم میں مل کر وہ زمزمہ آرائی کی کہ زبان تعریف سے قاصر ہے۔

بغداد۔ وہ شہر رومی۔ وہ بلدیہ شعر و فسانہ جو ہارون رشید کے عہد زریں ختم ہونے کے بعد بھی اسلامی تہذیب اور علوم و فنون کا مرکز تھا۔ بہت دور تھا۔ مگر ایک ایسی گھلی ملی تہذیب جو بغداد کے عربی تخیل سے پیدا۔ ایران کی ہواؤں سے پرورش یافتہ اور ہندوستان کے سحر و گداز سے آسودہ تھی ساحل بنگال تک پھیلی ہوئی تھی۔ ادھر اندلس میں اسلامی تہذیب عروج پر تھی۔ فنون کی قدر دانی اور غیر مہذب یورپ کو زیور علم سے آراستہ کرنے کا "خیر جاریہ" شیوہ عام تھا۔ اگر اندلس کا سلطان زریاب موسیقی کے علم اور ہنر کا باکمال تھا۔ تو دوسری طرف بغداد کا ابراہیم موصلی بھی اپنے فن میں کامل دستگاہ رکھتا تھا۔ تمام اسلامی ممالک میں ایک معین تہذیب نشوونما پا رہی تھی۔ عربوں کی موسیقی دانی ان کی فطری شعر پسندی سے اور بھی اجاگر ہو گئی تھی۔ تمام اسلامی ممالک میں نغمہ جانفزا ایک ہی اصول و قماش کے پیدا ہو رہے تھے جب ایران سے رابطہ ہوا تو عہد قدیم کی موسیقی نے اس موسیقی کے ساتھ مل کر ایک اور طرب پیدا کیا۔ یہ وہ بنیاد تھی جس کے طفیل سلاطین اسلام کو ہندوؤں کی موسیقی کے سمجھنے میں مدد دی اور جب ہندوستان پر اسلامی حکومت ہوئی۔ تو عربی۔ ایرانی۔ ترکی اور عجمی تخیلات۔ تہذیب اور موسیقی کے پرتو پڑنا شروع ہوا ہندوؤں کی موسیقی نے اس عربی اور ایرانی موسیقی کے ساتھ مل کر ایک نیا جسم اختیار کیا جس کے اثرات آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ اسلامی اور ہندی موسیقی کی ہم آہنگی نے نہ صرف فن موسیقی کو نئے نئے اصول سے آشنا کر دیا۔ بلکہ بیسیوں مزامیر اور موسیقی دان اور صاحب طرز باکمال بھی پیدا کر دیئے جن کی خدمات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

نئے نغمات اور نئے باجوں سے لوگوں کے کان آشنا ہو گئے۔ جہاں لوگ "وینا" "بین" "پکھاوج" گرجانتے تھے وہاں "دلربا"۔ "رباب" اور "عود" کو بھی پہچان گئے۔ حضرت امیر خسروؒ نے "سہ تار" کی ایجاد کی جو کثرت استعمال سے "ستار" بن گیا۔ حضرت امیر خسرو ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک عجوبۂ روزگار ہستی تھے دنیا کا کوئی علم اور کوئی ہنر اس عجیب غریب ترک بچے سے بچا ہوا نہ تھا علوم و فنون کا مخزن تھا۔ شاعری میں ید طولٰے۔ موسیقی میں استاد۔ ایجاد و اختراع میں کمال صناعوں کا استاد۔ صاحب حال اور صاحب قال۔ دنیا ایسا صاحب شعر اور صناع دوبارہ پیدا نہ کرے گی۔ حضرت امیر خسروؒ نسلاً ترک تھے۔ اور ہندوستان میں آ کر حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید ہوئے۔ جن کے روحانی فیوض نے ان کی طبیعت رسا کو اور بھی روشن و منور کر دیا حضرت امیر خسرو کو ہندوستان کی ایک ایک ادا بھاتی تھی۔ انہیں یہاں کے موسموں۔ یہاں کے رواجوں۔ یہاں کے لوگوں کی رہن سہن سب سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ملک اور اس ملک کی خوبصورت چیزوں کو باہم گر ایک کرنے کے مشتاق رہتے تھے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اسلامی عہد کا یہ مصنف شعری ذوق فطری طباعی و ذہانت اور علوم و فنون کا گہوارہ ہونے کے باعث ایک عدیم المثال شخصیت تھی تو بجا نہ ہوگا۔ اس میں لیونارڈ کی سی نزاکت خیال۔ اور سر فلپ سڈنی کی سی رعنائی حیات پائی جاتی تھی۔ آرٹ اور لٹریچر نے اس کو ایک عجیب غریب چیز بنا دیا تھا۔ حضرت امیر خسروؒ نے جہاں اور چیزیں موسیقی میں اپنی ذہانت سے ایجاد کیں ان میں "خیال" اور "قوالی" ان کی خاص یادگار رہی ہیں۔ اس سے پہلے قوالی کی قماش کی چیز سے یہاں کے موسیقار ناواقف تھے۔ اہل ہند کے صاحب دل لوگوں کے لئے یہ طریقۂ عبادت مزامیر بہت ہی مرغوب معلوم ہوا۔ اصل میں یہ چیز حضرت نظام الدین اولیاؒ کی روحانی مسرت و آسودگی روح کیلئے جاری کی گئی تھی جسے سن کر حضرتؒ وجد میں آ جاتے تھے۔ پروفیسر یون نوگوچی شہرہ آفاق جاپانی شاعر جب دہلی آیا تو اسے قوالی کی ایک محفل خاص میں شریک کیا گیا میں نے اس قسم کے گانوں کو کبھی نہ سنا تھا۔ اور نہ صوفیا کی محفل دیکھی تھی اس کے دل پر اس کا اثر ہوا اور اس نے بڑے اہتمام سے قوالی کے اثر انداز محاسن کا اعتراف کیا ہے۔

حضرت امیر خسرو نہ صرف خود اچھے موسیقی دان تھے۔ بلکہ گیت اور دوہے ہندی زبان میں بے نظیر لکھتے تھے۔ فارسی غزلیات ان کی شہرت دوام حاصل کر چکی ہیں۔ ہندوستان کے دیہات کی تصویریں کھینچنا ان کا کمال تھا۔ دیہاتی لڑکیاں امیر خسرو کے اشعار گاتی تھیں۔ جن میں جذبات و تخیلات کی وہ روانی اور وہ تصویر کشی ہوتی تھی۔ کہ انسان سن کر بے اختیار ہو جاتا ہے۔ آج کل بھی حضرت امیر خسرو کے ترانے ہندوستانی اہل دیہات کی زبانوں کے چڑھے ہوئے ہیں۔ جب شمالی ہند میں لڑکیاں ساون کی رت میں آموں کے درختوں پر جھولا ڈالتی ہیں تو حضرت امیر کے گیتوں سے جنگل گونجنے لگتے ہیں۔ لوگوں کو زمانہ قدیم سے شعر و موسیقی سے کیسا لگاؤ تھا۔ اس کا اندازہ اردو زبان کی تاریخ کے مطالعہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اردو کا پہلا نام "ریختہ" تھا جس کے لفظی معنی "نغمہ" یا "گیت" کے ہیں۔ یعنی اردو زبان گیتوں کے اظہار











مطالب کے ذریعہ بنائی گئی تھی۔ اردو دراصل برج بھاشا اور فارسی کی آمیزش سے بنائی گئی تھی۔ اور ضرورت تھی کہ اس کے ادب کو ایسے ہی جواہر ریزوں سے مالا مال کیا جائے۔ جو ایرانی۔ عربی۔ ترکی تہذیبوں کے ساتھ خالص ہندی جذبات اور ہندوستانی تمدن کے بھی آئینہ دار ہوں۔ بادشاہ وقت کے دربار اور اہل علم فارسی ترکی سمجھتے تھے۔ مگر عوام کے لئے فارسی اشعار و ادب کا سمجھنا دشوار تھا۔ اس لئے ایک ایسی گھلی ملی زبان کا رواج دیا گیا۔ جو عوام و خواص دونوں کے لئے قابل فہم ہو اور ملکی و غیر ملکی جذبات و حسیات کی ترجمان ہو۔

ہر تعمیر کے ساتھ خرابی اور ہر خرابی میں صورت تعمیر مضمر ہوتی ہے۔ بعض حوادث و خرابات اپنے ساتھ تحسین و تعمیر کا پیغام بھی لے کر آتے ہیں۔ یہی حال دکن پر علاء الدین خلجی کے حملہ کا ہوا۔ حضرت امیر خسروؒ اسی بادشاہ کے دربار میں تھے۔ مسلمانوں کو یہ خبط رہا ہے کہ وہ اہل علم اور اہل ہنر کی دلجوئی اور قدر دانی میں جویا رہتے ہیں۔ حملہ کے بعد دستکاروں۔ صناعوں۔ اہل حرفہ اور علما و فضلا کے لئے عام معافی اور حفاظت کا اعلان کر دیا جاتا تھا۔ اور زمانہ امن میں تو دربار کی طرف سے قدر دانی و عزت افزائی میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑی جاتی تھی۔

جنوبی ہند مسلمان حملہ آوروں سے محفوظ رہنے کی وجہ سے نسبتاً زیادہ پر امن فضا میں سانس لیتا رہا تھا۔ اس لئے وہاں کی تہذیب بہت بڑی حد تک غیر ملکی مراسم و نفوذ و اثر سے پاک رہی۔ ویدوں کے عہد سے یہاں کے لوگ جس پرانی تہذیب کے علمبردار چلے آ رہے تھے۔ وہ یہاں اب بھی موجود تھی۔ علاء الدین خلجی کے آنے سے یہاں کے اہل ہنر اور اس کے ساتھ آئے ہوئے صناعوں کا ایک اختلاط شروع ہوا۔ اور دو تہذیبوں کا ایک دھارا بہنے لگا۔ جس کے نتائج سے بعد کی نسلیں برابر اثر پذیر ہوتی رہیں۔

سترھویں صدی کے آخری زمانہ میں فارسی زبان میں ایک کتاب "راگ درپن" کے نام سے تیار ہوئی تھی اس میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ حضرت امیر خسروؒ کی ذہانت اور موسیقی دانی کا پایا گیا ہے۔ جو سلطان علاء الدین خلجی کے دربار میں وقوع پذیر ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ جنوب ہند کا مشہور گویا۔ گوپال نائک ایک پالکی میں سوار جنگل میں سے گذر رہا تھا۔ سلطان علاء الدین خلجی کو معلوم ہوا کہ وہ یگانۂ روزگار اس کی رہائش گاہ سے اسقدر قریب ہے۔ نہ معلوم کب اس سے ملنے کا اتفاق ہو۔ سپاہی بھیج استاد کو بلوا منگایا۔ جب حضرت امیر خسرو نے سنا کہ گوپال نا[ئک دربار] میں باریاب ہو گیا ہے تو آپ نے سفر کا بہانہ کر کے چند روز کے لئے د[ربار سے] رخصت حاصل کر لی۔ دراصل یہ طریقہ تھا گوپال نائک کے گانے کو خف[یہ طور پر] سننے کا۔

جب دربار ہوا تو امیر خسرو کسی ترکیب سے شاہی تخت کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ چھ روز تک گوپال نائک نے دربار خلجی میں کمالات اور جوہر دکھائے۔ ساتویں روز حضرت امیر خسرو علم دربار میں [اس] طریقہ سے وہ اس استاد کی موسیقی کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھ ہی گئے [تھے] مقابلہ کی ٹھانی۔ امیر خسرو کے کہنے پر نائک نے اپنی وینا کے تاروں پر [انگلیاں] چلانی شروع کیں اور وہ راگ پیدا کیا جو اس نے دربار کے پہلے روز [گایا تھا۔] حضرت امیر خسرو نے اپنا ستار اٹھایا اور کچھ باریکیاں پیدا کر کے اسی [راگ کو] خود بجا کر دکھا دیا اور طعن کے لہجہ میں کہا ——— ! "یہ تو کوئی خاص [راگ نہیں۔ اسے تو بہت] لوگوں نے بجا کر دکھا دیا۔ اس میں کیا استادی ہے۔ بازاری گویئے ایسا [گاتے ہیں۔"] گوپال نے دوسرا کمال دکھایا تو حضرت امیر نے اس کو بھی ٹھیک کر کے د[کھا] دیا۔ جب گوپال اپنی ساری فضیلت دکھا چکا تو حضرت امیر نے کچھ [ایسے] الاپ کر دکھائیں۔ شیراز کے پر تکلف صحن ہائے باغ میں نازنینان خود [آرا] اور عاشق صادق کا درد انگیز اسلوب اظہار ایسا بیساختہ بیان کیا۔ کہ [سننے والوں کے] دل جوش و مستی سے لبریز ہو گئے۔ لوگ ان نغمات کے اسرار و رموز پر [جھوم اٹھے۔] گوپال بھی یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ حضرت امیر خسرو نے کس کمال اور [کس خوبی کے] ساتھ اپنی موسیقی دانی اور شاعرانہ اختیار طبع کا مظاہرہ کیا۔ وہ ان [کے با]کمال ہونے کا معترف ہو گیا۔

ان دونوں استادان فن کے مقابلوں کے اور بھی بہت سے قصے زبان زد عام ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گوپال نہ صرف ایک م[اہر] موسیقی داں تھا بلکہ زبردست عالم اور نہایت شستہ بحث کرنے وا[لا تھا۔] شاید یہی وہ استاد ہے جس کے بارے میں حضرت امیر خسروؒ نے اپنی ایک [تصنیف میں] ذکر کیا ہے کہ ایک استاد موسیقی گانے اور شاعری کے باہمی مقابلہ کے با[رے میں] بحث کرنے کے لئے آیا تھا۔ حضرت امیر خسرو نے شعر کی طرفداری کی۔ ا[ور اس نے] شعر پر موسیقی کی فوقیت کا علم بلند کیا۔ ہندوؤں کا عقیدہ تو یہ ہے کہ ا[ستاد] بننے سے پہلے عالم بننے کی ضرورت ہے۔ یعنی پہلے پنڈت بنے پھر موسیقی کی [...]

کرے تب جا کر وہ "گندھروا" یا "نائک" کے بلند درجہ تک پہنچ سکتا ہے بعد کے مسلم بادشاہوں کے عہد میں بھی فن موسیقی کی ہمت افزائی ہوتی رہی نے دولت آباد میں ایک دائرہ نما ایوان تعمیر کرایا تھا۔ جہاں گانے والے جمع رہتے تھے۔ موسیقی کا مظاہرہ کرتے۔ درباری مہمانوں کو خوش اپنے کمالاتِ فن دکھاتے تھے ۔

بادشاہ زین العابدین جسے "بادشاہ" کے لقب سے ہندو مسلمان جانتے تھے ت ہی عالم و فاضل بادشاہ دکن گذرا ہے نہایت وسیع معلومات اس رے میں رکھتا تھا۔ وہ سنسکرت کا فاضل اور تبت کی بہت سی زبانوں کا لیکن اس سے بھی زیادہ وہ مشہور بادشاہ گذرا ہے جسے سلطان شرقی کے نام سے تاریخ جانتی ہے۔ جو ایک نہایت اعلیٰ دماغ حاکم وقت ہونیکے اتھ موسیقی کا بہترین استاد تھا۔ عطائے شاہی کے ساتھ بانسری کا بھی لگتا تھا۔ جونپوری شہر اسی بادشاہ کے نام پر آج تک معنون پائی جاتی ہے مگر مغلوں نے جس قدر ترقی اس فن کو دی شاید ہی کسی وقت میں اسے ہوئی ہو ۔

مغل علم دوست اور ہنر پرور تھے۔ ان کے سایۂ عاطفت میں صناع عالم۔ شعرا۔ مورخ۔ مصور۔ حکیم۔ وید۔ مجسمہ ساز۔ کاریگر غرض ہر فن و شغف کا آدمی پرورش پا رہا تھا۔ اور درباری ہمت افزائی سے ستان کو ان صاحبان کمال کے کاموں سے وہ وہ فوائد حاصل ہو رہے تھے سے قبل کبھی حاصل نہ ہوئے تھے ۔

اکبر اعظم نے اس بارے میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ لیا۔ میاں تانسین قبر گوالیار میں ہے۔ اکبر کے نورتن میں شامل تھے۔ اور ان کی یگانۂ روزگار کو آج بھی لوگ قدر و منزلت کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔

مغل سلطنت کے بانی بابر کو نہ صرف بہزاد جیسی آنکھ ملی تھی جو تصویر دوں نوش کی باریکیاں سمجھ سکتی تھی بلکہ موسیقی سے بھی اسے شغف تھا۔ چنانچہ وہ اپنی میں جگہ جگہ گانے والوں اور ان کے کمالات و مراسم کا بہت شوق سے ذکر ہے۔ جو لوگ "قانون" اور دیگر باجوں کو بجا سکتے تھے۔ ان کے حالات اور اہل موسیقی کا تذکرہ اس کے اندرونی رجحانات کو ظاہر کرتا ہے ۔

مغل درباروں کی شوکت اکبر کے زمانہ میں سب سے زیادہ رونق پر اور اکبر نے فنون کی ہمت افزائی کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ابو الفضل اپنی "آئین اکبری" میں کم و بیش تیس استادان موسیقی کا تذکرہ لکھتا ہے۔ جن کا دربار سے تعلق تھا۔ مگر ان سب میں تانسین میاں کا نام سب سے زیادہ نمایاں اور اہم درجہ رکھتا ہے تانسین ایک حقیقی و تاریخی ہستی تھی جسے فنِ موسیقی کا مربّیِ اعظم کہیں تو بجا ہے۔ کوئی تاریخ نہیں ہے۔ جس میں اس بے نظیر عالی دماغ موسیقی دان کا تذکرہ نہ ہو مگر اس کے مداحوں اور جاہل پیروؤں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوتا رہا ہے۔ اور پایا جاتا ہے۔ جس نے اس کی ذات سے ایسی بے سر و پا باتیں منسوب کر دی ہیں۔ کہ لوگ اس تاریخی ہستی کے وجود پر ہی شبہ کرنے لگے ہیں۔ "میاں تانسین گوالیار کے پیدائشی ہندو تھے۔ اور راجہ رامچندر راجہ بند یلا کے ہاں ملازم تھے۔ جس جگہ تانسین پیدا ہوئے تھے وہ صدیوں سے آرٹ کی پرورش گاہ ہونے اور گہوارہ ہونے کے باعث مشہور رہی ہے۔ آج تک گوالیار میں بیسیوں نادر گانے والے اور ساز بجانے والے پائے جائیں گے۔ گوالیار کا سب سے بڑا اور مشہور محسن موسیقی راجہ مان سنگھ گذرا ہے۔ اور وہ اپنے ہم نام اکبر اعظم کے راجہ مان سنگھ کی طرح ایک عالی دماغ اور کسب کمال کی شائق ہستی تھی۔ اس نے "دھرپد" طرز کا گانا ایجاد کیا تھا۔ تانسین کے عہد میں بھی فن موسیقی عروج پر تھا اور قدر افزائی کا یہ عالم تھا کہ ایک روایت کے بموجب تانسین کو اس کے راجہ نے صرف ایک گانے پر ایک لاکھ "ٹنکا" (سونے کا سکہ رائج الوقت) عطا کیا تھا۔ جب اکبر کو ایسے یگانۂ روزگار ہستی کا پتہ چلا تو اس نے دربار میں آنے کی دعوت دی۔ کہا جاتا ہے کہ جب میاں تانسین دربارِ اکبری کے لئے روانہ ہونے لگے۔ تو راجہ رامچندر اپنے محبوب گوئیے کی جدائی پر بہت مغموم ہوئے اور اس کی پالکی کو کندھا دیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے موسیقی کی عزت اور اس کے اہل کمال کا وقار کرنے کیلئے کتنا بڑا دل قدرت نے دیا تھا ۔

گوالیار میں یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ اکبر نے تانسین کی اس قدر دلجوئی کی کہ تانسین نے اسے اپنا گرو مان لیا۔ اور اسلامی عقیدہ اختیار کر لیا اور جیسا کہ صاحبان کمال کا قاعدہ ہے تانسین کو بھی گوالیار کی یاد ستاتی تھی اور وہ بار بار واپس جانے کی اجازت چاہتے تھے۔ اگرچہ وہ اب راجہ رامچندر کی ملازمت میں نہ تھے مگر وہ ان کے سب سے پہلے محسن تھے۔ اس لئے ابھی تک ان کے دل میں راجہ صاحب کی عزت و محبت جاگزیں تھی اس کا اظہار یوں ہوتا تھا کہ وہ اکبر اعظم کو کبھی سیدھے ہاتھ سے سلام نہیں کرتے تھے بلکہ الٹے ہاتھ سے

[redacted]

سلام کرتے تھے۔ سیدھا ہاتھ انہوں نے اپنے پہلے آقا راجہ رامچندر کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ مگر اکبر اعظم بھی دلجوئی۔ عزت افزائی اور قدر دانی میں راجہ سے کم نہ رہنا چاہتا تھا اور طرح طرح سے تانسین کو خوش کرتا رہتا تھا۔ ایکدن کا ذکر ہے کہ اکبر اعظم آموں کے ایک باغ میں ٹہلتے تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ میاں تانسین نے دیکھا کہ ایک درخت پر بہت رسیلا اور خوبصورت آم لگا ہوا ہے شاخوں میں جھول رہا ہے۔ تانسین کی اس پر نیت آگئی اور اس کی طرف لپکنے لگے۔ مگر وہ اتنا اونچا تھا کہ ان کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اکبر نے ادھر اُدھر دیکھا قریب کوئی ملازم نظر نہ آیا۔ کہنے لگے۔ آؤ میری پشت پر سوار ہو کر کھڑے ہو جاؤ اور آم توڑ لو۔ تانسین ادب و عزت کے اس مظاہرے سے اس قدر مسرور بلکہ مجحوب ہوا کہ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر تعظیم کی۔ کورنش ادا کی اور اس کے دل میں یہ بات جاگزیں ہو گئی کہ اکبر جیسا جلیل القدر شہنشاہ ہند بھی اس کے کمال فن کی اس قدر عزت کرتا ہے۔ کہ راجہ رامچندر کی یاد وہ اپنے دل سے بھلا سکتا ہے یا اکبر کو نعم البدل سمجھ سکتا ہے۔ اس کے بعد سے اس نے سیدھے ہاتھ سے سلام کرنا شروع کر دیا ؛

اکبر اعظم کا دربار تو علم و ہنر کی آماجگاہ تھا ہی اور مسلمان بادشاہوں کے دربار بھی موسیقی کی ترقی کے لئے وقف تھے۔ سلطان عادل شاہ بیجاپوری خود بہت اچھا گویا تھا۔ اور کئی سُر اس نے خود ایجاد کئے تھے۔ جب اکبر اعظم نے ایک امیر کو دربار بیجاپور میں سفیر بنا کر بھیجا۔ تو اس کے ساتھ کچھ گویئے بھی روانہ کئے تھے۔ تاکہ وہ ابراہیم عادل شاہ سے اس کی ایجادات موسیقی سے کچھ کسب کریں ؛

موسیقی کا ذوق تقریباً عام ہو چکا تھا۔ جگہ جگہ نایاب موسیقی داں پائے جاتے تھے۔ تانسین کی زندگی کا ایک اور واقعہ ہے کہ اس نے سُنا کہ بلگرام میں کوئی گویا رہتا ہے۔ جسے اس کے اعلٰے کمال کے باعث لوگ (مدعا نانک) کہتے تھے۔ تانسین نے سوچا کہ اس کے پاس چل کر کچھ حاصل کرنا چاہئے۔ وہ بھیس بدل کر روانہ ہوا تاکہ بلگرام پہنچکر کچھ معلوم کر سکے ؛

ابھی وہ شہر میں داخل بھی نہیں ہوا تھا۔ کہ باہر ایک کنوئیں کے پاس پیپل کے درخت کے نیچے ستانے کو بیٹھ گیا۔ کیا دیکھا کہ گاؤں کی کچھ لڑکیاں اپنی گگریاں لئے۔ ڈول رسی لٹکائے کنوئیں پر آئیں۔ اور پانی بھرنے لگیں تانسین نے دیکھا کہ ایک لڑکی نے کنوئیں میں ڈول ڈالدیا اور پانی بھرنے لگی یکایک کنوئیں کی چرخی میں سے رگڑ کھانے کی بہت سخت اور بھدی آواز نکلنے لگی۔ راہ چلتے کو تو یہ آواز لوہے کی چرخی کی چوں چوں معلوم ہوتی اور کچھ دھیان نہ کرتا مگر ایک لڑکی جو قریب ہی گگری لئے کھڑی تھی۔ چرخی کی بانگ بے ہنگام پر بہت جھلائی اور اپنی گگری مینڈ پر پٹک کر بولی ــــــ

"ارے کمبخت کیسی بے تکی آواز نکلتی ہے!"

تانسین میاں کے کان کھڑے ہو گئے۔ سوچنے لگے۔ جس جگہ کی گنوار لڑکیوں کے کان موسیقی سے اسقدر آشنا اور ذوق ترنم و آہنگ اس درجہ شائستہ و لطیف ہوں۔ وہاں کے استادوں کے تو کیا ہی کہنے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تانسین نے کان پکڑا اور بلگرام کے استاد سے ملے بغیر واپس آگیا۔ کہ ایسا نہ ہو کہ اس کی جگ ہنسائی ہو جائے ــــــ!

یہ واقعہ درست ہو یا نہ ہو یہ تو ضرور ماننا پڑے گا کہ اس وقت ذوق عالمگیر ہو گیا تھا۔ اور لوگوں میں ایک عام شائستہ مذاق ترنم پایا جاتا یہی وجہ تھی کہ گھر گھر موسیقی کا چرچا اور قدر دانی تھی ؛

آخری بادشاہوں میں محمد شاہ رنگیلے (دہلی) اور رسلے فن واجد علی شاہ (لکھنؤ) نے فن موسیقی کو جس اوج پر پہنچایا ان کے علاوہ دیگر مسلمان رؤسا و امرا نے وقتاً فوقتاً فن موسیقی کی باوجود مذہبی ممانعت کے جس طرح نوازا وہ مسلمانوں کی ہنر پسندی اور فطری فن نوازی کا زندہ ثبوت ہے ؛

(ظفر قریشی)

ہندوستان کی نامور خواتین نیرنگ خیال میں اپنے مضامین شائع کراتی ہیں۔ جو نیرنگ خیال کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔

لمعاتِ کوکب

(از جناب نواب پیارے مرزا صاحب کوکب رئیس اعظم لکھنؤ)

مری دنیا مری جنت مرے پیمانے میں — حشر بھی نشر بھی ہوگا مرا میخانے میں
توبہ ٹوٹی ہے یہ کس رند کی میخانے میں — موج مے لیتی ہے انگڑائیاں پیمانے میں
منتقل ہوگیا افسانے سے افسانے میں — سوزِ دل بنکے دھواں شمع سے پروانے میں
دیکھ کر عکس وہ آئینے میں فرماتے ہیں — بستیاں یونہیں سما جاتی ہیں ویرانے میں
شمع سر دھنتی ہے پروانہ جلا کرتا ہے — کوئی تو بات ہے ایسی مرے افسانے میں
دوست بن بن کے وہ دھوکے تو نہیں دیتا ہے — کم سے کم ایک صفت ہے یہی بیگانے میں
اک نظر زندگیٔ عشق پہ کیوں ڈال نہ لوں — کوئی گنجائشِ ترمیم ہو افسانے میں
جیسے گھبرایا ہوا ہو کوئی معشوق کہیں — یوں تمنا ہے مرے دل کے نہانخانے میں
وہ مجھے منزلیں قربت کی عطا کرتا جائے — اور میں اپنے کو سمجھا کروں بیگانے میں
ہر نفس شعلہ بداماں ہے ۔ سزا ہے اس کی — دو گھڑی بیٹھ گیا تھا کبھی میخانے میں
مٹ گیا دل مگر آثار مٹائے نہ مٹے — اب بھی کیا کچھ نہیں اجڑے ہوئے کاشانے میں
اک پتنگے میں یہ احساس وفا کے جذبے — عشق نے روح نئی پھونک دی افسانے میں

ذرّے لَو دیتے ہیں یا آگ لگی ہے کوکب
اک چمک سی وہ نظر آتی ہے ویرانے میں

آئینۂ خیال

(از جناب منور آغا صاحب منوّر ۔ لکھنؤ)

بہار آئی ہے اپنے وقت پر صحنِ گلستاں میں — یہ میری خوبیٔ قسمت کہیں ہوں قیدِ زنداں میں
نہ برگِ گل کے دامن پر نہ اوراقِ پریشاں میں — میری قسمت کا لکھا ہے مرے چاکِ گریباں میں
نہ شمعیں ہیں نہ پروانے نہ گل بزمِ خموشاں میں — نئی دنیا نہاں ہے عالمِ گورِ غریباں میں
مبارک ہو مبارک ہو اسیرانِ جنوں تم کو — بہار آئی گلستاں میں بہار آئی گلستاں میں
ہر اک ذرہ پریشاں ہے ہر اک قطرہ میں طوفاں ہے — اثر اب بھی یہ باقی ہے مری آہِ پریشاں میں
فلک اے مرکزِ ظلم و جفا اے دشمنِ قسمت — گرفتارِ بلا کیوں ہوں میں آب و گل کے زنداں میں
تمناؤں میں دل کی آج اک عالم ہے محشر کا — بہار آئی ہے شاید فصل بدلی ہے گلستاں میں
نہ کوئی ناخدا اپنا نہ کوئی رہنما اپنا — مری کشتی پڑی ہے قلزمِ ہستی کے طوفاں میں

جلوۂ جمال

ازجناب اسد صاحب ملتانی

رُخ پردۂ ظہور میں پنہاں کئے ہوئے
پھرتے ہو اک زمانہ کو حیراں کئے ہوئے

دن ہے کہ ہے نقاب تمہارا اُٹھا ہوا
شب ہے کہ تم ہو بال پریشاں کئے ہوئے

ہے کائنات شرح تمہارے جمال کی
رازِ حیات زینتِ عنواں کئے ہوئے

خود بیں ہو تم تو مجھ کو مٹانے سے فائدہ
میں بھی تو ہوں تمہیں کو نمایاں کئے ہوئے

ابتک گماں میں ہے دل گم گشتہ تلاش
جلووں کو ہو تم اس قدر ارزاں کئے ہوئے

پھرتا ہے کون تیرگیٔ شش جہات میں
خورشید کا چراغ فروزاں کئے ہوئے

یہ کون آگیا چمنِ کائنات میں
زیبِ بدن لباسِ بہاراں کئے ہوئے

یہ کون چھپ رہا ہے پسِ پردۂ خزاں
جلوے کو اپنے اور بھی عُریاں کئے ہوئے

کس حُسنِ خودنما کی تجلی کا فیض ہے
ہر شے کو اپنی ذات پہ نازاں کئے ہوئے

کس شوخ کی نگہ کے اثر سے ہے زندگی
عقل و جنوں کو دست و گریباں کئے ہوئے

للہ کھول آنکھ تو بیٹھا ہے کیوں اسدؔ
روزِ وصال کو شبِ ہجراں کئے ہوئے

زمزمۂ تغزل

(از نتیجۂ فکر عالیجناب خان بہادر نواب مرزا محمد حسین علی خان صاحب انصار بہادر۔ بی اے ریٹائرڈ کلکٹر)

مآل اندیش کھلتے ہیں خزاں کا غم بہاراں میں
گریباں چاک ہیں گل روتی ہے شبنم گلستاں میں

حسد صیاد و گلچیں باغباں کو ہے تو کیا ڈر ہے
مثالِ بوئے گل رہتا ہوں میں کنج گلستاں میں

جراحت ننگِ ہمت ہے جو ہو شرمندۂ مرہم
نہ ہو مشغول تو اے چارہ گر تکلیف درماں میں

وطن میں قدر ہو کیوں کر ہمارے دُرِّ مضموں کی
گھٹی رہتی ہے بیشک لال کی قیمت بدخشاں میں

پریشاں جب ہو انساں ہر طرف ایذا ہی ایذا ہے
نظر آتا ہے کانٹوں کا بچھونا صحن بستاں میں

خزاں آئی زمانہ فصلِ گل کا ختم ہے شاید
لگائے جاتے ہیں ٹانکے جو وحشی کے گریباں میں

قفس میں بھی شگفتہ ہو گیا دل فرطِ شادی سے
کسی نے کہدیا جھوٹوں بہار آئی گلستاں میں

عجب کیا دامنِ صحرا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا
قیامت ہے کہ میرا ہاتھ اُلجھا ہے گریباں میں

زلیخا بے خطا تھی کچھ خبر اصلا نہ تھی اس کو
نہاں ہے داغ رسوائی کا غم یوسف کے داماں میں

سخی پوشیدہ پوشیدہ سخاوت سب سے کرتے ہیں
کہ شبنم رات کو موتی لٹاتی ہے گلستاں میں

[illegible]

عرب کا بادشاہ

سلطان ابن سعود

(ایچ سینٹ۔ فلبی کے ایک مضمون کا ترجمہ جو انگریزی اخبار "لسنر" میں شائع ہوا)

(مترجمہ جناب عبدالرحیم صاحب شبلی۔ بی کام)

میں شاہ عرب سے قریباً بیس برس سے واقف ہوں کیونکہ ۱۹۱۷ء میں مجھے برطانوی سفیر بنا کر ان کے صحرائی دار الخلافہ میں بھیجا گیا تھا۔ وہ اس وقت اگرچہ عرب کے بیشتر حصہ پر قابض تھے۔ لیکن ان کی شخصیت کے متعلق بہت کم معلومات لوگوں کو حاصل تھیں۔

اس وقت تک اُن کی زندگی زیادہ تر فوجی معرکہ آرائیوں میں مصروف رہی۔ اُن کا ورزشی جسیم بدن جو متواتر گھوڑے کی سواری اور لڑائیوں کی وجہ سے خوب مضبوط ہو گیا تھا۔ معرکہ آرائیوں کے لئے خاص طور پر مناسب حال تھا۔ لیکن جو چیز مجھ پر زیادہ اثر انداز ہوئی وہ اُن کے اخلاق حسنہ کے وجیہ پہلو کی بجائے ان کی قوت نظم و نسق ہے۔ کسی نہ کسی طرح آپ نے غیر منظم اور منتشر عربوں کو اپنے نظام کے ماتحت کر لیا۔ اور فوجی طاقت کی یہ مشینیری آپ کے حکم کے اشارہ پر حرکت میں آنے کے لئے تیار ہو گئی جس کو بعد میں ابن سعود کے اثر و رسوخ کو تمام عرب میں پھیلانے کے لئے چند در چند وقفوں کے بعد استعمال کیا گیا اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں اُنکی بادشاہت قائم ہو گئی۔ آپ کو بلا شک و شبہ عرب کا عظیم الشان اور نمایاں ترین انسان تصور کیا جا سکتا ہے!

ملک کے جملہ انتظام کا بار ابن سعود شاہ عرب کے دوش پر ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی مصروفیات کے لئے چوبیس گھنٹہ کا دن نہایت قلیل ہے آپ تمام دن اپنے دیوان خاص یا عام میں سلطنتی امور کی انجام دہی کے لئے ہمہ تن مصروف و منہمک رہتے ہیں۔

اگر کسی شخص کو آپ سے کوئی کام ہو تو وہ دیوان عام میں خود حاضر ہو سکتا ہے۔

دنیا کے تمام بادشاہوں کی نسبت غالباً آپ کی باریابی سب سے آسان ہے آپ کے محافظ اور درباری فرش پر ہی آپ کے ارد گرد بیٹھ جا آپ خود بھی ننگے پاؤں عربی لباس میں کمرہ کے ایک کونے میں ایک اونچی تشریف فرما ہو جاتے ہیں۔ اور ملاقاتیوں اور وزرا کو بنچوں یا سٹولوں جاتا ہے۔

دیوان عام میں آپ صبح سات بجے سے لے کر دوپہر تک۔ تین لے کر چھ بجے شام تک اور پھر آٹھ بجے رات سے لے کر نصف شب تک کرتے ہیں۔

اپنے روزمرہ فرائض کے علاوہ آپ نمازوں اور دیگر مذہبی رسو بھی وقت نکال لیتے ہیں۔ آپ درحقیقت نہایت صالح اور عابد مسلمان اور کوئی چیز آپ کے مذہبی پروگرام میں حارج نہیں ہو سکتی۔

وقت پورا کرنے کے لئے آپ صبح سویرے تین بجے اٹھتے ہیں اور تہجد۔ نماز و تلاوت قرآن شریف کے بعد آپ اپنے معمول کے کام کے لئے ہو جاتے ہیں۔ دن کے وقت نمازوں وغیرہ کی ادائیگی کے لئے آپ کے کم از گھنٹے صرف ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ بدیں وجہ آپ کے پاس دیگر مصروفیات کیلئے بہت کم باقی رہ جاتا ہے۔ لیکن آپ اپنے آرام کو بھی قربان کر دیتے ہیں۔ آپ شاید پانچ گھنٹوں سے زائد کبھی سوتے ہوں۔ بلکہ اکثر اوقات آپ کم ہی سوتے خوراک بھی آپ کے نزدیک ایک تعیش ہے اور آپ بہت کم توجہ اس کی طر

نیرنگ خیال میں چند ایسے مضمون نگار بھی لکھتے ہیں جو کسی دوسرے رسالہ میں لکھنا مناسب نہیں سمجھتے۔

دیتے ہیں۔ کھانا بڑی بڑی قابوں میں فرش پر چن دیا جاتا ہے اور تمام حاضرین کو اس میں شریک ہونے کے لئے دعوت دیجاتی ہے۔ لیکن یہ دعوت صرف چند منٹ تک رہتی ہے۔ جس کے بعد سلطان اپنی ملاقاتوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

آپ کی واحد تفریح یہ ہے کہ آپ کبھی کبھی صحرا میں ہرن یا عربی شترمرغ کے شکار کے لئے نکل جاتے ہیں۔ یہ سیر و شکار حقیقی معنوں میں تفریح ہوتی ہے اور سلطان اس سے حد سے زیادہ محظوظ ہوتے ہیں۔

شکار کی پارٹی موٹروں میں روانہ ہوتی ہے اور جب کوئی شترمرغ یا غزال نظر پڑتا ہے تو موٹر اس کے پیچھے دوڑا دی جاتی ہے۔

شکار کے علاوہ سلطان کی تفریح یہ ہے کہ کھانے نماز پڑھنے سونے اور شاہی امور کی انجام دہی کے بعد جو وقت چوبیس گھنٹوں میں سے باقی بچتا ہے وہ اسے خانگی فرائض کی ادائیگی کے لئے صرف کرتے ہیں۔

آپ کو اپنے روزافزوں خاندان کی وجہ سے کافی وقت اس طرف خرچ کرنا پڑتا ہے۔

البتہ ہمیں شاہ عرب کی خانگی زندگی کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ کیونکہ عرب میں غریب اور امیر عورتیں دونوں نہایت سختی سے پردہ کی پابند ہیں۔

ان باتوں کے باوجود کبھی کبھی جب شاہ عرب کے ننھے بچے آپ کے قریب ہوں تو آپ اپنے انہماک کو توڑ کر ان سے تفریح طبع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اکثر اوقات دو یا تین سال کا بچہ سلطان العرب کے ایوان عالیہ میں کوئی چیز مانگنے کے لئے یا اپنا کوئی دکھڑا سنانے کے لئے چلا آتا ہے یا بچے دیہاتوں کی سیر کے وقت آپ کی معیت کرتے ہیں۔ اس وقت آپ کے دل کی اصلی کیفیت کا حال معلوم ہوتا ہے۔

اور یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو شخص ایک بچے کی ضدی طبیعت کے سامنے بالکل جھک جاتا ہے۔ اس کو یقیناً انسانوں کا فائدہ اور خدا کا برگزیدہ بندہ بننے کے لئے قسام ازل نے منتخب کیا ہے۔ خدا تعالےٰ کی خوشنودی اور قوم کے ناموس کی حفاظت۔ یہ ہیں وہ اصول جو اس نامور تاریخی ہستی نے زندگی کی شمع راہ بنا رکھے ہیں!

(عبدالرحیم شبلی)

فلسطین

(از جناب مشیر احمد صاحب علوی قادری بی اے)

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہو

غالب

ارضِ کنعان کا ایک جوان صالح اپنے برگزیدہ باپ کے حکم سے عراق کی طرف راہی ہوا تا کہ اپنے ماموں سے جو شہر حرّان کا ایک دولتمند باشندہ تھا اسکی بیٹی کی خواستگاری کرے وطن مالوف (بیر شیبہ) سے حرّان تک سترہ دن کا راستہ تھا۔ بے آب و گیاہ کوہستان اور خطرناک وادیاں سنگ راہ تھیں صحرائی جانوروں سے زیادہ اپنے توام بھائی (عیصر بن اسحٰق) کا خوف تھا۔ جس سے قدیم دشمنی تھی۔ شفیق باپ نے زاد سفر۔ تحائف و ہدایا کے لئے زر و جواہر کا انبار ساتھ کیا تھا۔ اور اس کی حفاظت کی فکر تردّدات میں اضافہ کا باعث تھی۔ بستی سے کچھ ہی دور نکلا تھا۔ کہ بے رحم بھتیجے (الفاز بن عیصر بن اسحٰق بن ابراہیم علیہ السلام) نے راستہ روکا اور جس قدر مال و متاع ساتھ تھا لوٹ لیا نہ ہاتھ میں کوڑی رہی نہ تن پر کپڑا۔ آگے بڑھے تو مال نہیں حال نہیں۔ اور پیچھے پھرے تو والد ماجد کو منہ دکھانے کی مجال نہیں۔ بیکسوں کے مددگار سے فریاد کی اور بہ چشم نم آسمان کی طرف رُخ کیا۔ دیکھا کہ بارہ روشن ستارے فلک اخضر پر درخشاں ہیں۔ دن کے وقت سورج کی تیز روشنی میں ستاروں کا نور دیکھ کر حسرت و استعجاب کے بادل چھا گئے۔ آنکھ نیچی کی تو پہچانا کہ وطن سے بہت دور موریہ کے کوہستان میں استادہ ہے اور دو دن کی مسافت چند لمحوں میں طے ہو گئی ہے۔ اس طے الارض کی کھلی ہوئی کرامت نے حیران و مدہوش کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے آفتاب غروب ہو گیا۔ ہر طرف تاریکی چھا گئی اور اسی کوہستان کے ایک گوشہ میں رات بسر کرنا لازم ہوا۔

پہاڑ پر سنگریزوں کی افراط تھی۔ درندوں سے حفاظت کے لئے اپنے اردگرد پتھر پارہ پتھر لگائے اور ایک پتھر پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ آنکھ بند ہوتے ہی قدرت ایزدی کا تماشا نظر آیا۔

سچے کا خواب

حضرت یعقوب نے دیکھا کہ ایک عظیم الشان زینہ زمین سے فلکِ ہفتم تک لگی ہے اور عجیب فرشتے اس راستہ سے زمین پر اترتے ہیں۔ اور پھر آسمان پر چڑھتے ہیں ملائک نے اس نو وارد مسافر کے نزول اجلال کی ملاء اعلےٰ میں خبر دی بابل کا بادشاہ آیا اور اس سیڑھی کے ستر ڈنڈوں تک چڑھ کر اترا۔ تاجدار آیا اور باون ڈنڈوں تک چڑھ کر لوٹا۔ یونان کا شہزادہ زینے طے کر کے نیچے گرا۔ بعد ازاں ایڈوم کا حاکم آیا اور بڑھ بڑھ آتا ہوا چڑھنے لگا۔ اس کے بادلوں تک پہونچنے اور آسمان پر حکومت کرنے کو ناگاہ خداوند کے جلال نے اس تماشائی کو گھیر لیا۔ آسمانوں کے در کھل گئے زمین کے طبق روشن ہو گئے۔ اور بانگ جرس نے صدا دی حاکم ہے۔ یہ مبارک زمین جس پر تو استراحت کر رہا ہے۔ تیرے فرزند کی میراث ہے اور تیری نسل ریت کے ذرّوں کی طرح بے شمار ہو گی یکایک فلسطین کی تمام زمین گنبد بن کر اس بخت بیدار سوتے کے ہاتھ میں آگئی۔ اور مکرر بشارت دی گئی کہ اس کے فرزند اس خطہ میں تصرف کریں گے .... اب اس سے زیادہ حیرت انگیز جلوے نظر آنے لگے۔ دیکھا کوہ سینا تجلی حق سے معمور ہے اور خدا کا ایک مقبول بندہ ازل سے احکام و قوانین کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ دفعتہً منظر بدلا۔ مرتبت عبادتگاہ تعمیر ہو رہی ہے اور خدا کی بندگی کا حق ادا کرنے والے دودھ اور شہد کی نہروں میں غسل کر رہے ہیں ایک لمحہ میں یہ تماشا بھی

[redacted]

یروشلم کا خوبصورت شہر جل رہا ہے اور عبادت گاہ کا سارا مال و اسباب لوٹا جاتا ہے۔ یہ منظر بھی روپوش ہوا۔ دنیا کے ہر گوشہ سے غلام آزاد ہو کر آئے اور عبادت گاہ کی تعمیر دوبارہ ہونے لگی۔

گھبرا کر آنکھ کھول دی۔ رات ختم ہو چکی تھی اور صبح کا سپیدہ پھیل گیا تھا۔ عنایت و نوازش خداوندی کا شکریہ ادا کیا اور اس مقدس مقام کا نام بیت ایل رکھا۔

یہودی قوم بہت ضدی متعصب اور سخت مزاج ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ جو خیال جم گیا اس کا نکلنا مشکل ہوتا ہے خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ آپ یہودیوں کو کسی طریقہ سے قائل نہیں کر سکتے وہ تمام اسباب و علل پر آنکھیں بند کر کے محض اپنے عقائد پر قائم رہتے ہیں۔ خواہ کوئی رسم کیسی ہی لغو کیوں نہ ہو۔ ایک بار اگر کسی یہودی نے کی ہے۔ تو وہ اب ہمیشہ قائم رہے گی۔ کسی خیال اور بحث سے اس کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ ولادت حضرت مسیح سے بہت قبل ۹۷ سنہ میں ایرانی تاجدار بخت نصر نے کنعان پر حملہ کر دیا۔ یروشلم محاصرہ ہوا۔ فوج کی کمان بخت نصر کے ہاتھ میں تھی۔ یہود کا بدنصیب بادشاہ عاجزی سے صلح کا خواستگار ہوا۔ اور اپنے اعزہ و رفقا کو ساتھ لے کر بغداد کی مستعصم باللہ کی طرح دشمن کے خیمہ میں امان مانگنے چلا گیا۔ جنگ خود بخود ختم ہوئی بخت نصر نے ہیکل سلیمان اور شاہی محل کے خزانے لوٹ لئے۔ یہودیوں کی نگاہ میں ہیکل سلیمان کی وہ قدر تھی جو مسلمانوں کی نظر میں کعبۃ اللہ کی ہے۔ بنی اسرائیلیوں سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ایک شخص آنیوالا ہے وہ زور دار ہے۔ اور حضرت مسیح تشریف لائے لیکن یہودیوں نے ان کے وعظ کو ہنسی میں اڑا دیا اور آج تک وہ اسی خیال میں مست ہیں کہ نجات دہندہ آئے گا۔ حالانکہ وہ ... ۲ سال قبل حضرت مسیح کو اپنے خیال میں صلیب پر چڑھا چکے ہیں۔

آپ نے ابتدا میں ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح حضرت یعقوب نے فلسطین کا خواب دیکھا تھا۔ چنانچہ آج تک یہودی اسی خیال پر قائم ہیں۔ اور آج ہزارہا برس کے بعد بھی یہودی فلسطین کو بیت یہود بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔

اصل میں یہودیوں کو سیاسی اصول پر فلسطین سے وطنی بالفور یادداشت کے بعد سے شروع ہوئی۔ اس سے قبل وہ لوگ فلسطین کو تاریخی اور مذہبی مرکز تصور کرتے تھے۔ عربوں سے انکا اتحاد تھا اور یہ تصور کیا کرتے تھے کہ فلسطین یہود تمدن اور مذہب کا مرکز ہے۔ اور قانع تھے کہ سال میں ایک بار زیارت سے ہو جایا کریں۔ لیکن حکومت کا خیال کبھی بھی پیدا نہ ہوا تھا۔ اگر بالفور یادداشت یہودیوں کی تحریک صیہونیت شروع ہوئی تو مسلمانوں (عربوں) کو اپنا فلسطین کی سیاسی رفعت کی مرکزی حیثیت کو قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا اب عبرانی تعلیم حاصل کی جاتی ہے۔ عبرانی تمدن کی نشر و اشاعت ہوتی اور تحریک صیہونیت کی تبلیغ کی جاتی ہے اور خالص یہودی مسئلہ پر گفت دروازہ کھولا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کو خالص سیاسی نقطہ خیال سے سب سے پہلا میں ایک المانی صحافی تھیوڈر ہرزل نے یہودیوں کے سامنے پیش کیا۔ اس کا تھا روس۔ آسٹریا۔ جرمنی اور دیگر مقامات سے یہودی ہجرت کر کے فلسطین آباد کئے جائیں۔ اس کی ڈائریاں۔ تقاریر۔ خطوط اور نجی تحریروں سے پتہ نہ اس تحریک سے اس کا کوئی مقصد نہ تھا بلکہ وہ وقتی ہنگامہ پیدا کرنا چاہتا تھا لیکن یہ تحریک اثر پکڑتی گئی اور یہودیوں کو تحریک صیہونیت کا قدیم خیال عود کرنا شروع ہوا بلکہ اب اس تحریک نے بیت ملی کا خیال پیدا کر دیا ۱۹۱۵ء میں اس قدیم تحریک کے نشوونما کے قدرتی ذرائع پیدا ہو گئے۔ مشرق و مغرب ہر جگہ اس تحریک کی پرچار شروع ہو گئی۔ پہلے یہودی تحریک صیہونیت پر اعتماد نہ رکھتے تھے اس لئے ایک جماعت نے جو عبرانی احیاء کی کوشش میں تھی وہ عام یہودیوں سے علیحدہ ہو گئی۔ اور رشید آمام گروہ کی نقدیت کرتا رہا۔ رشید امام اس عہد کا بہت بڑا یہودی مصنف اور صیہونی ملی جذبہ کا سب سے بڑا ناقد و ناظر بھی۔ بالفور اعلان کے بعد یہ جماعت حکومت کے ساتھ موالات پر تیار ہو گی۔ اس اعلان کے بعد عبرانی تمدن کا احیا ہو گیا ہے۔ اب فلسطین کے مدارس میں عبرانی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ عبرانی زبان بولی جاتی ہے۔ عبرانی تھیٹر۔ عبرانی مطابع عبرانی اخبارات رائج ہیں۔ بالفور اعلان نے اس تحریک صیہونیت کی پناہی کی اور عبرانی نژاد نسل بہت جلد فلسطین میں تیار ہو رہی ہے اور وہ دور نہیں ہے کہ وہ دنیا کی طاقتور قوم بن جائے گی۔

یہودی یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی نسل کی بقا کے لئے کسی خارجی حکومت کی پشت پناہی کی ان کو ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ ملک عربوں سے آباد ہے

نیرنگ خیال میں کسی مذہب و ملت کے خلاف مضامین شائع نہیں ہوتے اور اسے خالص ادبی پرچہ ہی رکھا جاتا ہے

کچھ یہودی یہ تصور کرتے ہیں۔ کہ جس طرح شمالی امریکہ میں ریڈ انڈین کا قلع قمع کر دیا گیا۔ اسی طرح فلسطین میں عربوں (صحرائی آبادی) کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہ یہودیوں کی سنگین غلطی ہے۔ عربوں کا تمدن خود یہودیوں سے کسی طرح کمتر نہیں ہے۔ وہ ریڈ انڈین نہیں ہیں انکو آسانی سے فنا نہیں کیا جا سکتا ہے اور مسجد اقصیٰ کا خیال مسلمانوں کے دماغ سے کبھی بھی نکل نہیں سکتا۔

حرم شریف۔ یہودیوں و مسلمانوں دونوں کے نقطۂ نظر سے مقدس مقام ہے حرم شریف کا بارہا خون سے غسل ہوا ہے اور آج بھی ہزارہا عرب موجود ہیں جو اپنے ناچیز خون کو حرم کی حرمت پر قربان کرنا پسند کریں گے [illegible] مکہ معظمہ مدینہ منورہ سے کسی طرح عزت میں بیت المقدس کو کم نہیں [illegible] میں یہودی بھی اپنے دماغ سے یہ خیال نہیں نکال سکتے [illegible] ہیکل سلیمان قائم تھا جو تحریک صیہونیت کا مرکز اصلی [illegible] کامیاب ہو جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اسلام کی ایک بڑی جائداد ان لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے جن کے اسلاف [illegible] سال قبل تھی۔ حرم شریف کا وجود مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کے لئے [illegible] لیکن یہودیوں نقطۂ نظر سے حرم کی یہ شکل نہ ہوگی۔ [illegible] بلکہ وہ تو اس کنبہ کو دیکھنا چاہتے ہیں جو ہزارہا سال قبل موریہ کا پہاڑ [illegible] حضرت یعقوبؑ خواب میں دیکھا تھا۔ جس کی تکمیل کا خیال ہر یہودی کو آج تک موجود ہے۔

یہی [illegible] وہ مرکز اصلی ہے جس کی بنا پر فلسطین کو سیت [illegible] بنانے کا خیال پیدا ہوا ہے۔ مسلمان بھی اسکو اسلام کا قبلۂ اول تصور کرتے ہیں اسی طرف حضرت شارع اسلام نے عرصہ تک نماز پڑھی تھی۔ اور اسی مقام پر معراج کا واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ اور تمام مسلمانان عالم اس حرم شریف کو اسلام کا مرکز اصلی تصور کرتے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے قربانیاں کی ہیں اور جب یہ چیز میسر آئی ہے تو اس کو آسانی سے چھوڑ نہیں سکتے۔ سینائے کردستان اور سکندریہ سے عدن تک اس تحریک نے مسلمانوں کو بیدار کر دیا۔ اور خصوصیت سے عربوں میں ایک جدید بیداری کی روح پیدا ہوگئی ہے اور جب تک حرم شریف کا وجود باقی رہے گا۔ تحریک صیہونیت کامیاب نہیں ہو سکتی۔

موجودہ حرم شریف ۱۴۵۱۰۰۰ میٹر یا ۳۶-۱ ایکڑ زمین سے تعمیر ہے

اور اپنے سنگی چبوترہ پر صناعی کے دو نادر نمونے پیش کرتی ہے اور حیرت ہے کہ خلفائے امویہ نے جس طرح اس حرم شریف کو چھوڑا تھا۔ بالکل اسی طرح آج بھی وہ موجود ہے۔ گو سلطان [illegible] نے بہت سی آرائشوں میں اضافہ کیا ہے۔ لیکن مسجد اقصیٰ بالکل اسی حالت میں پائی جاتی ہے۔ حضرت داؤد [illegible] ق۔ م۔ میں [illegible] بنی اسرائیل یروشلم پر حملہ کیا تھا اور بعد [illegible] حضرت داؤد [illegible] پہاڑ پر تعمیر کی تھی۔ اسی پہاڑ کی [illegible] روایات کی رو سے حضرت ابراہیم [illegible] حضرت اسمٰعیل کی قربانی [illegible] ہیکل [illegible] تھی اور بیت مقدس کو [illegible] بنی اسرائیلین [illegible]

[illegible] کا سب سے بڑا کارنامہ یہودی عبادت خانہ کی تعمیر [illegible] سیکڑوں سال تک [illegible] آج بھی شائستہ اور متمدن دنیا کے ایک [illegible] حضرت [illegible] جلوس یمنت الوس کے چوتھے برس [illegible] تکمیل کو پہنچی۔ یہ تاریخی واقعہ [illegible] تعمیر میں نہ تو بار نزول نہ [illegible] آواز سنائی دی۔ [illegible] اس مقدس عمارت کی لمبائی [illegible] ہیکل کے سامنے ایک برآمدہ [illegible] چاروں طرف عبادت زیاد [illegible] عمارت کے وسط میں پاک ترین مقام یعنی [illegible] خالص سونا منڈھا ہوا تھا اور زیتون کی لکڑی [illegible] دس دس ہاتھ اونچے بنائے گئے تھے جن کا ہر ایک بازو پانچ پانچ ہاتھ [illegible] دونوں مورتوں پر سراپا سونا چڑھا تھا۔

ہیکل کے دروازے خالص سونے کے تھے۔ اور دروازوں کے قبضے بھی طلائی ہی تھے۔

نیرنگ خیال میں فلموں پر صحیح تنقیدیں شائع کر کے نیرنگ خیال نے اپنے ملک کی فلمی صنعت کو بہت مدد پہنچائی ہے

ت مقدس کی تعمیر سے فراغت ہوئی - تو ۱۴ دن تک جشن عید منایا گیا اور ر
ناہ نے مذبح کے سامنے ایک فصیح و بلیغ خطبہ پڑھا جس میں بیان تھا کہ "یہ گھر
ی دائمی سکونت کے لئے بنایا گیا ہے"۔ اور اس کے بعد مناجات تھی کہ جو دعا
عمارت کی طرف رخ کر کے مانگے وہ رحمت ایزدی سے قبول ہو جایا
۔

غرض اس امن و برکت کے دور میں یروشلم تمام بلادِ دنیا کا مرکز تھا
عالم کے ایک گوشے کی نعمت کنعان میں موجود تھی۔
ہیکل سلیمان کی تکمیل سے تمام قوم خوش تھی۔ اور سارے شہر یروشلم میں
ل تھا۔ لیکن قصر شاہی میں اس رات دو عیدیں جمع تھیں۔ فرعون کی بیٹی سے
ں کی خوشی تکمیل عبادت گاہ سے ہی زیادہ تھی۔ خواب گاہ کے لئے ایک
ے شامیانہ بنوایا گیا تھا۔ کہ جس میں بیش بہا موتی ایسی صناعی سے جڑے تھے
بتاریں ستاروں کی طرح جگمگاتے تھے۔ دانشمند حاکم انسان ہی تھے عیش و
ت کے طلسم میں ایک ساعت کے لئے یادِ حق سے غفلت ہو گئی حسب معمول
ے شب کے بعد بیدار ہوئے اور معبودِ حقیقی کے سامنے سر نیاز جھکانے کا ارادہ
ر موتیوں کی جگمگاہٹ سے دھوکا ہو گیا۔ کہ ابھی رات باقی ہے۔ اور
ے خوب چمک رہے ہیں۔ اس لئے پھر سو رہے۔ اسی وقت ایک فرشتہ
ن سے نازل ہوا اور اس نے سمندر میں نرکل کا ایک ٹکڑا قائم کیا شہنشاہ کو
ں۔ وہ صبح کے دس بجے تک سوتے رہے۔ ہیکل کی کنجیاں "حضور" کے
ے نیچے تھیں۔ عبادت خانہ میں صحیح وقت پر نماز اور قربانی کی رسوم
و سکیں۔ عبادت گزار آزردہ ہوئے مگر بادشاہ کو بیدار کرنے کی مجال
جب غفلت کا پردہ چاک ہوا اور خوابگاہ سے باہر تشریف لائے تو
وظائف کے ناغہ ہونے پر سخت صدمہ ہوا۔
ادھر اس فرشتے کے گاڑے ہوئے نرکل کے گرد ریت جمع ہونے لگا
تہ اس جگہ ایک جزیرہ بن گیا۔ مدتوں کے بعد اس جزیرہ میں ایک جنگل
ا۔ اور جزیرہ کی اراضی بڑھ کر بر اعظم ہو گئی۔ آخرکار اس جنگل کو کاٹ کر
بنیاد اسی سرزمین پر رکھی گئی اور یہی وہ عظیم الشان سلطنت تھی جو
انکبری کے نام سے دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اور جس سے یروشلم کو
نہ میں ایسا تباہ و برباد کیا کہ اس کے بعد بنی اسرائیل کی عظمت پھر قائم
ں۔ یوں کہیے کہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر سے جس دن فراغت ہوئی اسی دن
تباہی بنی اسرائیل کا بیج بویا گیا۔

سہ
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولا برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

وفات حضرت سلیمان کا اعلان زوال سلطنت بنی اسرائیل کی عبرتناک داستان کا عنوان تھا۔ فلاکت و مصیبت کے بادل عہدِ زریں کے تمام ہوتے ہی جمع ہوئے مگر سب سے پہلے اتحاد کا شیرازہ منتشر ہوا۔ سلطنت مختلف قبائل میں تقسیم ہو گئی۔ بالآخر بخت نصر نے ۵۸۶ق۔م میں کنعان پر حملہ کر دیا۔ یروشلم کا محاصرہ ہوا۔ ۱۰ مہینہ محاصرہ رہا۔ مصیبتوں کے بادل دن بدن گھرے ہی ہوتے گئے۔ شہر میں قحط پڑا۔ شہر پناہ میں رخنہ ہو گیا۔ اور لوگوں نے بھاگ کر بیابان کی راہ لی۔ اب بابل کی خون آشام فوج یروشلم کی فصیل توڑ کر شہر میں داخل ہوئی۔ ہیکل سلیمانی میں آگ لگا دی۔ پیتل کے ستون اور حوض جو خداوند کے گھر میں تھے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کئے۔ شاہی محلات اور تمام عالی شان عمارتیں مسمار کر دیں۔ اور جس قدر زر و جواہر شہر میں دستیاب ہو سکا لوٹ لیا۔ ساری مملکت کی رعایا لونڈی غلام بنائی گئی۔ اور یروشلم کا مقدس شہر بے چراغ ہوا صرف کنگالوں اور زراعت پیشہ لوگوں کو چھوڑ کر کنعان کی تمام شریف آبادی بابل میں غلامی کی مصیبت اٹھانے کے لئے بھیجی گئی۔

کلدانیوں کی سلطنت ختم ہوئی۔ بخت نصر کے تخت گاہ پر خورش کا ہمایونی سایہ گستر ہوا۔ اور بنی اسرائیل ایک مالک کی حکومت سے نکل کر دوسرے آقا کی غلامی میں آگئے۔ ایرانی اصنام پرستی کے مخالف تھے۔ یہودیوں کی ترغیب کو بابلیوں کی توہم پرستی سے بہتر سمجھتے تھے۔ ان کو یروشلم کی تباہی بنی اسرائیل کی جلا وطنی کا غم تھا۔ اور کلدانیوں کو ذلیل کرنے کے لئے ان کی مفتوحہ قوموں کو عزت دینا مصلحت ملکی تصور کرتے تھے۔ کیخسرو جب بادشاہ ہوا تو اس نے بنی اسرائیل کی عزت و توقیر میں کمی نہیں کی۔ اور یہ تاریخی اعلان جاری کیا "خداوند نے زمین کی سب مملکتیں مجھے بخشی ہیں اور تاکید کی ہے کہ میں یروشلم میں اس کے لئے ایک مسکن بناؤں۔ پس تمہارے درمیان جو کوئی اس کی ساری قوم میں ہے۔ وہ یروشلم کو جائے اور اسرائیل کے خدا کا گھر جو یروشلم میں ہے بنائے اور جو کوئی نہ جانا چاہے وہ چاندی سونے مال اور مویشی سے مدد کرے

اور خدا کے گھر کے لئے جو یروشلم میں ہے ہدیہ بھیجے"۔ یہ فرمان یہودی قیدیوں کی رہائی کا پہلا شاہی اعلان تھا۔ بنی اسرائیل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ آخری اسرائیلی بادشاہ کے جاہ و حشم دیکھنے والے نوجوان سن رسیدہ اور ضعیف ہو چکے تھے بوڑھے مر چکے تھے۔ اور لڑکے بوڑھے تھے۔ یروشلم کی رونق اور آبادی چند ہی نفوس کو یاد تھی مگر آبا و اجداد کی راجدھانی بیت رحیم دیکھنے کا شوق اور ہیکل سلیمانی میں عبادت کرنے کی آرزو۔ باپ دادا سے میراث میں ملی تھی۔ دل کھل گئے اور ساری قوم یکزبان ہو کر یہوواہ کی عظمت اور عالی ہمتی کے ترانے گانے لگی۔

قدیم متبرک مقام پر عارضی قربانگاہ بنائی گئی اور سنہ ۵۳۵ ق۔م۔ میں عبادت خانہ کی تعمیر شروع ہوئی۔ بنیادی پتھر بڑے جوش و خروش سے رکھا گیا اپنے اعضا نے اس کار خیر میں مخالفت اور مزاحمت کی۔ سامری دشمنی پر تیار ہوئے۔ تعمیر قانوناً روک دی گئی۔ گشتاسپ نے دوبارہ ہیکل کی تعمیر کی اجازت دی اور شہنشاہ دارا کے چھٹے سن جلوس میں سنہ ۵۱۵ ق۔م میں یروشلم پورے ۲۰ سال کے بعد پایۂ تکمیل کو پہونچی بمونہ قدیم معبد سلیمانی کا تھا مگر مسالہ کم قیمت استعمال کیا گیا۔ سن رسیدہ نفوس جنہوں نے قدیم عالیشان عمارت کی زیارت کی تھی۔ اس جدید گھر کو دیکھ رونے لگے اور نوعمروں نے شادمانی کے ترانے شروع کئے۔ خوشی کا شور اور غم کی صدائیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ بوڑھے چند تھے اور جوان بہت۔ اس لئے اغیار کو یہ امتیاز دشوار تھا۔ کہ بنی اسرائیل تعمیر جدید پر مسرت کے شادیانے بجا رہے ہیں یا پرانی یادگار کی تباہی پر بین کر رہے ہیں۔

عزرا کاہن پندرہ سو ایرانیوں کا مختصر قافلہ لے کر یروشلم آئے۔ الہامی زبان میں خدا کا ہاتھ اس کے ساتھ تھا اس نے راستہ میں گھاٹ والوں سے بچایا۔ لیکن جب وہ یروشلم میں پہونچے وہاں رنگ دگرگوں تھا فسق و فجور کا بازار گرم تھا۔ مصحف انبیا کا نشان نہ تھا۔ تابوت سکینہ نذر آتش ہوا۔ اجنبی بیویاں گھروں میں تھیں۔ عزرا نبی نے لباس چاک کیا۔ روزے رکھے۔ ہیکل مقدس میں مناجات کی۔ بیت ایل میں رو رو کر دعا مانگی۔ آہ و زاری رنگ لائی۔ قوم کو بداعمالی کا احساس ہوا۔ اجنبی بیویوں کو چھوڑا اسوۂ ابراہیمی پر عمل پیرا ہونے کا بیڑا اٹھایا۔ عزرائیلیوں نے فوق العادت قوت حافظہ سے کام لے کر عہد نامہ عتیق کے سب پرانے صحیفے لکھوائے اور شریعت موسوی کو کیا۔ اُن کے جوش خلوص ہمدردی اور قابلیت نے آل داؤد کو ملت و پرستار بنایا۔ اور وہ قدامت پرست و متحمل قوم پرست کا جو ہزار ہا سال مظالم سہنے کے بعد آج بھی دنیا کے بر اعظم میں اپنے مخصوص رسوم و قواعد کے ساتھ زندہ ہے۔ ایشیا کا فلسفہ۔ یورپ کا فیشن امریکہ کے سائنس ان آداب و دستور کو ترمیم کرنے سے عاجز ہے۔ وہ سب سے ملے ہوئے ہیں ہندوستان میں ان کا ایک نامور فرزند وائسرائے بھی رہ چکا ہے۔ مدبرین میں ان کے افراد کا شمار ہے۔ دولت میں اس کا کوئی ہمسر نہیں لیکن بایں ہمہ سب سے الگ "خلوت در انجمن" اور "بے ہمہ باہمہ" کا مصداق ہیں۔ اور موجودہ مذہب عزرا کا شرمندۂ منت ہے۔ لیکن ابھی شہر پناہ کی تعمیر نہ ہوئی تھی۔ نحمیا کی عنایت سے ۵۲ روز کی مدت میں پناہ تعمیر ہوگئی۔ نحمیا اور عزرا ایران واپس چلے گئے۔ ان بلند ہمت بزرگوں کی برکت سے ارض موعود میں بنی اسرائیل کی سلطنت دوبارہ قائم ہوگئی۔

اب دنیا کی تاریخ کا ورق دوبارہ پلٹا۔ اکتوبر کی پہلی تاریخ سنہ ۳۳۱ ق۔م میں صبح کے وقت سکندر کی فوج نے لڑائی کا بگل بجایا اور چند گھنٹوں میں جنگ کا فیصلہ ہوگیا۔ مشرق کو مغرب نے کچل دیا۔ ایشیا کو یورپ نے روند ڈالا۔ ایرانی ۳ لاکھ مقتول میدان میں بے گور و کفن چھوڑ کر فرار ہوئے سلطنت کا چراغ گل ہوگیا۔ سے

نسب نامۂ دولت کیقباد ورق بر ورق ہر سوئے

سکندر ایشیا کا بادشاہ ہوا اور فرزندان اسرائیل اس کے فرمانبردار لیکن اس حیرتناک انقلاب کے ۱۰ سال ہی بعد ۱۱ جون سنہ ۳۲۳ کو شاہ وقت خاندان کیقباد کا بے چراغ کرنے والا منزل عدم کا مسافر ہوا اور وسیع سلطنت متعدد جنرلوں میں تقسیم ہوگئی۔ شام و فلسطین پر سیلوکس کی حکومت ہوئی۔ شام کی سلطنت تقریباً ۲۵۰ برس اس کے جانشینوں کے تصرف میں لیکن سنہ ۳۱۲ میں غزا اس مقام پر ٹالمی نے ولیعہد شام کو شکست دے قبضہ کرلیا۔ اور سبت کے دن یروشلم میں داخل ہوا۔ اب مصریوں کا فلسطین ہوگیا۔ جو تقریباً ایک صدی تک قائم ہوگیا۔ شام کے بادشاہ موقع کے منتظر

لسطین کو زیر نگیں کرنے کی گھات میں تھے۔ سنہ ۲۰۳ ق۔م۔ میں شاہ انٹیوکس
م کے فلسطین اور سواحل پر قبضہ کرکے کنعان کو دوبارہ شام کا صوبہ بنالیا
ن سنہ ۱۷۰ ق۔م میں یونانی تہذیب۔ یونانی تمدن۔ یونانی مذہب کی
، واشاعت شروع ہوئی۔ یہود قدامت پرست تھے۔ ان کے مذہب کو
انیوں سے اصولی اختلاف تھا۔ انہوں نے مذہب اور معاشرت تبدیل
نے سے انکار کیا اور حکومت نے انکو ظلم و جور کا تختۂ مشق بنایا۔ مصائب کی کوئی
نہ رہی۔ حتیٰ کہ ساٹس نے ۱۰ ہزار پیادے اور ۵ ہزار سوار لیکر حملہ کردیا۔
ن مقالی نے سرفروشانہ مقابلہ کیا۔ اور تمام ارض کنعان کا مالک ہوگیا۔ اور
ل سلیمانی جو اب معبد مشتری کے نام سے مشہور تھا۔ دوبارہ اس کو آلائشوں سے
ـ وصاف کیا۔ اور عبادتگاہ سلیمانی بنایا اور تین سال کے بعد شریعت موسوی کے
الق خدائے وحدہٗ لاشریک کی ستائش شروع ہوئی۔ یہ واقعہ سنہ ۱۶۴ ق۔م کا ہے۔
حون مقالی یروشلم کا متولی اعظم ہوا۔ ارض کنعان کو قلعہ بند کیا اور سنہ ۱۴۳ ق
۔ م میں اپنی خود مختیاری کا اعلان کردیا۔ اسرائیلی سکہ جاری ہوا۔ اور
ودیوں کی آزاد سلطنت دوبارہ ارض موعود پر قائم ہوگئی۔

ذرہ بھی چمک کے ہو ستارہ قائم جو زمین و آسماں ہے

بخت نصر کی غارت گری۔ بابل کی غلامی۔ شاہوں کی سفاکی کے بعد
اسرائیل کی ارض کنعانی میں خود مختار حکومت قوم کی جانبازی سرفروشی
رشوق شہادت کا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ ایک ہزار برس پہلے طالوت
دداؤد نے اس سرزمین پر سلطنت کا بنیادی پتھر رکھا تھا۔ مگر اس وقت
راف وجوانب میں کوئی زبردست قوت منتظم موجود نہ تھی۔ لیکن اسوقت
ومتہ الکبریٰ کی جمہوری حکومت روز افزوں ترقی کر رہی تھی۔ اور
ان کو مغلوب کرچکی تھی۔ یہود کا ملجا و ماویٰ مقدس یروشلم دشمنوں کے
رف میں تھا۔ حتیٰ کہ عبادتگاہ سلیمانی میں بھی یونانی اصنام کی خدائی تھی
عاجزی بےلبی اور ناامیدی کے ماحول میں آزادی کی کوشش اور
بیاب انقلاب کی سعی مشکور یہود امقالی کے صدق و خلوص کی کرامت تھی
ـنے خون جگر سے نخل آزادی سیراب کیا تھا۔ اور جان بیچ کر قوم کو ظالموں کے
ہسے رہائی دلائی تھی۔ رومتہ الکبریٰ کی جمہوری سلطنت کا نامور سپہ سالار
ی نے ۳۵ سالہ امارت میں بادشاہوں کو زیر کیا اور حیفا اور شام کی حکومتوں کو
زیر کیا۔ سنہ ۶۳ ق۔م میں جنوب کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ اس کو
یروشلم کے باہمی نزع کا حال معلوم ہوا۔ فوراً اس نے شہر پر حملہ کردیا۔ ۳ ماہ تک
شہر کی حفاظت کی گئی۔ فاقہ کشی کی نوبت پہونچی۔ ضبط و تحمل کی قوت گھٹی۔
فصیل میں رخنے پڑگئے۔ اور شہر بزور شمشیر فتح ہوا۔ ۱۲ ہزار یہودی تہ تیغ کئے
گئے۔ یروشلم کی شہرپناہ مسمار کی گئی۔ پامپی ہیکل سلیمانی میں داخل ہوا۔ اس
طرح ایک صدی کے بعد باہمی نفاق کی وجہ سے یہود کی خود مختار سلطنت کا خاتمہ
ہوا۔ اور سنہ ۶ء میں یروشلم کی حکومت ایک رومی گورنر کے سپرد ہوئی۔ اور
سلطنت کنعان روما کا ایک صوبہ بن گئی۔ اور ارض موعود کا خیال گونگے کا
خواب بن گیا۔

ہیروڈ کی عہد میں حضرت ذکریا و حضرت مسیح کا ظہور ہوا۔ حضرت
مسیح کو صلیب دی گئی۔ بنی اسرائیل ایک دوسرے کو کافر و مرتد تصور کرتے
تھے۔ بعینہٖ انکی وہی حالت تھی۔ جو آج کل مسلمانوں کی ہے۔ کوئی گورنر یہود کو
خوش نہ کرسکا۔ سنہ ۶ سے سنہ ۶۶ تک ۶۰ برس میں ۱۴ گورنر بدلے گئے۔
اتفاق سے جس دن یروشلم میں خود مختاری کا اعلان ہوا۔ اسی روز قیصریہ میں رومی
گورنر کے حکم سے ۲۰ ہزار یہودی قتل کئے گئے۔ باغیوں کی حکومت شروع ہوگئی۔
جوزیفس اس حکومت کا سردار مقرر ہوا۔ لیکن اس کی شہرت اس بےنظیر تاریخ
یہود سے ہے جو اس نے کئی سال بعد رومتہ الکبریٰ میں تالیف کی تھی۔ اس نے
آزمودہ فوج سے کھلے میدان میں جنگ خلاف مصلحت سمجھ کر جو کا بیٹ سے کے
حصہ میں قلعہ بند ہوگیا۔ یہود میں باہم اتفاق ہوتا تو دار السلطنت کی تسخیر آسان
نہ تھی۔ مگر بدقسمتی سے شہر کے اندر مخالف فرقوں میں جنگ شروع ہوگئی۔ اور
اس کا سلسلہ ختم نہ ہوا تھا کہ سنہ ۷۰ء میں طیطوس نے محاصرہ کرلیا۔ شہر میں قحط
پڑگیا۔ رومی دعاوی کر رہے تھے۔ اور پسپا ہوتے تھے۔ لیکن یروشلم کی طرح
اطاعت پر تیار نہ تھا۔ آخر کار رومیوں کے قلعہ شکن آلات نے ایک جگہ دیوار
میں رخنہ کردیا۔ رات کے وقت ۲۴ نفوس شہر میں داخل ہوئے۔ طیطوس نے
اشتہار جاری کیا۔ بہتوں نے فائدہ اٹھایا۔ مگر بیشتر خیموں اور ہیکل
مقدس میں پناہ گزیں ہوئے۔ ایک دل جلے نے جلتی ہوئی مشعل عمارت ہیکل
پھینکدی۔ شعلے بھڑک اٹھے۔ یہودیوں نے یہ منظر دیکھ کر چیخ ماری اور تلواریں
کھینچ کر دشمنوں کو مارنے اور ہیکل پر اپنی جانیں قربان کرنے لگے۔ طیطوس نے

شور مچایا۔ آگ بجھانے کا انتظام کیا مگر تلواروں کی جھنکار میں اس کی آواز کون سنتا۔ آج یہودیوں پر غضب خداوندی نازل تھا۔ ہزاروں بے گناہ قربانگاہ کے گرد کٹے ہوئے پڑے تھے۔ ہیکل کی سیڑھیوں سے خون کے پرنالے بہ رہے تھے۔ اور لاشیں بہہ بہہ کر نیچے گرتی تھیں قبل اس کے کہ ہیکل مقدس کے مقام تک آگ کے شعلے پہونچیں طیطوس نے اس کو بچانے کی آخر کوشش کی۔ مگر اس کی آنکھوں کے سامنے مغلوب الغضب سپاہیوں نے الہام گاہ کے عالیشان دروازے میں آگ لگادی اور ساری عمارت ایک ساعت میں جل کر خاک کا ڈھیر ہوگئی اسی طرح یروشلم کا خاتمہ ہوا۔ اور جوزیفس کی روایت کے مطابق تخمیناً ۱۱ لاکھ یہودی مقدس شہر کی حفاظت میں قتل ہوئے۔ یہود کی تاریخ ختم ہوگئی۔ بنی اسرائیل کا من حیث القوم وجود باقی نہ رہا۔ کنعانی غلام یورپ اور ایشیا کے بازاروں میں علی الاعلان فروخت ہوئے۔ یہودیوں کا ملک ریگستان ہوگیا۔ بھیڑیئے اور درندے ان شہروں میں رہنے لگے۔ جہاں اسرائیلیوں نے عیاشی اور بدکرداری کی داد دی تھی۔ ؎

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را ۔۔۔ چندیں اماں نداد کہ شب را سحر کند

کیا مسلمان قوم کے اکابر اس انجام سے سبق حاصل کریں گے۔

مسلمانوں نے رومیوں سے ۶۳۷ء میں فتح کیا۔ اور حضرت فاروق اعظمؓ خلیفہ دوم یروشلم میں فاتحانہ داخل ہوئے تو انہوں نے حرم شریف کو غلاظت سے بھرا ہوا پایا۔ آپ نے ایک چبوترہ تعمیر کیا اور پہاڑی پر الاقصیٰ کی تعمیر کی۔ جو ۴۰ سال تک قائم رہی اور اس کے نشانات بھی اب پائے نہیں جاتے اور یہی وہ مقام ہے جو اب بھی مسجد عمر کے نام سے مشہور ہے۔ خلفائے امویہ کے عہد میں حرم شریف کی موجودہ شکل وجود میں آئی وہ جزیرۃ العرب پر قابض نہ تھے اس لئے انہوں نے یروشلم کے تقدس کو سیاسی اصول پر بڑھانے کی بے حد کوشش بھی کی۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان نے موجودہ حرم شریف کی تعمیر کی۔ بہت سے انقلابات سے یہ عمارت دوچار ہوچکی ہے۔ لیکن اس کے تقدس اور رعنائی میں مطلقاً کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ ۱۰۹۹ء میں اس کو مسیحی محاربین نے بولین کی قیادت میں فتح کرلیا۔ لیکن سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۸۷ء میں اس کو مسیحی اقتدار سے رہا کیا۔ اور ۱۹۱۷ء تک یہ مقدس مقام اسلامی دنیا کا مرکز اصلی بنا رہا۔ ۱۹۱۷ء میں سلاطین عثمانیہ سے لارڈ النبی نے فتح کیا۔ اور اب بیت الیہود بنانے کا قدیم خیال پھر پیدا ہوگیا ہے۔

حضرات آپ نے فلسطین اور اہل فلسطین کی تاریخ داستان شباب و زوال ملاحظہ کی۔ اب اس کو بالفور اعلان کہئے یا برطانوی اقتدار مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کو اس مرکز اصلی۔ اس قبلہ اول کی رہائی کا خیال پیدا ہوگیا ہے۔ مسلمانوں کو برطانوی مدبرین کا شکریہ ادا کرنا چاہئیے کہ ان کو دوبارہ کسی مرکز خیال پر توجہ قائم کرنے کا موقعہ مل گیا ہے اور اگر آج مصطفےٰ کمال اتاترک کی عنایت سے قسطنطنیہ کی جانب عام مسلمانوں کو اطمینان قلب نصیب ہوگیا ہے تو اب تمام مسلمانان عالم کو اپنے مرکز اصلی کے تحفظ کا خیال بجد پیدا ہوگیا ہے۔ یہ خیال کہ حکومت برطانیہ مسلمانوں کے مقابلہ میں تحریک صیہونیت کی پشت پناہی پر تلی ہوئی ہے۔ یقیناً غلط ہے۔ برطانوی مدبرین کیلئے مسلمانان ہند اسی سے زیادہ عزیز ہیں۔ جس قدر کہ یہودی۔

مسلمانان ہند کو کسی بیرونی خبر پر اس وقت تک یقین نہیں کرنا چاہیے۔ جب تک حکومت ہند کے محکمہ نشر و اشاعت سے اس کی تصدیق نہ ہوجائے۔ اسوقت فلسطین کا مسئلہ حکومت کی توجہات کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اور امید ہے کہ انشاء اللہ مسلمانان ہند کی خدمات کی ہمنوائی میں اس اہم مسئلہ کا فیصلہ ہوگا۔

(قادری)

اس مقالہ میں مجھ کو ادیب سحر طراز منشی امیر احمد صاحب علوی کی داستان زوال سے امداد ملی ہے۔ اور جن لوگوں کو اس مسئلہ سے دلچسپی ہو اؤں کو داستان زوال کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئیے۔ یہ نایاب کتاب فسانہ کا افسانہ اور تاریخ کی تاریخ مسلمانان ہند کو اس کتاب کو دیکھ کر اپنی قوم مرحوم کے لئے کسی آخری فیصلہ کا سوچنا چاہئیے۔ یہ نایاب کتاب نواب ذکی احمد صاحب علوی القادری آنریری لائبریرین۔ امیر محل لائبریری۔ نصیر باغ۔ کاکوری (اودھ) لکھنؤ سے دو روپیہ قیمت پر مل سکتی ہے۔ (قادری)

عربی زبان اور دورِ جاہلیت

(از جناب سید محمد یوسف صاحب فاضل ادب بھوپال)

ماہرین علم الالسنہ نے دنیا کی بے شمار زبانوں کو تین اصولوں میں منقسم کیا ہے

السنہ آریہ	(یا ہندو یورپی زبانیں)	ہندی انگریزی وغیرہ
السنہ تورانیہ	(یا منغولیہ)	چینی تورانی وغیرہ
السنہ سامیہ		عربی سریانی عبرانی وغیرہ

السنہ سامیہ کا اطلاق ان زبانوں پر ہوتا ہے جو سامی اقوام کی زبانیں ہیں۔ سامی اقوام وہ قومیں ہیں جو آرمینیہ سے لے کر بحر عرب تک اور خلیج فارس سے لے کر بحر احمر تک آباد تھیں ؛

تقریباً دو ڈھائی ہزار برس قبل مسیح بابلی زبان کا پتہ ملتا ہے۔ اس زمانہ میں قوم عاد کا بابل پر تسلط تھا۔ قوم عاد عرب تھی اور اس کی زبان بھی عربی ہی تھی۔ عربی زبان بھی انہیں عربوں کے ساتھ ساتھ بابل میں پہونچی۔ اور وہاں کی قدیم زبان سے مل جل کر بابلی کی شکل اختیار کی۔ اس نظریہ کے مطابق بابلی حقیقتہً عربی ہی کی ایک شاخ تھی۔ جس طرح عربی اور ہندی کا آمیزش سے ایک نئی زبان سندھی پیدا ہوگئی۔ لیکن اس نظریہ سے بعض مستشرقین یورپ مختلف نظر آتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بابلی عربی کی شاخ نہیں بلکہ بابلی سے عربی نکلی ہے۔ تاہم یہ بات متفق علیہ ہے کہ عربی اگر السنہ سامیہ کی ماں نہیں تو کم از کم ان کی سب سے بڑی بہن تو ضرور ہے۔ اور بابلی کے بعد سب سے قدیم زبان ہے ؛

موجودہ عربی زبان کا اطلاق اس زبان پر ہوتا ہے جو ۵۰۰ء کے بعد کی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ عربی زبان نے اپنی موجودہ شکل عین ۵۰۰ء کے بعد ہی اختیار کی ہے۔ تدریجی ارتقا کے عالمگیر اصول سے زبان کی نشو و نما بھی مستثنےٰ نہیں۔ ایک ارتقا پذیر سلسلہ کی قریبی اگلی اور پچھلی کڑیاں بہت ہی کم مختلف ہوا کرتی ہیں۔ البتہ ۵۰۰ء سے قبل کی زبان اوراق و نیز حافظہ میں محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے ہم تک نہیں پہونچ سکی اسوجہ سے ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ موجودہ شکل ۵۰۰ء سے اختیار کی ہے ؛

عربی زبان کے پانچ دور قرار دیئے گئے ہیں۔ اول دور جاہلیت۔ دوم دور اسلامی۔ سوم دور اموریہ۔ چہارم دور عباسیہ۔ پنجم از آخر دولت عباسیہ تا زمانہ حال ؛

دور جاہلیت کی مدت ۵۰۰ء سے ابتدا ار اسلام یعنی ۶۲۲ء تک قرار دی گئی ہے۔ اس دور کی ادبیات کا کثیر حصہ مکتوب نہ ہونے کی وجہ سے ضائع ہوگیا۔ کیونکہ اس دور تک عرب لکھنے پڑھنے سے بے بہرہ تھے۔ ٹھیک اس وقت جب آفتاب اسلام طلوع ہوا۔ عرب میں کل ۱۷ شخص ایسے تھے جو لکھنا جانتے ہوں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس زمانہ میں تحریر کا بہتکا سوال ہی نہ تھا۔ لیکن اگر ایک طرف عرب لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے تو دوسری طرف احفظ الامم ہونے کا امتیاز بھی رکھتے تھے۔ یہ بڑے بڑے قصائد اور خطبات صرف ایک دفعہ سن کر یاد کر لیا کرتے تھے۔ اس دور کی ادبیات کے متعلق ہم کو جو کچھ بھی معلومات ہیں وہ ان کے اسی خداداد حافظہ کی مرہون ہیں۔ اس دور کی جو ادبیات ہم تک پہونچی ہیں وہ وہی ہیں جو سینہ بہ سینہ نقل ہوتی ہوئی دور امویہ تک پہونچیں جبکہ علوم کی تدوین و تالیف ہوئی ؛

یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ فطرتاً انسان نظم کو بہ نسبت نثر کے زیادہ اور جلد تر یاد کر سکتا ہے۔ اس لئے اس دور کی جو ادبیات ہم تک پہونچی ہیں وہ زیادہ تر نظم ہیں۔ نثر کا صرف بہت تھوڑا حصہ ہے جو چند خطبات اور کچھ وصیات دینی پر مشتمل ہے۔ لیکن نظم عربی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے

کہ وہ بجا طور پر دیوانِ عرب کہلانے کی مستحق ہے۔ یہ نظم عرب کی تمام تاریخ جنگ کے واقعات۔ اجتماعی و تمدنی حالات۔ معاشرتی رسوم۔ عقائد۔ خیالات و رواج و نیز خانگی زندگی کا آئینہ ہے۔ اس میں ہم کو عرب کے تمام سچے سچے جذبات اپنے بالکل فطری رنگ میں نظر آتے ہیں۔ ان کے اہم ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس دور کی شاعری تصنع و تکلف سے بالکل پاک و مبرا ہے۔ اس زمانہ میں بدویت کا غلبہ تھا اور عرب ان تکلفات سے جو حضریت کے لئے لازمی ہیں بالکل ناآشنا تھے۔ وہ تمام اصناف شعر۔ مدح۔ ہجو۔ غزل۔ مرثیہ وغیرہ میں صرف اپنے سچے جذبات کا اظہار کرتے اور اس میں تصنع کا کبھی شائبہ تک نہ آنے دیتے ؛

وہ اگر غزل یا نسیب کہتے تو اس میں اپنے سچے جذبات عشق کا اظہار کرتے۔ وہ اگر کھنڈرات پر کھڑے ہو کر آنسو بہاتے تو اس کا محرک اپنے حبیب کی سچی یاد ہوتی۔ وہ اگر مرثیہ کہتے تو اپنے جذبات حزن و ملال سے مجبور ہو کر۔ وہ اگر قصیدہ کہتے تو اپنے ممدوح کے اخلاق و صفات سے متاثر ہو کر۔ وہ اگر ہجو کہتے۔ تو واقعی اخلاق ذمیمہ کی اور اس میں بھی فحش اور جہل سے پرہیز کرتے۔ غرض یہ وہ نمایاں خصوصیت ہے جو اس دور کی شاعری میں سب سے زیادہ نظر آتی ہے ؛

عربی ادب کی تہذیب میں قریش کا دور سب سے اہم ہے۔ یوں تو ملک عرب کی وسعت کے لحاظ سے عربی زبان مختلف حصوں اور مختلف قبائل میں مختلف لہجوں کے ساتھ بولی جاتی تھی۔ لیکن ان سب میں معیار فصاحت قریش کی زبان قرار دی گئی اور رفتہ رفتہ تمام قبائل اپنی زبان کو قریش کی زبان کی سطح پر لانے کی کوشش کرتے رہے۔ وجہ یہ تھی کہ قریش حجاز مکہ کے ارد گرد آباد تھے۔ مکہ زمانہ قدیم سے ایک مقدس شہر مانا جاتا تھا۔ اور حقیقتاً وہ "دنیا کے بتکدوں میں" سب سے پہلا گھر ہے۔ تمام عرب دور دور سے ہر سال موسم حج میں جمع ہوتے ان اجتماعات کے موقعوں پر فصاحت و لعب کی بڑی بڑی مجالس منعقد ہوتیں اور وہاں تمام قبیلوں کے شعراء و خطبا شعر خوانی و نغمہ سنجی کرتے اور فصاحت و بلاغت کے بڑے بڑے معرکے قائم ہوتے۔ عرب ان مواقع پر مختلف قبائل کی زبان سے فصیح ترین الفاظ و محاورات کا انتخاب کر لیتے اور جو الفاظ و محاورات قریش کے اشعار و گفتگو میں آتے وہ تمام قبائل میں رائج ہو جاتے۔ اسی دور جاہلیت میں عربی زبان نے ایک ادبی زبان کی حیثیت اختیار کی اسی وجہ سے یہ دور اسقدر اہم

خیال کیا جاتا ہے۔ نیز قریش کی زبان بالکل خالص سمجھی جاتی تھی۔ اسو جہ سے کہ ا
بدویت کامل طور سے غالب تھی۔ اور دوسری قوموں سے اختلاط نہ ہونے
وجہ سے ان کی زبان خراب نہ ہونے پائی تھی۔ برخلاف ان کے شمال کی وہ اقو
جو روم یا ایران کے ماتحت تھیں یا یمن کے باشندے جو تمدن اور تہذیب
پیش پیش تھے۔ دوسری عجمی اقوام سے میل جول کے سبب اپنی زبان کی خص
کھو چکی تھیں اور در حقیقت ان کی زبان خالص عربی کہلانے کی مستحق نہ تھ

اس دور کی عشقیہ شاعری سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ پہلے عرب
ان خاص حالات سے واقفیت ہو جن میں وہ ریگستان کے عرب جن کے د
فطری عشق سے معمور تھے۔ زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ دور جاہلیت تک عر
صرف چند مخصوص حصوں میں تمدن نے قدم رکھا تھا۔ باقی اکثر حصہ خانہ بد
تھا۔ اور خالص بدویت میں زندگی بسر کرتا تھا۔ یہ لوگ آب و گیاہ کی تلاش م
اپنے اونٹوں کو لئے دور دور مارے پھرتے تھے جہاں پانی اور گھاس ملتا وہ
مقیم ہو جاتے۔ اور جب تک پانی اور گھاس باقی رہتا وہیں خیمہ زن رہتے
جب پانی اور گھاس ختم ہو جاتا خیمہ اٹھاتے اور کوچ کر جاتے۔ یہ لوگ عموماً
میں رہا کرتے تھے اسی وجہ سے انہیں اہل دبر بھی کہا جاتا ہے۔ بسا اوقات ایس
ہوتا کہ کسی پانی کے کنارے مختلف گھرانے اور قبائل آباد ہوتے۔ ایک عرص
وہاں ساتھ رہتے۔ اسی عرصہ میں باہمی عشق و محبت کے رابطہ پیدا ہو جا
اور اس کے بعد جب پانی گھاس کے ختم ہونے پر کوچ کرتے تو عاشق و معشوق
دونوں مختلف سمتوں میں چلے جاتے اور لق و دق صحرا ان کے درمیان حائل
ہو جاتے۔ اگر پھر کبھی ان مقامات سے گذر ہوتا جہاں وہ اپنے محبوب
رہا کرتے تھے۔ تو یکایک ان کے جذبات کو ٹھیس لگتی۔ اور دلسوز اشعار ا
زبان سے نکل جاتے۔ جو ان کے سچے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتے۔ زمانہ فر
میں اپنے معشوق کی صحبتیں یاد کر کے ان پر آنسو بہاتے اور اس کے حسن و
ذکر کرتے۔ اور اپنی بےبسی و بےچارگی کو نہایت موثر پیرایہ میں ظاہر کر

معشوق کی پرانی ملاقات گاہوں پر آنسو بہانا عربی شاعر
ایک خصوصیت ہے۔ عرب اکثر اپنے قصائد کی ابتدا اسی طرح ک
کرتے تھے۔ امراء القیس نے خاص طور پر اس طرز کو آسمان کمال
پہونچا دیا ؛

(سید محمد یوسف)

اسلامی خواتین سے خطاب

اے گرامی عورتو اسلام کی — تم سے کچھ کہنا ہیں باتیں کام کی
رنگِ مغرب اور تم حیرت ہے یہ — صبحِ مشرق پر سیاہی شام کی
آفتابِ مشرقِ عزت ہو تم — سوئے مغرب کیا امیدیں نام کی
بلبلِ شیدا کے حق میں ہے ستم — یہ نمائش چہرۂ گلفام کی
وہ اٹھی چہرے سے زلفِ مشکبار — جھلملائی لو چراغِ شام کی

کیوں نہ لو چشمِ حیا پرور سے کام — کیا ضرورت خنجر و صمصام کی
گھومتی ہو پارکوں میں ننگے سر — بن کے صورت گردشِ ایام کی
دیکھ کر کہتی ہے دنیا دیکھئے — بیٹیاں ہیں باحیا اسلام کی
گل بداماں ہیں سرِ دامن کے داغ — کچھ خبر ہے جامۂ احرام کی
دیویاں ہو دین کے مندر کی تم — چاہیئے ہر وقت پوجا رام کی
ہار ہو مخصوص شوہر کے لئے — کیوں بنو زینت گلوئے عام کی
اپنی قسمت دوسروں کے ہاتھ میں — خوبیاں ہیں بختِ نافرجام کی
اب تمہارے ہاتھ میں ہے آبرو — دخترِ پیغمبرِ اسلام کی

شمیم کرہانی

چچا چھکن نے روزہ رکھا

(از جناب مفتی بشیر الدین احمد بشر بی اے علیگ المیوی)

خدا معلوم وہ کونسی گھڑی تھی جو رمضان کا چاند نمودار ہوا۔ چچا چھکن کا چہرہ اچھا خاصہ جمعۃ الوداع بن گیا۔ پاندان۔ حقہ۔ چائے کی کیتلی۔ گولی والی ڈبیا۔ سب پر مایوسانہ نظر ڈالی اور ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "مبارک ہو۔ مگر مدّو تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا سنی سنائی کہہ رہے ہو۔ مجھے تو کہیں دکھائی نہیں دیتا ہے۔ ذرا میری عینک لانا"

اتفاق سے مطلع بھی صاف تھا اور عینک کے شیشے بھی ناک پر کمانی چڑھاتے ہی چچا نے نظام شمسی کے اس ٹکڑے کو آسمان کی وسعتوں میں تلاش کرنا شروع کیا اور چیں بجبیں ہو کر بولے "بکتا ہے جھوٹے ۔ خواہ مخواہ گھبرا دیا۔ مگر مدّو کمبخت فوراً ہی بول اٹھا "حضور مغرب کی طرف دیکھئے ۔ مغرب کی طرف۔ آپ تو الٹی طرف دیکھ رہے ہیں"

چچا کو غصہ آنا لازمی تھا۔ کیونکہ ایک طرف تو واقعی انکی پیٹھ کعبے کو ہو رہی تھی۔ دوسرے ایک ہی جنبش میں رہی سہی امید کی جھلک ختم ہونے کا اندیشہ تھا۔ مگر چچا کو خدا نے خاص دل و دماغ عطا فرمایا ہے وہ ایسے موقعوں کبھی بکھسیانے نہیں ہوتے ۔ کیا مجال جو ذرا بھی گھبرائے ہوں۔ کڑک کر بولے "ہاں ہاں میں بھی جانتا ہوں چاند کدھر سے نکلتا ہے" ـــــ اور یک جنبش 'اباؤٹ ٹرن' ہو گئے۔ قریب تھا کر چچا آرکمڈیس کی طرح 'یورپکا' ـــ یوریکا چلّانے لگیں مگر بوکھلاہٹ میں عینک مع کمانیوں کے چچا کی ناک کی سطح سے زمین کی سطح پر آ رہی۔ اور ضربات کی وجہ سے شیشے بجائے دو کے چار ہو گئے۔

کون ہے جو ایسے موقعہ پر برانگیختہ نہ ہو جائے ـــ چچا بھی تو آخر آدمی ہی تھے۔ جوتی اتار کے آٹھ دس مدّو کے ایسی تڑاخ پڑاخ رسید کیں کہ یاد ہی تو کرتا ہوگا ـــــ "کمبخت کھڑا کھڑا منہ تک رہا ہے۔ ہر وقت باتیں۔ ہر وقت باتیں۔ سوائے باتوں کے کچھ نہیں ـــ اور تو نے میرے جوتوں پر پالش کی۔ تو کیا کرتا جب تک پچاس مرتبہ (چچا کا غصہ پھر تیز ہو گیا اور نعلین کی ضربات شیشے کی ضربات سے سہ چند ہو گئیں) ـــ پچاس مرتبہ نہ کہا جائے۔ یاد تھوڑی آتا ہے۔ جاہٹ۔ دور ہو سامنے سے"

مدّو پٹنے کو تو ہٹ گیا لیکن ایک ہی گز جا کر کہنے لگا۔ "میں نے کیا کیا تھا ـــــ رمضان آ گئے تو میں کیا کر دوں ـــــــ عینک میں نے گرائی تھی ـــــــ"

چچا کو سامع ازل نے ایسے کچے کان عطا نہیں کئے ہیں جو اتنے فاصلے سے کوئی لفظ سن لیں ـــ سمجھ گئے کہ معافی مانگ رہا ہے ۔ بس پھر کیا تھا رحم و عفو کا دریا موجیں مارنے لگا۔ اور چچا سعدی کا مقولہ ۔

"خطا درگذار و ثوابم نما"

کانوں میں گونجنے لگا۔ نرم لہجے سے آواز دی۔ "مدّو ـــ لے یہاں آ ـــــ زنانے میں خبر کر دے کل ہمارا روزہ ہوگا ـــــ اور ـــــ لے یہ جیب میں ڈال لے"

چچی پہلے ہی سے گھبرا رہی تھیں یہ سنتے ہی گرج پڑیں۔ "روزہ رکھیں گے تو مجھ پر کیا احسان ـــــ کل مردانے ہی میں رہیں۔ ایک تو کریلا اسپر نیم چڑھا۔ دیکھئے کیا رنگ لائیں گے ـــــــ"

بدقسمتی سے چچا کو کھانسی کی پرانی شکایت ہے۔ یہ موذی مرض بھی انکی جان کو ایسا لگ گیا ہے کہ دس گز کے فاصلے پر ہوں۔ چپ چاپ بیٹھے ہوں مگر اس آلۂ نشرِ صوت کے ذریعے انکی موجودگی کا علم دور دور ہو جاتا ہے اسوقت بھی چچی کو انکی آمد کا علم دو منٹ پیشتر ہی ہو گیا ——

بچوں نے بھی کان کھڑے کئے —— آخر چچا آ ہی گئے —— "وہ سنا" چچا نے کہا "مدو نے کچھ تم سے کہا —— کل روزہ ہوگا —— میں نے خود چاند دیکھا ہے (مدو سے) ارے ابھی باہر ہی کھڑا ہے۔ بازار نہیں گیا۔ ایسا کاہل آدمی کبھی ہمارے دیکھنے میں نہیں آیا۔۔"

وہ چلا ہی تھا کہ چچی نے آواز دی۔ "عینک بھی لیتے جانا۔ شیشے لگوانے ہیں —— اور ہاں سن (پاس جاکر کان میں) افیون کی گولیاں ختم ہو گئی ہیں۔ ڈبیا بھروا لانا۔ رات کھٹکا ہے —— کل دن میں تو اللہ ہی اللہ ہے —— " چچا گھر میں قدم رکھتے ہی پھر لوٹ پڑے۔ "ارے بلانا اسے —— یہاں آ۔ خدا جانے کمبخت کو کیا جلدی ہے۔ رمضان آتے ہی اس کی تو عقل کٹ گئی —— " مدو لوٹ کر آیا تو چچا نے حکم دیا۔ "وہ ہمارا حقہ بھی درست ہوگا۔ پرانا نیچا بدل دینا —— جا جلدی جا"

خدا خدا کرکے چچا گھر میں آئے اور اپنی پھندھیائی ہوئی آنکھوں سے جو "عینکِ گم گشتہ" کے باعث "زندان" کی کوٹھریاں بن گئی تھیں۔ ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ مگر چند ہی منٹ بعد کچھ الٹے پاؤں سرپٹ دوڑے اور لگے آوازیں لگانے۔ "مدو —— مدو —— ارے کیا مر گیا۔ خدا سمجھے اسے مینہ آ رہا تھا۔ اولے پڑ رہے تھے —— بھاگڑ پڑ رہی تھی —— جو یہ کمبخت اتنی جلدی چل دیا —— صبح کو ٹھیریں کیا کھائیں گی —— کیا بچی روزہ رکھیں گی ——"

چچا یہ چلاتے ہوئے اور ہانپتے کانپتے ہوئے پھر گھر میں وارد ہوئے چچی نے فوراً پنکھا جھلنا شروع کیا۔ اور آخر کار وہ ان شعلوں کے بجھانے میں کامیاب ہو گئیں —— پھر کیا تھا۔ خوب روزے کا فلسفہ سمجھانا شروع کیا۔ اور چچا کو پورے آدھے گھنٹے اس موضوع پر لکچر سننا پڑا۔ چچی نے یہ آخری فقرہ ت سمجھا کر کہا کہ "روزے میں کسی قسم کا غصہ کرنا یا لڑنا بھڑنا سخت گناہ ہے۔ روزہ مکروہ ہو جاتا ہے"۔

چچا نے اس قسم کے فقرے رمضان سے پہلے بھی سنے ہیں۔ وہ ایسے موقع پر تبسم فرمایا کرتے ہیں۔ فوراً ہی کہنے لگے "ہاں —— یہ تو بتاؤ اب تمہاری طبیعت کیسی ہے اور حرارت آج بڑھی تو نہیں ——"

چچا صبح کو اٹھے تو حسب معمول تکئے کے نیچے سے ڈبیا نکال کر ایک گولی منہ میں ڈال لی۔ اور دل ہی دل میں خدا کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے لگے ان لوگوں کی بدنصیبی پر افسوس کرنے لگے۔ جو ابھی تک اِن لذات سے ناآشنا ہیں۔ کچھ دیر بعد چچا پورے "نونِ غنہ" بن گئے۔ اور اسی عالم میں مدو کو (جو باضافۂ نون مندو ہو گیا تھا) حکم فرمایا کہ چلم پر آگ لے آ۔

مدو یہ بانگِ صبح سنتے ہی چونک کر بولا۔ "حضور آج تو آپ کا روزہ ہے" اب تو چچا کے بھی ہوش ٹھکانے ہو گئے۔ گھبرا کر بستر سے کھڑے ہو گئے۔

"ہیں —— ارے آج تو روزہ تھا —— اور میں نے تو —— ابھی —— —— ارے جا کلی کو پانی لا —— نالائق شیطان —— ہر کام دیر سے کرتا ہے

مسلسل پندرہ منٹ کی "گلوخیز" آواز کے ساتھ چچا نے حلق اور منہ کا غسل کیا۔ اور اس عرصہ میں اکثر ہیضے نما آوازیں بھی نکالیں —— مگر گولی نہ نکلنا تھی نہ نکلی —— ناچار صبر کرکے مدو کی طرف گھور کر کہا۔ دیکھتا کیا ہے حقہ لا —— بس روزہ تو ختم ہوا"

مرزا جی بھی گھڑی کی سوئی کی طرح وقت پر آتے ہیں۔ سات بجے اور وہ چچا کے پاس موجود —— بندۂ خدا آج تو کچھ دیر سے آئے ہوتے۔ ٹھیک اُس وقت جب چچا نے سکون و اطمینان کا سانس لے کر حقے کی نے ہاتھ میں اٹھائی تھی کہ گھڑی نے سات بجائے اور مرزا جی آ دھمکے —— چچا کو دیکھتے ہی چلانے لگے —— "ہیں۔ ہیں —— ہیں —— یہ کیا حرکت —— رمضان میں —— مرد خدا آج تو صبر کیا ہوتا ——"

چچا تو جب شرماتے جب ان کا قصور ہوتا یا قصداً نہ رکھا ہوتا۔ چنا ہی جملوں میں ساری واردات الف سے لے کر ی تک سنا دی اور مدو پر اس سلسلے میں خوب بوچھاڑ کی —— "اگر اس کو ذرا بھی عقل ہوتی تو یہ ڈبیہ یہاں ہرگز نہ رکھتا۔ یا کم از کم مجھے صبح ہی یاد دلا دیتا —— مگر اسے تو سوائے اپنے عیش کے کوئی فکر نہیں ہے —— مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں —— اس کی بلا سے"۔

مرزا جی نے کچھ دیر تامل کیا لیکن پھر فوراً ہی بہت قرأت کے ساتھ فرمانے لگے "حضرت کیا مضائقہ ہے —— روزہ ہرگز ساقط نہیں ہوا ——

[illegible] سہوًا یا نادانستہ طور پر زیرِ حلق پہونچ جائے تو ساقط ہرگز نہیں ہوگا"
چچا یہ شرعی حکم سنکر خاموش ہوگئے۔ حقے کی گرفت بھی ڈھیلی کردی
۔۔۔ مگر دل سے خدا ہی جانتا تھا ۔۔۔ آخر مدّو کو حکم دیا "حقہ اُٹھالے۔
[illegible] میرے سامنے نہ لانا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا"۔

چچا کی شرعی معلومات محدود سہی مگر دنیاوی تجربات اور عام معلومات میں وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔ جملہ واقعات اور اپنے حسنِ انتظام کا ایسا خاکہ کھینچ دیا کہ مرزا جی بھی لوہا مان گئے کہ واقعی منتظم ہو تو ایسا ہو۔ ہنڈیا چولہے سے لے کر مدّو جی کی سول نافرمانی تک کے واقعات چند گھنٹوں میں بیان کر ڈالنا ان کا ادنےٰ کرشمہ ہے۔ مرزا جی پر ان کی قابلیت اور خداداد ذہانت کا سکہ پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت کی گفتگو نے مزید مہرِ تصدیق ثبت کردی۔

لیکن آفتاب اب نصف النہار تک پہونچ چکا تھا۔ اور مرزا جی کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہوچکا تھا۔ کئی مرتبہ دروازے سے باہر ادھر اُدھر دیکھا جماہیاں بھی لیں لیکن چچا کی تقریر پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ بدقت تمام مرزا جی نے امورِ خانہ داری کا مذکرہ کرکے رخصت چاہی مگر چچا نے اسی عنوان پر ایسا لکچر دیا کہ مرزا جی کو بیٹھتے ہی بنی۔ وہ تو مقرر پر خود رمضانی خشکی غالب ہونے لگی۔ ورنہ مرزا جی کی قیدِ بامشقت پورے بارہ گھنٹے سے کم نہ ہوتی۔

اِدھر مرزا جی رخصت ہوئے اُدھر چچا زنانے میں پہونچ ہی گئے بچے تو چکے ہی چکے۔ "جل تو جلال تو" کا وظیفہ شروع کردیا۔ روزے کی خشکی حقے کی جدائی ۔۔۔ ڈبیا والی گولی کی یاد ۔۔۔ کھانسی کا حملہ اور اکیلی چچا کی جان ۔۔۔ مگر واہ رے چچا اب بھی ہنستے ہوئے داخل ہوئے۔ بچوں سے مخاطب ہوکر فرمایا "دیکھو۔ آج اماں جان نے کیا کیا سامان کئے ہیں ۔۔۔ شاباش (کھانسی کا مسلسل حملہ) شاباش۔ اب تک کتنے سوال نکالے۔ سلیٹ میرے پاس لے آؤ"۔

چچا کا نام بدنام ہے ورنہ ایسے خوش مزاج انسان دنیا میں کم ہیں۔ [illegible] دس منٹ ایسی دل خوش کن اور ہمت افزا باتیں کیں کہ یک [illegible] مشتاقانہ اور مشفقانہ شانیں پوری آب و تاب سے جلوہ گر

چچا نے روسو اور فروبل کے اصولِ تعلیم مطالعہ نہیں کئے ہیں۔ مگر ہم سچ کہتے ہیں۔ یہ سب کے سب ان کے سامنے طفلِ مکتب ہیں۔ دو لفظوں میں بچوں کے دل میں تعلیم کی خوبی اور فوائد اس دلچسپ پیرائے میں بیان کئے کہ چھوٹے میاں جھٹ پٹ اپنی تختی لکھ مع قلم و دوات کے چچا کے سامنے بغرضِ "اصلاح" حاضر ہوگئے۔

جس نے اقلیدس کی تیسری جلد اور چچا کے ہاتھ کے بنائے ہوئے جیم کے دائرے دیکھے ہیں۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر کہدے کہ کون سے زیادہ دیدہ زیب ہیں۔ بغیر پرکار کے اس خوبی سے جیم کا پیٹ مدوّر بنا دینا چچا ہی کا حصہ ہے ۔۔۔ قلم۔ روشنائی دونوں خراب اور پھر "اصلاح" حوال کا تقاضہ۔ چچا کب تک چپ رہتے۔

"نامعقول۔ کبھی دوات قلم ٹھیک نہیں رہتا" چچا نے گڑگڑا کر کہا۔
روشنائی ایسی گاڑھی کہ قلم تک نہیں گھستا ۔۔۔ جا۔ پانی ڈال"

چھوٹے میاں نے بموجب تعمیل حکم دوات پوری پوری پانی سے بھردی۔ اور چچا نے جونہی نوکِ قلم کو روشنائی میں جھٹکا دیا۔ ساری اچکن پر چھینٹیں ہی چھینٹیں پڑ گئیں۔ آخر کب تک خون کا سا گھونٹ پیتے۔ تن بدن میں چنگاری سی لگ گئی اور برس ہی تو پڑے۔

"گدھے کے بچے ۔۔۔ نامعقول ۔۔۔ رُکا تو رہو۔ (چچا پیچھے پیچھے اور چھوٹے میاں آگے آگے بھاگ رہے تھے)

آخر چچی کو اٹھنا ہی پڑا اور چچا اور چھوٹے میاں کے درمیان ہمالیہ کی طرح حائل ہوگئیں۔ مگر چچا اس آسانی سے ہتھیار ڈالنے والے نہ تھے ۔۔۔ تختی اٹھا کر چھوٹے میاں پر جو وار کرنا چاہا تو رستم کے گرز کی داستان بے حقیقت معلوم ہونے لگی۔ چھوٹے میاں تو ایک ہی جست میں آنگن سے نکل کر کوٹھری میں پلنگ کے نیچے محفوظ ہوگئے۔ مگر چچا شیر کی طرح برابر گرجتے رہے۔ آخر چچی نے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔ اچکن کے خراب ہوجانے پر اظہارِ تعزیت کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ دھوبیوں کی مسیحا نفسی کے واقعات بھی سنائے اور چچا کو یقین آگیا کہ یہ داغ ضرور مٹ جائیں گے۔

چچا کو غصہ روکنے کے بہت سے نسخے یاد ہیں لیکن سب سے زیادہ مجرّب یہ ہے کہ وہ سخت سے سخت غصے کے وقت بھی فوراً ایک گھونٹ۔ آبِ خنک پی لیتے ہیں اور ساری حرارت فَفُرد ہوجاتی ہے۔ چچا کی یہ عادت سب کو

معلوم ہے اور اس لئے ایسے مواقع پر ان کے سامنے پانی کا گلاس ضرور پہونچ جاتا ہے۔ چچا نے حسب معمول اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کہیں چلّو بھر بھی نہ دکھائی دیا۔ آخر خود ہی بڑھ کر پانی اُنڈیل گلاس منہ کو لگایا ــ کہ چچی پیچھے سے بھاگیں اور گلاس ہاتھ میں پکڑ لیا ــ "ہیں۔ ہیں ــ ذرا صبر کرو۔ آخر ایسی بھی کیا بھول ــــ تم تو بچوں سے بھی گئے گذرے ہو"

چچا نے گلاس تو زمین پر مارا اور ڈانٹ کر بولے ــ "روزہ تو تمہارا ہی ہے ــــ میں کیا جانوں ــــ میرے تکئے کا غلاف سل گیا ــــ ابھی کیوں سلا ہوگا ــــ میں بھی ابھی سارے گھر کو آگ لگا دونگا ــــ

سامنے ہی باورچیخانہ تھا ــ چچا نے پھکنی۔ دست پناہ ــ اور کرچھا باری باری پھینکنا شروع کیا۔ اور اب دیگچی کی باری آئی۔ ماما ہٹ کر ایک طرف کو کھڑی ہو گئی۔ اور چچا نے بسم اللہ کہہ کر دیگچی کا وزن کرنا شروع کیا۔ چچی پھر دوڑیں اور دور ہی سے ایک کی بجائے دو دو غلاف ہاتھ میں لئے ہوئے اور ہوا میں لہراتے ہوئے دکھا رہی تھیں "لو دونوں غلاف کل ہی تیار ہو گئے تھے۔ بس کمرے میں سے لینے گئی تھی کہ یہاں یہ......... شروع ہو گیا"

چچا کے غصہ کا اسٹیم لاکھ تیز سہی لیکن بیک وقت دو جھنڈیاں ہلتے دیکھ کر آخر انہیں رُکنا ہی پڑا دوسرے وہ "دیگچی کے حادثے" میں بھی احتیاط بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ ہماری یاد میں یہ واقعہ صرف دو ہی مرتبہ پیش آیا ہے جبکہ چچا نے دیگچی بالکل ہی اُلٹ دی ہے۔ ایک تو کئی سال ہوئے اس موقع پر جبکہ چچا کی جیتی جاگی بٹیر کا رحمت خاں کے بٹیر کی ایک ہی لات میں فرار ہو گئی تھی اور چچا نے دو روز کھانا نہ کھایا تھا یا ابھی دو ڈیڑھ برس ہوئے جب کانگرس اور جمعیتہ العلماء ہند کے رضا کاروں نے تمام مسکرات کی دوکانوں پر پکٹنگ لگا دیا تھا اور چچا کو پورے تین روز تک "ڈبیا والی گولی" میسر نہیں ہوئی تھی۔

مؤذن نے عصر کی اذان دی اور چچا ان دنیا کے دھندوں کو چھوڑ سیدھے مسجد کی طرف ہو لئے۔ ادھر چچا زنانے سے باہر گئے۔ اُدھر چھوٹے میاں اپنی جائے پناہ سے باہر نکلے اور ماما اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

نماز اور رمضان کے اس لطف کا تو کوئی چچا ہی کے دل سے پوچھے جس خشوع خضوع کے ساتھ انہوں نے آج نماز ادا کی مستقل نمازیوں کو یہ شان کہاں نصیب ہوتی ہے۔ ہر چند کہ مسجد نمازیوں سے خالی ہو گئی اور ہر شخص چار فرض ادا کر کے اپنے اپنے کام کو واپس چلا گیا مگر چچا ایسے کچے نمازی نہ تھے جو مسجد میں آکر اتنی جلد واپس ہو جائیں۔ چچا یا تو مسجد میں آنے کا نام نہیں لیتے ہیں اور جب آ جاتے ہیں تو مشکل سے جایا کرتے ہیں اور آج تو گھر پر جانا تھا بھی بے سود۔ سوائے افطار کی تیاریوں کے وہاں کیا رکھا تھا۔

چچا نے بعد نماز وظیفہ جو شروع کیا تو اٹھنے کا نام نہ لیا۔ کئی مرتبہ مدّو بھی آیا مگر چچا نے نگاہ بھی اٹھا کر نہ دیکھا بلکہ منہ پھیر لیا۔ آخر کچھ دیر مدّو نے آواز دی "حضور افطار میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ تشریف لے چلئے۔ بیگم صاحب نے سامان باہر مردانے ہی میں بھیجدیا ہے"۔

چچا کے وقت کے قریب نہ آنے سے دل میں خوش ہوئے اور چچی کے اس موقع پر "سامان رسد" کی "انتقال مکانی" کرنیکا مقصد بھی سمجھ گئے لیکن تسبیح پڑھتے وقت بولنا مکروہ ہے اور چچا سے زیادہ اس مستحب فعل کا عامل کون ہو سکتا ہے فوراً ہی مدّو کی طرف گھورتے ہوئے اس زور سے "ہوں۔ ہوں" کیا کہ بیچارہ الٹے پاؤں ہی لوٹتے بنی۔

غرض وظیفہ ختم ہوا اور چچا اٹھ کھڑے ہوئے۔ مدّو نے سامان خورونوش بہت قرینے سے لگا دیا تھا۔ ایک چھوڑ دو دو حقّے بھر کر رکھدیئے تھے۔ ڈبیا بھی تپائی پر موجود تھی۔ چچا کا چہرہ "بقعۂ نور" ہو رہا تھا۔ دل ہی دل میں مدّو کے حسن انتظام کی داد دیرہے تھے۔ ملازم ہو تو ایسا ہو۔ باوفا۔ موقع شناس۔ اور پھر اس پر سلیقہ مند آخر فرما ہی اٹھے۔ "شاباش میاں مدّو۔ شاباش۔ بھئی مرزا جی کو اور بلا لاؤ تو اچھی صحبت رہے گی"۔

مدّو مرزا جی کو بلانے چلا گیا اور چچا تخت پر آبیٹھے۔ ایک ہی نظر میں سب چیزوں کا جائزہ لے لیا۔ کھانے کی لطیف خوشبوئیں اور انواع و اقسام کی افطاری دلخوش کن چیزیں تھیں اور چچی کی استعداد خانہ داری پر صاد کر رہی تھیں۔ چچا بھی دل ہی دل میں اس کے قائل تھے۔ لیکن انکی نظر زیادہ تر حقّے اور ڈبیا پر پڑ رہی تھی اور کان موذن کی آواز پر تھے۔

یکایک چچا کو آواز آ ہی گئی اور بسم اللہ کہکر حقّے کا دم لگانا شروع کیا۔ دن بھر کے بعد اس رفیق کو اب منہ لگایا تھا۔ چچا کا دل ہرگز چھوڑنے کو نہ چاہتا تھا لیکن پھر بھی سنت ادا کرنے کے لئے چند کھجوریں بھی کھائیں اور افطار بھی [illegible] فرمائی۔ چند منٹ بعد مدّو بھی بھاگتا ہوا اور دروازہ کے باہر ہی سے [illegible] آ رہا تھا ــ "مرزا جی بعد افطار تشریف لائیں گے ــ اذان میں بھی [illegible] منٹ ہی باقی ہیں" فوراً ہی پاس کی مسجد سے [illegible]

فلسفی کی عید

[ذیل کا مضمون حضرت جیواد میرٹھی کا لکھا ہوا ہے جو اب ہمارے درمیان موجود نہیں مرحوم نے اپنی بیماری کے ایام میں یہ مضمون نیرنگ خیال کے لئے لکھا تھا جو ان دنوں شائع نہ ہو سکا اس لئے اس مضمون کی اہمیت اب بڑھ گئی ہے۔ ناظرین مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کریں]

"ایڈیٹر"

انتیسواں روزہ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری جھلملی کرن۔ شفق میں ایک ہلکے سے ابر کے نیچے ناخن سے باریک مدھم چاند کا ایک ذرا سا روشن کنارہ!

کیا ہماری تمام خوشیوں کی یہی ابتدا ہے؟ آسمان پہ پھیلی ہوئی تاریکیوں میں ایک روشن نقطہ ناکام زندگی میں ایک امید موہوم ہزار رنجوں میں ایک ذرا زیادہ خوشی۔ ہزار تکلیفوں میں ایک راحت۔ ہزار پریشانیوں میں ایک سکون۔ ہاں یہی ایک اور صرف ایک "چیز" ہماری غمگین زندگیوں میں چاند کے اس مدھم سے روشن کنارے کی طرح ملتی ہے! اور یہ ایک چیز کیا ہے؟ ہستی! اور اس کا اظہار!! خواہ یہ اس انتیسویں رات کے چاند کی طرح دوسرے ہی لمحے میں غائب ہو جائے! فنا ہو جائے!! مگر پھر بھی وجود کا احساس خودی کا ادراک کیا۔ ان کا اظہار ہی زندگی کی کہانی کا آغاز و انجام نہیں؟

لیجیے یہ سوچتے ہی سوچتے چاند غائب ہو گیا! تاریکی بڑھ گئی۔ ایک لمحہ کی خوشی نے ہمیں رات کی تاریکیوں کے حوالے کر دیا۔ شام کے ایک فرحت افزا منظر نے تمام شب کے لئے ہمیں غافل سلا دیا؛

ہم صبح کو خواب کی موت سے بیدار بھی ہوں گے؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے!!!

زمین کی ایک ہلکی سی جنبش اور مٹی کا ڈھیر اُف ہیبتناک خیال——!!!

جب زندگی کی شام آتی ہم سو جاتے ہیں۔ اس عید کی رات کے مانند۔ مگر افسوس کہ کبھی صبح نہیں ہوتی۔ پھر تاریکی ہی تاریکی ہے۔ خدا جانے کبھی نور کی کوئی ہلکی سی جھلک بھی میسر آتی ہے کہ نہیں یا یونان کے دیوتا انسانی زندگی کے ماحصل کو اپنی کشتی میں رکھ کر اس دریا میں جو چٹانوں سے ڈھکا ہوا ہے اور جہاں خوفناک سکوت اور خاموشی کا دور دورہ ہے۔ نہ معلوم کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں؟

کچھ بھی ہو کل ہم جاگیں گے۔ ضرور۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ عید کے دن؛

(۲)

عید کے دن میں نے سڑک کے کنارے ایک اندھے فقیر کو دیکھا۔ اس کا چہرہ کالا سیاہ تھا۔ عید کی رات کے مانند!۔ جس پر خوفناک مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ کیسی مایوسی؟ وجود کی! "میں کیوں ہوں؟" وہ یہ سوچ رہا تھا۔ نہیں اس نے سوچنا سمجھنا سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ مگر ذہن؟ وہ بھی معطل ہو گیا تھا۔ تخیل؟ جواب دے چکا تھا۔ دنیا کی تاریکیاں اس کے قلب کی گہرائیوں پر چھا گئی تھیں۔ وہ خاموش تھا۔ ہاں وہ رو رہا تھا۔ اس لئے کہ وہ اپنے ہونے کا اظہار نہ کر سکتا تھا!!!

خوش و خرم انسانوں کا ایک بے کراں ہجوم اس کے آگے سے گزر رہا تھا۔ دیر و زود فرداسے بے نیاز۔ اپنے خدا کی نماز پڑھنے! اپنے رب کے آگے سر جھکانے۔ سجدہ کرنے!

بڈھے فقیر نے ایک آہ کھینچی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بابا خدا کے واسطے۔ اللہ کے نام پر........"

مگر کسی نے فقیر کو کچھ نہ دیا۔ اس کا چہرہ ایسا گھناؤنا تھا کہ کوئی اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا تھا؛

بڈھے فقیر نے دل پر ہاتھ رکھ کر پھر کہا "بابا خدا کے نام پر بس ایک پیسہ" کسی کا ہاتھ نہ اٹھا۔

میں نے سوچا۔ "خدا!" اندھا فقیر اور کسی کے نام پر سوال نہیں کرتا۔ نہیں! رنج واندوہ نے دل ودماغ سے تمام ناموں کو محو کر دیا تھا۔ مگر شام کی بڑھتی ہوئی تاریکیوں میں چاند کے باریک اور مدھم کنارے کی طرح "خدا" کا خیال چمک رہا تھا۔ ہاں مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اگر آج اس اندھے فقیر کو جو ہفتوں کا فاقہ زدہ معلوم ہوتا تھا کچھ نہ ملا تو وہ خیال بھی عید کے چاند کی طرح جلدی ہی غائب ہو جائے گا۔ اور پھر تاریکی ہی تاریکی ہوگی۔ لا انتہا اور غیر متزلزل تاریکی!!!

"محمد کے نام پر" فقیر نے آواز لگائی۔ چند آنسو اس کی بند اور میلی آنکھوں سے ڈھلک پڑے۔ ایک ضعیف العمر آدمی نے بے دردی سے ایک پیسہ فقیر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"اپنی اولاد کے صدقے میں" ایک بڈھی ماں نے ایک اور پیسہ آہستہ سے فقیر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اندھے نے دونوں پیسوں کو محسوس کیا۔ ہاں وہ اس کے ہاتھ میں موجود تھے۔

بڈھے فقیر نے پھر کہا "اے بھائیو۔ اپنے جان ومال کی خیرات"۔ دو نوجوانوں نے دو پیسے نفرت اور حقارت سے فقیر کی طرف پھینک دئے۔ وہ بیٹھ گیا اور خاک کے ڈھیر میں وہ گمشدہ ہیروں کو تلاش کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ مٹی کیچڑ میں بھر گئے۔ اور بالآخر دو پیسے اسے مل گئے۔ . . . .

مگر فقیر بدل گیا تھا!!!

میں نے محسوس کیا اس کا چہرہ اور بھی کالا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں اور بھی سختی سے بند ہوگئیں۔ پہلی امید کے نشانات بھی اس کے چہرے سے مٹ گئے۔ اس کی سیاہی کو کس چیز سے نسبت دوں؟ آسمان وزمین کی تمام سیاہ ترین تاریکیوں کے مجموعہ سے؟ یا کسی حبشی غلام کی رنج واندوہ سے بھری ہوئی کالی راتوں سے؟ اب خدا کا وہ مدھم خیال بھی اس کے دل ودماغ سے لمحہ بھر میں غائب ہوگیا تھا۔ وہ خاموش اور مبہوت بیٹھا۔ وہ اٹھا۔

"بابا جان ومال کی خیرات" اس نے آواز لگائی۔

میں منتظر اور ششدر کھڑا رہا مگر صرف یہی الفاظ بار بار اس کی زبان سے نکلتے تھے۔

"خدا۔ محمد۔ اولاد" کیا وہ ان سب کو بھول گیا۔ مجھے معلوم نہیں۔ البتہ وہ ان تینوں میں سے کسی کے نام پر بھی کچھ نہ مانگ رہا تھا۔ جان ومال کی خیرات میں کبھی کوئی اس کے ہاتھ پر ایک آدھ پیسہ رکھ دیتا اور بس۔ ایک پیسے نے تینوں چیزوں کو بھلا دیا تھا!!!

زندگی اور زندگی کی کشاکش۔ ہستی اور ہستی کا قیام انسانی دل ودماغ سے تمام خیالات کو حرفِ باطل کی طرح دھو ڈالتا ہے۔ ایمان کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ بسا اوقات احتیاج کی آندھیوں سے ہمیشہ کے لئے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ مصیبت کا بارگراں کمزور شانوں کو ہمیشہ کے لئے کچل ڈالتا ہے۔ اور لاچاری کا پہاڑ انسان پر ایسا ٹوٹتا ہے کہ اس کو ہمیشہ کے لئے کمر خمیدہ کر دیتا ہے!

کیا کوئی ہے جو اندھے فقیر کو صرف ایک پیسہ خدا کے نام پر دے اور اس کے ایمان کی متزلزل بنیادوں کو پھر استوار کر دے؟

(جیوا دمیرٹھی)

افسانہ

عرب کی مہمان نوازی

(از جناب کوثر چاندپوری)

شریف مکہ کھجور کے ایک پرفضا باغ میں چند عرب شیوخ کے ہمراہ بیٹھا ہوا قہوہ پی رہا تھا۔ بلور کے سفید چمکدار فنجانوں میں قہوے کی سرخ رنگت یوں جھلک رہی تھی جیسے گورے چٹے آدمیوں کے رخساروں میں خون اپنی تمام شوخیوں کے ساتھ جھلکا کرتا ہے:

شریف کا بڑا بیٹا ادب سے باپ کے سامنے دو زانو بیٹھا ہوا گھوڑوں کے حالات بیان کر رہا تھا۔ شریف کے اصطبل میں سیکڑوں عربی اور ترکی گھوڑے تھے۔ اسے گھوڑے کی سواری کا بہت شوق تھا۔ اس لئے وہ عرب و عراق اور دوسرے ممالک کے قوم دار گھوڑوں کے خریدنے پر بیشمار روپیہ صرف کیا کرتا تھا۔ گھوڑوں کی نگرانی اس کے بڑے بیٹے کے سپرد تھی۔ جو شہسواری میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔ قہوہ کا ایک دور...... ہو چکا تھا دوسرا شروع ہونیوالا تھا کہ شمال کی طرف سے ایک ادھیڑ عمر کا بدو کٹھی ہوئی سیاہ رنگ کی عبا پہنے مشکی گھوڑے پر سوار آیا۔ اور گھوڑے سے کود کر اپنا طویل موزہ زمین میں گاڑ دیا پھر باگ کو نیزے میں الجھا کر مجلس قہوہ میں شرکت کرنے کی غرض سے قریب آیا۔ اور نہایت بیباکی کے ساتھ جس میں عربی حریت و شجاعت کی خاص شان تھی۔ بلند آواز میں کہا —

السلام علیکم!

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ کی بہت سی آوازیں ایک دم فضا میں گونج گئیں اور برادرانہ جوش و مساوات سے نووارد کا خیر مقدم کیا گیا۔ بدو۔ رومی قالین کا سرا الٹ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ شریف نے مزاج پرسی کے بعد قہوہ کی فنجان اسکی طرف بڑھاتے ہوئے کہا — کس لئے تکلیف فرمائی۔ کوئی حاجت ہو تو بیان فرمائیے!

بدو نے اپنے نیزے سے بندھے ہوئے گھوڑے کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا۔ اسے بیچنا چاہتا ہوں آپ کو اچھے جانوروں سے دلچسپی ہے۔ پسند ہو تو خرید لیجئے!

شریف نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ گھوڑے پر ڈالی اور پوچھا کیا لوگے؟

"مجھے پانچسو روپے کی ضرورت ہے"

لیکن جانور اتنے کا نہیں ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو روپے دے سکتا ہوں!

اتنے میں نہیں لوں گا۔

بدو نے ذرا تند لہجہ میں کہا۔ اور فوراً سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک کامل خاموشی طاری رہی پھر ایک بوڑھا عرب جس کی پلکیں اور بھنویں تک سفید تھیں۔ اور آواز میں لرزہ تھا بولا۔ غضب کیا شریف تم نے۔ جانتے ہو یہ گھوڑا کس نسل کا ہے — یہ وہ گھوڑا ہے جس کے ایک کم عمر بچھڑے پر بنو ہاشم اور بنی امیہ میں عرصہ تک خونریزی کا بازار گرم رہا تھا۔ عرب میں اس سے بہتر نسل کا گھوڑا دستیاب نہیں ہو سکتا۔ ایسے روپے میں اس کی ایال کے دو بال بھی سستے ہیں!

شریف سنبھل کر بیٹھ گیا اور غور سے عرب کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ آپ نے اسی وقت کیوں نہ کہا؟

میں سمجھتا تھا تم گھوڑوں کو پہچانتے ہو۔ اس کے انکار پر قیمت بڑھا دو گے مگر تمہیں اس پر آمادہ نہ پایا اور بدو بھی قیمت سنکر سیدھا چلا ہی گیا۔ جب تک مجھے مڑ کر بھی نہ دیکھا تو مجھے خیال ہوا کہ تم نے گھوڑے کی اصلیت کو نہیں سمجھا اور اب تمہیں آگاہ نہ کیا گیا تو ایک اچھی چیز ہاتھ سے نکل جائے گی +

پھر اب کیونکر اُسے واپس بلایا جائے۔ معلوم نہیں وہ کس گاؤں کا رہنے والا ہے؟ اس کا پتہ چلا لینا کچھ دشوار نہیں ہے۔ وہ کوئی ہوا نہیں ہے کہ اڑکر نکل جائے۔ یقیناً کسی دوکان پر جائے پیتا ہوا مل جائے گا۔ ورنہ اس کی جائے سکونت معلوم کرنے کی کوشش کیجائے گی۔ شریف کے حکم سے متعدد آدمی بدو کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ اور مکہ کے تمام بازاروں اور سراؤں کو چھان ڈالا۔ لیکن بدو نہ ملا۔ شہر کے ایک دروازہ پر کسی نے کہا کہ چند گھنٹہ قبل ایک بدو سوار ادھر سے گذرا ہے۔

شریف کو اس اطلاع ہوئی تو سخت ملال ہوا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی عبدالرحمن بن عبداللہ سے کہا۔ تم بدوی قبائل اور ان کے قریوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے چلے جاؤ۔ اور جس قیمت میں ملے وہ گھوڑا خرید لاؤ۔ رحمن نے اول وقت حرم شریف میں نماز ادا کی اور اپنے سرخ رنگ کے گھوڑے پر بیٹھ کر چل دیا۔

آفتاب افق مشرق سے دو تین نیزہ بلند ہو چکا تھا۔ اور اس کی گرم گرم شعاعیں کھجوروں کے اونچے درختوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ریگ زار عرب میں جہاں پانی عنقا کا حکم رکھتا ہے بدوی قبائل کے چھوٹے چھوٹے لڑکے کھجوروں کی لمبی کمر پر بیٹھے ہوئے پانی کی طرف اس طرح دوڑے جا رہے تھے جیسے مرغابیوں کے غول تالابوں کی تلاش میں آسمان پر منڈلایا کرتے ہیں:

یہ وقت گھوڑوں کو پانی پلانے کا تھا اور لڑکوں کو روزانہ اس کام کے لئے دس بارہ کوس دوڑنا پڑتا تھا۔ آج بھی وہ اسی دوڑ دھوپ میں مصروف تھے۔ رحمن نے انہیں روک کر عربی زبان میں کچھ دریافت کیا —— دور —— پیڑوں کے جھنڈ میں کھجور کی چٹائی سے بنا ہوا ایک مکان نظر آرہا تھا —— لڑکوں نے اس کی طرف اشارہ کر دیا۔ چنانچہ رحمن نے گھوڑے کا رخ اسی طرف پھیر دیا۔ یہ ایک بدو کا مکان تھا۔ اور معلوم ہو چکا تھا۔ کہ احمد بن عمر جو کل شریف سے ملا تھا یہیں سکونت رکھتا ہے۔ رحمن نے دروازے کے قریب آکر آواز دی۔ یا اخی —— باہر آؤ!

احمد بن عمر وہی کل والا بدو جو شریف کے دربار میں صدر درجہ جنگجو اور خونریز معلوم ہو رہا تھا۔ آواز سنتے ہی سراپا خلوص و انکسار بنا ہوا گھر سے نکلا اور مرحبا —— مرحبا! کی مسلسل اور محبت آفریں آوازوں میں اس نے مہمان سے معانقہ کیا۔ مزاج پوچھا۔ پھر باہر ایک ٹوٹے سے بوریئے پر اس کو بٹھا کر اندر چلا گیا۔ اور عربی اخلاق کے موافق اجنبی مہمان سے آنے کا مقصد دریافت کرنے سے پہلے گھر میں جاکر اس کے کھانے کا بندوبست کیا؟

دو گھنٹہ بعد احمد نے رحمن سے کہا۔ کھانا تناول فرمایئے۔ یہ کہکر اسنے ہاتھ دھلائے اور کھانا لینے چلا گیا۔ پہلے دو بڑی سینیوں میں شہد آیا اور اس سے مہمان کے سامنے رکھد یا گیا۔ پھر چند کھجوریں۔ چار پانچ چھوارے اور جو کی روٹی کے دو سوکھے ہوئے ٹکڑے آئے یہ سب چیزیں چمڑے کے دسترخوان پر چنی گئیں۔ آخر میں ابن عمر بڑی سی قاب میں گوشت کے بڑے بڑے پارچے لے کر آیا جن سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ابن عمر نے نہایت عاجزی سے دریافت کیا۔

کس نئے تکلیف فرمائی؟

رحمن نے جواب دیا۔ کل آپ شریف کے پاس کوئی گھوڑا لے کر گئے تھے؟

ہاں گیا تھا! مگر اس نے گھوڑے کو پہچانا نہیں۔

بیشک اس وقت شریف نے غلطی کی۔ لیکن اب وہ آپ کی بتائی ہوئی قیمت دینے پر آمادہ ہے۔ اسی لئے مجھے بھیجا ہے۔ لیجئے یہ اس کی قیمت! یہ کہکر رحمن نے اپنے میزبان کے آگے گنیوں کا ڈھیر لگا دیا۔

احمد نے نفرت کے ساتھ منہ پھیر کر کہا —— گھوڑا اب میرے پاس نہیں ہے

رحمن جانتا تھا۔ بدو باوجود ضرورتمند ہونے کے اپنی غیرت کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ کل شریف کی بے اعتنائی نے اس کو صدمہ پہونچایا ہے۔ اس لئے اس کی عربی حمیت گوارا نہیں کرتی کہ گھوڑا اس کے ہاتھ فروخت کرے۔ اس نے کہا۔ یا اخی معاف فرمایئے۔ شریف نے گھوڑے کی قیمت بہت کم بتائی تھی۔ اسی وجہ سے غالباً آپ کو ناگوار ہوئی مگر آپ جانتے ہیں مسلمانوں میں خرید و فروخت کے وقت کسقدر احتیاط ملحوظ رکھی جاتی ہے اور سودا چکانے کے متعلق کتنے سخت احکام ہیں۔ مجھے امید ہے کہ شریعت کا احترام کرتے ہوئے آپ شریف کو معاف کر دیں گے۔ اور گھوڑا مجھے دیدیں گے ۔ میں شریف سے وعدہ کرکے آیا ہوں کہ شام تک گھوڑا لے آؤنگا۔

خالی ہاتھ کیونکر جاسکتا ہوں؟

ابن عمر کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا جو اس کے میزبان نے سمجھا۔ اس کا چہرہ جوش تمود سے سرخ ہوگا اور یقین دلانے کے لئے اس نے کہا۔

واللہ! میرے پاس وہ گھوڑا اب نہیں ہے آپ جائیے اور شریف سے کہدیجئے کہ وہ گھوڑا کسی طرح تمہیں نہیں مل سکتا۔

رحمٰن کو یقین ہوگیا کہ گھوڑا احمد کے پاس اب نہیں ہے۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کہاں گیا اور اس نے کسی کو فروخت کردیا۔

رحمٰن نے کہا۔ آپ مجھے اتنا بتا دیجئے کہ آپ نے گھوڑا کس کے ہاتھ بیچا ہے۔ میں دو چار گنی زیادہ دے کر اس سے لے لوں گا۔

افسوس ہے ـــــ بھائی رحمٰن گھوڑا کسی طرح بھی آپ کے ہاتھ نہیں آسکتا وہ بیچا نہیں گیا!

پھر کیا ہوا اور کیوں نہیں مل سکتا؟

رحمٰن نے تعجب کے ساتھ دریافت کیا۔

احمد اپنے راز کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا اور نہ چاہتا تھا کہ اصل واقعہ سے رحمٰن کو آگاہ کرے مگر وہ پختہ ارادہ کرکے آیا تھا کہ کچھ بھی ہو گھوڑا لے کر آؤنگا۔ اس لئے اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ اور پورا قصہ رحمٰن کو سنانا پڑا۔ احمد نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔

برادر عزیز۔ اُسے آپ کی تشریف آوری کی تقریب میں ذبح کردیا گیا۔ میرے پاس آپ کی دعوت کا اس سے بہتر سامان موجود نہ تھا۔

رحمٰن یہ سنتے ہی فرط حیرت و استعجاب سے اچھل پڑا اسے سخت ملال ہوا۔ کہ ایسا قیمتی اور صحیح النسل گھوڑا یوں ضائع ہوگیا۔ وہ متاسفانہ لہجہ میں بولا۔

آپ نے گھوڑا کیوں ذبح کیا؟ میں تو شہد اور روٹی سے بھی پیٹ بھر سکتا تھا۔

بیشک روٹی سے آپ پیٹ بھر لیتے مگر دو سوکھے ٹکڑوں کے علاوہ اور روٹی بھی گھر میں نہ تھی ـــــ یہ بھی میرے بھوکے بچوں کا حق تھا جو میں ان سے چھین کر لے آیا تھا۔

رحمٰن کی عجیب حالت ہوگئی۔ وہ دیوانہ وار ٹکٹکی باندھے احمد کو دیکھ رہا تھا۔ احمد اس کے جذبات سے بے خبر تھا اور اپنی دھن میں مسلسل بول رہا تھا۔

دو تین وقت سے بچوں نے کچھ نہ کھایا تھا۔ گھر میں چند کھجوروں کے علاوہ تھا ہی کیا جو کھاتے۔ خوش قسمتی سے آج صبح ایک دوست ادھر سے گذر رہا تھا اور تھوڑا سا شہد کچھ روٹی کے ٹکڑے دیتا گیا تھا۔ شہد کا زیادہ حصہ صرف ہوگیا۔ بچے مکھیوں کی طرح اسے لپٹ گئے۔ سوکھے ٹکڑوں کو البتہ وہ نہ چبا سکے۔ ارادہ تھا کہ پانی لا کر انہیں بھگو دیا جائے گا۔ اور نرم ہونے پر بچے کھالیں گے۔ اتنے میں آپ آگئے۔ اور میری حمیت نے گوارا نہ کیا کہ ایک چیز مہمان کی تواضع سے بچا کر بچوں کو کھلادوں جو فاقہ کی تکلیف برداشت کرنے کے عادی ہیں۔ مجھ پر قرض بھی بہت ہوگیا تھا۔ موسیٰ یہودی نے تنگ کر رکھا تھا۔ ایک طرف بچے کھانے کو مانگتے تھے۔ دوسری طرف موسےٰ مکہ کا مشہور ساہوکار اپنا قرض طلب کرتا تھا۔ موسم حج میں اسی لئے میرا اونٹ مر گیا تھا۔ اور حاجیوں سے جو آمدنی ہوا کرتی تھی جس کے بھروسہ پر ہم لوگ سال بھر تک قرض لیتے رہتے ہیں۔ غیر متوقع طور پر اونٹ کے مر جانے سے بالکل بند ہوگئی اور فاقہ کشی تک نوبت پہونچ گئی۔ میں گھوڑے کو کسی قیمت پر بھی الگ کرنے پر آمادہ نہ تھا ورنہ ممکن تھا کہ حج سے پہلے گھوڑا بیچ کر اونٹ خرید لیتا مگر جب بچوں کا بھوک سے بلبلانا دیکھا نہ گیا اور موسیٰ کے غیر شریفانہ تقاضوں نے میری اسلامی حمیت سے کھیلنا شروع کیا تو میں نے سوچا کسی امیر کو گھوڑا دیدوں۔ میں نے سنا تھا کہ شریف مکہ گھوڑوں سے بہت دلچسپی رکھتا ہے۔ اسی لئے میں اس کے پاس گیا تھا کہ ایک اچھے گھوڑے کو اسی کے یہاں میرے گھر کا سا آرام حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ شریف کی آنکھوں میں بصارت نہیں ہے۔ قہوے کی کثرت اور دنبہ کی چربی نے اسے اندھا کردیا ہے۔ مجھے پانچسو روپے کی ضرورت تھی اسی وجہ سے میں نے یہ قیمت بتائی تھی۔ ورنہ ممکن تھا کہ اس سے زیادہ دام مل جاتے صبح تک گھوڑا گھر پر موجود تھا۔ ارادہ تھا کہ مکہ کے کسی اور امیر کے پاس لیجاؤں۔ خوش قسمتی سے اس وقت آپ تشریف لے آئے اور میں نے جو چیز اپنے بھوکے بچوں کی آہ و بکا سے بچا رکھی تھی آسے آپ پر قربان کرنے کی عزت حاصل کرلی۔ آپ جا کر شریف سے کہدیجئے کہ اچھے گھوڑے اگر مل جائیں اور مجھ جیسا کوئی غریب بدوا نہیں الگ کرنے پر مجبور ہو جائے تو پانچسو روپے میں بھی سستے ہیں!

رحمٰن کی آنکھوں میں آنسوؤں کی بوندیں جھلک آئیں۔ اس نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔ بھائی احمد گھوڑا تو اب واپس نہیں آسکتا۔ البتہ اس کی قیمت حاضر ہے۔ قبول کرلو۔ میں یہ روپیہ اب واپس نہ لے جاؤں گا۔

قبول کرلوں! یعنی گوشت کی ایک قاب کے معاوضہ میں پانچسو روپے کی کثیر رقم قبول کرلوں؟!

استغفر اللہ! ــــــ گوشت کے معاوضہ میں اس احسان اور اخوت کے بدلے میں جو آپ نے میرے مقابلہ میں ظاہر کی۔ شریف اس نقصان کا ذمہ دار ہے۔ اور اسی کے خزانہ پر اس کا بوجھ پڑنا چاہئے۔ اگر وہ اس پر راضی نہ ہوگا تو میں اپنے پاس سے یہ رقم اس کو ادا کردوں گا۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ آپ کو موتے کے مکروہ تقاضوں سے نجات نہ دلاؤں۔ آپ اپنا کام کرچکے اب میرا فرض ہے کہ آپ کی تکلیف کو محسوس کروں!

لیکن اتنی بڑی رقم فرض کرلیجئے کہ شریف نہ دے سکا تو آپ

. . . .

. . . .

کیا واقعی اپنے پاس سے ادا کردیں گے!

ــــ یقیناً ــــ اسی وقت دیدوں گا۔ جب شریف اس کے دینے سے انکار کرے گا۔

میرے لئے یہ امر بہت ہی مکروہ ہے کہ آپ کو اتنی سخت دشواری میں مبتلا کروں!

میں شریف کا چھوٹا بھائی ہوں۔ اور بڑے بھائی کی غلطی کا خمیازہ قاعدے سے چھوٹے بھائی کو بھگتنا چاہئے!

آپ شریف کے بھائی ہیں؟

جی ہاں میں اس کا بھائی عبدالرحمٰن بن عبداللہ ہوں!

احمد سر سے پیر تک کانپ گیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ ایک بادشاہ کے امیر کے سامنے کھڑا تھا بلکہ اس لئے کہ رحمٰن نے ابتک اس کے ساتھ جس طرح گفتگو کی تھی اس میں امارت و نخوت کا کوئی شائبہ تک نہ تھا یا غالباً اس بنا پر کہ وہ ایک زبردست مذہبی پیشوا کے سامنے کھڑا تھا ــــ بالآخر اس نے رحمٰن کے اصرار سے مجبور ہو کر روپیہ قبول کرلیا!

(کوثر چاندپوری)

اے چاند! ــــ

اشعارِ منثور

ایک چاندنی میں

(از جناب ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ حیدرآبادی)

اے چاند ــــ!!!

! ــ میں تجھے دیکھ رہا ہوں اور تو . . . . ؟

شاید ان کو ــــ!!! وہ تجھے دیکھ رہے ہیں اور تو مجھ کو! ــــ

ــــ مگر حیف! کاش ایسا ہوتا ــــ!!!

ہم ایک دوسرے کے راز سے واقف نہیں ــــــــ!!!

تو میری مجبوری پر ــــ بے بسی پر ــــ اے چاند ــ تو ــــ آسمانی سطوت سے ہنستا ہے۔ میرا مذاق اڑاتا ہے اور اپنے پُرنور حسن کے غرور میں ــــ جو چاندنی بن کر دنیا کو پُرنور کر رہا ہے۔ مجھ کو حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہے!..!

مگر افسوس ــــ!!! تو اس راز سے قطعاً ناواقف ہے ــــ!!!

میری پستی کا زینہ ــــ تیرے بامِ سطوت سے کہیں زیادہ بلند ہے ــــ اور میرے دل کی گہرائی لامحدود! تیری حسین شعاعیں میرے دل میں داخل نہیں۔ ہاں ــــ بیشک ــ داخل نہیں ہوسکتیں ــ جب تک تو ــــ ان کا عکس میرے پُرانتظار و شبنم ریز آنکھوں کو نہ دکھلائے گا! اور ان کا راز مجھ پر افشا نہ کرے گا ــــ

میں تیری حسین شعاعوں کو ہرگز ہرگز اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتا

ــــ اور ــ تیری مضحکہ خیز خندہ زنی سے ہرگز ہرگز متاثر نہیں ہوسکتا!!!

(ڈاکٹر محمد عباس علیخاں لمعہ)

ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کی علمی ترقیاں

(از جناب مالک رام صاحب ایم اے۔ ایل ایل۔ بی)

اس امر میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ کہ ابتدائی زمانہ کے مسلمانوں نے دنیا کے تہذیب وتمدن میں بہت زبردست حصہ لیا ہے۔ اسلام نے عہد وسطیٰ کے عیسائیوں کی طرح علم وفن کی ترقی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ بلکہ اس لئے آزاد خیالی اور علمی تحقیق وتفتیش کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے ان چیزوں کو مذہب کا جزو قرار دیدیا۔ مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ ارض وسما پر خداوند تعالےٰ کی صفات کے مظہر کی حیثیت سے نگاہ ڈالے۔ اس پر غور وتدبر کرکے انہیں بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے استعمال کرے۔ اور یہ بھی عبادت الٰہی کا حصہ ہے۔ مذہب کی یہی ترغیب تھی۔ جس نے ابتدائی مسلمانوں کو علم وفن میں اتنی زبردست اور حیرتناک ترقی کرنے کے قابل بنا دیا۔ اگر ان کے کارناموں پر تفصیل سے نظر ڈالی جائے تو اس کے لئے دفتروں کی ضرورت ہے۔ دنیا جسقدر تہذیب میں ترقی کرتی جائے گی۔ اتنا ہی اُسے خدمات بنی آدم کا احساس زیادہ ہوگا۔ اور انہیں نگاہ قدر ومنزلت سے دیکھا جائے گا۔

دنیا کی ترقی

تاریخ شاہد ہے کہ اسلام نے بعض نہایت پست اور غیر ترقی یافتہ اقوام کو اخلاقی اور مادی ترقی کے معراج کمال تک پہنچا دیا۔ جس ملک کو بھی انہوں نے فتح کیا۔ پرانے اسرائیلیوں کیطرح اس کے باشندوں کو تلوار کے گھاٹ نہیں اتارا۔ بلکہ انہیں ایک نئی زندگی دی۔ جس کا نصب العین بلند تھا۔ اور انہیں تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچایا اور کئی وحشی قومیں مہذب اور متمدن ہوگئیں۔ عرب جس ملک میں بھی گئے انہوں نے اسے اپنا وطن بنا لیا۔ انہوں نے مفتوح علاقے کی تہذیب کو اپنا لیا اور اپنے نئے وطن کی ذہنی۔ اخلاقی اور مادی ترقی کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور لطف یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں اسلام کی علمی و ذہنی ترقیاں جن اشخاص کی مرہون منت ہیں۔ وہ عرب نہیں تھے۔ بلکہ ان لوگوں کی اولاد تھے۔ جنہوں نے ابتدائی زمانہ میں عرب چھوڑ کر دوسرے ملکوں کا اپنا وطن بنا لیا تھا۔ جہاں کہیں بھی ..... اسلام پہنچا۔ وہ جگہ مرکز علم وفن بن گئی۔ اور علم وادب۔ فنون لطیفہ۔ سائنس اور صنعت وحرفت میں متاہیر پیدا ہوئے۔ دمشق۔ قرطبہ۔ غرناطہ۔ بغداد اور قاہرہ وقتاً فوقتاً اسلامی تہذیب کے مرکز بنے رہے۔ اور ایشیا۔ یورپ اور افریقہ میں اس وقت علم کی مشعل بردار تھے۔ جب مغرب توہمات اور جہالت کے چاہ ضلالت میں غوطے کھا رہا تھا۔

یورپ پر اسلام کے احسانات

یورپ اپنی ترقی کے لئے اسلام کا اس سے سوا مرہون منت ہے جتنا اسے اعتراف ہے۔ جب تک وہ کلیسا کے زیر اقتدار رہا۔ اس میں کسی طرح کی ترقی کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔ نہ صرف یہ بلکہ عیسائیت کے ظلم کے نتیجہ میں رومن اور یونانی ترقیوں کے آثار بھی محو ہوگئے۔ یورپ کے اس اخلاقی وذہنی جمود کے زمانے میں یہ مسلمان ہی تھے۔ جنہوں نے دنیا کی شاہراہ ترقی پر مقدمۃ الجیش کا کام دیا۔ ایک زمانہ تھا جب یورپ میں علم صرف عربی زبان کے واسطے سے ہی حاصل کیا جاسکتا تھا۔ اس کی نشاۃ ثانیہ تک جس نے اسے طویل خواب غفلت سے بیدار کیا۔ اسلامی تعلق واثر کا نتیجہ تھی۔ اگر مسلمان اسپین کو فتح نہ کرتے۔ تو کون کہہ سکتا ہے کہ یورپ کتنی مدت اور اسی وحشیانہ حالت میں رہتا۔ دنیائے سائنس اور علوم وفنون کی تمام ترقیاں اسلامی اندلس کی منت پذیر ہیں۔ جہاں سے سارے براعظم یورپ نے روشنی حاصل کی۔ تمام علوم خواہ وہ ہیئت کا ہو یا ریاضی کا طبیعیات کا یا فلسفہ کا اسلامی اسکولوں سے لیا گیا تھا۔ مارٹن لوتھر سے لے کر



کیا



آپ



ایسا



کو سکاتے ہیں ۔

لینن کے زمانہ تک کوئی ہندی - اخلاقی یا سیاسی اصلاح ایسی نہیں ہوئی جس پر اسلامی اثر کی مہر نہ لگی ہو۔ ڈریپر نے سچ کہا ہے - جس طرف بھی ہم دیکھتے ہیں - ہمیں جنگ و امن اور علم و فن کے میدان میں اسلامی اثرات نظر آتے ہیں

ڈاکٹر کیمبل نے جو ایک مشہور انگریز سائنسدان ہیں - اپنی کتاب "عربی طب" میں لکھتا ہے "جب یورپ عہد مظلمہ میں دماغی ظلمت کی گہرائیوں میں غوطے لگا رہا تھا - خلفائے بغداد و قرطبہ کی سرپرستی میں دنیائے اسلام تہذیب و تمدن کی بلندیوں پر صعود کر رہا تھا - اور ایک ایسے زمانہ میں جب عہد وسطیٰ کے بیرن اور اعلےٰ خاندانوں کی خاتونیں اپنے دستخط تک نہیں کر سکتی تھیں - مسلمانوں کا قریباً ہر نوجوان مرد اور عورت آسانی سے لکھ پڑھ سکتا تھا"

کنیاس یونیورسٹی کے پروفیسر فرانک بلیک مور نے اپنی مشہور کتاب انسان کی اجتماعی تاریخ میں لکھا ہے:-

"جو ملک بھی فتح ہوا - وہاں پہلا کام ایک مسجد کی تعمیر کا ہوتا تھا۔ جہاں اللہ کی عبادت ہو اور اس کے رسول (صلعم) پر درود بھیجا جائے اس مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ ہوتا تھا - جس میں قرآن کے پڑھنے اور لکھنے کی تعلیم دی جاتی تھی - اسی بنیاد سے سائنس اور علم و ادب کی عمارت اٹھائی جاتی تھی - اور ان کے بعد وہ دنیا جہان کے خزائن علم و فن کو حاصل کرنے میں لگ جاتے تھے - نقل کے بعد وہ ایجاد کے میدان میں تگ و دو کرتے تھے اور اس طرح انہوں نے دنیا کے علم میں قابل قدر اضافہ کیا - مدرسوں کی بنیادیں رکھی گئیں - اور کتب خانے تعمیر ہوئے جن سے علم کے مستقل چشمے پھوٹ نکلے"

سائنس میں ترقیات

مسلمانوں نے بہت تھوڑے عرصہ میں سائنس کے میدان میں حیرتناک ترقی کی - آج سے تیرہ سو سال پہلے انہوں نے کئی ایسی چیزوں کا خیال کیا - جو آج دریافت ہو رہی ہیں - انہوں نے ان اشیا کے خواص اور صلاحیتوں کا مطالعہ کیا - جو آفرینش سے نہ کسی نے دیکھی تھیں - اور نہ ان پر غور کیا تھا - درحقیقت انہوں نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جس پر سنجیدگی سے غور نہ کیا ہو - انہوں نے کیمسٹری - ہیئت - ریاضی - طب میں نہایت اہم تحقیقات کی - انہوں نے تاریخ اور جغرافیہ میں خاص مہارت پیدا کی - انہوں نے سیاست علم الطیور علم طبقات الارض اور علم نباتات میں نہایت قیمتی اضافہ کیا - مسلما[illegible] مصوروں کی معیت میں دور دراز کا سفر کرتے تھے - مختلف [illegible] نہایت دقت نظر سے مطالعہ کیا جاتا تھا - قلم اور برش سے اس کی تصویر [illegible] کھینچی جاتی تھی - الجیرن ایک ماہر علم نباتات چالیس برس تک ہندوستان [illegible] طول و عرض میں پھر کر مسالہ جمع کرتا رہا - اس کے علاوہ مسلمانوں نے اور کئی علوم میں تحقیقات کر کے کتابیں لکھیں - مثلاً جہاز رانی - زراعت - علم آثار [illegible] اعداد و شمار - علم انساب اور جغرافیہ میں ان کا قابل قدر کارنامے موجود ہیں یہاں تک کہ جدید ترین ایجاد ہوائی جہاز سے بھی وہ ناواقف نہیں ....

.... خلیفہ المامون کے عہد میں ایک انجنیر عبدالقاسم نے ایک طیارہ تیار کیا - لیکن وہ پرواز میں گر کر ٹوٹ گیا اور انجنیر کی جان علم کی بھینٹ ہو گئی -

آٹھویں صدی میں خلفائے عباسیہ نے بغداد کا مشہور دارالفنون قائم کیا - جہاں مشہور ریاضی دانوں اقلیدس - ارشمیدس اور اپالونیس - ہیئت دان بطلیموس اور ماہرین نباتیات ہپوکریطس اور ڈائیموڈس کی کتب کے ترجمے کئے گئے - اس جگہ اور دوسری علمی درسگاہوں میں اس وقت یونانی تہذیب کو قائم رکھا گیا - جب بازنطیم کے باہر غیر مسلم دنیا میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی - خلیفہ ہارون الرشید کے قائم کردہ بیت الحکمت کے کتب خانہ میں سنسکرت - یونانی - قبطی - کلدانی - اور فارسی زبان کی سیکڑوں ہزاروں کتابیں تھیں - عربی کی کتابوں کا تو کہنا ہی کیا - خلیفہ الحاکم کا کتب خانہ اتنا عظیم الشان تھا کہ اس کی فہرست ۴۰ جلدوں میں مرتب ہوئی تھی

کیمسٹری

حالیہ کیمسٹری جیسا کہ ہمبولٹ کی رائے ہے "متفقہ طور پر مسلمانوں کی ایجاد ہے" - اس میدان میں ان کی کامیابی نہایت دلچسپ ہے - انہوں نے سیسہ [illegible] سکہ - تانبہ - چاندی اور سونے کے خواص کی تحقیقات کی - وہ ان کے [illegible] اور کشتے تیار کرنے کے طریقوں سے واقف تھے - کئی الفاظ مثلاً المبک [illegible] وغیرہ عربی سے نکلے ہیں - جبیر ابن حیان (جو مغرب میں جیبر [illegible] سے مشہور ہے) قریباً پانچسو کتابیں کیمسٹری کے موضوع پر لکھی ہیں [illegible] بارگندھک کا تیزاب - چاندی اور [illegible] کا ہوکب [illegible]

ہندوستان کی نامور خواتین نیرنگ خیال میں اپنے مضامین شائع کراتی ہیں جو نیرنگ خیال کی بہت بڑی خصوصیت ہے

کرکے پہلی بار دریافت کئے۔ مسلمانوں نے ہی دنیا کو پہلی دفعہ تقطیر۔ فلٹر کرنے اور بلور بنانے کا طریقہ ...... ظاہر کیا۔ وہ مائع کو بخارات میں تبدیل کرنے کا گُر جانتے تھے۔ یورپ میں سب سے پہلے اسلامی اندلس میں کیمسٹری کی بنیاد رکھی گئی۔ اور اگر مسلمانوں کو پائٹیرز کے مقام پر افسوسناک شکست نہ ہوتی۔ تو یہ اپنے عروج پہنچ جاتی۔ جلدکی آخری مسلمان کیمسٹری دان تھا۔ اس کی وفات سنہ ۱۳۶۱ء میں ہوئی۔

علم ہیئت

کہا جاسکتا ہے۔ کہ مسلمانوں نے اپنا نام آسمان پر لکھدیا۔ انہوں نے اپنی رصدگاہوں میں کئی نئے ستارے دریافت کئے اور انہوں نے شعبے بنائے انہوں نے نظام شمسی کی حرکات اور دوسرے اجرام فلکی کے متعلق بیسیوں دریافتیں کیں۔ انہوں نے زمین کا حجم اور چاند کی گردش اور بروج کی تبدیلیوں وغیرہ کی تحقیقات کی۔ ابن رشد نے سورج کے داغ معلوم کئے۔ ابوالحسن نے فضا کا انعکاس معلوم کیا۔ المیمون نے محور کا جھکاؤ معلوم کیا۔ ابن یونس نصیر الدین یوسی اور البیرونی اور نہایت اعلےٰ ہیئتی نقشے تیار کئے۔ البیرونی نے نقشے تیار کئے۔ البیرونی کے نقشے لاطینی میں ترجمہ ہوئے۔ اور یہیں سے یورپ میں علم ہیئت کی بنیاد پڑی۔ یورپ میں محمد فرغانی کی کتابیں ترجمہ ہوکر پہنچیں ابویونس اور ابتانی مسلمانوں کے عظیم ترین ہیئت دانوں میں سے ہوئے ہیں۔ یہ مسلمان ہی تھے۔ جنہوں نے یورپ میں سب سے پہلے رصدگاہیں تعمیر کیں اور دوربین قطب نما۔ پنڈولم اور کئی اور مفید چیزیں ایجاد کیں۔ اسلامی سلطنت کی سب سے مشہور رصدگاہ مرغانہ میں ۱۲۵۹ء میں تعمیر ہوئی۔ جو طرطوس کے قریب ہے۔

علم ریاضی

ریاضی کی اعلےٰ شاخیں قریبًا ساری کی ساری مسلمانوں کی قابلیت کی آئینہ دار ہیں۔ اس اہم مضمون میں مسلمانوں نے متعدد مقامات پر ترقی کی عربی ہندسے۔ طریقہ اعشاریہ اور تحویل نے جو یورپ نے مسلمانوں سے حاصل کیں علوم کی ترقی میں بہت مدد دی۔ ان کے زمانہ میں مسلمانوں نے دنیا کی ہیئت مکانیات اور ریاضی۔ الجبرا۔ اعداد و شمار۔ شعبہ مخروطیہ میں دنیا کی رہنمائی کی۔

اس کے علاوہ دوسرے شعبہ جات میں مسلمانوں کی ایجادیں قابل فخر ہیں۔ جیومیٹری میں یہ مسلمان ہی تھے۔ جنہوں نے سب سے پہلے اقلیدس کا ترجمہ کیا۔ اور اسے استعمال میں لائے۔ یہ سولھویں صدی تک کسی یورپی زبان میں ٹھیک طرح ترجمہ تک نہیں ہوا تھا۔ مسلمانوں نے ہی پہلی بار الجبرا کو جیومیٹری میں استعمال کیا۔ انہوں نے دوسری طاقت کی مساوات دریافت کیں۔ اور اسی سے چار طاقت کی مساوات اور بائنومیل تھیورم (

) تک ترقی کی۔ انہوں نے کروی علم زوایا۔ خِ ثلاثہ کو ایجاد کیا۔ اور سائین وکوسائین کو داخل کرکے انہوں نے پیمائش اور علم ہیئت کی ترقی میں بہت حصہ لیا۔ پنڈلم کی ایجاد سے وقت کی درستی اور اصطرلاب کی ایجاد سے اجرام سماوی کی گردش کی صحیح دریافت بھی مسلمانوں کی ممنون احسان ہے۔

علم طب

موجودہ یورپی علم طب کا بانی ابن سینا تھا۔ جو مشہور زمان مسلمان طبیب تھا جس کا علم المفردات ابتک متداول ہے۔ حالیہ دواخانے بھی مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔ ابن زور دواخانوں کا بہت زبردست نقاد تھا۔ اس نے دوسروں کے ساتھ دنیا کے مختلف حصص سے جمع کردہ ادویہ کا اثر انسانی جسم پر معلوم کیا۔ اور اس طرح کئی دریافتیں کیں۔ مسلمان طبیبوں نے سب سے پہلے بیہوش کرنیوالے طریقوں کا استعمال کیا۔ قرطبہ کا Al. Bu'a sis دنیا کا مشہور سرجن (جراح) گذرا ہے۔ مشہور جراحوں۔ ماہرین امراض چشم۔ دنداں سازوں اور امراض مستورات کے ماہرین کی بھی کمی نہ تھی۔ ان میں کئی ایسے تھے جو کسی ایک مرض میں خاص دسترس رکھتے تھے۔ آنکھوں کے امراض کا علاج بہت حد تک مسلمانوں کا معلوم کردہ ہے۔ ابوالحسن مصنف علوم چشم جس نے ہوا کا وزن دریافت کیا۔ اور بصارت کے متعلق یونانیوں کی کئی اغلاط کی تصحیح کی۔ اور جس نے پہلی بار تاریخ میں دکھایا۔ کہ آنکھوں میں روشنی کی شعاعیں باہر سے آتی ہیں۔ نہ کہ آنکھ سے نکلتی ہیں۔ اور ثابت کیا۔ کہ اس پر جو اثر ہوتا ہے وہ اعصاب کے ذریعہ دماغ تک پہنچتا ہے۔ اس نے معلوم کیا۔ کہ روشنی کا انعکاس فضا کی حالت وغیرہ سے تبدیل ہوجاتا ہے۔

بغداد میں جو ایک وقت اسلامی دنیا کا مرکز تھا۔ مختلف شعبوں کے ۸۶۰ ڈاکٹر تھے۔ جو اپنی اپنی صنف کے ماہر تھے۔ ڈاکٹروں اور کیمسٹوں کو

نیرنگ خیال میں چند ایسے مضمون نگار بھی لکھتے ہیں جو کسی دوسرے رسالے میں لکھنا مناسب نہیں سمجھتے۔

کام شروع کرنے سے پہلے ایک امتحان میں بیٹھنا اور لائسنس لینا پڑتا تھا۔ ساری اسلامی دنیا میں شفاخانے تھے۔ جہاں مختلف بیماریوں کے مریضوں کی رہائش کا علیحدہ علیحدہ انتظام تھا۔ بلا امتیاز مذہب وملت اور نسل ورنگ مریضوں کو ان شفاخانوں میں داخل کیا جاتا تھا؂

تاریخ وجغرافیہ

عربی میں کئی ایک ایسی لاثانی کتابیں ہیں۔ جن میں علوم طبیعیہ کا نہایت تفصیلی ذکر ہے۔ مسلمانوں نے اس وقت زمین کے کروی ہونے کا اعلان کیا جب پادریوں سے مرعوب یورپ بیانگ دہل اعلان کر رہا تھا۔ کہ زمین چپٹی ہے۔ تاریخ کے میدان میں مسلمانوں کے کارنامے اتنے مشہور ہیں کہ ان کا تفصیلی ذکر تحصیل حاصل سے کم نہیں۔ انہوں نے ہزارہا کتابیں اس موضوع پر لکھیں۔ جن میں بعض کی ضخامت اسی اسی جلدوں تک ہے خلاصہ یوں سمجھئے۔ کہ ایک ہزار برس تک مسلمان تاریخ کے مالک ہیں۔ وہ علم وفن کے مشعل بردار رہے۔ اور انہوں نے دنیا میں تہذیب وتمدن کی روشنی پھیلائی۔ اگر وہ کبھی مغرب کے لئے یہ علمی ورثہ نہ چھوڑ جاتے۔ تو آج ہرطرف جو ترقی وہاں نظر آ رہی ہے۔ یہ ناممکن ہو جاتی۔ مسلمان دنیا کی ترقی کے مقدمۃ الجیش تھے۔ لیکن یہ اسی وقت تک رہا کہ وہ صحیح معنوں میں مسلمان اور قرآن وشریعت اسلام پر عامل رہے۔ جونہی انہوں نے اسلام کے بلند نصب العین کو آنکھ سے اوجھل کر دیا۔ ان کا تنزل شروع ہو گیا۔ مغرب کے ساتھ اس کے الٹ ہوا۔ جب تک وہ لوگ پکے عیسائی رہے۔ انہوں نے کوئی قابل ذکر ترقی نہیں کی۔ جونہی انہوں نے کلیسا کا بھاری جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا۔ انہوں نے تہذیب وتمدن اور دیگر علوم میں قابل قدر ترقی کی۔ ایک صورت میں ایک پرانے اور ترقی پذیر مذہب کا اثر اور دوسری صورت میں مذہبی روح کا فقدان اور مادی استیلا کی موجودگی ان دونوں کی تاریخ عروج میں نمایاں نظر آتی ہے۔ اسلام سے پہلے سارے مذاہب نے انسان کی اخلاقی ترقی تک اپنے آپ کو محدود رکھا اور قریبًا اس کے دنیوی پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اسلام کے اثر کے ماتحت جس کا سب سے بڑا مقصد خدمت بنی نوع انسان ہے۔ مسلمانوں نے ان چیزوں کی طرف توجہ کی جو مخلوق مادی منفعت کا ذریعہ ہو سکتی ہیں انہوں نے دیکھا کہ انسان کی مادی ترقی کا انحصار اس کا قوائے فطرت کو مغلوب کر لینے پر ہے۔ پس وہ علوم مفیدہ مثلاً کیمسٹری۔ ہیئت۔ طب زراعت۔ کلبہ رانی۔ جہاز رانی وغیرہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اگر پیغمبر اسلام کی بعثت سے پہلے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انسان قوائے فطرت پر قابو پا کے ان کو بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ تو اسلام کے ظہور سے صدیوں پہلے یہ چیزیں مفید ثابت ہو سکتی تھیں؂

اسلام عیسائیت اور تہذیب

جن لوگوں پر مذہب کا کچھ زیادہ اثر نہیں۔ اور جو خدا سے زیادہ مخلوق سے ڈرتے ہیں۔ ان کی نمایاں ایجادیں۔ اسلحہ اور سامان جنگ۔ بھک سے اڑ جانے والے مواد۔ زہر وغیرہ وہ اشیا جو امن اور تعمیر سے زیادہ تباہی اور تخریب کا سامان ہیں ——— ایسی چیزیں ہیں۔ اگر ان کے مذہب کا ان پر کافی اثر ہوتا۔ تو حضرت عیسے کے پیرو (جن کی تعلیم یہ ہے۔ کہ اگر تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال سامنے کر دو) کبھی ان تباہی کے آلات کی ایجاد میں اتنا شغف نہ دکھاتے؂

ایک ہزار برس کی عظمت۔ دولت اور غلبہ کے بعد مسلمانوں میں تعیش اور آرام پسندی کی عادات آنے لگیں۔ اور ان کا تنزل شروع ہو گیا۔ روحانی بےحسی اور دماغی جمود اس کے قدرتی نتائج تھے۔ یہی حال دوسری مذہبی جماعتوں کا بھی ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس کے لئے اسلام ذمہ دار نہیں۔ بلکہ یہ سب کچھ مسلمانوں کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اسلام سے پہلے اور بعد کی دنیا پر ایک نظر ڈالنے سے ہمیں معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ اس میں کیا کیا صلاحیتیں ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کا زوال اسلام سے منسوب نہیں کیا جا سکتا یہ سخت ناانصافی ہوگی۔ کہ آج کل کے مسلمانوں سے اسلام کا اندازہ لگایا جائے حقیقی اسلام جو حیات اور نور ہے۔ اس چیز سے بہت مختلف ہے۔ جو اس وقت اسلام کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تو مردہ رسوم اور بےمعنی رواجات کا مجموعہ ہے لیکن اسلام کی نہضت ثانیہ کے آثار نمایاں ہیں۔ ترکی۔ ایران۔ عرب مصر۔ افغانستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں ترقی کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ اور کام شروع ہو چکا ہے؂

ملک رام

سُہاگ کا دان

(سید امتیاز علی صاحب تاج بی۔ اے کے فلمی افسانہ کی ایک جھلک)

(۱) راج بھون کے سنہری کلس اور اونچی مٹھیاں غروب ہوتے ہوئے سورج کے سامنے اندھیری اور اداس نظر آ رہی تھیں۔

دور بلندی پر لگا ہوا جھنڈا اُداسی سے لٹک رہا تھا۔

سامنے ایک مٹھی پر بیٹھی ہوئی چیل نوحہ روز روشن چلچلا رہی تھی۔

اندر دربار کا کمرہ ویران پڑا تھا۔ سنگھاسن ایک کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔

نیچے پاؤں رکھنے کی چوکی پر ایک مرجھایا ہوا پھول پڑا تھا۔

اداسی میں سنگ مرمر کی ایک چوکی پر ایک بیش قیمت کھرل رکھی تھی۔ دو زنانہ ہاتھ اس میں ایک دوا پیس رہے تھے۔

ایک دوسرے زنانہ ہاتھ نے ایک جڑاؤ پیالہ چوکی پر رکھ دیا جو ریشم کے رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔ چھاننے کی غرض سے کھرل کی دوا ریشم کے رومال میں اُلٹ دی گئی۔

ایک ہاتھ نے دوسری دوا کا شیشہ چھنے ہوئے عرق کے پیالے میں اُلٹ دیا۔

دو ہاتھوں نے ایک ننھی سی خوشنما طشتری بڑھائی۔ جس میں دوا کا جڑاؤ پیالہ رکھ دیا گیا۔ طشتری والے ہاتھ اونچے ہونے شروع ہوئے۔

(۲) جمنا طشتری میں دوا کا پیالہ لئے راج بھون کے صحن میں سے گزر کر اندر دالان میں جا رہی تھی۔

راج بھون کے صحن پر حسرت اور اداسی برس رہی تھی۔ ملول و متفکر داسیوں کی ٹولیاں جگہ جگہ کھڑی تھیں۔ جمنا ان کے پاس سے گزرتی۔ تو اسے دیکھ کر وہ فکرمندی کی سرگوشیاں کرتی کرتی رک جاتیں یہ آہستہ سے مُڑ کر جمنا کو دیکھتیں۔ اور جیسے پھر سرگوشیاں کرنے کو سر موڑ لیتیں۔ جمنا خاموش ان کے پاس سے گزرتی چلی گئی۔

صحن سے تین سیڑھیاں دالان میں جاتی تھیں۔ سیڑھیوں پر چند اور داسیاں سست سست اور سر تھامے بیٹھی تھیں۔ جمنا کو دوا لاتے دیکھ کر ایک نے ہلکی سی آہ بھری۔ سب جمنا کو تکنے لگیں۔ جمنا نے ان پر ایک نظر ڈالی اور چپ چاپ گزرتی چلی گئی۔

(۳) جمنا ایک لمبے اور خالی دالان میں سے گزر رہی تھی۔ سارے دالان میں ستونوں کے مدھم اور لمبے لمبے سائے پھیلے ہوئے تھے۔

ایک ستون کا سہارا لئے نوجوان وکرم خاموش کھڑا تھا۔ سر پیچھے کو ڈالے بے پرواہ انداز میں اوپر کو تک رہا تھا۔ جمنا کے قریب آنے پر وہ چونکا اور سیدھے کھڑے ہو کر دلچسپی کی نظریں اس پر ڈالیں۔ جمنا نے اسے دیکھا۔ دوپٹے کی اوٹ کر کے بڑھتی چلی گئی اور موڑ مڑ گئی۔ وکرم آہستہ آہستہ اس کے پیچھے بڑھا اور موڑ پر پہنچ کر رک گیا۔

(۴) ایک بند دروازے پر پہنچ کر جمنا نے ہلکی سی دستک دی۔ دروازے کا ایک پٹ آہستہ سے کھلا اور بوڑھا وید چوکھٹ میں آ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر غم اور نا امیدی لکھی تھی۔

جمنا نے اس کا چہرہ تکتے تکتے طشتری اس کی طرف بڑھا دی۔

وید ذرا دیر کھوئی ہوئی نظر سے طشتری کو دیکھتا رہا۔ پھر ہاتھ ہلکے سے واپس لے جانے کو ہلا دیا۔ جمنا کی آنکھوں میں خوف جھلکنے لگا۔

وید نے ایک آہ بھری۔ واپس اندر جانا چاہتا تھا۔ کہ نظر وکرم پر پڑی

وکرم ویدکو تکتا ہوا دروازے کے قریب آرہا تھا۔ قریب پہنچ کر آہستہ سے
بولا۔"ویدجی!"
ویدنے مایوسانہ انداز میں وکرم کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وکرم نے
پوچھا۔
"کیسے ہیں بھائی؟"
ویدنے سر پھیر کر ایک نظر اندر ڈالی۔ وکرم نے بھی ایڑیاں اُٹھا کر
اندر دیکھنا چاہا۔ ویدنے مایوسی سے سر ہلا دیا۔ وکرم نے سر جھکا لیا۔
ویدنے پوچھا۔"رانی جی کہاں ہیں؟"
وکرم نے جواب دیا۔"چڑھاوے لے کر مندر گئی ہوئی ہیں"
وید آہ بھر کر بولا۔ جاؤ۔ انہیں بلوالو۔ اب پرارتھناؤں کا سمے
نہیں رہا۔"
یہ کہہ کر وید اندر چلا گیا۔ جمنا سن سی کھڑی رہ گئی۔ وکرم ایک پل کے
توقف کے بعد جلدی جلدی واپس چلا گیا۔
(۵) دالان میں سے گزر کر وہ ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔
(۶) کمرے میں وکرم کا دوست سورج مل فرش پر آلتی پالتی مارے پانسہ
پھینکنے کی مشق کر رہا تھا۔ وکرم داخل ہو کر دروازے کے قریب
رُک گیا۔ سورج نے اُسے دیکھا اور بھنوؤں کو یوں ہلایا۔ گویا
معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جواب میں وکرم نے تردد کا چہرہ
بنا کر سر ہلا دیا۔ سورج کھڑا ہو گیا۔"تو پھر جیتا کاٹ کی ہے۔ راج
پاٹ کا مالک بن جائے گا"
وکرم نے یوں سر ہلایا۔ گویا سورج نے ایک نامناسب بات کہی ہے
سورج بڑھ کر وکرم کے پاس آگیا۔"ویدجی کیا کہتے ہیں؟"
وکرم نے آہ بھر کر کہا۔"کہتے ہیں۔ پرارتھناؤں کا سمے نہیں رہا۔ رانی
جی کو مندر سے بلوالو"
سورج نے مصنوعی غم سے ایک آہ بھری۔
وکرم بولا۔"سورج۔ میں یہیں ٹھہرتا ہوں۔ تم جلدی سے مندر
میں جاکر بھابی کو خبر پہنچاؤ۔"
سورج مستعد ہو کر بولا۔"ابھی لو"
(۷) مندر میں رانی مورتی کے سامنے سیڑھیوں پر سر رکھے
پڑی تھی۔
مندر سنسان تھا۔ چپ چاپ صرف رانی کی ہلکی ہلکی آہوں اور
سسکیوں سے ٹوٹ رہی تھی۔ اس نے اپنا اشک آلود چہرہ اٹھا کر
مورتی کو دیکھا۔ اور دکھ سے بولی:۔
"پربھو۔ مجھ ابھاگی پر دیا کیجئے۔ مجھ دکھی پر دیا کیجئے"
وہ اپنے آنسوؤں کو اپنے دوپٹے کے آنچل سے پونچھ رہی تھی۔ تو
جیسے رانی کی پرارتھنا کے جواب میں ایک ہلکا ہلکا گیت سنائی دینے لگا
جو کہیں دور سے آرہا تھا۔ ایک ایسی آواز کا گیت جس کے گہرے سروں کے
سوز میں کوئی غیب کی آواز تلقین کرتی معلوم ہوتی تھی۔
تیرے دُکھ کی دوا دنیا میں نہیں ؛ تیرا سکھ پربھو کے چرن میں ہے
رانی کا ہاتھ آنسو پونچھتے پونچھتے رُک گیا۔ اس نے آنچل چہرے سے
ہٹا کر غم کی کھوئی ہوئی نظروں کے ساتھ کان گیت پر لگا دیئے۔ جو
آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا اور واضح ہوتا جا رہا تھا۔ سنتے سنتے
نئے آنسو اس کی آنکھوں میں اُبل پڑے۔ اور وہ مورتی کی طرف بیقراری سے
ہاتھ پھیلا کر بولی۔"تمہارے چرن میں۔ پربھو تمہارے چرن میں۔ میں
اپنا دکھ لے کر تمہارے چرن میں آئی ہوں۔ میرے سہاگ پر
مرتیو کی چھایا کانپ رہی ہے۔ مجھ پر دیا کیجئے۔ مجھ پر دیا کیجئے"
(۸) وشنو بھگت۔ مندر کا بڈھا پجاری گاتا ہوا مندر کی طرف بڑھ رہا تھا!
تیرے دُکھ کی دوا دنیا میں نہیں ؛ تیرا سکھ پربھو کے چرن میں ہے
(۹) مندر کے باہر چبوترے پر رانی کی داسیاں موجود تھیں۔ ایک دو یہاں
کھڑی تھیں۔ ایک دو وہاں۔ کوئی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی تھی کسی نے
دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ سب کی سب اداس اور مضمحل نظر آتی
تھیں۔ نظریں پجاری پر گڑی ہوئی تھیں۔
بھگت سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر آیا۔ تو ایک نے جھک کر اس کے
پیروں کو ہاتھ لگایا۔ باقی داسیاں بھی جہاں کھڑی تھیں بے اختیار
وہیں دوزانو ہو گئیں۔ وشنو بھگت گاتا ہوا اُن کے درمیان سے
گزرتا چلا گیا۔ اس نے آہستہ سے مندر کا دروازہ کھولا اور اندر
داخل ہو گیا۔
داسیاں کھڑی ہو گئیں [illegible]

[illegible]یاں عقیدت کی نظروں سے مندر کے دروازے کو تکنے لگیں۔
ایک داسی نے کہا "بھگت جی کی آواز میں اثر ہے۔ ان کی دعا بھی بے اثر نہ ہوگی"۔

دوسری بولی "بھگوان کرے ان کی دعا مہاراج کو چنگا کر دے"

تیسری نے آہ بھر کر کہا "ان میں اب رہا کیا ہے"

کنچنی بولی۔ ہائے بھری جوانی میں ایسے بھیانک روگ کے پنجے میں پھنس جانا"۔

(۱۰) اندر رانی مورتی کے سامنے کہہ رہی تھی۔ "ہے پربھو۔ میرے سہاگ پر نہیں۔ تو ان کی جوانی پر ترس کھائیے"۔

پجاری جوت جگا چکا تھا۔ اور مشعل ہاتھ میں لئے مندر کے چراغدان روشن کر رہا تھا۔ چراغوں کی بڑھتی ہوئی روشنی میں مندر کی جڑاؤ دیواریں اور فرش پر تھالوں میں سجے ہوئے نذرانے جھلک جھلک کر رہے تھے۔ بھگت مشعل ہاتھ میں لئے ایک چراغدان روشن کرتے کرتے رک گیا۔ اور چڑھاووں کو دیکھ کر بولا۔ "رانی۔ تیرے چڑھاوے انمول ہیں۔ پر دیوتا صرف چڑھاووں کے مول ہی کو نہیں دیکھتے"۔

رانی نے دکھ بھری نظروں سے بھگت کو دیکھا۔ "میں اپنے پتی پر سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہوں۔ مانگو مجھ سے کیا مانگتے ہو"۔

بھگت نے کہا۔ "رانی دیوتا دھن کے بھوکے نہیں۔ انہیں دھن کا لالچ ہوتا تو سنسار میں کسی کنگال کی آشا پوری نہ ہوا کرتی۔

بھگت نے مڑ کر پھر چراغدان روشن کرنا شروع کر دیا۔

رانی غمگین فکر کے بعد بولی۔ "پھر میں کیا چیز پیش کر سکتی ہوں"۔

بھگت نے مشعل ایک برتن میں کھڑی کر دی۔ "رانی نچھاور مول سے نہیں پرکھا جاتا۔ اس بات سے پرکھا جاتا ہے۔ کہ دینے والے بلیدان کتنا بڑا کیا ہے"۔

رانی کچھ دیر کا منہ تکتے تکتے بولی۔ "میں نہیں سمجھی"

بھگت آہستہ آہستہ چلتا ہوا مورتی کے سامنے سیڑھیوں کے [illegible] بھگت نے پوچھا۔ "سنسار میں کیا چیز تجھے سب سے پیاری ہے؟"

رانی اندیشہ ناک نظروں سے بولی۔ "پتی پریم"

بھگت ذرا دیر چپ چاپ سامنے دیکھتا رہا۔ "رانی یہ سمے اپنی سب سے پیاری چیز نچھاور کر دینے کا ہے"۔

رانی کی آنکھیں خوف سے زیادہ کھل گئیں۔ "کیا "پتی پریم!" وہ کھڑی ہو گئی۔ "پتی کو تیاگ دوں؟"

بھگت آہستہ سے سر ہلا کر بولا۔ "تیرا سوال بھی کچھ چھوٹا نہیں۔ راجہ پر موت اپنا منہ کھول چکی ہے"۔

رانی ہاتھ سینے پر رکھے کھڑی تھی۔ رحم انگیز انداز میں بولی۔ "تو پھر میرے لئے کیا رہ جائے گا؟"

بھگت مورتی پر عقیدت کی نظریں ڈال کر بولا۔ "شاید یہی سوچ کر بھگوان تجھ پر ترس کھا جائیں۔ اور مہاراج کو چنگا کر دیں"۔

رانی نے بیقرار ہو کر کہا۔ "جس پریم کے لئے سوال کیا جا رہا ہو۔ اسی پریم کو تیاگ کون سکتا ہے؟"

بھگت پل بھر خاموش رہا۔ "مجھے دیکھو۔ میری بھی
آٹھ سال کی بچی کھو گئی تھی اسے دکھوں سے
بچائے رکھنے کی کامنا میں میں نے اس کو ڈھونڈھنا
چھوڑ دیا۔ اپنا دکھ بھرا جیون لا کر وشنو کی مورتی کے
آگے سمرپن کر دیا۔ وہ اب میری نہیں ہو سکتی۔ میں
اس کا نہیں ہو سکتا۔ مگر دکھ میرے ہردے میں سے
نکل گیا ہے۔ مجھے شانتی ہے۔ کہ میری بچی جہاں
کہیں بھی ہے۔ وشنو آپ اس کا رکشک ہے"۔

رانی نے بیچارگی سے منہ موڑ لیا۔ پل بھر جھکی کھڑی رہی۔ پھر پلٹ کر بیقراری سے بولی۔ "بھگت جی۔ کوئی اور نچھاور۔ کوئی اور نچھاور"

بھگت نے اسے رحم کی نظروں سے دیکھا۔ اور آہ بھر کر بولا۔ "بیٹری جو تیرا جی چاہے۔ نچھاور دینا اپنی اپنی شکتی پر موقوف ہے۔ تیرا لین کوئی چھوٹا نچھاور دے کر ہو سکتا ہے۔ تو تجھے اختیار ہے"۔

رانی نے ذرا سے تامل کے بعد بیتابی سے سر موڑ لیا۔

بھگت قریب آ کر بولا۔ "لیکن اگر وہ نچھاور بس نہ ہوا؟"

نیرنگ خیال کے مستقل خریدار توجہ فرمائیں

قاضی عبدالغفار کی لازوال تصنیف

لیلیٰ کے خطوط و روزنامچہ

نیرنگ خیال کے تمام مستقل خریداروں کو

تین روپے آٹھ آنے کی بجائے

صرف دو روپے (عہ) علاوہ محصولڈاک میں بذریعہ وی پی ارسال ہوگی

وصول فرماکر اس عظیم الشان رعایت سے فائدہ اٹھائیے

اگر آپ کتاب خرید چکے ہیں، یا کسی اور وجہ سے خریدنا نہیں چاہتے، تو آج ہی
بذریعہ کارڈ اطلاع دیجئے، تاکہ دارالادب پنجاب کو جنہوں نے صرف نیرنگ خیال کی
عقیدت سے مجبور ہو کر یہ رعایت دی ہے، نقصان نہ اٹھانا پڑے۔

حکیم محمد یوسف حسن ایڈیٹر نیرنگ خیال لاہور

رانی کا سر بے بسی سے جھک گیا۔

"اور دوسرا انجھا ور لانے کا سمے بھی نہ رہا؟"

رانی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"پتری ویدنراس ہو چکے ہیں"۔

رانی سسکیاں بھرنے لگی۔

"اور کیا پتہ۔ راجہ کے بیہوش جسم میں گنتی کے سانس رہ گئے ہوں اسی پل آخری سانس اس کے ہونٹ پر چلا آ رہا ہو؟"

رانی تڑپ کر مڑی۔ "چپ ہو جاؤ۔ چپ ہو جاؤ"۔

(۱۱) سورج مندر کے باہر آ کر رکا۔ گھوڑے کو چھوڑ کر وہ دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ داسیاں فکرمندی سے اس کی طرف بڑھیں مگر وہ سیدھا مندر کے دروازے کی طرف لپکا۔

(۱۲) بھگت مڑ کر مورتی کے سامنے چلا گیا تھا۔ اور پوجا کی تیاریاں کر رہا تھا۔ رانی سر جھکائے کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ یکلخت دروازہ کھلا اور سورج نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا۔ "رانی جی۔ ویدجی نے آپ کو بلایا ہے۔ مہاراج کی حالت بہت نازک ہے"

رانی نے مڑ کر اسے دیکھا۔ سورج باہر چلا گیا تھا۔ ہیبت کے مارے وہ سن سی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ کان شائیں شائیں کر رہے تھے۔ ذرا دیر یونہی کھڑی رہی۔ پھر بھاگ کر مورتی کے سامنے گئی اور دوزانو ہو کر بولی۔ "بھگوان دیا۔ دیا۔ میں اپنا سب کچھ ارپن کرتی ہوں۔ میں بچن دیتی ہوں کہ اگر میرا پتی تندرست ہو گیا تو میں تمہاری بھگت بن کر اپنا جیون تمہارے چرنوں میں گزار دوں گی"۔

یہ کہکر شدتِ عقیدت سے وہ مورتی کے سامنے دہری ہو گئی بھگت اٹھ کر اس کے قریب آیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا "پتری تیرا کلیان ہو"۔

(۱۳) وکرم بے چینی سے اس کمرے کے باہر ٹہل رہا تھا جس میں راجہ بیمار پڑا تھا۔ بار بار دروازے کی طرف تکتا اور اندر کی کسی آواز پر [illegible] مندر سے کوئی آواز [illegible]

(۱۴) راج بھون کے دروازے پر سپاہی کھڑے تھے۔ رانی اپنی داسیوں سمیت جلدی جلدی بڑھتی ہوئی آئی۔ ذرا دیر دروازے کے سامنے تھمی۔ پریشان نظروں سے سپاہیوں کے چہروں کو دیکھا۔ باہر وہی حالت تھی جو وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ زیادہ اطمینان حاصل کرنے کو وہ بیقراری سے اندر چلی گئی۔

(۱۵) راج بھون کے صحن میں سے گزر کر رانی گھبرائی گھبرائی دالان میں چلی گئی۔ داسیاں پیچھے پیچھے تھیں۔

(۱۶) آخری دالان میں پہنچ کر اس کی نظر وکرم پر پڑی۔ وہ دالان کے پہلی طرف کھڑا تھا۔ رانی تھم گئی۔ وکرم بڑھ کر رانی کے قریب آ گیا۔ دوسری داسیاں دالان کے موڑ پر رک گئیں۔ اور بیتابی سے سر بڑھا بڑھا کر راجہ کے کمرے کے دروازے کو تکنے لگیں۔

رانی نے اندیشہ سے وکرم کے چہرے کو دیکھا۔ وکرم کو دروازے کی طرف متوجہ دیکھ کر وہ اس کے ساتھ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھی۔ وکرم نے دروازے پر دستک دی اور پیچھے ہٹ گیا۔

دروازہ آہستہ سے کھلا۔ بوڑھا وید چوکھٹ میں آ کھڑا ہوا۔ رانی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔

وید جوش کی بیتابی سے بولا۔ "رانی جی! مہاراج نے آنکھیں کھول دی ہیں"۔

رانی نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔ "حالت؟"

وید کے چہرے پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا۔ "ایکا ایکی سنبھل گئی ہے"۔

رانی نے آہ بھر کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے اپنے بیقرار سے ابھرتے ہوئے سینے کو ہاتھوں میں تھام لیا۔ وکرم اس ایکا ایکی تغیر پر حیران تھا۔ رانی نے احسانمندی کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھائیں۔

(۱۷) آسمان پر بادل پھٹ رہے تھے۔ اور ان میں سے چاند [illegible] ہو رہا تھا۔ بستی ہوئی ندی میں چاند [illegible]

افسانہ

خوش قسمت لڑکا

(از جناب علی عباس حسینی ایم اے)

بوڑھی رحیمن ننھے حمید کا ہاتھ پکڑے گھر سے نکلی ۔ دادی کے سوکھے ہاتھوں میں پوتے کی نرم نرم انگلیاں بالکل اس طرح تھیں۔ جیسے خزاں دیدہ پتوں میں نو دمیدہ کوپل رحیمن کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ چہرے پر جھریاں پڑی تھیں۔ آنکھوں کے گرد باریک باریک نشانات تھے۔ گال دانتوں کے نہ ہونے سے پچکے ہوئے تھے۔ ٹھوڑی قریب قریب ندارد تھی۔ پاؤں کانپتے ہوئے پڑتے تھے۔ عصا کا سہارا لینا ضروری محسوس ہوتا تھا۔ پھٹا سا برقعہ جسم پر تھا۔ اس کا نچلا حصہ کیچڑ میں اٹا ہوا تھا۔ پاؤں میں پرانی وضع کی پیوند دار جوتی تھی۔

ننھا حمید سر جھکائے ساتھ تھا۔ آواز بھرائی ہوئی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی اور چہرے اور پھٹے کپڑوں سے بلا کی حسرت برستی ہوئی!

ضعیفہ نے کہا۔ "بیٹے آٹھ نو برس کے سن میں نوکری بڑی قسمتوں سے ملتی ہے۔ خدا کا شکر کرو کہ اس نے مجھ بڑھیا کی فریاد سن لی۔ دیکھو خدا کا شکر ضرور ادا کرنا"

حمید نے گردن جھکائے ہوئے کہا۔ "جی ہاں دادی اماں"۔ ضعیفہ بولی۔ "اور بیٹا اب کے میلے میں تم اپنے لئے چار پیسے والی ٹوپی خرید لینا۔ تم ماشاءاللہ اب نوکر ہو گئے ہو!"

حمید نے پچھلے ہی انداز سے کہا۔ "بہت اچھا دادی اماں!"

بڑھیا بولی۔ "اور دیکھو بیٹے یہ جو تم کھٹ پٹی اس وقت پہنے ہوئے ہو اسے اتار کے رکھ لینا۔ اسے عید بقرعید میں پہننا۔ اب تم سمجھدار ہو۔ تم کو "کم" کا خیال رکھنا چاہئے۔ ایسے ویسے دنوں میں ننگے پاؤں میں کوئی ہرج نہیں۔ کھٹ پٹی رہے گی تو تیج تیوہار کے دنوں سب کے ر تم بھی کھٹ پٹ کھٹ پٹ کرتے چلو گے۔"

حمید کی جھکی ہوئی گردن اور جھک گئی۔ وہ بھرائی آواز میں بو "بہت خوب دادی اماں"۔

صبح کا وقت تھا۔ پو پھٹ چکی تھی۔ مرغ بانگ دینا بند کر چلے تھے۔ مسجدوں سے تہلیل و تسبیح اور مندروں سے ناقوس کی آوازیں آ رہی تھیں۔ عورتیں دو دو چار چار کی ٹولیوں میں ہاتھوں میں لوٹا لئے گھونگھٹ نکالے گھر طرف پلٹی راہ میں ملتی جاتی تھیں۔ ہر ایک رحیمن اور اس کے پوتے کو جاتا دیکھتی راستہ کھوٹا ہونے کے وہم سے منہ سے نہ کچھ بولتی۔ ہاں ان دونوں پر بار بار حسرت کی نظر ضرور ڈالتی۔

یہ دونوں کھیتوں کے کنارے آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ بو رحیمن چھوٹے حمید کو ملازمت کے فرائض۔ آقا و ملازم کے تعلقات۔ خدا کے بندوں پر احسانات۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں سمجھا کے خاموش ہو چکی تھی۔ ح سب کچھ سن لیا تھا۔ اور دادی کے ہر سوال پر یہی جواب دیا تھا۔ "جی ہاں دا اماں۔ بہت خوب دادی اماں"۔ لیکن جب وہ ساری باتوں کو سننے کے بعد آنکھ اٹھا کر دیکھتا تو راستہ سامنے ویسا ہی چمکتا ہوا دکھائی دیتا۔ اور منزل کا پتہ نشان نہ ملتا!

آفتاب نے اپنے سنہری سہرے کے اندر سے جھانکنا شروع کیا۔ دہ بیلوں کی جوڑی ہنکاتے۔ ہل کندھے پر رکھے کھیتوں میں دکھائی دینے لگے۔ کو گاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کوئی بیلوں کو ہنکاتا ہوا اور کوئی جنگل سے پلٹتی ہوئی ہنسی ٹھٹھول کرتا ہوا۔ اہیر کے لڑکے گاؤں بھر کے مویشی میدانوں میں چرانے

اکٹھا کر رہے تھے۔ گڈریے بھیڑوں کا گلا ہنکاتے۔ "ہرے! ہرے! آرا! آرا!" کرتے چلے جا رہے تھے........ ضعیفہ اور حمید بھی چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے چلے جا رہے تھے۔ ان کے سامنے راستہ دور تک زرد زرد چمک رہا تھا۔ لیکن منزل کا دھندلا خاکہ بھی نہ دکھائی دیتا!

سامنے منگلو جاٹ آتا ہوا دکھائی دیا۔ کاندھے پر لاٹھی تھی اور اس میں نیا جوتا لٹکا ہوا تھا۔ سر پر چھوٹی سی پگڑی تھی۔ جسم میں ایک مارکین کا کرتا۔ اور ٹانگوں میں زرد رنگی ہوئی دھوتی۔ گنگناتا مسکراتا چلا آ رہا تھا۔ بڑی بی کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ بولا "کہاں جات ہو کھالا؟"

ضعیفہ بولی "گسائیں پور۔ بھیا۔ وہاں حمید کا کام لگ گیا ہے۔"

وہ سادگی سے بولا۔ "ارے کھالا۔ اِ، سن ماں اور کام! اسے کھیلے کا سن ہے کی کام کا؟"

ضعیفہ نے اس کے سوال کے جواب میں صرف اتنا کہا۔ "ہاں بھیا میرے پاس سوائے اس کے اور کوئی مرد نہیں۔" پھر پوچھا "تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

وہ کچھ شرماتا ہوا مسکرایا۔ "سسرال سے!"

حمید نے دادی کی انگلیاں کھینچیں۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ راستہ سامنے تھا۔ گسائیں پور کوسوں دور۔ بس چلنے لگے!...... چلے جا رہے تھے۔ اور منزل کا پتہ نہیں!

آگے بڑھ کے مولوی صاحب ملے۔ فینس نیم کے درخت کے نیچے رکھی تھی۔ آٹھ کہار قریب ہی ذرا سستا رہے تھے۔ خاں صاحب کے بیٹے کا مکتب تھا۔ مولوی صاحب بسم اللہ پڑھانے جا رہے تھے۔ بڑی بی کو دیکھ کے بولے۔

"ابی رحیمن بی تم کہاں اتنے سویرے جا رہی ہو؟"

ضعیفہ نے سلام کر کے کہا۔ "جی اس بچے کو کام پر لگانے جا رہی ہوں!"

مولوی صاحب نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا "ہوں ماشاء اللہ اتنے سے سن میں کمانے جا رہا ہے۔ خوب! بہت خوب! مگر تم نے اسے نماز سکھا دی ہے؟"

ضعیفہ کے زرد چہرے پر سرخی آگئی۔ بولی۔ "جی ہاں مولوی صاحب میں نے اسے نماز خود سکھائی ہے۔ ہم غریب بھی خدا کا نام لینا جانتے ہیں!

مولوی صاحب نے سٹ پٹا کے "نہیں! نہیں! ہاں! ہاں! ماشاء اللہ" کہا اور دونوں مسافر آگے بڑھ گئے۔ ایک بوڑھا۔ ایک بالا۔ ایک عمر کی حدیں ختم کئے ہوئے۔ دوسرا زندگی میں قدم رکھتا ہوا۔ دونوں کے پاؤں میں رعشہ۔ دونوں کے گھٹنے کمزور۔ ایک کا کثرتِ کار سے۔ دوسرے کا ناکردہ کاری سے۔ لیکن معذور و مجبور چلے جا رہے تھے۔ آفتاب کی حدت بڑھتی جاتی تھی۔ منزل کوسوں دور تھی۔ لاپتہ تھی۔ مگر قدم نہ رکتے تھے!

گسائیں پور کے مفصلات شروع ہوئے۔ پختہ مکانات۔ سر بفلک عمارتیں دکھائی دینے لگیں۔ شہر کے پھاٹک سے ملا ہوا آموں کے درخت کے قریب ایک اندھا فقیر بیٹھا تھا۔ "ایک پیسہ پاؤ بھر آٹا۔ ایک پیسہ پاؤ بھر آٹا۔" "اندھے فقیر کا سوال۔ اندھے فقیر کا سوال" کی رٹ لگی تھی۔ اس کے زرد زرد دانت دکھائی دیتے تھے۔ اس کی میلی داڑھی کے بال الجھے ہوئے تھے۔ اور اس کی آنکھوں میں دیدوں کی جگہ کیچڑ بھری ہوئی تھی۔ اس نے تھکے مسافروں کے پاؤں کی چاپ سنتے ہی ان کی طرف رخ کیا۔ اپنا سوکھا ہوا زرد ہاتھ پھیلا دیا۔ "بابا بھلا ہوگا! اندھے سور کا سوال۔ ایک پیسہ پاؤ بھر آٹا!"

ضعیفہ نے پوتے کا ہاتھ مضبوط تھام لیا۔ فقیر کے قریب جا کر بولی "بابا ہم نے سنا تھا تمہیں ایک لڑکا نوکر چاہئے!"

فقیر کے لب و لہجہ میں فرق آگیا۔ پہلے عاجزی تھی اب حکومت۔ بولا۔ "تم لائی ہو؟" اور اس نے اپنے ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کیا۔ بڑھیا نے حمید کو اس کے قریب کر کے کہا۔ "ہاں۔ دیکھو ماشاء اللہ نواں سال ہے!"

اندھے بھکاری نے حمید کو سر سے پاؤں تک اس طرح ٹٹولا جس طرح قصاب بکری کو دام کرتے وقت ٹٹولتا ہے۔ پھر بولا۔ "ہاں مضبوط معلوم ہوتا ہے۔ کیا نام ہے؟"

بچے نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "حمید!"

اندھے نے پوچھا "تم مجھے نہایت احتیاط سے گاؤں گاؤں لے چلو گے؟"

ننھے حمید نے گرفتہ آواز میں کہا۔"جی ہاں"

اندھے نے پوچھا۔"تم میرے ساتھ گا سکو گے؟"

لڑکے نے چھوٹی سی زبان سوکھے ہونٹوں پر پھرا کے کہا۔"جی۔ آپ اگر سکھا دیں گے"۔

اندھے نے جھولی سمیٹی اور لکڑی اٹھائی۔ وہ بچے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بولا۔"آؤ۔ چلیں۔ یہاں بیٹھے بیٹھے کچھ نہیں ملتا چلو پھیری لگائیں!"

حمید نے دادی کو حسرت سے دیکھا۔ پھر سڑک پر نظر کی بہت دور تک سپید سپید چمکتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ نہ رکنے کا موقع۔ نہ ٹھہرنے کی جگہ۔ اور نہ پناہ کا مقام! منزل کوسوں دور تھی! بالکل لاپتہ تھی!

. . . .

. . . .

وہ اندھے کے آگے آگے چلنے لگا۔ اس کا ایک سوکھا بچے کے کاندھے پر تھا اور وہ اس کے ساتھ صدا لگا رہا تھا۔"دیدے۔ بابا دیدے! . . . .

ایک ہے اندھا ایک ہے بچہ۔ ایک ہی پیسہ پاؤ بھر آٹا۔ دیدے دیدے بابا"۔

ایک کی آواز میں خشونت تھی دوسرے کی آواز میں رقت تھی ایک اپنا حق مانگ رہا تھا۔ دوسرا اپنی حق تلفی کا ماتم کر رہا تھا!"

رحیمن دیر تک اپنی کمزور آنکھوں سے پوتے کی غائب ہوتی ہوئی صورت دیکھتی رہی۔ پھر اپنے دامن سے آنسو پونچھتی ہوئی آسمان طرف دیکھ کر بولی۔ تیرا شکر ہے میرے مالک! تو نے میرے بچے کو اتنا خوش قسمت بنایا کہ وہ نو ہی برس کام پر لگ گیا!

(ماخوذ)

شیکسپیر اور حقیقت شناسی

(از جناب علامہ ڈاکٹر سید نجم الدین احمد صاحب جعفری ڈپٹی ڈائریکٹر انفرمیشن بیورو دہلی)

ہندوستان کے مشہور ڈرامہ نویس آغا حشر ہم سے رخصت ہوگئے وہ مردہ قوم کے فرد تھے۔ اس لئے شاید ہم لوگ ہمیشہ کے لئے ان کو بھول گئے لیکن انگریزوں کا خدائے سخن شیکسپیر آج تک زندہ ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ مستقبل میں وہ زندہ نہیں رہے گا۔ انگلستان کے اس جلیل القدر ڈرامہ نویس نے ایسی غیر فانی ناموری اور شہرت حاصل کی ہے۔ جو حکومت برطانیہ کی عظمت اور وقار سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ ہماری زبان کے جاننے والے بھی آغا حشر اور دیگر ادیبوں کے ذریعہ شیکسپیر سے بہت کچھ واقف ہو چکے ہیں۔ اس لئے آج ہم انگلستان کے اس خدائے سخن کے ادبی کارناموں کے ایک مخصوص پہلو پر مجملاً بحث کرنا چاہتے ہیں۔

شیکسپیر کے ادبی کارنامے تحصیل علم و ادب۔ اخلاقی تعلیم و تعلم اور انسانی زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرنے کے لئے نہ ختم ہونے والے خزانے ہیں۔ ان کی روشنی میں ہم دنیا کی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کے قابل بن سکتے ہیں۔ یہ کچھ آسان کام نہیں ہے کہ انسان کی ہر لحظہ تبدیل ہو جانیوالی طبیعت کی ہر رنگ میں صحیح صحیح تصویر کھینچ دی جائے۔ اس مضمون میں میرا بحث بھی یہی ہے کہ شیکسپیر کے نقطۂ نظر سے معرفت انسانی یعنی Human ism (ہیومن ازم) سے کیا مراد ہے۔ شعراء کے کلام میں اس موضوع کی جانچ پڑتال خاص طور پر نشاۃ ثانیہ سے شروع ہوئی [illegible] زمانہ سے اس تخیل کو اسی قدر اہمیت [illegible] کہ لوگوں کے [illegible] خیال [illegible] رہی کا [illegible] زمانہ میں بھی یہی خیال پیش پیش نظر آتا ہے۔

شیکسپیر کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں۔ کہ اس نے اپنے زمانے کے خیالات کو حقیقت شناسی کا جامہ پہنانے کے لئے شاعری اور ڈرامے کے فن سے کس قدر کام لیا ہے۔ شیکسپیر کے اسی طرز نے نفسی فلسفے کو شاعری کے تابع فرمان بنا دیا۔ اہل انگلستان کے دماغی پس منظر کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے اپنی قوت متخیلہ کی امداد سے عوام کے جذبات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ شیکسپیر اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے معاصرین غیر مادی اور خارق العادۃ قوتوں پر ایمان رکھتے ہیں چنانچہ اس نے اپنے اکثر ڈراموں میں جان بوجھ کر چڑیلوں بھوت پریوں بلاؤں اور دیگر خارق العادۃ اور خوفناک قوتوں سے کام لیا ہے اس لئے نہیں کہ وہ ان اعتقادات کو قوت دے بلکہ اس لئے کہ ان کا اثر انفرادیت اور ذمہ داری کے خیالات کی تبلیغ کے ذریعہ سے دھیما کیا جائے۔ شیکسپیر نے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا کرنے کی کوشش کی کہ توہم پرستی کا انجام ہمیشہ المناک ہوتا ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک اس کی یہی خواہش رہی کہ عوام محسوس کرنے لگیں کہ یہ دنیا عالم اسباب ہے۔ اور اس میں توہم پرستی کو دخل نہیں۔ [illegible] خیالات پیدا کرنے سے شیکسپیر کا مقصد یہ تھا کہ عوام میں زندگی کی [illegible] مرگیوں اور ناخوشگواریوں کا ہمت اور دلیری سے مقابلہ [illegible] قابلیت پیدا ہو سکے۔ چنانچہ اس کو اپنے مقصد میں [illegible] ہوئی۔ اور اس کے ڈراموں نے نہایت [illegible] دل مدمار [illegible] [illegible]

... ل دور ہوگیا کہ شہنشاہیت اشیت کی ... بات یہ ہے کہ وہ خود عضوی نظام کی حقیقت پر ایمان رکھتا تھا۔ اور اسی کی خوبیوں کی تبلیغ کرتا تھا۔ اس کے نزدیک نظام اور ... قدرت کی وسیع قوت کے آئینہ دار ہیں۔ اس اصول کی تائید میں اس کی تصنیفات میں سے "ٹرلیس اینڈ کرسیڈا" اور ان دلائل کو جو اس نے سرٹامس مور کی زبان سے ادا کئے ہیں۔ پیش کیا جا سکتا ہے۔ گوتم بدھ کی طرح اس کا بھی یہی خیال ہے۔ کہ زندگی بذاتِ خود انسان کو گناہوں سے پاک کرنے والی ہے۔ اور اس تزکیہ کے لئے کسی ایسی قوت کی ضرورت نہیں جو ماورائے فطرت ہو۔ شیکسپیر کا یہ بھی خیال ہے کہ انسانی سوسائٹی کی ترقی و توسیع کے لئے فطرت اور تربیت میں مطابقت ہونی لازمی ہے۔ اس نے اس نظریہ کا اظہار اپنی تصنیف "ٹیمپسٹ" میں "پراس پیرو" کے کردار میں کیا ہے۔ یہ ڈرامہ سرتاپا غیر فطری مذہب کی نکتہ چینی پر مشتمل ہے۔

شیکسپیر کے اصلی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے ان جذباتی اور اقتصادی حالات سے کسی قدر واقف ہونا ضروری ہے۔ جنہوں نے زندگی اور اس کی ذمہ داریوں کے متعلق اس کے خیالات میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ مختصر طور پر ذیل میں اس پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

شیکسپیر کی خانگی زندگی کا ایک دور بہت تاریک تھا۔ اس کے والد نے اس کو محروم الارث کر کے دنیاوی دولت سے اُسے بالکل محروم کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ "ارل ساوتھمپٹن" نے بھی جس پر اس کی معیشت کا دارومدار تھا۔ اسے بالکل بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ سچ ہے مصیبت تنہا نہیں آتی۔ اسی زمانہ میں طاعون نے انگلستان کی فضا کو اور زیادہ مکدر بنا دیا۔ ان پے در پے مصائب سے شیکسپیر کا دل ٹوٹ رہا تھا کہ اس کی حوصلہ افزا طبیعت نے اس کی معاونت کی۔ جس سے ثابت ہو گیا کہ اگر اسے ... پڑتیں تو یقیناً اس کی زندگی کا معاشرتی پہلو ہمیشہ کے لئے ... اور بجائے اس کے کہ وہ تہذیب و تمدن کے رہنما کی ... اختیار کرتا وہ ایک مایوسانہ اور غلامانہ ذہنیت کا شکار ... ہی شیکسپیر کی زندگی کا عظیم الشان ... اس ...

شہرت حاصل کرنی شروع کی۔ تجربے نے اس پر ثابت کر دیا کہ اس کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اور دوسروں کے رحم و کرم پر بھروسہ رکھنا سخت نادانی ہے۔ انہی ٹھوکروں نے زندگی کی اصلیت کو اس کے سامنے بے نقاب کر دیا۔ اور وہ پبلک کا آدمی بن گیا۔ یہ کہنا بیجا نہیں کہ پبلک ہی کی سرپرستی نے اسے غیر فانی شہرت کا مالک بنایا۔ شیکسپیر کے ڈرامے اس زمانہ کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے ابتدائی کارناموں میں اس کے اصلی جوہر اسقدر تاباں نہیں جیسے کہ ان شاہکاروں میں ہیں جو اس نے بعد میں لکھے ہیں۔ جبکہ اسے انسان کا خاصہ تجربہ ہو گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ہم کو یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ شیکسپیر کی شہرت کو غیر فانی بنانے میں اس کے قدردانوں کو بھی بہت زیادہ دخل ہے۔ یہ بات ہم سب کو معلوم ہے۔ کہ شیکسپیر کے ڈراموں کے پلاٹ جدید نہیں ہیں۔ بلکہ پرانے ڈراموں کے پلاٹوں سے ماخوذ ہیں۔ لیکن اس نے پرانے پلاٹوں کو اپنی قابلیت سے اسقدر بلند اور دلچسپ کر دیا ہے۔ کہ وہ اس کے اپنے بن گئے ہیں۔

"وار آف روزاز" (War of Roses) نے شیکسپیر کے دل میں امن و نظم کا جذبہ پیدا کیا۔ اور اس کے جذبۂ قومی کو بھی ابھارا شیکسپیر کو اگر اس زمانہ کا مجسمہ اور حاصل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ اسنے اپنے زمانہ کی تمام کمزوریوں کا مطالعہ کیا اور ان سب کے خلاف بڑی حکمت سے جہاد کیا۔

ادبی دنیا کی ایک اور شخصیت میں بھی جسکو عوام گوئٹے کے نام سے جانتے ہیں۔ یہی خوبیاں موجود ہیں۔ ادبی شخصیتوں سے ہٹ کر سیاست دانوں میں سے بھی ایک شخصیت کا یہاں پر ذکر کیا جا سکتا ہے۔ میری مراد لائڈ جارج سے ہے۔ اس کا مورخ لکھتا ہے کہ باوجود اپنی کمزوریوں کے لائڈ جارج بچپن ہی سے موروثی حقوق کی مراعات کے عیوب اور غریبوں اور امیروں کی مروجہ تفریق کے خلاف تھا۔ اس لئے آگے چل کر اس کے بعض کارنامے اس کی اس رائے کے آئینہ دار بنے۔

اگر شیکسپیر کے ادبی کارناموں کو معروضی نظریے سے جانچنے کی بجائے موضوعی نظریے سے پرکھا جائے ...

کارنامے کو نفسِ مضمون اور طرزِ بیان کے لحاظ سے تنقید کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے۔ تو ہم کو شیکسپیر کے ادبی کارناموں میں حقیقی انسان کا پرتو نظر آئے گا۔ اور بجائے اس کے کہ مخصوص انداز میں کہیں کہیں انسانی فطرت کی تصویر نظر آئے۔ ہمیں ہر رنگ میں عام طور پر انسان کا حقیقی جلوہ دکھائی دے گا۔ اس حقیقت سے اس عام علمی نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ کہ انسانی اجتماعیت آپس کے میل جول اور مختلف قسم کی تحصیلات کے ربط ضبط یا تضاد اور اثرانگیز واقعات سے ظہور میں آتی ہے۔ ان مسلمات پر ہم شیکسپیر کی زندگی کو چار دوروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) ابتدائی دور۔ جبکہ وہ زعمِ شباب میں عام نوجوانوں کی طرح ہر مشکل شے کو آسان سمجھتا تھا۔

(۲) ساؤتھمپٹن کا دور۔ جبکہ وہ اس فریب میں مبتلا تھا کہ زندگی مزے سے گزر رہی ہے۔ اور گزر جائے گی۔

(۳) ساؤتھمپٹن سے علیحدگی کا دور۔ جبکہ وہ مایوسی اور تذبذب کی پُرخار وادیوں میں بھٹک رہا تھا۔

(۴) آخری دَور۔ جبکہ اس نے خام خیالیوں سے نجات حاصل کر لی تھی۔ اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ تھیٹر اس کی زندگی بنا دے گا۔

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ شیکسپیر کے بہت سے ڈرامے خود اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ اس کی زندگی کے کسی دور میں لکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی تحریروں میں ایک اور نمایاں خصوصیت موجود ہے۔ جو اس کے رتبہ کو عوام سے بہت بلند کر دیتی ہے۔ جب ساؤتھمپٹن نے اس سے اپنے تعلقات منقطع کر لئے اور اس کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں تو عوام کی طرح اس نے کہیں بھی اپنے ممدوح کے خلاف نفرت یا دشمنی کا اظہار نہیں کیا۔ برخلاف اس کے ایران کے شاعرِ اعظم فردوسی نے جب شاہنامہ لکھنے کا صلہ اپنی امیدوں کے مطابق سلطان محمود غزنوی سے نہ پایا تو اس نے سلطان کے خلاف بہت کچھ زہر اگلا۔ چنانچہ محمود کی ہجو میں جو اشعار اس نے لکھے ہیں۔ وہ آج تک زبان زدِ خاص و عام ہیں۔

شیکسپیر کی تحریروں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے [illegible]

[illegible] انہیں پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اور انسان [illegible] پسند بنانے اور جذبات کو حقیقت اور معرفت میں تبدیل کر [illegible] یہی وجہ ہے کہ اس نے ڈرامہ کو حقیقت کا صحیح ترجمان بنا دیا [illegible] اپنے کرداروں کے ذریعہ حقیقت کا سبق دینا چاہتا ہے تو ہم [illegible] ہیں کہ وہ کرداروں اور ان کے کارناموں کے تضاد کو اس طرح [illegible] کرتا ہے۔ کہ دماغ اور قلب کو ایک دھکا سا لگتا ہے جس سے وہ [illegible] چوکنے ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی مثال کے لئے میک بیتھ اور اوتھیلو کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اوتھیلو میں مور کے اخلاقی اور عملی پہلوؤں میں کافی تضاد ہے۔ اسی طرح میک بیتھ میں۔ میک بیتھ اور لیڈی میکبیتھ کے کردار اور اعمال میں صاف اختلاف نظر آتا ہے۔ حافظ شیرازی بھی اسی طرح اپنے زمانے کے لوگوں کے کردار اور اعمال پر نکتہ چینی کر کے عوام کو متاثر کرنا چاہتے ہیں۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت میروند آں کارِ دیگر می کنند

شیکسپیر کے ڈراموں میں ہملٹ ایک امتیازی خصوصیت رکھتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہمیں شیکسپیر کی بعض خصوصیات کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس ڈرامے کے خاص کردار "پرنس ہملٹ" اور "ہوریشیو" ہیں۔ اس ڈرامے کو لکھنے سے مصنف کا مقصد یہ ہے کہ اس دنیا میں فتوحات یا کامیابیاں ان لوگوں کا حصہ ہوتی ہیں جو عمل پر ایمان رکھتے ہیں اور موت کے خوف پر غالب آ جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ "ہمتِ مرداں مددِ خدا" یا "اَلسَّعیُ مِنّی وَالْاِتْمامُ مِنَ اللّٰہ" کے اسلامی اصول کی اس کیریکٹر کے ذریعے تبلیغ کرتا ہے۔ ہملٹ کے [illegible] یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیکسپیر اس اسلامی اصول کو بھی سامنے [illegible] جس کی رو سے انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ نقصان کا [illegible] بدلہ لے لے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ وکتبنا علیہم [illegible] بالعین۔۔۔۔ الخ۔

اس ڈرامہ میں اس نے [illegible]

[illegible]

[illegible] کے ایک بچے ہیرو کی تصویر ہے

[illegible] معلوم مستقبل پر غالب آنے پر منحصر [illegible] سے اتفاق کریں گے کہ ایورسٹ پر چڑھنے کی [illegible] ہوائی میں پرواز یا کرۂ آبی میں جانے کی مہموں میں بھی [illegible] کا رفرما ہے جو ہملٹ میں موجود ہے۔

ڈاکٹر سمارٹ جیسے ناقدوں کا خیال ہے کہ تقدیر اور ذمہ داری کو [illegible] کی تحریروں میں نہایت موزوں جگہ دی گئی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے [illegible] شیکسپیئر نے انفرادی ذمہ داری اور تدبیر پر زیادہ زور دیا ہے۔ اور تدبیر کا وہی پہلو ہے جو "السعی منی والاتمام من اللہ" میں ہے۔ لیکن چونکہ اس کے دور کا عقیدہ تھا کہ ؎

سب کام اپنے کرلیں تقدیر کے حوالے
نزدیک عاقلوں کے تدبیر ہے تو یہ ہے

اس لئے مجبوراً اسے تقدیر کو ایسی جگہ دینی پڑی کہ جس سے وہ نظریہ جس کو وہ پیش کرنا چاہتا تھا مافوق نہ سمجھا جائے۔ اور عوام اسے قبول نہ کرسکیں۔ اس نے بار بار اپنے ڈراموں میں زور دیا ہے کہ کامیاب زندگی وہ لوگ بسر کرتے ہیں جو صاحب عمل ہوتے ہیں۔ اور ماحول اور زمانہ کی رفتار کے مطابق اپنے آپ کو تبدیل کرسکتے ہیں شیکسپیئر کے نزدیک محروم القسمت وہ لوگ ہیں جو زمانہ کی ہوا کے مطابق اپنے آپ کو بدل نہیں سکتے۔ گویا شیکسپیئر کا عمل اس مصرعہ پر تھا۔

زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ بہ ساز

ایک اور جگہ وہ کہتا ہے۔ "اگر اتفاقات زمانہ مجھے بادشاہ بنا دیں گے [illegible] اتفاقات زمانہ میری ہمت کے بغیر مجھے بادشاہ بنا سکتے ہیں"۔

شیکسپیئر کے نزدیک انسان کی قوت استدلال خدا کی دی [illegible] ایک غیر مترقبہ نعمت ہے۔ چنانچہ وہ ہملٹ میں کہتا ہے۔

[illegible] کیا ہے جس کا سب سے بڑا مقصد اور [illegible] کی قدر و قیمت محض کھانا اور سونا ہے [illegible] وقعت نہیں رکھتا [illegible]

....

وہ ہستی (خدا) جس نے ہم کو انتہائی [illegible]

پس و پیش دیکھ کر پیدا کیا۔ اس نے ہم کو قوت
استدلال جیسا عطیہ بیکار رکھنے کے لئے نہیں دیا"

اسی طرح انصاف کا وہ نصب العین جس کو رحم سے گداز کرکے۔ "مرچنٹ آف وینس" میں شیکسپیئر نے پورشیا کی زبانی پیش کیا ہے۔ کوئی اور مغربی شاعر ویسی مثال پیش نہیں کرسکا۔ حقیقت میں یہ الفاظ دنیا کے لئے ایک بیش بہا عطیہ ہیں۔ اور اس سے زیادہ بلند خیالی کا نمونہ اور رہو بھی کیا سکتا ہے:-

"رحم کا وصف زبردستی پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ رحم آسمان سے
ہلکی ہلکی بارش کی طرح برستا ہے۔ اس میں دوگونہ رحمتیں
پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اول تو اس پر رحمت ہوتی ہے
جو رحم کرتا ہے۔ دوسرے اس شخص پر بھی رحمت
ہوتی ہے جو اس سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ رحم ایسی خوبی ہے
جو ہمت والوں میں سب سے زیادہ ہوتی ہے"

کالرج کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ "مرچنٹ آف وینس کا ڈرامہ" ہر حیثیت سے شیکسپیئر کے ماہر انسانیت ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

آخر میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ شیکسپیئر نے اپنے ملک والوں کے دلوں میں اولیت اور ہمت کی اہمیت کو محسوس کرنے کا جذبہ اس طرح بیدار کیا ہے۔ کہ آج انگلستان کو جس قدر حیثیت حاصل ہے وہ ایسے ہی جذبات کا نتیجہ ہے۔ وہ یہ بھی بتلاتا ہے کہ بنی نوع انسان کی ترقی کا دارومدار قدیمی روایات اور ازلی احساسات کو از سرِ نو زندہ کرنے پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کا انحصار مستقبل میں فطرت کے ساتھ ساتھ چل کر کیمیائے زندگی کو فطرت انسانی میں تبدیل کرنے پر ہے مختصر یہ کہ عضوی نظام و آئین کی وقعت۔ آزاد خیالی کی عظمت اور سچے انصاف کی قدر و قیمت جس قدر برٹش پبلک میں پائی جاتی ہے۔ اس میں شیکسپیئر جیسے ادیبوں کا بہت کچھ حصہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ حضرات جو شیکسپیئر کی تصنیفات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اس کی تحریروں سے [illegible] سبق حاصل کرکے اپنے آپ کو اس کار زار حیات میں بہتر [illegible] کوشش کریں گے۔

افسانہ

حسنِ اتفاق

(ازجناب الفرے۔ سہاوری)

برکھا کی آخری بہار تھی۔ سورج بدلی سے نکلا تو سارے سنسار کو [illegible]پا دیا۔

یاور ایک چوکھٹے میں جڑی ہوئی تصویر بغل میں دبائے ہوئے [illegible]ھر کے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ راستہ کم کرنے کے لئے اس نے چال کو تیز [illegible]ر دیا۔ مگر پسینے کا کیا علاج کہ جس نے تھوڑی ہی دیر میں اس کے کپڑے [illegible]شرابور کر دیئے۔ اسوقت اس کی پریشانی کا کوئی اندازہ لگا تا امکان کی [illegible]دوری اسے پُل صراط طے کرنے سے کم نہ تھی۔

[illegible]گھر کی سنسان گلی کے موڑ پر ایک بھکارن لڑکی نے "رام بھلا کرے" [illegible]مکر عاجزی سے اپنا ہاتھ اُس کے آگے بڑھا دیا۔ یاور نے تصویر والی بغل کو [illegible]ذرا سخت کیا۔ اور دوسرے ہاتھ سے جیب کو بھکارن لڑکی کی امداد کا [illegible]ذریعہ بنانا چاہا۔ سورج کی تپش۔ تصویر کا بوجھ اور پسینے کی بے پناہ [illegible]مدنے اُسے گھبرا دیا تھا۔ اس وقت اُس کی دلی آرزو بھکارن سے [illegible]پیچھا چھڑا کر مکان پہنچنے کی تھی۔ "جلدی کام شیطان کا" اُس نے جلدی [illegible]اور گھبراہٹ میں پیسے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مگر وہ تھے کہ دنیا سے [illegible]تنگ بننے والے زاہد کی طرح باہر آنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔

یاور کا ایک ہاتھ جیب میں اور دوسرا تصویر کے تھامنے میں [illegible]تھا۔ نگاہ نیچے اور گردن آگے کی طرف جھکی ہوئی تھی کہ وہ دروازے [illegible]میں پہنچ گیا۔ مشکل سے وہ ایک چھوٹی ———— تصویر کی [illegible] [illegible] کمرے کے مکان میں پہنچا۔ میں تصویر [illegible] [illegible]

اور مکان کی بناوٹ نے یاور کا خون خشک کر دیا۔ سامنے بہار [illegible] کپڑے پہنے کوئی خاتون پنجوں کے بل کھڑی تھی اور ہاتھوں کو [illegible] ہوئے کپڑے لٹکانے کی کھونٹی کو دیوار سے جدا کر رہی تھی۔ گویا [illegible] پری آکاس جانے کے لئے پر تول رہی تھی۔ یاور کے پاؤں کے نیچے سے [illegible] نکل گئی۔ اور کے مکان میں بیباکی سے گھس آنا اُس کے لئے قیامت نہیں تو اور کیا تھی۔ وہ اُلٹے پاؤں لوٹا۔ مگر اڑ۔ لڑا۔ دھڑام!! [illegible] اور دھماکا تمام صحن میں گونج گیا۔

عورت نے مڑ کر دیکھا تو دروازے کی چوکھٹ پر کوئی ———— ایک مرد گھٹنوں کے بل زمین پر گرتا اور گرتے ہی سنبھلتا نظر آیا۔ آن کی آن میں زمین پر پڑے ہوئے ایک [illegible] سوا اب اس کی نظر کے سامنے کچھ بھی نہ تھا۔ وہ دم بخود [illegible] میں کھڑی تھی۔ جیسے اس کے منہ میں زبان گلے میں آواز اور پاؤں میں سکت ہی نہ تھی۔ وہ کسی بھیانک چیز سے ایک سا[illegible] کمسن بچے کی طرح دروازے کے اُن کواڑوں کو تکتی [illegible] رہی۔ جو ڈراؤنے درندے کی طرح منہ پھاڑے [illegible]

(۲)

(اچھل کر) اُنی خوبصورت [illegible] تصویر [illegible]

[illegible] میں [illegible] سکتے ہو۔ [illegible]

[illegible] ایسے ہی خیال میں پھنسا [illegible]

[illegible]

[illegible] ہمسائی کے گھر میں دھماکا سا ہوا۔ میں جانوں [illegible]

[illegible] بیگم! تمہیں تو یونہی وہم ہے۔ نہ کہیں کوئی گرا ہو۔ ذرا پتا [illegible] اور تمہارے کان کھڑے ہوئے۔ بیچارے پڑوسی آج مکان خالی کر رہے ہیں۔ سامان کسنے باندھنے میں کوئی چیز گر گرا گئی ہو گی" [illegible] جو بیگم کی منہ چڑھی تھی جواب دے کر پھر سالن نکالنے میں لگ گئی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

بھاوج کی اس چھان بین سے یاور کے رہے سہے ہوش اور بھی گم ہو گئے۔ جس نے گھر کے غسل خانے میں آ کر پناہ لی تھی۔ مگر رضا کے بیباکی اور لاپروائی کے جواب سے اُس کے جی میں جی آ گیا۔ ندامت خوف اور رسوائی۔ اُسے اب بھی گھیرے ہوئے تھے۔ اُسے اپنے زخمی گھٹنوں اور ابتر کپڑوں سے زیادہ اپنی رسوائی کا پورا ثبوت قلمی تصویر اُس گھر میں رہ جانا تھا — اور یہی بات اُسے رہ رہ کر ستا رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے اپنی بھاوج سے یہ بات بتا دینی کہاں تک مناسب تھی۔ یقین کریں گی یا نہیں اور اگر بتا کر بات کو نہ [illegible] کہیں پڑوسی رنگ نہ لائیں .... مگر نہیں عورت [illegible] نہیں ہوتی۔ رسوائی کے خیال سے اب بھی اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ دو چار ہی منٹ کے بعد اس نے [illegible] کو ملتوں میں اوپر کی طرف گھمایا۔ ماتھے پر بل ڈالے جیسے کسی کٹھن مسئلے پر غور کیا ہو۔ اور پھر اطمینان سے انگڑائی لی۔ جیسے کوئی سونے والا کسی خوفناک خواب سے چونک کر اور یہ جان کر کہ جو کچھ دیکھا خواب تھا یہی کو تسلی دے یا کسی بات کو سوچ کے طے کرے۔

ہاں [illegible] وہ اس قصہ کو کسی سے نہ دُہرانے پر تُل گیا تھا

(۳)

[illegible] یاور وقت سے [illegible] یہ اس کا معمول تھا [illegible]

اس کی دن دونی ترقی دیکھ دیکھ کر رشک کرتے تھے۔

ہوا کی لطافت اور رت کی مناسبت آج یاور کو بہت بھا گئی۔ آج اس نے سواری میں بیٹھ کر دفتر جانا سخی داتا اور رحیم کی دی ہوئی نعمتوں کو ٹھکرا دینے کے برابر جانا۔ وہ آہستہ آہستہ نگاہ سامنے کئے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ سڑک پر چڑیا بھی نہ تھی۔ دفتر زیادہ سے زیادہ سو گز کے فاصلے پر ہوگا۔ کہ زمین پر پڑا ہوا ایک لانبا چوڑا تختہ اُسے نظر پڑا۔ اوندھا پڑا ہوا یہ تختہ کسی تصویر کا چوکھٹا معلوم ہوتا تھا۔

انسان کی فطرت ہے کہ وہ لاوارث چیز سے دلچسپی لئے بغیر نہیں رہتا۔ رہانیت کا سوال وہ کچھ بھی ہو۔ یاور بھی انسان تھا وہ اس کی طرف لپکا اور جھک کر اُٹھا لیا۔ یہ ایک تصویر تھی۔ جس کا سینے سے لگائے رکھنے والا نگہبان شیشہ اس کی حفاظت کرتا ہوا چور چور ہو چکا تھا۔ اب تصویر کی حالت پہلی رات کی لُٹی ہوئی دُلھن جیسی تھی۔ گرد میں اٹی ہوئی تصویر کو اس نے رومال سے صاف کیا۔ نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں خوشی اور خفیے سے چمک اُٹھیں۔ ایک پل میں اُس کے جسم میں بجلی سی کوند گئی۔ کیوں؟ چوکھٹے میں یہ خود یاور ہی کی تصویر تھی۔ پچھلی برسات کا وہ دن اُس کے سامنے آ گیا سیلے دھیانی میں پڑوسی کے مکان میں اُس کا چلا جانا۔ پلٹنا۔ گر پڑنا اور تصویر کا وہیں رہ جانا ایسی باتیں تھیں جن کی یاد ایک پل میں تازہ ہو گئی۔ گہری نظر سے دیکھنے پر بھی تصویر اسے اپنی ہی معلوم ہوئی۔ چوکھٹا [illegible] تھا۔ اُس پر سنہری اور مومی نقش و نگار بھی وہی۔ پھر تصویر کو پہچاننے میں چوک کے کیا معنی۔

سامنے ٹھہر جانے والی کار اگر یاور کے کوٹ کی آستین [illegible] چھو جاتی تو شاید وہ ابھی کچھ دیر اور سوچ بچار کرتا رہتا۔ وہ سنبھلا اور تصویر کو بغل میں دبا کر اپنے دفتر کی طرف چل پڑا۔

"بندہ پرور!"

اُس نے دو قدم آگے بڑھ کر [illegible] سے آواز سُنی۔ [illegible] داڑھی میں تنکا۔ پھر کر دیکھا تو [illegible] جنگ [illegible] اس کی [illegible]

[illegible] اُس کے چہرے پر خیالت سی تھی۔ [illegible]
ی؟" اُس نے اپنے دل ہی دل میں کہا۔ "مگر اپنی ہی تو ہے۔" آپ
ہمت کر کے جواب بھی دے لیا۔ وہ اِسی الجھن میں تھا کہ ڈرائیو
دوڑتا ہوا اب پاس آچکا تھا بولا۔

"معاف کیجئے گا! تصویر (یاور کی بغل کی طرف اشارہ کر کے)
ی کار سے نکل پڑی تھی۔ یہ میری بھول تھی صاحب! وہ کچھ
لے جھکے اور بے تکے پن سے کہے جا رہا تھا۔ کچھ منٹ ہوئے میری
لک کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے۔ بہت دور سے اس کی تلاش
ں پھرا ہوں"

یاور ابھی تک اُس کا مُنہ تک رہا تھا اور اس سوچ
ں تھا کہ کیا جواب دے۔ ڈرائیور کے چپ ہونے پر بولا۔

"بھئی! تصویر تو میری ہے۔ دیکھو!" اتنا کہکر یقین دلانے
ے لئے تصویر کو ڈرائیور کے آگے بڑھا دیا جس نے اُسے ہاتھ میں
یا اور گھور کر دیکھا۔ اور پھر یاور کو اوپر نیچے دیکھا ——
ورت اور تصویر کو ملایا مگر کچھ تو یاور کا مطلب نہ سمجھ کر اور کچھ
صویر اور چہرے کے ایک ہونے پر چڑ چڑ ہو کر بولا۔

"تو جناب اس سے کیا ہوتا ہے؟ ایک صورت اور مورت کے
سیوں آدمی ہوتے ہیں۔ جناب عالی! خود میرے ہی نام کے ہمارے
لک کے تین کرایہ دار ہیں"۔

تصویر کو جواب ڈرائیور کے ہاتھ میں تھی —— یاور
ی کی چوک سے وہ للچائی نظروں سے تک رہا تھا اور کیوں نہیں
. وہ اس کی بے فکری اور فرصت کے زمانے کی ایک یادگار تھی۔
ور دوسرے وہ اس کی ایک چوک اور ندامت کی تصویر تھی
ور اگر ان تمام باتوں کو بھی جانے دیا جائے تو وہ ایک ایسی چیز
تھی جو اُسے پیاری تھی اور تھوڑی ہی دیر اُس کے قابو میں رہ سکی
تھی۔ [illegible]
[illegible]

[illegible] یقین دلائے اور اس کے سوا صورت کیا ہو سکتی [illegible]

یہ تصویر میری ہے جو میں نے پچھلے موسم میں [illegible]
میں .... وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ موٹر [illegible]
عورت کی آواز آئی جیسے کوئی جھنجلا کر بولے۔

"جعفر! میرے دستخط کیوں نہیں دکھا دیتا"۔

ڈرائیور نے جلدی سے نظر دوڑا کر تصویر کے قدموں کے
نیچے اشارہ کیا۔ باریک قلم سے لکھا تھا۔ "پارس" ابھی یاور کی
نگاہ دستخطوں ہی پر جمی ہوئی تھی۔ کہ جعفر نے تصویر اپنے قبضے [illegible]
اور چلتا بنا۔

یاور کے مُنہ سے ایک حرف بھی نہ نکل سکا۔ وہ ڈرا [illegible]
اس حرکت پر ایک پل کے لئے اس طرح کھڑا رہا جیسے ایک [illegible]
سینے میں گولی کھا کر کھڑا رہے۔ اُس کی نگاہ موٹر پر جمی ہوئی [illegible]
مگر ہر معمولی پرکھ والا بھی بتا سکتا تھا کہ اس کی نظر میں کچھ نہ تھا
یا یوں سمجھنا چاہئے کہ بے پلکوں کی دو آنکھیں ہیں اور ان کی [illegible]
میں سامنے کی نظر آنے والی تمام چیزیں سفید پہاڑ ہیں۔ اور بس
اس وقت اُس کی خفت کا کوئی حد حساب نہ تھا۔ عمر بھر میں [illegible]
یہ دوسرا دن تھا۔ اُس کے جی اور سمجھ کا حال اُس مسافر [illegible]
جیسا تھا۔ جو چلتے چلتے اُس چٹیل میدان میں آکر کھڑا ہوا [illegible]
سوچنے لگے۔ جہاں سے ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی [illegible]
پگڈنڈیاں اور رٹیاں پھٹتی ہوں۔

انہی اُلجھنوں میں یاور کے کانوں میں ایک قسم کی [illegible]
اور بے سُری بھنبھناہٹ سی آنے لگی۔ یہ موٹر کے چالو [illegible]
گھبرا اٹھا تھا۔ یاور چونکا۔ جس طرح کوئی گہری نیند [illegible]
آواز دی [illegible] اور [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] انگلستان جاتے ہیں۔ معلوم ہوا۔ اس [illegible] کو ٹلتے ہو۔ اگر نہیں تو میرا بچہ ہے۔ اُس کے [illegible] دار میں ہوں۔ تم مجھے اپنا ہی سمجھو۔ بھائی کے [illegible] پہلے اُن کے نکاح کا سامان کرو۔ یہاں سب کام ٹھیک ہو چکے۔ بس برات لانے کی تاریخ لکھ بھیجو۔ تمہارا کرم جاہ

ہونے والے خسر کا خط آنے پر یاور کی برات گئی۔ نکاح ہو گیا اور اس کے بعد ہی وہ انگلستان کو سدھارا۔

"مشرق مشرق ہی ہے اور مغرب مغرب" یہ ایک نفسیات کے ماہر کا نظریہ ہے نسبت اور نکاح مشرقی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی زندگی کی کتاب کا نیا ورق شروع ہونے والے رشتے اور لگاؤ ہیں ایک مشرقی نوجوان نسبت کے بعد ہی سے صرف اپنی ہونے اور آنیوالی بیوی ہی کو سارے جہان کے حسن اور خوبیوں کی جان سمجھنے لگتا ہے۔ یہی حالت لڑکیوں کی ہے۔ ہوتے ہوتے اگر نسبت ہو گئی ہے تو نکاح تک یا نکاح ہو چکا ہے تو رخصت تک ان دونوں (مرد اور عورت) کی باہمی دلچسپی عشق کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پچھلے میاں بیویوں کے جوڑوں میں محبت یہ اس حالت میں تھا جبکہ ہمدردی اور ہم خیالی پوری پوری پائی جاتی تھی۔ مرد آج کل کی طرح مانگ چوٹی کے غلام تھے اور نہ مخملی اور عورتیں نگار خانوں کی چٹک مٹک والی مالدار رکھیں اور بی۔ اے ایم۔ اے اور فرنگن نما۔ یاور بھی مشرقی تھا اور ہندوستانی۔ اُس کے جی میں بھی یورپ کی زہریلی تتلیوں کے بسنے کو کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کے من میں بسی اور سمائی ہوئی صرف اس کی بیوی تھی۔ لیکن اس کے دوست کے ایک خط نے اُسے پریشان کر دیا۔

دنیا بھر کے سادہ لوح اور جورو پرست یاور صاحب! تسلیم [illegible] پہلے ہی فقرے سے ماتھے پر بل ڈال لئے؟ تو پکڑ بیٹھے! [illegible] بات میں منہ بگاڑ لیا۔

[illegible] چاندنی "موہنی" تمہاری بیوی کے بنانے کا [illegible] [illegible] میں [illegible] تھا۔ وہ

برادری کی کنواری لڑکیاں [illegible] میں [illegible] چھوڑ چکی ہیں۔ ان کی نماز کی جگہ کا مرتبہ بڑے سے بڑے پیر صاحب سے [illegible] کسی طرح کم نہیں۔ آدھ گھنٹے برابر اس کی نماز اور وظیفے کا [illegible] کرنا پڑا۔ اتنے میں گھر کی ماما ایک بے نام کا لفافہ لائی۔ بھائی میری عادت شک کی بہت ہے۔ اسی لئے شک کر کے اُس خط کو [illegible] لیا۔ اُس میں کیا تھا؟ لو پڑھ لو۔

میری من موہنی بہن چاندنی! [illegible]

اللہ تمہاری عمر بڑی کرے۔ پھولو اور پھلو۔ پیاری بہن چاند کی ضرورت ہے۔ اللہ وہ مرادوں مانگا دن جلد لائے! مگر نہ میرا جیسا کہ ہوا اور کچھ نہ ہوا۔ تمنائیں مٹیں۔ منصوبے خوار ہوئے۔ اور ارادے خاک۔ تصویر ہے اور میں۔ یہی جی کی اک یادگار باقی ہے۔ رنج اور فکروں کے عذاب نے زار کر [illegible] اب تو یقین سا ہو گیا ہے کہ میری یہ خیالی دلچسپی جان لیوا ہو کر اب زندگی مجھے ایک ڈراؤنا درندہ معلوم ہوتی ہے۔ اور ایک مردہ شکار۔

چاندنی! خدا کے واسطے میرے لئے دعا کرو۔ دوسرا دعا قبول ہو جایا کرتی ہے۔ تم معصوم ہو۔ کنواری بھی ہو نمازی بھی۔ بہن دعا کرو کہ مجھے اپنے مالک کا منہ دیکھنا نصیب میری پیاری چاندنی! مجھے اُن سے محبت نہیں اور جو اپنے سوا کسی اور کا کلمہ پڑھے۔ خدا اسے زمین کا پیوند کر دے بس چاندنی بس! یہی دعا یہی الفاظ۔ اللہ تمہاری زبان سے اور مبارک کرا دے۔ دن بھر ہلکا بخار رہتا ہے۔ جی چاہتا مرتبہ تم سے ضرور مل سکوں۔ چاندنی! ہو سکتا ہے؟

تمہاری غم کی ماری بہن "یاور"

لیجئے یہ ہیں اُن کی رنگا رنگ کیفیتیں جنہیں تم پیار [illegible] محل کہتے ہو۔ بلا بیوی کے میاں جان سے جاتے تھے۔ یا بر قعے میں لپٹی ہوئی صورت چاہیے بعد میں وہ [illegible] کہیں نہ نکلے [illegible] آپ کی [illegible]

[illegible]

بلکہ سالم ایک عدد جناب کی بیگم صاحبہ ہیں کہ کسی اور ہی کا دم بھرتی اور اُسپر جان چھڑکتی ہیں۔ جب تک دوسرا خط پہونچے تم آچکو گے اس لئے باقی باتیں زبانی رہیں گی۔

تمہارا

محمد سعادت خاں

(۵)

پورے تین برس دیکھتے ہی دیکھتے گذر گئے۔ انیس کا انگلستان جانا کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ وہ واپس آگیا۔ مگر اس کا چہرہ اُترا اُترا سا تھا۔ بات کرنے میں روکھاپن۔ چال میں سستی اور مستعدی سے کوسوں دور۔ دوست اور پیارے انگلستان کا حال پوچھتے کہ وہاں سماج کی کیا حالت ہے۔ عُریانی کی کیا کیفیت ہے۔ کچھ معاشرت کا طرز تو بیان کرو۔ وہاں تمہاری شام اور راتیں کیسی گذرتی تھیں؟ لوگ معنی اور بے معنی سب ہی کچھ تو پوچھتے۔ مگر وہ اللہ کا بندہ جواب بھی دیتا تو واجبی سا اور بہت ہی متین بن کر۔ اب اُسے کسی دلی رنج اور سوچ کا شکار سمجھے جانے میں کیا کسر تھی۔ بیچارہ عجب اُلجھن میں پھنسا تھا۔

وہ کبھی کہتا کہ اِن گُنوں بھری بیوی کب منہ لگانے کے قابل ہے۔ ابھی میں ہی سوچ رہا ہوں کل سماج بھی ذلیل سمجھنے لگے گی پھر سوچتا کہ نہیں ابھی معاملہ اک طرفہ ہے اور گھر کی بات گھر ہی میں ہے۔ پہلے کسی طرح تہ کو پہنچ لینا اچھا ہے۔ کبھی اُس کے جی میں جنبی بست اتنی سماجاتی کہ سمجھ بوجھ اور سوچ بچار بھی کنارہ کر جاتے اور [illegible]تا کہ نہیں سعادت خاں بکتا ہے۔ اُمّ ہانی ——— کتنی مست [illegible]نکھوں والی۔ کیسی البیلی اور لمبے لمبے گیسوں والی۔ کسقدر پیار کے [illegible]ل بیوی ہے۔ بھلا ایسی نورس پر شبہ کرنا کون سی سمجھداری ہے [illegible]ری بھاوج نے کتنے یقین سے کہا تھا۔ کہ وہ بات کرتے وقت بھی [illegible]ں آنکھ نہیں ملاتی۔ یہ تو شرم کی نشانی ہے۔ شرمیلی لڑکی تو پوری [illegible]جی ہوتی ہے۔ سماج کے بندھن تو اُس کا زیور ہیں۔ اُمّ ہانی [illegible]ری بیوی ہے۔ وہ مجھ سے محبت نہیں بھی کرتی تو ضرور کرے گی [illegible]یک ساتھ جھنجلا کر کہتا۔ "ہونے دو! میں اُسے چاہتا ہوں اور [illegible] اتنا کہ مجھ سے جاہ کی جلنے لگے"۔ انہی بیچاپیچ میں

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی راتوں پر راتیں کالی کئے جا رہا تھا۔ کھوج لگانے کے لئے غریب نے بہتیرے ڈورے ڈالے مگر پتہ چلنا تھا نہ چلا۔ یہاں تک کہ ہار کر بیٹھ رہا۔ اور رخصت کا انتظار کرنے لگا دن اور ہفتے مہینے کے پھیر میں آگئے۔ مگر یاور کی اُلجھنوں میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ یہاں خسر کے اس خط سے جو اُس کے بھائی نے اُسے بھیجدیا تھا پریشانی اور ہو گئی۔

میرے عزیز! فلک منزل

مزاج پوچھوں کہ سلام کروں۔ اُمّ ہانی کی دن دونی بیماری سے سمجھ پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ کچھ نہیں سوجھتا۔ سماج کی رسموں پر اسوقت تو خاک ڈالو اور بھیّا! محمد یاور کو پرچہ دار کے ساتھ جیسے بنے فوراً بھیجدو۔ وہ بھی دیکھ جائے۔

تمہارا اکرم جاہ

خسر کا بلاوا۔ بھائی کی رضا اور اپنی پریشانیاں یاور کو سسرال لے ہی پہونچیں۔

(۶)

جس کمرے میں یاور نے قدم رکھا بغلی اور روشن تھا۔ تھوڑی دیر تک تو اُمّ ہانی اُسے نظر ہی نہ پڑی۔ وہ ایک پلنگ پر لیٹی تھی اور تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ وہ سر سے پیر تک کانپ رہی تھی۔ اُسکے زرد چہرے اور رُکے رُکے تیوروں میں ایک کشش تھی جو اثر کئے بغیر رہنے والی نہ تھی۔ بیمار پہلی ہی نظر میں یاور کو بہت بھلی معلوم ہوئی۔ اس کے سنوارے ہوئے کتابی چہرے میں چھوٹی اور ستواں ناک میں۔ بچوں کے جیسے رخساروں میں بیمار نرگسی اور نیم باز آنکھوں میں اور غم و غیرت سے نڈھال حلقوں میں ایک اچھوتی ادا تھی کمزوری اس کے جسم پر چھا رہی تھی۔ یاور کو اس کی حالت پہ بے انتہا ترس آیا۔ وہ اس کے پاس پہونچکر بولا۔ "لاج محل!" بیمار نے ان آنکھوں سے جن میں حسرت اور صدمہ ملا جلا ہو۔ یاور کے چہرے کو دیکھا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور یاور کے چہرے کو ایک مرتبہ پوری کوشش سے پلک اُٹھا کر دیکھنا چاہا مگر نہ دیکھ سکی۔ یاور نے اس کا ہاتھ [illegible] پڑا تھا۔ کسی بے جان چیز کی طرح اس کے ہاتھ میں آ [illegible] کچھ کوشش [illegible]

دیکھ رہی تھی۔ حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کے ہاتھ سے اس کی بیوی کا ہاتھ چھوٹ پڑا۔ یہ تصویر خود اُسی کی تھی۔ وہی جو کھٹا تھا اور وہی تصویر اسے فوراً ایک خیال آیا اور اس نے تصویر کے قدموں کے نیچے کچھ ڈھونڈھا۔ وہ وہیں لکھا تھا ـــــــ "اُمّ ہانی عرف پارس" فرق اتنا تھا کہ اب پارس سے پہلے اُمّ ہانی عرف اور لکھا تھا۔ وہ نام کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ حروف اُس کی نگاہ کے سامنے ناچنے لگے۔ یاور نے نگاہ ہٹا کر اُسے دیکھا۔ بیمار نہ جانے کب سے اس کی آنکھ ناک کو پڑتال رہی تھی یا تصویر سے ملا رہی تھی۔ اللہ ہی بہتر جانے۔

پارس نے مسکرانے کی کوشش کرکے کہا "معاف....."

مگر نہ کہہ سکی۔ اُس کے پیلے ہونٹ اس کے قابو میں نہ تھے۔ وہ پھر بولی "معاف کرنا........ نہیں مجھ سے بولا نہیں جاتا"۔ اتنا کہکر وہ چپ ہوگئی۔ یاور دری کے فرش پر گھٹنے ٹیک کر پلنگ کی پٹی کے پاس جھک گیا۔ اس نے ایسے لہجے سے جس میں رنج اور پیار دونوں ہوں کہا۔ "لاج محل!" اور سچ پوچھو تو وہ اس سے زیادہ کچھ کہہ بھی نہ سکتا تھا۔ اُس کا گلا بھر آگیا تھا۔ بیمار نے ایک مرتبہ پھر اپنی آنکھیں آہستہ آہستہ یاور کی طرف اُٹھائیں۔ آہ اِس نور میں لڑکی کی آنکھوں کو جسے عشق ہو کون بیان کرسکتا ہے؟ اُن میں اک التجا تھی۔ محبت تھی اور ستم یہ کہ درگذر کا سوال تھا۔ شعلے کی لپٹ جلتی ہوئی سوئیوں کی طرح یاور کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ اس کا گلا سوکھ گیا۔ وہ بیتاب ہو کر جھکا اور اپنے کپکپاتے ہوئے ہونٹ بیمار کے ہاتھ پر رکھدیئے۔

(۷)

سنتے ہیں کہ یاور کی لاج محل حکیم کی امید سے بھی بہت پہلے اچھی ہوگئیں۔ مگر ہمیشہ میاں اس کوشش میں رہے کہ سعادت خاں کا خط بیوی کے ہاتھ نہ لگنے پائے اور بیوی اس تاک میں رہیں کہ کسی طرح لے اُڑیں۔ اور ان کے سرتاج کو اُن سے چھیڑنے کا موقعہ نہ مل سکے۔ اس کا حال جو افسانہ بن چکا ہے بقیدِ حیات پھر کبھی۔

الفرے (سہاوری)

نورس

چند ادبی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین یوپی کے نہیں۔ ہندوستان کے مشہور ادیب حامد اللہ صاحب افسر کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔

ادبی مضامین لکھنا یا مضمون نویسی کرلینا فی زمانہ بچوں کا کھیل سمجھا جاتا ہے۔ لیکن افسر صاحب کے مضامین نرالی وضع کے ہیں یہ علم کا گنجینہ ہیں۔ مکمل ہیں۔ اور زبان۔ مطالب اور قوت عمل کے لحاظ سے قابل تعریف ہیں۔ اس کتاب میں ۱۶ عنوانات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ ہر عنوان دلچسپ اور مطالب اُس سے بھی زیادہ جاذب توجہ ہیں۔

اس پایہ کی کتابیں انگریزی میں تو بہت مل سکتی ہیں۔ لیکن اردو میں عنقا ہیں۔ اور جو ہیں بھی وہ نورس کے پایہ کی نہیں۔ یہ کتاب مدارس اور لائبریریوں کے لئے یوپی نہیں سارے ہندوستان میں رائج ہونی چاہئے۔

کتاب مجلد ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ اعلےٰ۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔ (عہ)

پچاس برس پہلے کی دِلّی

(از جناب افسر الشعرا حضرت آغا شاعر قزلباش۔ دہلوی)

یادش بخیر! اب سے چالیس پچاس برس پہلے ہندو۔ مسلمان بڑے پیار اخلاص سے آپس میں نہایت خوش وخرم رہا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتا تھا۔ میل جول کا یہ عالم تھا کہ شادی بیاہ میلہ ٹھیلہ۔ ماتمی۔ غمی۔ غرض دنیا کے ہر کام میں ایک دوسرے کی شرکت لازمی تھی۔ گویا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ جو کسی طرح قطع نہ ہوتا تھا راستہ گلی یا محلّے میں کبھی جب کوئی پاس پڑوسی ایک دوسرے سے مل جاتا تو کئی کئی منٹ تک آپس میں صاحب سلامت کے بعد ایک دوسرے کی خیر و عافیت بلکہ خانگی حالات کی پوچھ گچھ ہوا کرتی تھی "تمہارے گھر میں خیر صلاح ہے؟ بہن کیسی ہیں؟ پتاجی کس طرح ہیں؟ بال بچے تو اچھے ہیں؟ گذارے کی کیا شکل ہے؟" اگر خدا نخواستہ بیماری دکھی ہوئی تو ہر طرح ہر ممکن امداد سے ہاتھ بٹاتے اور بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے کام آتے۔

مثالاً ایک ۶۶ برس کا بوڑھا موجود ہے جو خدا کو حاضر و ناظر جانکر کہتا ہے کہ یہیں دلّی ہی میں موری دروازے کے قریب ایک تیلوں کی گلی مشہور ہے۔ جہاں ہم رہتے تھے۔ یہ مکان ہمارا ذاتی تھا الد صاحب باہر اپنی نوکری پر تھے۔ خاصا اچھا کھاتا پیتا گھر تھا۔ والد صاحب کے نہ ہونے کی وجہ سے کچھ رشتے کنبے کی مستورات ہی مل کر مرحومہ والدہ صاحبہ ہی گھر کا کام چلا لیا کرتی تھیں۔ مرد عورت کوئی گھر میں نہ تھا۔ باہر دو نوکر اور مامائیں و دائیں ہی تھیں۔ مگر نوکر پھر نوکر ہوتے ہیں۔ جو یکایک میں ۱۲ برس کی جان سا شدید بیمار پڑا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ پردہ دار عورتیں [illegible] بیبیاں سب کی سب گھبرا گئیں۔ اور اک پٹنک پتیا پجاری کوئی سمجھدار بڑا بوڑھا تو تھا ہی نہیں۔ اس لئے دن بدن میری حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ لیکن خدا کی شان! جسکو وہ جلائے اُسے کون مار سکتا ہے؟ ہمارے برابر ہی ایک عیسائی پادری صاحب رہتے تھے۔ جن کے گھر میں ایک ہندوستانی بی بی تھیں۔ ہماری ماما کی زبانی جو انہوں نے یہ واقعہ سنا تو دوسرے ہی دن وہ نیکدل بی بی صبح ہی صبح خود ہمارے گھر چلی آئیں۔ اپنی گاڑی منگائی اور مجھے لیکر اُس میں بیٹھ گئیں۔ اور خاص اپنے فیملی ڈاکٹر رام سنگھ سے جارجوع کی۔ قسمت کی خوبی! ڈاکٹر صاحب کا علاج مجھے راس آیا۔ اُنکی تشخیص دوا۔ دارو نے فوراً فائدہ کیا میم صاحبہ کی پیرو وڑی اور نگہداشت نے رفتہ رفتہ آخر میری جان بچالی۔ اور میں پھر لوٹ پیٹ کر اچھا ہوگیا۔ وہ دن اور آج کا دن جب تک وہ نیکدل بی بی زندہ رہیں۔ میں اُن کو ماتا۔ پادری صاحب کو پاپا اور اُن کے بچوں کو بھائی اور بہن کہہ کر پکارتا رہا۔ میری بہشتن والدہ صاحبہ کا تو یہ حال تھا کہ جب کبھی وہ میم صاحبہ ہمارے گھر آتیں تو وہ بیچاری ان کیلئے اپنی آنکھیں بچھانے کو تیار ہو جائیں۔ حالانکہ وہ ہندو دھرم تھیں۔ پادری صاحب عیسائی تھے۔ اور وہ ڈاکٹر رام سنگھ صاحب بھی عیسائی مذہب رکھتے تھے۔ یہ تھا اب سے چالیس پچاس برس پہلے کا میل ملاپ جبکہ ایک روپیہ کے ۳۰ سیر گیہوں پچیس سیر کا آٹا۔ من بھر کے چنے اور تین سیر کا وہ خالص گھی آتا تھا۔ جواب قیامت تک نصیب نہیں۔ سچ مچ ایک روپیہ کا آٹا اسوقت دو میاں بیوی پورے مہینے بیس روز تک کھا سکتے تھے۔ خالص دودھ۔ دہی۔ مکھن۔ تیل۔ لکڑی ڈنگری۔ ترکاری اور ساگ پات تو انغاروں ملتا تھا۔ ایک پیسے میں چار سودے ملتے تھے و صیلا۔ دمڑی ملاکر کوڑیاں تک چلتی تھیں۔ [illegible]

... دوکان پر جاکر دو تو ایک ادنےٰ کنجڑا تک آسے اٹھا کر پھینکدے گا
... وصفیکہ ملک پہلے سے اچھی ہے۔ آبپاشی کی بھی کثرت ہے مگر زمیندار
اور سرمایہ دار ہیں کہ غریبوں کو مارے ڈالتے ہیں۔ کسان غریب سے غریب تر
آن کے اثاث البیت۔ مال مویشی سب نیلام۔ وہ گرمی سردی کی سخت
اذیتیں سہہ کر بھی اب دو انچ زمین اپنی ملکیت نہیں بتا سکتے۔ نہ مٹھی
بھر غلے کو اپنا غلہ کہہ سکتے ہیں۔ قرضے کا بار ان لوگوں کی جانیں لئے
لیتا ہے۔ باوصفیکہ ریلیں جاری ہیں۔ ڈاک۔ تار۔ ہوائی جہاز
بجلی۔ ہزاروں قسم کے محکمے۔ ترقی پر ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن
خدا جانے یہ کیا فقیر کی دعا ہے۔ کہ ایک کروڑپتی سے لے کر ایک ادنےٰ
گھسیارا تک پریشان اور دل گرفتہ نظر آتا ہے۔ دستکار ہاتھ پر ہاتھ
رکھے بیٹھے ہیں۔ سیکڑوں بندگانِ خدا سڑکوں پر کیچڑ میں دو طرفہ فٹ
پاتھ پر درختوں کے نیچے۔ کمپنی باغ وغیرہ میں جگہ جگہ راتیں گذارتے
ہیں۔ اور کسی غریب کو پیٹ بھر کر چنے تک میسر نہیں۔ اسی دلّی میں
چشم دید ایک وقت وہ بھی تھا۔ جبکہ برسات کا موسم اپنی البیلی شان سے
آتا تھا۔ بادل گھرتے تھے۔ جہاں ذرا گرج اور کڑک ہوئی بس مور
الاپتے۔ کویل کوکتی اور شوقین جوڑے سیر کی ٹھیرا دیتے۔ چنانچہ لگاہوت
یا نگمبود دروازے کے پاس اک ٹوٹا کنواں ہے۔ اکثر اس قسم کی سیریں
ہوا کرتی تھیں۔ یہاں ایک دفعہ جمنا مائی خاص ٹوٹے کنویں کے
قریب بڑے زور شور سے بہ رہی تھیں۔ عین اسی وقت بہت سے
شوقین جوڑے۔ عورت مرد۔ حسین مہ جبین صورتیں اپنے خاص
خاص ہمجولیوں کو لے کر وہیں جا براجے۔ آن کی آن میں دریا کے
کنارے جھولے پڑ گئے۔ ایک طرف دیگیں کھڑکنے لگیں۔ دوسری
طرف زمین پر فرش بچھ گیا۔ کھانے پکنے لگے۔ تر ترکاریاں چھلنے لگیں۔
میوے دانے کی بہتات تھی۔ آم۔ جامنیں ہٹی پڑی تھیں۔ چرندم
خورندم ہونے لگا۔ اتنے میں یکایک کویل کی کوک کی طرح برابر سے
ملار کی تانیں اُڑنے لگیں اور کسی نے یہ گانا شروع کر دیا۔ ؎

کبھی ساون کی جھڑی اور کبھی بھادوں برسے
ایسا برسے میرے اللہ! کہ چھاجوں برسے

یہ اک متوالی جوگن اور بیراگی صاحب تھے جو آمنے سامنے
پاؤں جوڑے نہایت خوش گلوئی کے ساتھ یہی شعر الاپ رہے تھے۔ اور
جھولا جھولتے جاتے تھے۔ سب کے سب بت بنکر کھڑے ہو گئے۔ اور
دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ رہی۔ آہ! آہ! یا وہ سماں تھا یا آج اسی ٹوٹے
کنویں کے قریب کوئی جاکر دیکھے خاک اڑ رہی ہے۔ بچے۔ بوڑھے
عورت۔ مرد۔ جوانوں کی لاشیں آتی ہیں اور وہیں آن کا کریا کرم
ہوتا ہے۔

دلّی کی نہر سعادت خاں کا تو ذکر آپ نے ضرور سنا ہوگا
آہ! وہ نہر سعادت خاں اس اجڑی دلّی کی جان تھی۔ جان۔ جس
اب یہاں نام و نشان بھی نہیں۔ وہ تاریخی عجوبۂ روزگار ایجاد بہیر
موری دروازے کے پاس عین ڈفرن برج کے نیچے بہتی تھی۔ پل پر
کبھی سایہ دار تنا ور درختوں پر سے اس میں دوپہر کے وقت گدائیا
ہوتی تھیں۔ اور طرح طرح کے تیراکوں کے کمال دکھائے جاتے تھے
وہ نہر گرمیوں کے موسم میں غریبوں کی تفرج گاہ تھی۔ پل سے آگے بڑ
ملکہ کے باغ میں ہوتی ہوئی چاندنی چوک میں دورہ کرتی ادھر ا
قلعے میں جا نکلتی تھی۔ اس کے دونوں طرف چوڑی چوڑی پٹریاں
جنپر سودے والے۔ خوانچے والے۔ پھول والے۔ طرح طرح
آوازیں لگاتے تھے۔ مثلاً ککڑیاں بیچنے والا کہتا تھا" لیلیٰ کی
ہیں۔ مجنوں کی پسلیاں ہیں۔ کیا خوب ککڑیاں ہیں"۔ فالسہ و
لگاتا تھا" سالونے سلونے شربتی فالسہ"۔ سردے والا کہتا تھا
"من قاش فروشے دلِ صد پارۂ خویشم" بہرحال ایک میلا
تھا۔ سفید اور زرد چنبیلی۔ موتیا۔ مولسری کی لپٹیں۔ رستے
مہکاتی تھیں۔ بہشتی کٹورے بجاتے تھے۔ مگر افسوس اب یہاں
سعادت خاں کا نام و نشان تک بھی نہیں۔ وہ نہر پاٹ
سایہ دار درخت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر خال سے لگ گئے۔

یہ تاریخی نہر نواب سعادت علی صوبہ دار اودھ
تھی۔ جن سے تیموریہ سلطنت کا کوئی تاجدار عہد سخت نار
تھا۔ بلکہ اس نے نواب صاحب کا حاضر دربار رہنا بھی ممنو
دے دیا تھا۔ اسپر مہینوں کی کدو کاوش کے بعد صوبہ دار
درپردہ مقربانِ بارگاہ شاہی سے رسل و رسائل پیدا کئے

ا بالکسی طرح میری خطا بخشی ہو جائے۔

یکن وزرائے دربار نے ہر دفعہ انہیں یہ ہی جواب دے کر ل دیا۔ کہ جہاں پناہ آپ سے سخت برہم اور ناخوش ہیں۔ وقتیکہ آپ کوئی نادرِ روزگار۔ نہایت قیمتی تحفہ نہ پیش کریں گے بیل منڈھے چڑھنی معلوم۔

آخر نواب اودھ نے چاروں طرف سے مایوس ہو کر بکلخت اموشی اختیار کر لی۔ جو سالہا سال تک رہی۔ مگر اسی مدت میں انہوں نے معتمدانِ خاص اور کارکنوں کو ملا جلا کر بصرفِ زرِ کثیر نہایت خفیہ ر پر اسی نہر کو زیرِ زمین تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ جو شدہ شدہ ایک ماہی دریا سے قبل جو کسی عید کے موقع پر دلّی ہی میں ہونے والا تھا۔ نہایت اخفا اور خوبی کے ساتھ آخر آخر اتمام کو پہنچ گئی۔ اور کسی کو نوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ کہتے ہیں بس جونہی کہ وہ تہوار یا عید کا ن قریب آیا۔ نواب سعادت علی خاں خود چھٹے دم دلّی آموجود ہوئے۔ اور اپنے خفیہ کارکنوں کے ذریعے وزرائے دربار سے پیام و سلام کیا۔ بلکہ یہ بھی گذارش کر دیا کہ میں اپنے وعدے پر حاضر ہوں۔ ر جہاں پناہ کے لئے وہ نادر روزگار تحفہ بھی ساتھ لایا ہوں۔ نانچہ کچھ دن بعد وہ عید آئی۔ دربار بھی ہوا۔ ملکوں ملکوں کے سفرا ی پیش ہوئے۔ عین اسی وقت جہاں پناہ سے عرض کیا گیا کہ وہ دیرینہ معتوب صوبیدار اودھ یعنی نواب سعادت علی خاں بہادر حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ وہ تحفہ بھی حاضر لائے ہیں۔ حکم ہوا حاضر کیا جائے!

چونکہ نواب کی حاضری اور نادرِ روزگار تحفے کا غلغلہ اب م ہو چکا تھا۔ اس لئے تمام اُمرا۔ وزرا اور حاضر باش سب ہی مشتاق تھے۔ وزیر اعظم نے نواب کی حاضری ... بس اُدھر نواب نے دربار میں قدم رکھا۔ اِدھر نقیب ... لگائی۔

"نواب سعادت علی خاں بہادر صوبہ دار اودھ حاضر ... حضورِ جہاں پناہ صاحبقرانِ اعظم نگاہ روبرو"

مگر دیکھتے کیا ہیں کہ نواب خالی ہاتھ مجرا گاہ پر بھی پہنچ گئے سات بار تسلیم بھی بجا لائے۔ اور اسی طرح خالی ہاتھ آگے ہی آگے بڑھے چلے آتے ہیں۔ اب تو وزیر اعظم کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ حاضرینِ دربار بھی ششدر رہ گئے۔ لیکن صوبیدار دلیرانہ آگے بڑھے اور پایۂ تخت کے قریب پہونچکر جہاں بادشاہ کے قدم تھے بس وہیں جھک کر اور ایک آہنی حلقے پر ہاتھ رکھ کر باواز بلند انہوں نے یہ لفظ ادا کئے۔

"جہاں پناہ کی عمر دراز۔ دوست شاد۔ دشمن پامال۔ یہ خطاوار گنہگار غلام حسب وعدہ ایک کنیز حضور کے پاؤں دُھلانے کو حاضر لایا ہے"

اتنا کہہ کر جبکہ تمام دربار حق حیران اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے اسی آہنی حلقے کو زور سے اوپر کو کھینچ لیا۔ معاً فوارے کی طرح پانی اچھلا اور بادشاہ کے قدموں پر آپڑا۔ اس وقت جہاں پناہ نے مسکرا کر اپنے پاؤں وہاں سے ہٹا لئے۔ اور تمام دربار صورتِ تصویر بن گیا۔

(آغا شاعر)

غم نصیب

(سوویٹ حکومت کا ایک بہترین افسانہ)

(حاجی محمد صادق - صادق ایوبی جرنلسٹ ڈیرہ غازیخاں)

مجھے فخر ہے کہ میں لیونڈ لیناف کو پہلی بار اردو کی بزم ادب میں متعارف کر رہا ہوں۔ لیونڈ لیناف کی ولادت ۱۸۹۹ء میں ہوئی۔ آپ کا مولد و منشاء شہر ماسکو ہے۔ لیناف ایک چابکدست مصور ہے۔ جو انسانی فطرت کی تصویر اپنے تخیل کے موقلم سے کھینچ سکنے کے علاوہ جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی پر بھی کامل قدرت و دستگاہ رکھتا ہے۔ لیناف پر قدامت پسندی غالب ہے۔ اس لئے آپ کی افسانہ نگاری میں عموماً دیہات کے ادنےٰ طبقہ کی زندگی کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ اس واقعیت و حقیقت نگاری کے لئے آپ عوام میں زیادہ مقبول نہیں ہیں کیونکہ بولشویک عظمت حالیہ کے دلدادہ ہیں۔ اور ذلت ماضیہ کے اعادہ و بیان کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ اب کچھ مدت سے لیناف کے آرٹ کو اُن لوگوں نے جو ذوق سلیم کے سچے لذت شناس سمجھنا شروع کیا ہے۔ لیناف تازہ واردان ادب میں سے ہے ۱۹۲۲ء سے آپ نے نثر نگاری شروع کی ہے۔ اس سے قبل آپ ایک شاعر کی حیثیت سے ملک میں روشناس تھے۔ لیناف کے اسلاف کسان تھے آپ کو ڈوسٹکی اور گوگول کا حریف و ہمنوا سمجھنا غلطی ہے۔ آپ کی تصانیف میں طباعی۔ آنچ۔ ندرت۔ پائی جاتی ہے۔ یہ خوبیاں آپ کو صحیح طور پر چیخوف کا جانشین قرار دیتی ہیں۔

(صادق ایوبی)

احسان ابھی چھوکرا تھا کہ ایک روز اُسے کھیت میں کام کرتے ہوئے بچھو نے آلیا تھا۔ جس سے وہ سوکھ کر کانٹا ہوگیا اور ریپی سامنہ نکل آیا۔ آخر وہ ہلکان ہو کر رسان رسان گرتا پڑتا۔ مصیبت بھرتا۔ لکڑی ٹیکتا اپنی [illegible] کے پاس جا پہنچا۔ [illegible] نے دفعیہ بخار کے لئے زیادہ مقدار میں کونین دیکر [illegible] تندرست تو ہو جاؤ گے مگر تمہارا بہرہ ہو جانا یقینی ہے۔ [illegible] اس روگ اور کسالے سے چھٹکارا [illegible] نے اُسے جھگڑوں سے [illegible] چھٹ کر [illegible] مزدوری اور بیری [illegible]

دنیا اُس کے خیال میں ساکت و صامت تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ تو درکنار اُسے بادل کی گرج تک سنائی نہ دیتی تھی۔ احسان کیلئے دنیا میں انسانیت غائب غلہ تھی۔ کیونکہ لوگ اس کی مزدوری مار لیتے تھے۔ وہ ایک بڑھئی تھا مگر فاقہ کش۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے اس کی عمر کا بیشتر حصہ فاقے میں تیر ہو چکا تھا۔ اس پر بھی بستی کا [illegible] بے رحم مُلّا اس کی مزدوری مار لیا کرتا تھا۔ بیچارہ سارا [illegible] پی کر۔ لہو پانی ایک کر کے۔ قبریں کھود کر شام [illegible] پلے نہ پڑتی۔ حالانکہ گورکن کو منہ [illegible] مزدوری [illegible]

...کہتے تھے۔ ایذائیں دیتے تھے۔ اوزار تالاب میں پھینک دیتے تھے
یا مجال کہ وہ اُف کرے یا موذیوں کو کوسنا دے۔

کوڑھ میں کھاج۔ مفلسی میں آٹا گیلا۔ نامراد احسان حسینہ پر جان سے فدا تھا۔ محبت کے اس کھٹراگ نے اُس کا اور بھی پتلا حال کیا تھا۔ اس ناکام محبت کے پاس حسینہ کا ایک رومال تھا۔ جب ...ئی ایام سے گھبرا اٹھتا تو اس نشانی سے دل بہلایا کرتا تھا۔ یہ رومال ...کے لئے ایک ڈھارس تھی۔ بستی کے لڑکے رومال کو دیکھ کر مضحکہ اڑاتے ... آوازے کستے تھے۔ مگر احسان ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ دنیا بھر ...اس کا کوئی نہ تھا۔ صرف ایک لنگڑی ناٹھی پھوپھی تھی جو ہمدرد ...ار تھی۔

اب وہ اپنا دکھڑا سنانے کے لئے اُدھر کا رخ کر رہا تھا۔ اُسکی ...بھی ایک بستی میں جو چند فرسخ کے فاصلہ پر واقع تھی ایک مُلاں کے ...خادمہ تھی۔ وہ ایک پاکدامن و باحیا عورت تھی اس لئے لوگ اُسے ...م" کہتے تھے۔ احسان عموماً مریم کے پاس جا نکلتا تھا۔ وہ اُس کی خوب ...بی اور غمخواری کیا کرتی تھی۔ احسان غم غلط کر کے اپنے مسکن کو ...آیا کرتا تھا۔ اسی معمول نے جان رکھ لی تھی۔ ورنہ فرطِ الم نے ...کب کا مٹا دیا ہوتا۔

جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ دنیا پر عذاب طاری ...۔ فوجی نقل و حرکت جاری تھی۔ ہر نیا دستہ فوج احسان کی بستی سے ...رتا تھا۔ کیونکہ بستی برسر راہ واقع تھی۔ ہر روز شام کو احسان ...دوری سے فارغ ہو کر۔ تھکا ہارا۔ اوزاروں کا پشتارہ اٹھائے ...ٹے فوجیوں سے دوچار ہوتا تھا۔ سپاہی اس کے لئے ہوّا نہ تھے ... فوجیوں کو دیکھ کر دیہاتیوں کے اوسان خطا ہوتے ہیں۔ ...نے لوٹ کھسوٹ شروع کر دی تھی۔ ... کھسوٹ سے ... لگے ... ڈرتا ... احسان کے گھر میں ... [illegible]

کہ اس کے گھر کی جھلکتی ہوئی روشنی اس کے ضمیر ... حسینہ کا خیال رہ رہ کر چٹکیاں لے رہا تھا۔ حسینہ ایک ... لڑکی تھی۔ اُس کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ ایک مرجھائی ہوئی فلاکت ... اور بے آب و رنگ صورت سے شادی کر لے۔ وہ اس امر کا کھلے بندوں اظہار بھی کر چکی تھی۔ جب احسان اس سخت و سنگین حقیقت سے آگاہ ہوا تو اُس نے حسینہ کے رومال کو جسے وہ حرزِ جان بنائے ہوئے تھا پھوپھی کو دیدینے کا ارادہ کر لیا۔ تاکہ وہ تیوہاروں پر اسے استعمال میں لا سکے۔

طیور اپنا آخری راگ ختم کر چکے تھے۔ موذن اذان دے چکا تھا۔ جس کی گونج تک فضا میں فنا ہو چکی تھی۔ دھندلکے میں احسان نے مُلا کے مکان پر پہنچ کر دستک دی۔ اُس کی پھوپھی کی بجائے مُلا کی بیٹی نے جواب دیا۔ کسی مجہول کیفیت نے احسان کا کلیجہ برما دیا۔ اس کے دل کی دنیا ہل گئی۔ اس نے اپنی ٹوپی کو ہاتھ میں لے کر لڑکی کو گھورا۔ نازک دل لڑکی احسان کی ہیئت کذائی دیکھ کر ڈر گئی اور بے اختیار ہو کر چیخ اٹھی۔ اُس کی چیخ سنکر مُلا باہر نکل آیا۔ وہ بھونڈے لباس میں تھا۔ اور جھنجھلا کر بولا کہ "مدت سے ہم مریم کو مٹی دے چکے ہیں۔ تمہارے کھیے اک زمانہ ہو چکا ہے۔ وقت پر اس کی مٹی عزیز کرنے آئے ہو—؟"
پھر سر کھجلا کر کہا۔ کہ سامنے اُس کا مدفن ہے۔ احسان کے دل پر ایک بجلی سی گری اور اس کے ہوش کھو گئے۔ حواس فقر و ہو گئے۔ اب دنیا میں وہ بالکل کس مپرس تھا۔ نہ نام لیوا نہ پانی دیوا تھا۔ پھر اس نے ہکلاتے ہوئے مُلا کو سلام کیا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے اُسکی پھوپھی کا صندوقچہ رکھا تھا۔ اور کواڑ کے قریب اس کا ڈنڈا ... تھا جسے اٹھا کر اس نے کندھے پر ڈال لیا۔ پھر وہ رومال نکال ... حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ زبان بند تھی۔ حلق ... لبوں پر پپڑی بندھی تھی۔ اور جی بھرا ہوا تھا۔ رومال ... تھا۔ ... [illegible]

…ذریعے تھا۔ سر چھپانے کو کوئی گوشہ کد راتک نہ تھا اور …میں واپس جانا بھی محال تھا۔ راستہ پر خطر تھا۔ آخر اُس نے بڑی تلاش و تجسس کے بعد رات کاٹنے کے لئے ایک بیوہ بھٹیاری کا گھر تاڑ لیا۔ اس بستی میں نشہ پانی کا استعمال عام تھا۔ ہر چھوٹا بڑا شراب کا رسیا تھا۔ بیوہ جھٹ احسان کے لئے لذیذ شراب لے آئی۔ اسی اثنا میں ایک مدھم سی چیخ سنائی دی۔ بیوہ نے کان لگا کر کہا کہ "ظالم حاکم پھر اپنی بیوی کو زدوکوب کر رہا ہے"۔

اتنا کہکر بیوہ نے محسوس کیا کہ احسان کو اونچا سنائی دیتا ہے۔ پھر وہ اُسے دانتوں سے اٹھا کر کمرہ کے اندر لے گئی۔ اور بولی کہ "ابھی غریب خانے کو اپنا گھر جانئے۔ یہاں کسی کیل کا کھٹکا نہیں —— ذرا کھل کر بیٹھو"۔

چراغ کے نزدیک پرانی پٹاری پر ایک موٹے جھوٹے کپڑے کی شرخ صدری پڑی تھی۔ جس میں لمبے لمبے شلنگے بھرے ہوئے تھے۔ سیب کے چھلکے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے جنہیں بیوہ نے اکٹھا کرکے کمرے کے باہر پھینک دیا۔ بیوہ مہمان کی دلداری و دل آسائی کیلئے ہر کوشش صرف کرکے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ احسان نے شراب ڈھال کر چھلکتے ہوئے پیمانے میں اپنا عکس دیکھا۔ عکس سیاہ تھا جسطرح اُس کا بخت سیاہ تھا۔ پھر تیوری چڑھا کر شراب پینے لگا۔ اُسے بادہ کشی کے آداب و مسائل یاد نہ تھے۔ کہ وہ ساقی گری کی ضرورت محسوس کرتا۔ فوراً دوسرا جام بھر کر رکھدیا اور جھجک کر کچھ زیر لب کہا۔ بیوہ نے یہ تیور دیکھ کر کہا کہ خدا کے واسطے یہ رونا جھینکنا بند کرو۔ پیمانہ و ساغر سامنے دھرا ہے مگر زبان نہیں کھلتی........ کوا بھی اپنے آشیانے میں منقار زیر پر نہیں رہتا۔ مگر تم ہو کہ دم بخود ہو........"

اس نوک جھوک سے بیوہ نے احسان کو ابھارا۔ وہ اُسے پھسلانا چاہتی تھی —— "تمہاری آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہیں..... عورت ایسی آنکھوں کو قطعاً نہیں چاہتی۔ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو تجھے گھر سے نکال دیتی۔ کیونکہ عورت ہرگز ہرگز کسی تنگ مزاج اور ترش رو مرد کو … نہیں کرتی —— "

… چراغ کی لو ٹمٹماتے رہا۔

اُسے ریجھانا پھسلانا اور رنگ پر لے آنا مشکل تھا۔ بیوہ مہر و محبت باتیں کرکے پشیمان ہو رہی تھی۔ احسان کے جذبات سراسر مردہ تھے وہ بیوہ کی جانب ملتفت نہ ہوا۔ حالانکہ وہ ہر ممکن ترغیب سے کام لے چکی تھی۔ احسان شراب کا عادی نہ تھا۔ اُسے کچھ گٹھرے کی چڑھ گئی اور وہ رہ رہ کر ہنکارنے لگا۔ بدمستی میں وہ خالی الذہن نہ تھا۔ اُس کی پھوپھی کا صندوقچہ اُس کے ذہن میں تھا۔ جوش مستی میں وہ ایک لڑکھڑا کر اُٹھا اور ایک پتھر اُٹھا کر اُسے خوب کھینچا۔ اس اوچھے پن … اُس نے محسوس کیا کہ درودیوار اُس کا مضحکہ اُڑا رہے ہیں ——

آخر وہ نشہ میں چور ہو کر پڑ رہا۔ رات بھر گھنا ؤنے خواب دیکھتا رہا۔ بیوی کی امیدیں منقطع ہو چکی تھیں۔ احسان کی گرہ میں مال بھی نہ تھا۔ کہ وہ ہتھیانے کی آس رکھتی۔ اُس کا ڈھیر ناخسارے کا سودا تھا۔ بیوہ نے گجردم اُس کے شانے ہلا کر اُسے نیند سے بیدار کیا۔ احسان جمائیاں لیتا ہوا۔ بے کیفی کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا اور فوراً ہی … سحر کے بعد گھر کی راہ لے لی۔ دل اندھا ہوا تھا۔ کل کل ٹوٹ رہی تھی۔ جوڑ جوڑ چٹخ رہا تھا۔ اور سر کا چکر چلنے سے مانع تھا۔ مگر احسان نشم نشم آنکھیں بند کئے برابر بڑھتا چلا گیا۔ عالم بڑا سہانا تھا۔ اس کا دل ٹھہر گیا۔ دماغ کام کرنے لگا۔ اور وہ لہرا کر کچھ گانا چاہتا تھا۔ ناگہاں ایک پھونس کے جھونپڑے پر نظر پڑی اور وہ چپ ہو گیا۔ ایک بڈھا ٹڈا راہ روک کر بولا کہ "اے قفلے کے مارے! یہاں سے اُڑنچھو ہو جا ورنہ دھر لیا جائے گا۔ رات ایک گھوڑا چوری ہو گیا اور پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے"۔

بڈھا احسان کے گھر گھاٹ کو جانتا تھا۔ احسان صدموں کا جان کاہ دبا کر چلتا تھا۔ اب دوپہر ہو چکی تھی۔ احسان کی آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ پیٹ پیٹھ سے لگ چکا تھا۔ راستہ میں فوج کا دستہ ملا۔ احسان نے ٹیلے پر چڑھ کر بستی پر نگاہ ڈالی تو ایک جم غفیر نظر پڑا۔ وہ اِسے کوئی جھنجھٹ سمجھ کر دوڑا۔ وہاں پہنچکر تو آنکھ کا کاجل چرانے والا ہٹنڈا و مستنڈا لوہار سپاہیوں کے نرغے میں تھا۔ لوہار بال باندھا چور تھا۔ ہیکڑی سے چوری کرنا اُس کا شیوہ تھا۔ جس کی دھاک و دبدبہ رنگ تھی۔ وہ آج اس نہ تھا کہ …

انصاف کے پتلے فرید نام ایک شخص نے اعیانِ مجمع سے مخاطب ہو کر کہا کہ مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔ اب اس کی وہاں گردن ماریئے جہاں پانی نہ ہو۔ ورنہ یہ ذات شریف ہمارے گھروں میں جھاڑو پھیر دے گا۔ دیکھو تو سہی یہ دھو یا دیدہ کیسا خوش خوش نظر آتا ہے ——— حالانکہ ہیکڑ سے ہیکڑ مجرم بھی شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے دیدوں کا پانی ڈھل چکا ہے۔ اب کوئی دم میں جیلخانہ کی ہوا کھائے گا۔ تو تمام مشٹنڈہ مردی غائب غلّہ ہو جائے گی اور مغز کے کیڑے جھڑ جائیں گے ———"

یہ سنکر لوہار کے پاؤں سے لگی سر میں بجھی۔ اُس نے بیڑی کا کش لے جواب دیا کہ "میں خمیازہ بھگت لوں گا۔ میری تو لوہے کی چھاتی ہے ——— !"

لوہار فرید کی گردن ناپ لیتا مگر بے بس تھا۔ فرید قابو میں آتا تو وہ اس مردار کی کُتر کُتر کرتی جیب گدی سے کھینچ لیتا۔

فرید نے دانت پیس کر کہا۔ کہ مردود! اب تجھے لینڈی کتے کی موت ماریں گے ——— لینڈی کتے کی ———"

اسی اثنا میں ولی کھونچڑ نے جس کی آنکھوں میں ذرا سیل نہ تھا مجمع سے سر نکالا۔ ولی بتولے بنانے میں طاق تھا۔ اپنی چرب زبانی کے باعث وہ ایک پختہ کار اور صائب الرائے شخص تسلیم کیا جاتا تھا۔ بستی والے اس کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے۔ اُس نے آگے بڑھ کر یہ شوشہ چھوڑا کہ لوہار قطعاً مجرم نہیں ہے۔ شہر میں اونٹ بدنام کا معاملہ ہے۔ گھوڑا کسی اور نے چرایا ہے۔ لوہار کو قید کرنے سے پہلے ہمیں اپنے گھوڑے کاٹ کے رکھ دینے چاہئیں ——— پتھر پڑیں اس سمجھ پر۔ ساری بستی میں صرف ایک لوہار ہے جو گھوڑوں کی نعلبندی کرتا ہے۔ پھر یہ شخص گھوڑوں کے جملہ امراض کا ماہر بھی ہے ——— خدارا ذرا مطلب کی گھات چلو۔ اس میں کس کا نقصان ہے ——— ؟"

ولی نے احسان پر نظر ڈال کر کہا۔ کہ بستی میں چار بڑھئی موجود ہیں۔ ہم [illegible] کے ساتھ ایک [illegible] کر سکتے ہیں۔ لوہار کے بدلے بڑھئی [illegible] ———

[illegible] بدلے میں آ گئے۔ انہوں نے آنکھوں پر پٹی باندھ [illegible] احسان کے گلے میں ڈالنے پر تُل گئے۔ ادھر احسان [illegible] بھرے عموماً ایسا ہی کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی معاملہ فہمی کی [illegible] رکھتے ہیں۔ مجمع پر سکوت طاری تھا۔ احسان کو معاً خیال [illegible] جانب متوجہ ہیں۔ اسی لئے وہ شرما گیا۔ آنکھ کا جادو مشہور ہے [illegible] نڈر بھی جھینپ جاتا ہے۔

وہ یتیم تھا۔ غریب تھا۔ بے کس تھا۔ بے نوا تھا۔ اس کا [illegible] لاگو نہ تھا کہ اس کی لاگ لپیٹ کرتا۔ اس کا کوئی کھونٹا نہ تھا کہ [illegible] کودتا ——— وہ مجرم تھا۔ کیونکہ اس کے بارے میں [illegible] کوئی نہ تھا۔ بے رحم برادری اُسے مجرم گردانے پر تُل چکی تھی۔ [illegible] زبردستوں پر ہاتھ صاف کر سکتے ہیں۔ امیر غریبوں پر ظلم ڈھا سکتے ہیں۔ زبان تراش بے زبانوں پر آفتیں توڑ سکتے ہیں۔ احسان منہ [illegible] ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بتوجہ کر قربانی دینے کے لئے تیار ہے۔ [illegible] غریبوں کو جراُت کی دایہ دودھ دھارتی ہے۔ اس کی بے [illegible] تھی مگر بستی والوں کے دل پک چکے تھے۔ وہ مقدس جذبہ رحم [illegible] میں ودیعت کیا گیا ہے۔ مفقود ہو چکا تھا۔ اور شقاوت [illegible] ظالم ضمیر کا خون کرنے پر تُل چکے تھے۔ اب خدا [illegible] نچوڑنا تھا۔ ایک بڈھے کھوسٹ نے جو احسان کے قریب [illegible] کہا کہ "احسان مان لو ہماری یہی خواہش ہے۔ اب اس سے [illegible] محال ہے ———"

عزیز نے آنکھوں پر ٹھیکری رکھ کر کہا کہ قوم کی [illegible] کرو۔ ہم تمہیں اپنی اولاد کی طرح کھلائیں گے اور [illegible] جمع رکھو ———"

اس پر تمام مجمع نے صاد کیا۔ گو بے [illegible] احسان [illegible] نہ پوچھا اور ٹکر ٹکر دیکھا کیا۔ اب [illegible] سراسر متوجہ تھے۔ حالانکہ [illegible] احسان حیران [illegible] بستی والے [illegible]

...ب ایک پھانس ہوتا ہے جو رہ ... ہے۔ عشق ایک خار ہوتا ہے۔ جو رہ رہ کر آنکھوں ... پھانس اور کانٹا نکالے بغیر چین نہیں آتا۔

بیچارہ احسان ایک مسرت افروز استعجاب کے ساتھ ... کر رہا تھا کہ اہلِ قریہ شاید اسے پُرسا دینے آئے ہیں —! مجمع کھیت سے نکل کر بستی کے قریب پہنچا تو بستی کے لڑکے ... لڑکیاں احسان کو حقارت آمیز رحم کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ پھر دو مسلح سپاہیوں نے اُسے حراست میں لے لیا۔

ہوا آہیں بھرنے لگی۔ فضا مغموم ہو گئی۔ مظلوم احسان نے جھاڑی سے پتہ توڑ کر انگلی سے صاف کیا۔ اور اُسے مٹھی میں بند کر کے سونگھا — تبسم اس کے لبوں پر کھیلنے لگا۔ خوشی سے نگاہیں بول اٹھیں گویا اس کی پھوپھی کا صندوقچہ اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ اِس یاد نے اُس کے دل میں سیکڑوں سوئیاں بھونک دیں اور زردیاں چہرے پر کھنڈ گئیں — "حسینہ کو میرا آخری سلام کہنا!"

یہ تھا پیامِ محبت جو غم نصیب احسان کی زبان سے نکلا پھر وہ خاموش ہو گیا۔ جس طرح فطرت خاموش اور بے زبان ہے۔ احسان کی اس خاموشی اور بے زبانی میں ہزاروں افسانۂ درد متکلم و گویا تھے۔

....

(ترجمہ بہ تصرفِ کثیر)

(صادق ایوبی جرنلسٹ)

جگر پارے

(از جناب جگر مرادآبادی)

اُف وہ روئے تابناک چشم تر میرے لئے — ہائے وہ زلفِ پریشاں تا کمر میرے لئے
جوشِ غم جوشِ حیا آغازِ عشق احساسِ حسن — کشمکش سی کشمکش آٹھوں پہر میرے لئے
کچھ تجاہل کچھ تغافل کچھ توجہ کچھ غرور — رات دن میرے لئے شام و سحر میرے لئے
سر سے پا تک آہ وہ اک پیکرِ حسنِ حزیں — چار جانب دیدۂ حسرت نگر میرے لئے
عشوہ عشوہ منظرِ حسن و جمال رنگ رنگ — جلوہ جلوہ دعوتِ ذوقِ نظر میرے لئے
ہر نفس میں ایک دنیائے محبت نو بنو — ہر نظر میں اک پیامِ تازہ تر میرے لئے
سامنے آتے ہی آتے وہ تنفس تیز تیز — سینۂ شفاف وہ زیر و زبر میرے لئے
وہ رُخِ رنگیں پہ انوارِ محبت زرد زرد — وہ لبِ نازک پہ طوفانِ شرر میرے لئے
حیف وہ لغزیدہ لغزیدہ قدم میری طرف — ہائے وہ دزدیدہ دزدیدہ نظر میرے لئے
شبنم آلودہ وہ آنکھیں وہ گلاب افشاں جبیں — وہ دھڑکتا دل وہ گھبرائی نظر میرے لئے
سرد سرد آہوں میں تاثیرِ محبت گرم گرم — خشک خشک آنکھوں میں جوشِ اشک تر میرے لئے
ہائے وہ رنگین رُخ وہ سیمیں تن و زریں کمر — ہائے وہ لعلیں لب و سلکِ گہر میرے لئے
... نگاہ نازنیں وہ ہلکی ہلکی ...یں — معنیٔ بے لفظ و شرحِ مختصر میرے لئے
... وہ فطرت وہ مرا تمکین ہوش — وہ شکستِ حسن وہ نیچی نظر میرے لئے
تا جگر کے واسطے ہوں اور جگر میرے لئے

اصلاحات ۱۹۱۹ء

جدید اصلاحات

(از جناب گپتا۔ ایم۔ اے۔ سونی پت)

لارڈ مونٹیگو کے اعلان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پارلیمنٹ نے ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کیا۔ ان اصلاحات کا نفاذ ہندوستان میں ۱۹۲۱ء میں ہو گیا تھا۔ موجودہ نظام حکومت ان ہی اصلاحات کے تحت مرتب ہوا ہے ان اصلاحات کی خصوصیت یہ تھی کہ ہندوستان میں خود مختاری حکومت کی بنیاد پڑی۔ خواہ خود مختاری کتنی ہی محدود کیوں نہ تھی۔ جیسا کہ قسط اول میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ ہندوستانی خواہاں تھے کہ ان کو خود مختاری حکومت حاصل ہو جائے۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے کانگریس مسلم لیگ نے ایک مشترکہ رپورٹ تیار کی تھی لکھنؤ میں ہندوستان کی ہر دو اہم جماعتوں نے باہم میثاق بھی باندھا تھا مگر برطانوی جن کا صدیوں کا مفاد ہاتھوں سے جا رہا تھا کس طرح راضی ہو سکتے تھے تاکہ ہندوستانیوں کو خود مختاری حکومت دیدی جائے۔ اسی بنا پر ہندوستانی مطالبہ کی سر توڑ مخالفت کی۔ لیکن حکومت برطانیہ مونٹیگو کے اعلان کی روشنی میں قدم پیچھے نہ ہٹا سکتی تھی۔ اس لئے پارلیمان نے ان مخالف نظریوں کی درمیانی راہ اختیار کی یعنی ہندوستان میں دو عملی حکومت قائم ہو گئی۔

دو عملی حکومت کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستانی حکومت دو حصوں میں تقسیم کر دی جائے۔ کچھ حصہ پر سرکار برطانیہ پہلے کی طرح با اقتدار رہے ان معاملات کو غیر منتقل قرار دیا گیا۔ اور کچھ معاملات پر ہندوستانی حاوی ہو گئے۔ جو منتقل امور کہلائے ... وہ پر کوشاں تھے کہ ہندوستانیوں کو ان امور پر قدرت عطا فرمائی ...

جن پر وہ آسانی سے حاوی ہو سکیں اور جو ان کے لئے وسیع میدان تجربہ مہیا کر سکیں۔ لیکن جن میں ناتجربہ کاری کی بنا پر اگر غلطی ہو جائے تو اس کا ازالہ بآسانی ہو سکے ان شرائط کو مد نظر رکھتے ہوئے مرکزی حکومت کا تمام انتظام غیر منتقلہ معاملات کی فہرست میں شمار ہوا۔ کیونکہ مرکزی حکومت کے پاس اول تو اہم معاملات تھے۔ مثلاً فوج۔ خزانہ۔ سکہ درآمد برآمد ریلوے ڈاکخانہ وغیرہ وغیرہ جن کے انتظام میں غیر معمولی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اور جہاں خفیف ترین غلطی تمام ملک میں انتشار پیدا کر سکتی ہے اور دوسرے مرکزی حکومت کا کام صوبوں پر نگرانی رکھنا تھا اس کے لئے بھی تجربہ و دانشمندی کی ضرورت تھی لیکن ہندوستانی فن حکومت سے اسوقت نا آشنا محض تھے۔ مسلم حکومت کی بربادی کے بعد ہندوستانیوں کا کام خدمات سرانجام دینا رہ گیا تھا۔ نہ کہ حکومت کرنا اس لئے ان پر حکومت کا بار ڈالدینا خطرہ سے خالی نہ تھا۔

اس لئے صوبے خود مختار حکومت کے تجربہ گاہ قرار دئے گئے صوبوں میں بھی یہی سوال پیدا ہوا اس لئے صف اول میں لگان زمین۔ عدل و انصاف پولیس۔ مالیات وغیرہ وغیرہ اہم صیغہ جات رکھ لئے گئے اور دوسری فہرست میں تعلیم۔ زراعت آبپاشی۔ ہسپتال۔ لوکل سیلف گورنمنٹ وغیرہ درج کئے گئے۔ موخر الذکر امور منتخب شدہ ممبران کونسل ... ان کی تنظیم و ترقی کا بار ان کے کندھوں پر رکھ دیا گیا ... دیا گیا کہ وہ وزراء سے ان امور کے متعلق ... کر ...

[illegible] کرسکتی تھیں۔ وزرا پر کونسلوں کو [illegible] کی غرض سے وزرا کی تنخواہ بھی کونسل کی رائے پر منحصر رہی [illegible] وزیر سے ناراض ہوجائے تو وہ اس کو تنخواہ دینے سے انکار [illegible] وزیر کو مجبور کر سکتی تھی۔ کہ وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہوجائے [illegible] پر کونسل کو مکمل اختیار حاصل تھا۔ گورنر عموماً وزراء کونسل کے [illegible] میں دست اندازی نکرتا تھا۔ لیکن اگر وزیر کوئی ایسی تجویز رواج دینا [illegible] جس سے صوبہ کا امن خطرہ میں ہو یا مرکزی حکومت کے اختیارات یا فرائض پر ضرب لگے یا دوسرے صوبوں کی حق تلفی ہو۔ تو گورنر دخل دے سکتا ہے۔ اور اس حالت میں وزیر کو ایسی تجویز سے دست بردار ہونا پڑتا ہے یا اپنے عہدے سے مستعفی۔

لیکن اول الذکر امور کا انتظام کا ذمہ دار گورنر تھا اور اس کی امداد کے لئے ایک کونسل مقرر کی جاتی تھی جس کے ممبر مختلف شعبوں کے صدر ہوتے تھے اور ان کے انتظام کے ذمہ دار۔ لیکن یہ ذمہ داری گورنر سے متعلق تھی۔ کونسل ان معاملات میں کسی پر کوئی قرارداد پاس کردے۔ لیکن یہ قرارداد بمنزلہ سفارش کے ہوتی تھی۔ یعنی گورنر خواہ اسے منظور کردے یا نامنظور رہنے دے۔ گورنر کا یہ حق غیر منتقلہ امور کی ترکیب میں پنہاں تھا جب وہ ان امور کے انتظام کا گورنر جنرل سکریٹری آف سٹیٹ اور اس کی وساطت سے پارلیمنٹ کا جوابدہ تو ضروری ہے کہ اسے اختیار بھی ہو کہ ان امور میں اپنی حسب منشا کام کرسکے۔ کونسل[1] میں گورنر صدر ہوتا ہے۔ اور عموماً کثرت رائے پر عمل کیا جاتا ہے۔ لیکن گورنر کو اختیار ہے کہ بربنائے ضرورت کثرت رائے کے خلاف عمل کرے۔

چونکہ کونسل[1] میں منتخب شدہ ممبران کی کثرت قائم کی گئی اور یہ ممبر رائے دہندوں سے منتخب ہوتے تھے۔ اس لئے رائے دہندگان صفات ایسی قرار دی گئی کہ زیادہ سے زیادہ اشخاص رائے دہندگان بن سکیں۔ اگرچہ دوعملی میں فرض [illegible]

[1] [illegible] کونسل سے مراد گورنر کی کونسل ہے۔ جس کے تمام ممبر نامزدہ ہوتے ہیں جو مختلف [illegible] کے صدر ہوتے تھے۔ یہ ممبر کونسل [illegible] واضع قوانین کے ممبر بھی ہوتے ہیں [illegible] منتخب شدہ ممبران [illegible]۔ بلکہ یہ ممبران عملاً غیر منتخب ممبران [illegible]

حکومت دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی اور حصہ کی ذمہ داری [illegible] اور متضاد خیال کے لوگوں کے کاندھوں پر رکھدی گئی۔ لیکن خزانہ [illegible] مشترکہ ہے یعنی ذرائع آمدنی تقسیم نہیں کی گئی۔ صوبہ کی کل آمدنی ایک ہی جگہ جمع کی جاتی ہے اور مشترکہ ملکیت ہے۔ شروع سال میں وزرا اور کونسل کے ممبر متحدہ فیصلہ کرتے ہیں کہ منتقلہ و غیر منتقلہ صیغہ جات میں کس تناسب سے رقم تقسیم کیجائے۔ اگر کسی وجہ سے وزرا اور ممبران کونسل کسی فیصلہ پر قائم نہ ہوسکیں تو گورنر کو اختیار ہوتا ہے کہ حسب ضرورت دو حصوں میں روپیہ تقسیم کردے۔ گورنر کا فیصلہ آخری اور ناطق ہے اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھا سکتا۔ ممبران کونسل کو تو احتجاج کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ جو بار ان کے کاندھوں پر ہے اس کی حقیقی ذمہ داری گورنر پر ہے اور ان صیغہ جات کی تنظیم کا گورنر ہی جوابدہ ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ گورنر حتی الامکان اپنی ذمہ داری کے بار کو ہلکا بنائے۔ اور دوسروں پر اپنی ذمہ داری ڈالدے اور ہر حالت میں غیر منتقلہ صیغہ جات کی ضروریات اس کے پیش نظر رہیں گی۔ البتہ وزرا کو بسا اوقات شکایت رہتی ہے کہ ان کو اپنی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کا موقعہ نہیں دیا جاتا کیونکہ ان کے پاس روپیہ کی کمی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پندرہ سالہ دور حکومت کے بعد بھی تعلیم معمولی چند سے زائد نہیں اور حسب منشا اضافہ نہیں ہوا۔ ہسپتال اور صفائی کا کوئی انتظام نہ ہوسکا۔ دیہات کی ضروریات میں کوئی عمدگی نہ پیدا کر سکا۔ دوعملی کے دور میں صیغہ مالیات غیر منتقلہ صیغہ تھا۔ اس کی تنظیم ممبر مال کے سپرد تھی اور ہر وزیر اپنی مجوزہ تجویز ممبر مال کے پاس بھیجتا تاکہ صیغہ مال اسکو مالی حالت کے متعلق مشورہ دے سکے۔ مگر صیغہ مال [illegible] تجویز کو نہ محض مالی نگاہ سے پرکھتا تھا۔ بلکہ اس کی پالیسی پر بھی رائے زنی کرتا تھا۔ گو وزیر مالیات کے مشورہ کا پابند نہیں تھا۔ اور اسے رد بھی کرسکتا تھا۔ لیکن ممبر مالیات کی رائے کو ٹھکرانے کے بعد اسکو روپیہ حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کے لئے اب یہ راستہ رہ جاتا تھا کہ وہ گورنر کے پاس جائے اور اس سے خصوصی رضامندی حاصل کرے۔ لیکن یہ قریباً ناممکن تھا۔ کیونکہ گورنر غیر منتقلہ صیغہ جات کی تنظیم کا ذمہ دار تھا اس حالت میں صیغہ مال کی رائے کو کیسے ٹھکرا سکتا تھا۔ نیز بعض صیغہ جات کی [illegible] ممبر مال کے سپرد تھی۔ قدرتاً وہ اپنے صیغہ جات کی ترقی [illegible]

ہندوستانی مدبر ہمیشہ اس امر پر زور دیتے رہتے ہیں۔ کہ صیغہ مال کسی منتخب شدہ کونسل آئین ساز ممبر کے سپرد ہونا چاہئے لیکن جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے ہندوستانی ابھی فن حکومت میں نو آموز کی حیثیت رکھتے تھے کسی اہم صیغہ کو ان کے سپرد کر دینا خالی از خطرہ نہ تھا۔ اس لئے صیغہ مالیات غیر منتقلہ صیغہ رہا

مرکزی حکومت کے نظام پر روشنی ڈالنے سے قبل صوبہ جاتی حکومت کا ایک اور پہلو پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ کونسل آئینی و قانون سازی کے ممبروں میں کثرت منتخب شدہ ممبرونکی ہوتی ہے۔ اور ۳۰ فیصدی سے زیادہ نامزد ممبروں کی تعداد نہ ہوسکتی تھی۔ جن میں کچھ سرکاری اور کچھ غیر سرکاری آدمی ہوتے تھے۔ کونسل کا صدر کونسل خود منتخب کرتی تھی۔ کونسل کو بجٹ کے کافی حصہ پر رائے زنی کا حق حاصل تھا۔ اور غیر منتقلہ صیغہ جات پر وہ پوری طرح حاوی ہوتی تھی۔ ان کی پالیسی کو جس سانچے میں چاہتے ڈھال سکتے تھے اور وزرا کو ان کے عہدوں سے خارج کر سکتے تھے۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ کونسلوں نے اپنا کام حقیقی توجہ اور دلچسپی سے انجام نہیں دیا۔ ہندو مسلم سوال ایک حد تک ممبروں کو مشترکہ لائحہ عمل پر کاربند ہونے سے روکتا تھا۔ سرمایہ پرست اپنے مفاد پر مزدور پیشہ لوگوں کو قربان کرتے رہے۔ نامزدہ ممبروں نے صورت حالات اور بھی خراب کر دی۔ وزرا نے قوم کی آواز پر چلنے کی بجائے گورنر کے اشارہ پر ناچنا پسند کیا۔ نامزدہ ممبروں کی ۳۰ فیصدی رائے اس حالت میں مل سکتی تھی۔ بعض لوگوں کو مذہبی طعن سے شریک کیا جاسکتا تھا۔ سرمایہ پرست اور رجعت پسند اصحاب بھی ان لوگوں کے ساتھ ملجاتے تھے۔ اس طرح پر وزیر نامزدہ ممبرونکی خوشنودی حاصل کرکے چند سرمایہ پرست اور رجعت پسند اصحاب بھی ان لوگوں کے ساتھ ملجاتے تھے۔ اس طرح پر وزیر نامزدہ ممبرونکی خوشنودی حاصل کرکے چند سرمایہ پرست اور رجعت پسندوں کی خوشامد کرکے اور چند مذہبی متعصبین کو بڑھا کر با اختیار بن سکتے تھے۔ کونسل کے منتخب شدہ عوام کے نمائندوں کی ان کو مطلق پروا نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ عوام کے نمائندے مختلف جماعتوں مختلف خیالات اور مفاد کے پیرو تھے۔ اس لئے ان کا کسی ایک مرکز پر متفق ہونا ناممکن تھا۔ وزرا اس لئے ان لوگوں کی مطلق پروا نہ کرتے تھے۔ اور دو عملی دور اسی لئے ناکامیاب ہوا اگر وزرا حقیقی طور پر وزرا ہوتے۔ اگر ملک و قوم کا مفاد ان کے پیش نظر ہوتا۔ اگر مذہب کو سیاسیات سے الگ کرکے وہ اقتصادی مفاد کو ہی اپنی بنیاد بنالیتے تو ممکن تھا۔ کہ ہندوستان کہیں زیادہ ترقی کر چکا ہوتا۔ مگر خود غرضی نے کام خراب کیا۔ کیا ہندوستانی مدبرین اس تجربہ سے سبق لیں گے؟

مرکزی حکومت کے ایوان قانون ساز میں کثرت منتخب شدہ ممبران کی تھی۔ اور اسمبلی کو کسی حد تک بجٹ پر رائے زنی کا حق بھی حاصل تھا۔ مگر کوئی صیغہ خاص طور پر ان کے زیر اہتمام نہیں رہا۔ ماسوائے بجٹ پر رائے دہندگی کے جس پر کونسل آف سٹیٹ اور اسمبلی کو یکساں اختیار تھے۔ کوئی تجویز اس وقت قرار داد نہ بن سکتی تھی۔ جب تک کہ ہر دو ایوان متفق نہ ہوں۔ افتراق کے وقت دو ایوانوں کا مشترکہ اجلاس کیا جاسکتا تھا۔ اور یہ فیصلہ ناطق ہوتا۔ مگر گورنر جنرل نے ایسا کوئی موقع نہیں دیا۔ اور عموماً متنازعہ امور اپنی رائے سے فیصل کر دئے گئے۔

گورنروں کی انتظامیہ کمیٹی کونسل کی طرح گورنر جنرل کی مدد کیلئے بھی ایک کونسل مقرر کی جاتی ہے۔ جس کے ممبر مختلف صیغوں کے صدر ہوتے تھے۔ گورنر کی طرح گورنر جنرل بھی اپنی کونسل کا صدر ہوتا تھا۔ اور عموماً ہر امر کا فیصلہ کثرت رائے سے کیا جاتا ہے۔ مگر گورنر جنرل کو اختیار ہے کہ اگر اسے ضرورت محسوس ہو تو کثرت رائے کے خلاف احکام جاری کرے یہ حق گورنر جنرل کو ۱۷۸۶ء میں دیا گیا تھا۔ جبکہ لارڈ کارنوالس نے ہسٹنگز کے حشر سے سبق لے کر زور دیا تھا۔ کہ گورنر جنرل کا عہدہ قبول کرنے سے پیشتر اسے اپنی کونسل پر کامل اقتدار دیا جائے۔ تاکہ وہ حسب منشا تنظیم سلطنت کر سکے۔

گو مرکزی حکومت کے جملہ دفاتر امور غیر منتقلہ ہیں اور ۸۵ فیصدی بجٹ پر بھی ایوان واضع قوانین کو رائے زنی کا حق نہیں لیکن نئے دور کی فضا اس امر کی مقتضی تھی۔ کہ مرکزی حکومت میں بھی کچھ تبدیلیاں کی جائیں جو لارڈ مونٹیگو کے اعلان کا لفظی و معنوی مقصد تکمیل تک پہنچا سکیں۔ اس کیلئے مدبرین برطانیہ نے ایک جدید طریقہ اختراع کیا۔ گو قانونی لحاظ سے اسمبلی کو گورنمنٹ کی پالیسی پر اثر انداز ہونے کے لئے کوئی حربہ نہ ملا تھا۔ لیکن عملی زندگی میں اس کی کمی چند مراعات سے کی گئی۔ یعنی چند ایسی روایات پیدا کی گئیں۔ جن سے ہندوستانی مدبرین اقتصادی و مجلسی زندگی پر اثر ڈال سکیں۔ ان میں سب سے مشہور اور ... اقتصادی آزادی

تھی یعنی ہندوستانی مدبر ہندوستانی اقتصادی پالیسی کو مرتب کر سکتے تھے اس رویہ کے ماتحت محفوظ محاصل تعمیر کئے گئے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستانی صنعت کو فروغ دینے کے لئے آمد پر اتنے محاصل لگائے جائیں کہ ہندوستانی صنعت ان کا مقابلہ بآسانی کر سکے۔ لیکن برطانیہ اشیا کو خصوصی مراعات بخشی گئیں۔

جیسا کہ پہلی قسط میں معلوم ہو چکا ہے کہ سیکریٹری آف سٹیٹ کو اختیار کامل حاصل تھا۔ یا بالفاظ دیگر وہ سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ ہر امر کے لئے اس کی منظوری ضروری تھی۔ مگر یہ اختیارات و آزادی کی سپرٹ دو متضاد چیزیں تھیں۔ اس لئے ضروری ہوا کہ سیکریٹری آف سٹیٹ کے وسیع اختیارات پر قیود بند لگائی جائے۔ لیکن چونکہ سیکریٹری آف سٹیٹ پارلیمنٹ کا نمائندہ تھا۔ اور اسی کو جواب دہ ہوتا تھا۔ اس لئے اس کے اختیارات پر قید لگانا پارلیمنٹ کے اختیارات پر قید لگانے کے مترادف ہے۔ مگر پارلیمنٹ کے اختیار پر کوئی آئینی قید نہیں لگائی جا سکتی کیونکہ یہ اصول کے خلاف ہے اس لئے مصنفان مونٹیگو رپورٹ نے سیکریٹری آف سٹیٹ کے اختیارات تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سیکریٹری آف سٹیٹ کے اختیارات آئندہ وہی ہوں گے جو ۱۹۱۹ء سے قبل اسے حاصل تھے۔ مگر صوبجاتی حکومتوں کے منتقلہ صیغہ جات میں اسے دخیل ہونے کا حق نفی کے مساوی ہے وہ ان کے اعمال میں خصوصی حالات میں ہی دخل دے سکتا ہے۔ غیر منتقلہ صیغہ جات میں بھی اگر کونسل اور حکومت کسی امر پر متفق ہوں تو سیکریٹری آف سٹیٹ روایتی طور پر دخل نہیں دے سکتا۔ لیکن حکومت اور نمائندہ ممبر ان متفق ہی کب ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں کا زاویہ نگاہ جداگانہ ہے۔ اور دونوں کا نصب العین الگ ہے۔

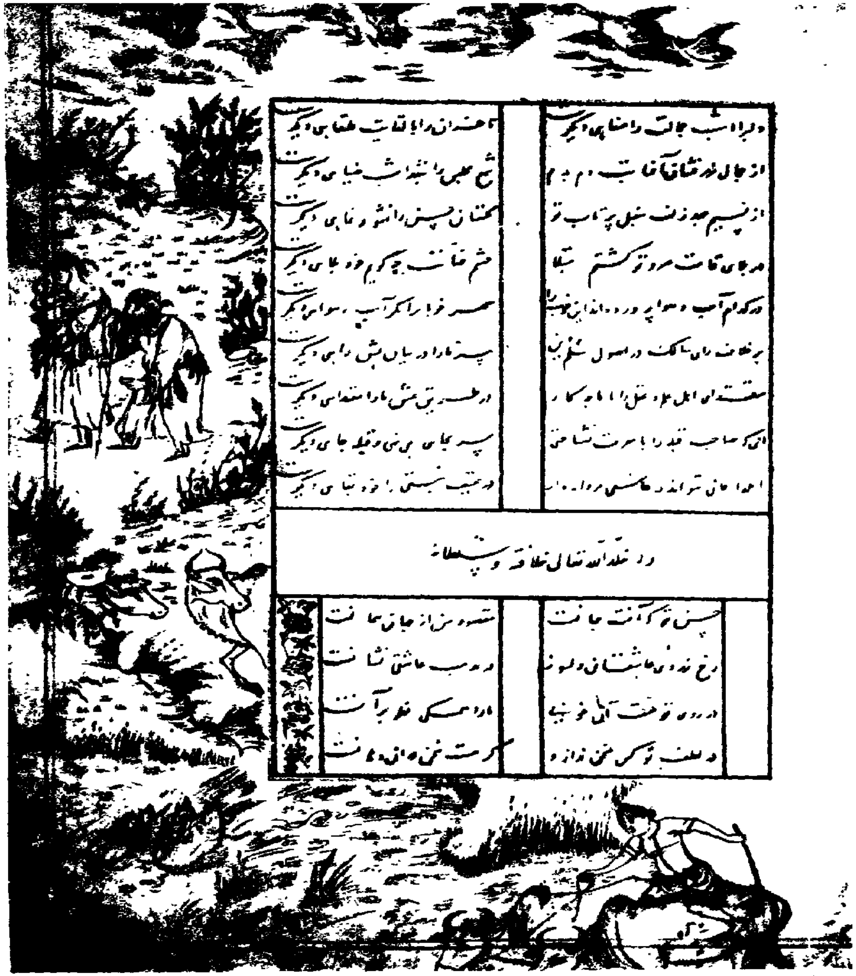
مرکزی حکومت کے ایوان واضع قوانین میں نمائندہ ممبروں کی کثرت ہے لیکن وہ کسی امر کے ذمہ دار نہیں۔ رائے دہندگان سے وہ کہہ سکتے ہیں کہ گورنمنٹ نے ان کی تجاویز قبول نہیں کی ایسی حالت میں ہم کیا کریں یہ جانتے ہوئے کہ حکومت کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر نہیں پڑ سکتی وہ بہ اطمینان حکومت کے نظم و نسق میں مداخلت کر سکتے ہیں ان کے بجٹ کے جس حصہ کو چاہیں نامنظور کر دیں جو قرار چاہیں پاس کر دیں اگر حکومت وقت کو ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑے اور ان کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہ ہو کہ جس سے وہ اپنے فرائض کی انجام دہی اپنی مرضی کے مطابق کر سکیں اور پر جو ذمہ داری عاید ہوتی ہے وہ اس کو کسی طرح بھی نہیں ہٹا سکتے۔ فرائض کی انجام دہی کے لئے آئینی دو حربہ ان کے سپرد کر دیئے گئے۔ حر[بہ] وہ اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے غیر موافق قرار داد کو نامنظور کر سکتے یہ اختیار اصطلاح میں ویٹو کہلاتی ہے۔ یعنی اگر گورنر جنرل محسوس کرتا [ہے کہ] کسی قرار داد سے نظم و نسق ہند خطرے میں ہے۔ تو وہ اس قرار داد کو نا[منظور] کر سکتا ہے۔ دوسرے ذریعہ سے گورنر کو اختیار ہے۔ کہ اسم[بلی] کونسل آف سٹیٹ کسی ضروری قانون کو پاس کرنے سے انکار کر د[یں] کسی بجٹ کے حصہ کو منظور کرنے سے منحرف ہو جائیں۔ جس کے بغیر حک[ومت] اپنے فرائض کو انجام نہیں دے سکتی۔ تو گورنر جنرل اس قانون کو اپنی پاس کر سکتا ہے۔ اور اس حصہ بجٹ کو منظور کر سکتا ہے۔ اور اس صو[رت میں] وہ قانون بن جاتا ہے اور مطلب پوری ہو سکتی ہے۔

لیکن یہ دونوں ذرائع اسوقت استعمال کئے جا سکتے ہیں [جب] اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ با جلاس ہوں اور وہ کوئی ایسا قانون [پاس] کریں یا رد کریں۔ جس کی گورنمنٹ مخالف یا موافق ہو۔ لیکن اگر د[ونوں] ایوان بہ اجلاس نہ ہوں۔ اور ملک میں ایک ایسی صورت حال پ[یدا] ہو جائے کہ خصوصی ذرائع کی ضرورت محسوس ہو اور روزمرہ کے صورت حالات پر قابو پانے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں۔ اس وقت گو[رنر] جنرل کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ مناسب قانون خود نافذ کرے اور [یہ] قوانین اصطلاح میں آرڈیننس کہلاتے ہیں۔ اور چھ ماہ تک قانون کی [طرح] نافذ رہتے ہیں۔ چھ ماہ بعد گورنر جنرل ان قوانین کو دوبارہ اسی صو[رت] میں نافذ نہیں کر سکتا۔ البتہ دوسری صورت میں رد و بدل کر کے جا[ری] کر سکتا ہے۔

ہندوستانی سیاسی ناقد گورنر جنرل کی ان غیر معمولی اختیارا[ت پر] ہمیشہ نکتہ چیں رہے ہیں۔ مگر ان کی نکتہ چینی دراصل مروجہ آئین کے [خلاف] ہے۔ کیونکہ جب ہم ایک مرتبہ اس اصول کو تسلیم کر لیں کہ ہندوستان[ی] نظام حکومت صوبوں میں دو عملی ہوتا ہے۔ اور مرکز میں غیر ذمہ دار پھر ہم کسی [ان] اختیارات کو ناجائز قرار نہیں دے سکتے کیونکہ کھلونے کی شکل وہی ہو گی [جو] ڈھانچہ کی فطرت میں منقش ہے۔ تصویر کی صورت خاکہ کے مشابہ ہو[گی]



محبوب
خوشبودار بے ضرر بال صفا پوڈر
ہر جگہ کے زاید اور غیر ضروری بال اتارنے کیلئے
ہمارے تیار کردہ بال صفا پوڈر
محبوب
کی ایک شیشی منگوا کر دیکھیے۔ یہ پوڈر
تمام رائج الوقت پوڈروں میں
قیمت فی شیشی علاوہ محصولڈاک۔ قیمت تین شیشی





نمائش فنون ایرانیہ کے صدعاں دو تصاویر -

نمائش فنونِ ایرانیہ

(جملہ حقوق محفوظ)

(از جناب ڈاکٹر سید یمین ہاشمی - ایل - ایل - بی - ایم - اے - پی - ایچ - ڈی - (لندن)

گو نمائش فنون ایرانیہ کو منعقد ہونے پورے پانچ سال ہو گئے - لیکن جہانتک مجھے علم ہے اسکے متعلق کوئی تفصیلی مضمون ہندوستان کے کسی رسالہ یا اخبار میں شائع نہیں ہوا - میں نے مندرجہ ذیل صفحات میں جو توضیح و تفصیل دی ہے اور جس زاویہ نظر سے اس نمائش پر روشنی ڈالی ہے وہ یقیناً مفید ہے - اس قسم کے تحقیقی مضامین مشکل سے دلچسپ ہو سکتے ہیں - طوالت بھی ان کی ایک خصوصیت ہے - میں نے حتی الوسع دونوں نقائص سے بچنے کی کوشش کی ہے -

جسوقت یہ نمائش لندن میں ہو رہی تھی - میں اسی زمانہ میں وہاں بہ سلسلہ تعلیم مقیم تھا - لندن یونیورسٹی نے مجھے بہ حیثیت متعلم ادبیات فارسی اس نمائش میں کام کرنے کی ہدایت کی - اس نمائش کے ختم ہونے کے بعد یونیورسٹی نے مجھے اس کام پر مامور کیا - کہ میں ہندوستان میں گشت لگا کر ان قلمی نسخوں کی فہرست مرتب کروں - وہ معلومات جو میں نے نمائش میں حاصل کیں اوسپر ہندوستان کی "سیر و تفریح" نے کافی اضافہ کیا - مجھے امید ہے کہ ارباب مذاق اس سے لطف اندوز ہوں گے -

یوں تو نمائش کا ہر حصہ قابل توجہ و لائق بیان تھا - لیکن میں نے اس کے صرف دو شعبوں کے مطالعہ میں وقت صرف کیا - انکی بابت میں نے جو کچھ رائے قائم کی وہ ہدیہ ناظرین ہے - مضمون کے آخر میں چند ضمیمہ جات بھی شامل ہیں - ضمیمہ (الف) میں نایاب و نادر الوجود کتابوں کی مختصر فہرست ہے - اس فہرست میں چند ایسی کتابیں بھی شامل ہیں - جو دیگر خصوصیات کے باعث قابل الذکر ہیں - ضمیمہ (ب) میں مشہور مخصوص شبیہ و تصویر کی فہرست ہے - ضمیمہ (ج) میں خوشنویسوں اور کتب نویسوں کی فہرست شامل ہے - میں نے ہر نام کے ساتھ سنہ حیات درج کر دیا ہے - آج اکثر فارسی کے قلمی نسخوں کی تاریخ صرف اس لئے معین نہیں کی جا سکتی کہ ان کے لکھنے والوں کا زمانہ حیات معلوم نہیں - یہ فہرست اس غرض کے لئے بے حد مفید ہے - میں نے یہ فہرست یورپ کی متعدد فہرستوں سے تیار کی ہے - ضمیمہ (د) میں چند مشہور مصوروں کے نام درج ہیں - جن کا زمانہ حیات معلوم ہو سکا وہ درج کر دیا گیا ہے - ضمیمہ (ر) میں چند متفرق اشیاء کا ذکر ہے جو تاریخی و ادبی حیثیت سے اہم ہیں میں نے بغرض زینت احمد جلائری کے دیوان کے ایک صفحہ کا عکس اور جہانگیر کی ایک نایاب شبیہہ کا عکس بھی شامل مضمون کر دیا ہے - (سید یمین ہاشمی)

مصوری

ایرانی مصوری خداداد مرصع نگاروں کا تمثیلی عمل ہے - گو اسمیں فطرتی جذبات کا اظہار تقریباً مفقود ہوتا ہے لیکن قصص و حکایات کی تمثیل بے مثل ہوتی ہے - اس کا سر قدرتی مناظر کے سامنے کبھی خم نہ ہوا - اس لئے کہ دنیا دی جاہ و حشم ہمیشہ

ہ اس کے سامنے سر بسجود رہے + (لارنس بنین)

جو تصویریں نمائش میں موجود تھیں ان کے دیکھنے سے ظاہرہ ہوتا معلوم ہوتا تھا کہ ایرانیوں کو مصوری سے بہت کم شغف رہا ہے - قدرتی مناظر کی تقریباً مفقود تھیں - قصص و حکایات کو مصور کرنے کی بہت زیادہ کوشش کی تھی - اس کے بعد درجہ اول تصویروں کا تھا - جو ایرانیوں کے مذہب شبیہہ

مختلف رخ پیش کر رہی تھیں۔

لیکن میں نے اپنی تحقیقات نمائش کی چار دیواریوں میں ہی محدود نہ رکھی۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے کتب خانوں کے بیش قیمت ذخائر دیکھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ ایرانیوں کو مصوری سے قدرتاً مناسبت تھی۔ لیکن اندرونی و بیرونی اثرات نے اس ذوقِ فن کی ہمت افزائی نہ کی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ رہا کہ ایرانی اس فنِ لطیف میں کوئی غیر معمولی اور نمایاں ترقی نہ کر سکے۔

اصول دعویٰ نبوت پر اگر غور کیا جائے تو ایران کی مثال دنیا میں یکہ و تنہا ہے۔ آدم سے رسول عربیؐ تک دنیا میں کسی مدعی نبوت نے فنِ مصوری کو اپنا معجزہ قرار دے کر نہیں پیش کیا۔ لیکن یہ فخر مانی کو حاصل ہے۔ چونکہ مدعیانِ نبوت کے اسنادو معجزے ہمیشہ ملکی مذاق کے مطابق رہا کئے ہیں۔ اس لئے اگر میں یہ نتیجہ نکالوں تو بیجا نہ ہوگا کہ ایرانیوں کی سازِ زندگی میں مصوری کے لطیف نغمات بہر صورت موجود تھے۔ جسوقت مانی نے ملک کے سامنے اپنا "معجزہ" پیش کیا۔ اس وقت ایران کی فضا اس کے استقبال کے لئے ہمہ تن آمادہ تھی۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس کے اعلانِ نبوت کے وقت (تیسری صدی عیسوی) دنیا کے کسی حصہ میں یہ مذاق صحیح طور پر رائج نہ تھا۔

مانی اپنے مقاصد میں ناکامیاب رہا اور اس کا نام دنیا کے کامیاب پیغمبروں کی فہرست میں کبھی بھی شامل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس غیر معمولی ہستی کی ناکامرانی ایرانیوں کی بد مذاقی پر کبھی بھی محمول نہیں کی جا سکتی۔ جس قوم نے صناعی۔ معماری۔ نقاشی۔ شاعری ایسے فنونِ لطیفہ میں اپنے کمال دلبستگیوں کے ثبوت پیش کئے ہیں۔ اسکی بابت کبھی بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے جذبات تشکیل و تصویر سے متنفر تھے۔ ایک طرف تو زرتشت کے خشک مسائل نے جذبات میں جمود و سکون پیدا کر رکھا تھا۔ جن میں کسی قسم کی تحریک اور تعاقب فوری صورتوں میں ناممکن تھا۔ دوسری سمت مانی کی صلح کل تبلیغی مسائل نے بہرام گور کو برگشتہ کر دیا تھا۔ مانی کی قبل از وقت وفات (۲۷۶ء) نے اس تحریک لطیف کو فنا تو نہیں لیکن دبا ضرور دیا۔

مزدک (چھٹی صدی عیسوی) کے مذہب کو فنونِ لطیفہ سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اس مذہب کو موجودہ بالشویزم سے بہت کچھ مماثلت ہے

طرح آج روس "نان و نمک" کے پیچھے دنیا کے سارے فنونِ لطیفہ کو چھوڑنے کے لئے آمادہ ہے۔ اسی طرح مزدکیت نے مادیت کی علمبرداری میں ہر شعبۂ حیات کو نظر انداز کر دیا تھا۔

جب ایران میں اسلام نے قدم رکھا (۶۴۱ء) تو ملک میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو گیا۔ ایک طرف تو قاضی کے فتوؤں نے مصوری کو معصیت قرار دیدی۔ لیکن دوسری طرف اس لطیف مذہب نے جذبات میں جو ہیجان پیدا کیا وہ مختلف صورتوں میں اظہار کے لئے مضطرب تھے۔ اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جو خیال و عمل میں اتحاد کا مدعی ہے۔ ایک طرف تو وہ شرک کا دشمنِ جانی ہے اور "تجسید" کا عدوی مطلق۔ لیکن دوسری طرف عبودیت کے اظہار پیہم کا زبردست مدعی اور جذباتِ فطری کی تشکیل کا بے حد محرک۔ فتویٰ تجسیدِ خیال کا مانع لیکن تقویٰ تصویر ہیئت کا موئد۔ ظاہر بیں آنکھیں اس فرق کو سمجھنے سے مدتوں مجبور رہی ہیں۔ ابتک مشتبہ ہوں کہ دنیا اسلام کی اس زبردست خصوصیت کو اچھی طرح سمجھ بھی سکی یا نہیں۔

قاضی کے فتوے فنِ مصوری کے دشمن رہا کئے۔ لیکن جذبات کا تذکیہ جو اسلام کا لازمی نتیجہ تھا برابر جاری رہا اور اندر ہی اندر ایرانیوں کے دل اس قوت سے متاثر ہوتے رہے۔ شارع کی ظاہری پابندیاں چند دنوں تک نقاشی کو ضرور روک سکیں۔ لیکن شاعری جو مصوری کا روشن پیش خیمہ ہے۔ وہ ظاہر ہو کر رہی۔ ایرانی شاعری کی تاریخ میرے اس نظریہ کی موئد ہے۔ اب آپ پھر نفس مبحث کی طرف متوجہ ہوں۔

ایرانی مصوری کی تاریخ چار بڑے زمانوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے

دور اول۔ ۵۵۰ قبل مسیح لغایت ۶۴۱ء

یہ دور خود تین چھوٹے چھوٹے زمانوں میں منقسم ہے۔

(ا) عہد کیانی ۵۵۰ق۔م۔ لغایت ۳۲۶ قمری۔ اس زمانے میں مصوری حقیقتاً موجود نہ تھی۔ اس لئے کہ کاغذ اس وقت تک مفقود تھا۔ پتھر۔ پیتل۔ اور مٹی کے برتنوں پر جو نقوش دستیاب ہوتے ہیں ان سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی بت سازی و نقاشی میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔

(۲) عہد سکندری [illegible] تا [illegible] مذکورہ بالا عہد و نیز اس عہد میں یونانی اثرات سارے ایران پر حاوی تھے۔

(۳) عہد مانی ۲۱۶ء لغایت ۲۷۳ء۔ مانی چین میں مدتوں رہا اور اس نے ہندوستان میں بھی چند سال بسر کئے اس لئے اس دور کی مصوری نے چین و ہندوستان سے اگر کچھ خیالات حاصل کئے ہوں تو عجب نہیں۔ افسوس کہ اس عہد کی کوئی تصویر دنیا میں موجود نہیں۔

دور دوم ۱۴۹ھ لغایت ۱۲۵۸ء۔ اسلام کے جدید اثرات کے باعث اس دور میں ایرانیوں نے مصوری سے ضرور اجتناب کیا۔ لیکن درخت اور پھولوں کی نقاشی و زرنگاری میں شغف جاری رہا۔ اس دور کی لکھی ہوئی کتابوں کے صفحات اس امر کے شاہد ہیں۔ زرنگاری میں جو رنگ آمیزی چینی اصول پر کی جاتی تھی۔ ہندوستان کا اثر گو بہت معمولی ہے لیکن جہاں تک میں غور کر سکا نمایاں ضرور ہے۔ نقوش کو روشن بنانے میں جو اجزا استعمال کئے جاتے تھے۔ وہ یقیناً ہندوستانی تھے۔ سطح و فضا کی ترتیب و تشکیل میں بھی ہندوستانی مذاق ظاہر ہو رہا ہے۔[۲]

دور سوم۔ تیرھویں صدی لغایت پندرھویں صدی۔

گو زوال بغداد کا المناک واقعہ ۱۲۵۸ء میں ہوا لیکن ایران کی حالت تیرھویں صدی کی ابتدا ہی سے ابتر ہو چکی تھی جس میں کسی علم و فن کی ترقی ناممکن تھی۔ مغلیہ تسلط کے بعد ملک نے کروٹ بدلی۔ مغلیہ [illegible] کی اسلامی تہذیب و تمدن سے نفرت۔ یہودیوں کا غلبہ اور [illegible] خانہ جنگی۔ یہ اسباب مدتوں تک ملک کو اطمینان طلب مشاغل کی جانب متوجہ نہ کر سکے۔ با ایں ہمہ ملک نے اس دور میں مصوری کی طرف دوسرا قدم بڑھایا [illegible] ذی روح کو مصور کرنے کی کوشش شروع کی [illegible] نتیجہ خیز قصص تصویر کی صورت میں آنے لگے [illegible] حکایات کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔[۱] اس کے بعد [illegible] دلچسپ واقعات مصور کئے گئے۔

چودھویں صدی میں مصوری نے تین مزید مباحث کی [illegible] قدم بڑھائے۔ (۱) دواوین۔ (۲) تاریخ۔ (۳) مذہب [illegible] مذہبی تصاویر خاص کر قابل لحاظ ہیں۔ اس دور میں حضرت علیؓ و [illegible] شبیہیں تیار کرنے کی سب سے پہلی کوشش کی گئی۔

پندرھویں صدی کی حلیات میں حضرت علی کی وہ تصویر [illegible] مذہبی حیثیت سے نہایت اہم تھی جس میں آپ کو آسمان پر جاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔[۲] مصورانہ حیثیت سے اس دور کی دو خصوصیات [illegible] لحاظ ہیں۔

(۱) چینی اثرات کو ضبط و جذب کرنے کی سعی بلیغ کامیاب ہوئی اور اب ایک خاص ایرانی اثر ہر صورت میں غالب رہا۔

باغ و پھول کی تصویروں پر ایرانی سادگی کا صاف اثر معلوم ہونے لگا۔ سطح باغ و فضائے آسمانی کی تصویروں میں پہلی سی [illegible] ویرانیت باقی نہیں رہی۔ رومیوں کی تصویروں سے مشابہت [illegible] ہونے لگی۔ تصویر کے خاکوں میں جدت طبع و ندرت خیال نے [illegible] پایا۔

(۲) اس دور کی تصویریں رنگ کے اعتبار سے [illegible] چینی و ہندوستانی اجزا میں جواہرات کی آمیزش نے روشنی [illegible] ساتھ رنگینی بھی پیدا کر دی۔

دور چہارم۔ سولھویں صدی لغایت انیسویں صدی۔

[illegible]

---

[۱] یونانی اثرات کے لحاظ سے یہ دور عہد سکندر [illegible] یا عہد یونانی کے نام سے موسوم ہے کیونکہ تیسری صدی (قبل مسیح) کے وسط میں [illegible] یونان کے سیاسی اثرات ملک سے کم ہو گئے تھے اور پارتھین [illegible] [illegible] جا لیا تھا۔

[۲] [illegible] تاریخ الاحبار از [illegible] و [illegible]

[illegible]

[...]ویہ کے بعد سے ایرانی حکومت ملکی میں تین چیزوں کا متلاشی تھا۔

(۱) عرب سے قطعی علیحدگی۔

(۲) قدیم ایرانی شاہی خاندان سے وابستگی۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو اتباع شیعت

(۳) قومی اصول پر نظم و نسق حکومت۔

ملک کو دور صفویہ میں یہ ساری باتیں حاصل تھیں۔ ایسی صورت میں اس کے سامنے ترقی کی سب راہیں کھل گئیں۔ شاہ عباس اعظم کے زمانۂ حکومت میں مغرب کے متعدد ماہرانِ فن ملک میں آ کر مقیم ہوئے۔ جن سے ایرانیوں نے کافی فائدہ اٹھایا۔ شاہ طہماسپ صفوی کا شوق مصوری و نقاشی اس درجہ بڑھا ہوا تھا۔ کہ قدیم روایات کے خلاف شعرا اور بارے بالکل علیحدہ کر دیئے گئے۔[۵۱]

دور صفویہ کے ابتدائی حصہ میں جن لوگوں نے شہرت حاصل کی ان میں بہزاد کا نام خاصکر قابلِ ذکر ہے۔ اس کی مصوری کی بابت ایک مشہور ماہرِ فن کا خیال ہے[۵۲]۔

بہزاد کی فوقیت اس کے قوی و مستحکم خیالات میں مضمر ہے
اس کے معمول انفرادی حیثیت سے زندہ رہتے ہیں
اس کے انداز قوی و حق پرست ہوتے ہیں۔ اس کے
مصورانہ لطافت کے ساتھ ساتھ تخیل کی جدت خاصکر
قابل لحاظ ہے۔

اس کے علاوہ بہزاد میں ایک اور خصوصیت ہے۔ بہزاد کی تصویریں ایران کا بہترین قومی تخیل پیش کرتی ہیں۔ بہزاد کی تصویریں دورِ صفویہ کی آئینہ ہیں۔ اتحادِ نظر۔ ضبطِ عمل۔ تقسیم کار۔ غرض مجھے اس کی تصویروں میں ہر وہ بات نظر آئی جو شاہ عباس اعظم کی زبردست شخصیت اپنی محکوم رعایا کو اس دور میں پیش کر سکتی تھی۔

میرک (حیات ۹۲۲ھ - ۹۵۰ھ) جو بہزاد کے برسوں بعد آ تک ہے اپنے پیشرو سے ممتاز خیال کیا جاتا ہے۔ میرک ایک کھوئی ہوئی کڑی ہے جو بہزاد کو اس مدرسۂ مصوری سے منسلک کرتی ہے۔ جسے شاہ طہماسپ صفوی نے تبریز میں قائم کیا تھا۔[۵۳]

بعض کا خیال ہے کہ میرک[۵۴] اس مدرسہ مصوری کا نہ صرف پیش رو بلکہ اصل استاد تھا۔ مدرسہ تبریزیہ کے چند شاہکار میری نظروں سے ضرور گزرے۔ لیکن میں اپنی عدم قابلیت کا معترف ہوں کہ میں ماہرانِ فن کی اس رائے کو نہ سمجھ سکا۔ میں اپنی محدود تحقیق کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ مدرسہ تبریز کے ماہرانِ فن میرک کے نہیں بلکہ بہزاد کے متبع تھے۔ میرک کی تصاویر میں لطافت ضرور ہے۔ لیکن اس میں اور بہزاد میں وہی فرق ہے۔ جو فردوسی و نظامی میں ہے یا جو رزم و بزم میں ہے۔ علاوہ بریں میرک مغربی فن مصوری سے بے حد متاثر معلوم ہوتا ہے۔ گو اس کے نقوش بہزاد کے نقوش سے بے حد مشابہ ہیں۔ لیکن اس میں ایرانیت کم اور مغربیت زیادہ غالب ہے[۵۵]۔ مدرسہ تبریز کی تصویروں میں رنگ آمیزی البتہ مغربی طرز پر ہے۔ مسٹر بینن کا خیال اس دور کی تصویروں کے متعلق قابلِ لحاظ ہے۔

"اس دور کی رنگین تصاویر میں جو جوہر نگاری کا کمال
دکھایا گیا ہے۔ اس کی مثال دوسرے فنون میں
نایاب ہے۔ یہ تصویریں چینی تصاویر سے زیادہ شوخ
رنگ ہیں۔ اور لطف یہ کہ مغربی تصاویر کی طرح نہیں
عکس و سایہ بنانے کی کوشش بھی نہیں کی گئی ہے۔
اس لحاظ سے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس دور کے ایرانی
مصور تصویر سازی میں صحیح ترین مذاق رکھتے تھے۔"

اس سلسلہ میں قاچاریہ دور کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ فتح علیشاہ مغرب پرستی نے اطالوی مصوروں کو ملک میں بلایا۔ اطالوی اثر نے مصوری کو آسان و سہل ضرور بنا دیا لیکن جس صنعت و فن پر ملک کو ناز تھا وہ بہت

---

۵۱ بقول مشق:
"بہ تکلف خوش ترقی کردہ اند کاتب و نقاش و قزوینی و خر
بہزادون جلد ۲ صفحہ ۹
۵۲ [...] مورخہ ۵ جنوری ۱۹۳۱ء مضمون نمبر ۱۵۔

۵۳ ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۵ جنوری ۱۹۳۱ء مضمون نمبر ۱۔
۵۴ میرک کو شاعری سے بھی شوق تھا۔ ملاحظہ ہو دیوان میرک اے۔ آر ۱۲ ۹ ۴۔ برٹش میوزیم۔
۵۵ شارڈن۔

جلد ایران سے تباہ و برباد ہوگیا۔

آج ایران ایک نئے دور سے گزر رہا ہے۔ جس میں مصوری سے زیادہ فوٹوگرافی (عکاسی) کی قدر ہے۔ ایرانی مصور ابھی دنیا سے فنا نہیں ہوا۔ لیکن دم توڑ رہا ہے۔

چونکہ مجھے شاعری سے کسی قدر دلچسپی ہے۔ اس لئے میں نے ان موزوں اشعار کو ضبط کر لیا جو چند تصویروں پر لکھے ہوئے تھے۔ مجھے امید ہے کہ موجودہ خشک بحث کو مندرجہ ذیل اشعار دلچسپ بنانے میں کافی مدد دیں گے۔

(۱) ایک کمسن خوبرو عورت کی شبیہہ کے تحت میں:۔

اے قدِ تو سرو ناز پرور ٭ دلدادۂ قامتِ صنوبر
نگرفت بہر نہالِ قدرت ٭ از نخلِ امید کَے برم بر

(۲) ایک شاہزادہ کی تصویر کے حاشیہ پر:۔

چو سرو قد تو در جوئبار دیدہ رسد ٭ مرا ضدنگ بلا بر دل رمیدہ رسد
اگر صبا ز سر کوئے او رسد شاہی ٭ نسیم روضہ بجان ستم رسیدہ رسد

(۳) ایک "محو گلگشتِ چمن" کی تصویر پر:۔

پیوستہ جفا خوش نبود بلکہ وفا نیز ٭ ما عاشقِ دل سوختہ خود بیاز ایں باش

(۴) ایک زہد شکن واعظانہ انداز میں:۔

برآید روزگارت از سہ لب کام ٭ لبِ یار و لبِ جوئے و لبِ جام

(۵) ایک میخوار کی تصویر کے حاشیہ پر:۔

فی الجملہ اعتماد کلی بر ثباتِ عمر ٭ کایں کارخانہ الیست کہ تغییر می کند

(۶) سلطان حسین مرزا کی شبیہہ کے تحت میں:۔

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید ٭ حیرتے دارم کہ نازش را چساں خواہد کشید

۷ ایک کجکلاہ کی تصویر کے حاشیہ پر:۔

دلِ من ببرد زلفش جگرم ببرد چشمش ٭ تو مباش غافل ایجاں کہ ہنوز کار دارد
نتوانمش کہ بینم بہ رقیب ناموافق ٭ چہ خوش است گل ولیکن چہ کنم کہ خار دارد
بخدا کہ سینۂ من بشگافت و جاں بروں کن ٭ کہ درون خانۂ تو دگرے چہ کار دارد

(۸) ایک نوجوان عورت کی تصویر کے حاشیہ پر:۔

ز لطف تو بکسے [illegible]
[illegible]

(۹) ایک مصلے پر:۔

ابروئے دوست در نظر آرو نماز کن ٭ [illegible]

(۱۰) ایک شاہزادی کی شبیہہ کے تحت میں:۔

فرہاد نیست ورنہ دریں عہد روزگار ٭ [illegible]

(۲) کتب و کتابت

اسلام و مغربی عیسائیت نے جو کتاب کی قدر و منزلت کی ہے
اس کی مثال دنیا کے کسی تمدن میں دستیاب نہیں ہوسکتی
خدا کے کلام کی دعوت یا تو مسجدوں کے گوشوں سے
اٹھی یا کلیسا کے عافیت اندوز میناروں سے۔

(جے۔ ایس۔ ولکنسن)

ایرانی کاتب خیالات کو الفاظ کا جامہ نہیں پہناتا۔ اس کی کتابت کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کاغذ کے تاریک صفحات پر اپنی روشن آنکھ کی بصیرت اور اپنے متحرک ہاتھ کی قوت کا نچوڑ رکھ دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس کے بصیرت حروف دیکھتے ہیں۔ اس کے حروف کھنچ کر کھینچتے ہیں۔ اس کے شوشے ہنستے ہیں اور اس کے دائرے دنیا میں زندگی کے طریقے بتلاتے ہیں۔ (آر۔ کے۔ گذری)

دنیا میں کس نے اور کب کتابت شروع کی۔ یہ ابتک [illegible] اس کے بعثت کے زمانہ کو تاریخی انکشافات روز بروز آگے بڑھا رہے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر تک چینی حروف سب سے زیادہ قدیم سمجھے جاتے تھے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں یہ امتیاز مصریوں کو حاصل ہوا لیکن آج ایشیائے کوچک سے جو اشیاء برآمد ہو رہی ہیں ان [illegible] مصریوں سے بھی زیادہ پرانے سمجھے جاتے ہیں۔

ایران میں کتابت کب سے شروع ہوئی [illegible] مشکل ہے۔ جب سر ہنری [illegible] [illegible]

... گذشتہ ... میں در بند گوہر[1] کے ... بعد ... جی۔ جے۔ گیڈ نے اپنی تحقیقات پیش کی اسوقت دنیا کو یہ معلوم ہوا کہ ۲۵۰ ق۔م۔ میں بھی ایرانی کتابت سے خوب واقف تھا[2]۔

لیکن بوجہ اس کے کہ کوئی شے کاغذ کی مانند[3] ابتک ایجاد نہ تھی اس لئے اس دور کو اصلی معنوں میں کتابت کا زمانہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ساسانی دور میں کوئی شے کاغذ کی مانند ضرور ایجاد ہو چکی تھی۔ جب عہد فاروقیہ میں ایران فتح ہوا۔ اس وقت شاہی کتب خانوں میں بکثرت کتابیں موجود تھیں۔ مانی کے تعلق سے یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ کسی حد تک زرنگاری بھی موجود رہی ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ مانی اور اس کے رفقا کی تصانیف جب خلیفۂ وقت کے سامنے نظر آتش کی گئیں اسوقت سونے اور چاندی پگھل پگھل کر بہتے تھے[4]۔

خلافتِ راشدہ کا آخری دور ایران کے لئے نہایت بدامنی کا زمانہ تھا۔ عہد بنو امیہ میں ایرانیوں کا رسوخ بڑھ چلا تھا۔ علوم مروجہ میں بھی ان کو کافی دخل تھا۔ لیکن فنِ کتابت ابتک عربوں ہی کے ہاتھ میں رہا اور جہاں ایرانیوں کو اس میں درک رہا۔ وہاں بھی وہ عربی اصول تحریر و کتابت سے خود کو مستغنی نہ کرسکے۔

میں نے اس دور کی بعض تحریریں دیکھیں۔ چونکہ مجھے ان سے کوئی خاص شغف نہیں اس لئے میں ان میں کوئی امتیازی خصوصیت نہ پاسکا۔ میرے ایک دوست نے (جنہیں اس فن میں خاص درک ہے) البتہ مجھے چند باتیں بتائیں۔ ان کا خیال ہے کہ خود خطِ کوفی ایرانیوں کی اختراع ہے۔ چند عربی تحریروں میں (جو بنی امیہ کے ابتدائی عہد کی بتائی باتی ہیں) اور اس عہد کی آخری زمانہ کی کوفی تحریروں میں ایک امتیاز ضرور ہے۔ یہ امتیاز حکومت عباسیہ میں نمایاں اور سہل النظر ہے۔ چونکہ دورِ عباسیہ میں ایرانی کلیتاً حاوی تھے۔ اس لئے ان کے مخترع اور قوم پرست طبائع نے عربی خط میں وہ تصرف کیا جس نے اسے بغیر مسخ کئے ہوئے ایرانی بنالیا۔ قادر باللہ کے عہد زمانہ کی ایک کتاب حال میں دستیاب ہوئی ہے۔ جو کلیتاً فارسی خط میں ہے۔

ایرانیوں نے خط کوفی کو اپنا بنانے کی ایک دوسری ترکیب یہ کی کہ اسے شکست خط میں لکھنا شروع کر دیا۔ یہ طرز تیرھویں صدی تک برابر جاری رہا۔ میں نے برٹش میوزیم میں صدی کی لکھی ہوئی ایسی کتابیں بھی دیکھی ہیں جن کی طرزِ کتابت کو کوفی شکست" کہا جاسکتا ہے۔

تیمور (۱۴۰۲ - ۱۳۶۰) و شاہ عباس اعظم کے درمیان کے دوسو برس ایرانی کتابت کا بہترین زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ کتابت میں پختگی۔ سیاہی میں چمک و پائداری۔ حروف کے تمامی اجزا میں صفائی و وضاحت یہ سب باتیں اس دور کی خصوصیات کہی جاسکتی ہیں۔ شاہ طہماسپ کے عہد میں کتابت کو بیحد ترقی نصیب ہوئی اور اس عہد کی کتابیں فنِ خطاطی کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن جہانتک میں غور کرسکا ہوں نہیں ایک ایسا نقص ہے جو عہد سابقہ میں موجود نہیں۔ اور طہماسپ کی کتابت میں ایک مصنوعی اور غیر فطری رنگ ہے جو آنکھوں کو تو ضرور بھلا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن قلب کو اس سے ایک کشیدگی پیدا ہوتی ہے

قاچاریہ عہد میں نستعلیق سے زیادہ نسخ کی جانب توجہ کی گئی۔ آج ہندوستان میں کتابت گو کہ مقبول ہے۔ لیکن زندہ ہے لیکن ایران میں تقریباً ساری کتابیں لوہے کے ٹائپ میں طبع ہوتی ہیں۔

---

[1] یہ درہ ہے اور مقام قرا داغ کے قرآداغ کے قریب واقع ہے۔ (۳۱) مقام پر جو بت نصب ہے اس کی شکل "نرام سین" واقع لوری سے بہت مشابہ ہے۔ موخرالذکر کے تحت میں کوئی کتبہ نہیں لیکن دونوں کی کلیتاً مشابہت سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی وقت میں نصب کئے گئے تھے۔

[2] ... الذکر کے تحت میں جو عبارت کندہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بت ۲۵۰۰ ق۔م کے قریب بنایا گیا تھا۔ جب "نرام سین" نے "لولو" قوم پر فتح پائی۔ "اتوبانی" نے ... کے چند ہی برسوں بعد لولو کے تخت پر بیٹھا ایک اور یادگار بمقام "سرپل" قائم کی۔ جس کے اثرات ابتک موجود ہیں۔

[3] ... کے قدیم کتبات کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنفہ جی۔ جے۔ گیڈ۔

[4] ... اور پتھر پر ہوتی تھی۔ قدیم چینی چوبی کتب اور حضرت موسیٰ کی توریت کے واقعات ... ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۲

اس نمائش میں جو کتابیں پیش کی گئی تھیں انھیں گو مضامین کے حساب سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن فنِ کتابت و زرنگاری کا بہترین نمونہ تھیں۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ نمائش میں دورِ تیموریہ سے قبل کی کتابیں تقریباً مفقود تھیں۔ ان کتابوں میں نصف حصہ قرآن مجید اور فردوسی نظامی۔ خیام خسرو۔ سعدی و رومی و حافظ کی تصنیفات پر مشتمل تھا۔ بقیہ کتابوں میں چند نادر الوجود نسخے بھی تھے۔ جو فی نفسہٖ کمیاب سمجھے جاتے ہیں۔ غالباً ان میں سے بعض کے متعلق چند مفید معلومات کا ذکر بیجا نہ ہوگا۔

جس نسخہ نے ساری نمائش میں جان ڈالدی تھی وہ سلطان احمد جلائر (۱۴۱۰ - ۱۳۸۰) کے قلمی دیوان کے چند اوراق تھے۔[۱] ان پر سلطان بایزید (۱۵۱۲ - ۱۴۸۱) کی مہر ثبت تھی۔ حاشیہ کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ یہ اوراق تیمور کے کتب خانہ میں بھی رہ چکے ہیں کارکنانِ نمائش کا بیان ہے کہ نمائش کے پیش کردہ اوراق جلائر کے دیوان کا محض پسماندہ حصہ ہے۔ نیز اس سے زیادہ جلائر کا کلام دنیا میں کہیں بھی دستیاب نہیں۔ میں نے چار گھنٹہ کی متواتر محنت میں سارا کلام نقل کر لیا۔ اس نادر الوجود کلام کے چند اشعار ناظرین کی دلبستگی کے لئے درج ذیل ہیں۔

غزل

می شکنی دل مرا۔ زلف چو بازی کنی ؛ با تو نیاز می برم این ہمہ ناز می کنی
چند گداز می کنی قلب شکستۂ مرا ؛ قلب شکستۂ مرا چند گداز می کنی
این سگکیں تو ئی بندہ ایاز خاص تو ؛ ہر کرمے کہ می کنی بہرِ ایاز می کنی
سگ چو باشد آنکہ او بوسہ زند بپائے تو ؛ شانہ کہ باشد آنکہ او محرمِ راز می کنی
مطرب با نوا بیا یا دف و نائے و ارغنوں ؛ زہرۂ زہرہ خوں شود عود چو سازی کنی

احمد این دلیس بس وصف دو زلف او مکن
مختصر مفید کو قصہ دراز می کنی

دوسری غزل کے چند اشعار بھی لطف سے خالی نہیں:۔

روئے ماہ تو دیدم ز خود رم یاد آمد ؛ لب لعل تو دیدم شکرم یاد آمد

سرو را باقد رعنائے تو [illegible]
در شبِ تار کہ آں شب [illegible] ؛ [illegible]
نالۂ عاشق بیجان بگوشم [illegible]
در چمن نوحۂ مرغ سحرم یاد آمد

دوسری غزلوں کے مندرجہ ذیل منتخب اشعار [illegible]

طالب عشق حقیقت باز و اول عشق بت[(۱)] ؛ تا مجاز او را بود عشق [illegible]
آنانکہ ماہ را بجمالِ تو دیدہ اند[(۲)] ؛ بر آفتاب پردہ ز غیرت [illegible]
شبہائے شوق تا بہ سحر بے قرار و صبر ؛ چوں مرغ سر بریدہ بخوں [illegible]
چہ دہم شرح کہ ہر لحظہ دل می کنم[(۳)] ؛ چوں بلا میکشد از نہ گردوں [illegible]
اہل دل را ہمہ از عالمِ ظلمت برہاند ؛ پرتوِ چہرۂ خورشید جمال [illegible]
نزد لعلِ لب او لعل بدخشاں کم گیر[(۴)] ؛ با وجود قد او سرو [illegible]
گر گلستاں طلبی طوف کنی فصل بہار ؛ رخ او بر انگر و طرفہ گلستان [illegible]

ضمیمہ (الف) کتب نادرہ

(۱) دستوریہ مصنفہ عبداللہ ابن فضل۔ منقولہ [illegible]
(۲*) صفات العاشقین۔ مصنفہ ہلالی تصنیف [illegible] مطابق ۱۵۰۷ء
(۳) اعتقاد نامہ۔
(۴) قرآن مجید بخط فارسی کوفی مورخہ ۱۰۵۵ [illegible]
(۵*) دیوان آصفی (متوفی ۱۵۱۶ء) (کوہستانی) [illegible]
(۶*) دیوان ہلالی۔ (متوفی ۱۵۲۶ء) (کمیاب)
(۷*) دیوان رشید۔ مورخہ ۱۵۶۵ - ۹۷۳ [illegible]
(۸) قرآن کریم جسے سلطان بایزید یلدرم تلاوت کیا کرتا تھا۔
(۹*) گوئے چوگان۔ از محمود عارفی۔ مورخہ ۱۵۲۴ [illegible]
(۱۰*) مطلع السعدین۔ مصنفہ عبدالرزاق سمرقندی [illegible] مورخہ ۱۵۸۰ - ۹۸۸۔
(۱۱) منافع الحیوان۔

---

[۱] مالک محمد مورخہ ۱۴۰۲ - ۵ - ۸۰۵ [illegible]
[illegible] جن لوگوں کو حافظ کے مذاقِ شاعری کا [illegible] دلچسپی ہے وہ [illegible]
[illegible]

[illegible] الفد (۱۲۳۹-۶۴۳)

[illegible] الجزاری۔ مورخہ (۱۳۵۴-۷۵۵)

[illegible] کتابت۔

[illegible]) شاہنامہ۔ جس پر بابر سے اورنگ زیب تک تمامی سلاطین مغلیہ کی مہریں ثبت ہیں۔ صفحہ اول پر شاہ جہاں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارت و دستخط موجود ہیں۔ یہ دستخط نیز عبارت اس لئے اور بھی اہم ہیں کہ دیوان بابر (کتب خانہ رامپور) پہ جو عبارت و دستخط موجود ہیں اس سے یہ بالکل مشابہ ہے۔

(۱۵) تیمور نامہ ہاتفی۔

(۱۶*) شاہ و گدا۔ مصنفہ ہلالی۔

(۱۷) کتاب سمک عیار (ناول فارسی) یہ فارسی زبان کا سب سے پہلا ناول ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس فارسی ناول کا خاکہ مصنف داستان امیر حمزہ کے پیش نظر رہا ہو۔

(تیرھویں صدی عیسوی)

(۱۸) مناقب الاحبار ازعطار دبن محمد الحاسب۔ مشہور مہندس عالم علم الحساب۔ (۱۰۲۹-۱۷م)

(۱۹) علم الاسترلاب۔ از ابوالحسن نیشاپوری۔ مورخہ ۱۱۲۸-۵۲۲

(۲۰) آثار الباقیہ۔ مصنفہ البیرونی۔ اس کتاب پر تفصیلی تنقید کیلئے ملاحظہ ہو فہرست کتب خانہ اڈنبرا یونیورسٹی ۱۶۱

(۲۱) البلہان (نجوم عربی) (نایاب)

(۲۲) خواص الاشجار (عربی)

(۲۳) مفید الخاص۔ مصنفہ محمد بن ذکریا رازی (عربی) مملوکہ خاص سلطان ابوالفدا اسماعیل ابن ابوالمعالی۔ محمد بن الملک المنصور قلاون (۱۳۴۲-۷۴۳)

(۲۴) کلیات خواجو کرمانی۔ مورخہ ۱۴۳۰-۸۴۱۔ (کمیاب)

(۲۵) [illegible] شیخ علیقی۔ (نایاب)

[illegible]) دیوان امیر شاہی (وفات ۱۴۵۳-۸۵۷) صفحہ اول پر شاہ [illegible] جہانگیر و شاہ جہاں کے دستخط ثبت ہیں۔

[illegible] مصنفہ میر علی شیر نوائی (ترکی) ۱۴۹۵-۹۰۰

(۲۸*) مجموعہ۔ اس نایاب مجموعہ میں میر علی ہروی۔ محمد قاسم [illegible] محمد۔ (۳) سلطان محمد نور کی تحریروں کے نمونے درج ہیں۔ مورخہ ۱۵۲۴-۹۳۰۔ حاشیوں پر اکبر۔ جہانگیر و شاہجہاں کے تصدیقی دستخط ثبت ہیں۔

(۲۹) نظم الجواہر مصنفہ میر علی شیر نوائی۔ (ترکی) مورخہ ۱۴۸۵-۹۰

(نایاب)

(۳۰) خمسہ نظامی مورخہ ۱۵۴۷-۹۵۴۔ اسکی ۹ تصویروں پر بہزاد کے دستخط ثبت ہیں۔ صفحہ اول پر جو عبارت درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کو شاہ ایران نے شاہ جہاں کو ہدیتاً بھیجا تھا۔ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک خط بھی شامل ہے۔ جسے سلطان حسین مرزا ہراتی نے شاہ اسماعیل صفوی (۱۵۰۲-۴) کو بھیجا تھا۔ یہ خط تاریخی حیثیت سے نہایت اہم ہے۔ اس لئے کہ اس سے سلطان حسین و اسماعیل کے ان تعلقات کا پتہ چلتا ہے جو تاریخ میں دستیاب نہیں۔

(۳۱*) مہر و مشتری۔ از عصار (۱۳۷۷-۷۷۸) (کمیاب)

(۳۲) مخزن الاسرار از مولانا حیدر قلیہ (ترکی) مورخہ ۱۵۰۲-۹۰۸

(نایاب)

(۳۳*) مجالس العشاق۔ مصنفہ سلطان حسین ہراتی مورخہ ۱۵۰۳-۹۰۸ یہ نسخہ برٹش میوزیم کے نسخہ سے ہر نوع بہتر و قابل اعتبار ہے

(۳۴) ظفر نامہ۔ از شرف الدین علی یزدی۔ مورخہ ۱۴۶۷-۸۷۲ سرورق پر اکبر اعظم کی تحریر درج ہے جس کے تحت میں جہانگیر کا تصدیقی دستخط ثبت ہے۔

(۳۵) حمزہ نامہ۔

(۳۶) مناقب العارفین۔ مصنفہ احمد الفلکی (سوانح فقرائے سلسلہ رومیہ) (نایاب)

(۳۷*) داستان جمال و جلال (مثنوی) از محمد آصفی مورخہ [illegible] یہ نسخہ انڈیا آفس لائبریری کے نسخہ سے زیادہ صحیح [illegible]

(۳۸*) دیوان میر علی شیر نوائی۔ [illegible]

[illegible]

۴) تحفۃ الاحرار - از جامی مورخہ ۱۵۸۲ - ۹۹۰ مکتبہ خوند ملک بن میرک سمرقندی شاگرد جامی۔

۴) جامع الاصول (حدیث) از مجدالدین الجزاری - مورخہ ۱۴۳۵ - ۸۳۹ -

۴) اقوال حضرت علی - عربی مع ترجمہ فارسی صفحہ اول پر شاہ عباس کا یہ دستخطی حکم - مورخہ ۱۵۹۷ - ۱۰۰۶ - درج ہے کہ اسکی متعدد نقلیں مختلف حصص سلطنت میں بھیجی جائیں۔

۴) آثار المظفر از مولانا نظام (تاریخ اوائل اسلام) مورخہ ۱۵۶۶ - ۹۷۴ - یہ نسخہ نادر الوجود ہے۔

۴) صور الکواکب مترجمہ نصیر الدین طوسی (یزد - ۱۵۴۰ - ۹۴۷)

۴) مجمع الاحادیث - مع ترجمہ فارسی از جامی - مورخہ ۱۵۵۷ - ۹۶۴ یہ نسخہ نادر الوجود ہے۔

۴) رسالہ در علم موسیقی و شاعری مورخہ ۱۸۴۳ - ۱۲۵۹ -

اس مسئلے پر زیادہ واضح و مفصل تصنیف اس فن پر میری نظر سے نہیں گزری مجھے اندرونی شہادت کے مطالعہ کا موقع بدقسمتی سے نہیں دستیاب ہوا لیکن جس حد تک میں نے اس بے مثل تصنیف کو دیکھا اس سے میں نے یہ اخذ کیا کہ یہ رشید الدین طواط کی وہ گم شدہ تصنیف ہے جس کا ذکر دوسری کتابوں میں ملتا ہے۔

ضمیمہ (ب)

شبیہہ و تصویر

(۱) ایک اونٹ کی تصویر جسے مختلف درندے پھاڑ کر کھا رہے ہیں (۱۲۳۶ - ۶۳۴) یہ آخر دور عباسیہ کا عمل ہے - اور اس سے ان خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے - جو [illegible] کے خلاف موجود تھے۔ [illegible]

یہ تصویر نہایت اہم ہے۔

(۲) شبیہہ گوتم بدھ جسے شکمونی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے - [illegible] صدی عیسوی)

(۳) تصویر جنازہ اسفندیار - جنازہ کے لیجانے کا طریقہ و نیز رسم عزا بالکل وہی ہیں جو آج بہ سلسلہ محرم رائج ہیں - (چودھویں صدی عیسوی)

(۴) شبیہہ رشید الدین طواط -

(۵) شبیہہ حسین مرزا ہراتی - عمل بہزاد -

(۶) شبیہہ شیبک خاں - (محمد خاں شیبانی اوزبک وفات ۱۵۱۰ء)

(۷) تصویر دو اونٹوں کی جو آپس میں لڑ رہے ہیں - از بہزاد - اس تصویر کی نقل نہا مصور ہندی نے کی ہے - (۱۶۲۰ - ۱۰۱۷) جس کی تصدیق شاہ جہانگیر کے دستخط سے ہوتی ہے -

(۸) تصویر "شاہزادگان مصروف بہ شکار" عمل ایرانی جس پر ہندوستانی مصور "دولت" نے اصلاح دی ہے۔

(۹) شبیہہ حضرت علی - فرشتوں کی معیت میں آسمان پر جا رہے ہیں -

(۱۰) شبیہہ میر علی شیر نوائی (۱۴۴۱ - ۱۵۰۱)

(۱۱) شبیہہ ہمایوں و اکبر خورد سال. دستخطی عبدالصمد (شیریں قلم) ۱۵۵۰ء

(۱۲) شبیہہ بادشاہ سلیم (جہانگیر) از رضا ایرانی مصور دربار اکبری -

(۱۳) شبیہہ مرزا کامران - (کامران شاہ ہندی)

(۱۴) شبیہہ سلطان محمد مصور دربار شاہ طہماسپ صفوی)

(۱۵) شبیہہ شاہ طہماسپ -

(۱۶) شبیہہ میر سید علی کاتب -

(۱۷) شبیہہ مولانا ہاتفی (متوفی ۱۵۲۱) از بہزاد

[illegible]

ضمیمہ (ج)

خوشنویس

(۱) محمد بن اظہر - ۱۴۸۵ء ۸۸۹ھ
(۲) میر حسین الکاتب الخاقانی الحسینی - ۱۵۴۳ء ۹۵۰ھ
(۳) محمود المنجم الخاقانی البخاری ۱۵۴۶ء ۹۵۳ھ
(۴) خواجہ جمال بخاری ۱۵۴۸ء ۹۵۵ھ
(۵) شاہ حسین شہابی ہروی - ۱۵۸۴ء ۹۹۲ھ
(۶) میر علی السلطانی ۱۵۳۴ء ۹۴۱ھ
(۷) علی الکاتب - ۱۵۲۵ء
(۸) حافظ خرج اللہ - ۱۴۶۴ء ۸۶۸ھ
(۹) شیخ محمود الشیرازی - ۱۴۶۰ء ۸۶۵ھ
(۱۰) علاء الدین رضاشی - ۱۵۶۶ء ۹۷۳ھ
(۱۱) سلطان علی ہراتی - ۱۴۸۰ء ۸۸۵ھ
(۱۲) سلطان علی مشہدی - ۱۴۵۹ء ۸۶۳ھ
ابن محمد المشہدی -
(۱۳) عبداللہ ہراتی - ۱۴۳۰ء ۸۶۳ھ
(۱۴) میر حسین الساحر التبریزی -
(۱۵) ناصر کتابدار ۱۶۴۹ء ۱۰۵۹ھ
(۱۶) محمود الکاتب الحسینی الشیرازی ۱۴۲۰ء ۸۲۳ھ
(۱۷) جعفر بایسنغری (تبریزی) ۱۴۲۶ء ۸۳۰ھ
(۱۸) علی فاخر الاشتر خانی ۱۴۳۵ء ۸۳۹ھ
(۱۹) میر شیخ محمد بن شیخ احمد ۱۴۳۰ء ۸۳۳ھ
(۲۰) شاہ قاسم الحسینی - ۱۴۹۷ء ۹۰۲ھ
(۲۱) محمد امین ۱۶۱۷ء ۱۰۲۶ھ
(۲۲) شاہ محمود نیشاپوری ۱۵۳۹ء ۹۴۶ھ
(۲۳) احمد بیہقی ۱۱۲۸ء ۵۰۲۲ھ
(۲۴) ابن المقلی ۱۳۰۶ء ۶۰۶ھ
(۲۵) علی بن حسین الحسینی ۱۳۳۲ء ۷۳۱ھ
(۲۶) عبدالصمد بن محمد البغدادی ۱۳۲۲ء
(۲۷) لطف اللہ بن یحییٰ بن محمد ۱۳۹۳ء ۷۹۶ھ
(۲۸) عبدالمومن العلاوی الکاشی ۱۳۱۳ء ۷۱۳ھ
(۲۹) جعفر بایسنغری ۱۴۳۳ء ۸۳۶ھ
(۳۰) محمد بن محمد الحنفی الشناقی ۱۴۴۳ء ۸۴۷ھ
(۳۱) علی بن یحییٰ الحسینی - ۱۴۵۲ء ۸۵۶ھ
(۳۲) بایزید بن ابراہیم التبریزی ۱۴۳۸ء ۸۴۲ھ
(۳۳) نصر بن حسن السکی - ۱۴۵۲ء ۸۵۶ھ
(۳۴) محمد بن عماد النیشاپوری ۱۴۶۲ء ۸۶۶ھ
(۳۵) میر حسین عرف کلنگی ہراتی ۱۴۹۲ء ۸۹۸ھ
(۳۶) میر عماد الحسینی - آخر پندرھویں صدی عیسو
(۳۷) مرشد شیرازی - عرف عطار ۱۴۸۱ء ۸۶
(۳۸) علی الحسینی ۱۵۰۴ء ۱
(۳۹) سلطان محمد نور آخر چودھویں صد
(۴۰) عنایت اللہ شیرازی ۱۵۵۶ء ۹۶
(۴۱) عبدالہالق ۱۵۴۱ء ۹۴
(۴۲) میر علی ۱۵۳۰ء ۹
(۴۳) مرشد الدین محمدی ۱۵۶۰ء ۹
(۴۴) ابراہیم خلیل بخاری ۱۵۲۳ء ۹
(۴۵) احمد المنشی مصری ۱۳۳۹ء
(۴۶) محمد بن حاجی الحافظ ۱۴۳۵ء ۹
(۴۷) باباشاہ اصفہانی ۱۵۶۹ء
(۴۸) حاجی محمد بن ملک احمد تبریزی ۱۵۳۱ء
(۴۹) عبدالرشید ۱۶۲۲ء
(۵۰) محمد قوام شیرازی (سولہ صدی ع
(۵۱) حسن بن محمد احسان شیرازی ۱۵۶۰ء
(۵۲) فرید الکاتب ۱۵۵۱ء
(۵۳) بابا میرک تاشقندی ۱۵۵۰ء
(۵۴) میشی

ضمیمہ (د)

مصور ونقاش

) معین مصور ۷۸-۱۶۵۵-۱۰۸۹-۱۰۶۶

۱) شیخ محمد ۱۵۵۶- ۹۶۴

۲) محمود مصاحب بخاری سولھویں صدی

۱) قاسم علی ہراتی ۱۴۸۵- ۸۹۰-

۷) حیدر علی ابن بہزاد

۰) مظفر علی برادر زادہ بہزاد

۸) مقصود شاگرد بہزاد

۱) شیخ زادہ ۱۵۱۰- ۹۱۷-

۶) عبداللہ سولھویں صدی

۱) سید علی بن سید محمد ۱۵۴۰ء

۱) محمد ہروی مصور دربار شاہ طہماسپ ۱۵۲۲- ۹۲۸

رضا عباسی ۱۶۴۲ - ۱۵۷۸ء

۱۱) ابوالحسن غفاری کاشانی ۱۸۶۰

۱۱) محمد مومن ۱۵۵۰

۱۱) میرک ۱۵۰۰

۱۱) خسرو اورنگ ۱۶۰۰ء

۱۱) محمد سلیم تبریزی ۱۶۳۹- ۱۰۴۹

۱) مراد بن علی ۱۶۰۲- ۱۰۱۱

۱) شاہزادے بہرام خوقندی - سترھویں صدی

۲) محمد یوسف ۱۶۲۵

۲) بہرام عباسی "

۲) مرزا ابو عبداللہ "

) محمد علی سترھویں صدی

[illegible] قلی "

ضمیمہ (ر)

متفرقات

(۱) کیانی سپاہی کا بت (چوتھی صدی قبل مسیح) یہ بت جزیرہ تھسلی میں پایا گیا جس سے کیانی اثرات کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس کا لباس کوہ قاف کے باشلیقوں کی پوشاک سے مشابہ ہے (نمبر ۱۰ - ب)

(۲) پارتھین دیوی "اناہیت" کا بت۔ دنیا کی تاریخ بت سازی کی یہ ایک اہم کڑی ہے۔ (نمبر (۱۰) ڈبلو)

(۳) کاسہ جبہرار تکسر سیز (پانچویں صدی قبل مسیح) کا نام فارسی، بابلی، مصری و آرامی زبانوں میں درج ہے۔ یہ پیالہ کیانی سلطنت کی وسعت کا بین ثبوت ہے۔ (نمبر ۱۲)

(۴) دروازہ جس پر عبارت بخط کوفی درج ہے۔ مورخہ سنہ ۳۶۲ھ مطابق سنہ ۹۷۲ء۔ (نمبر ۸۰)

(۵) شطرنج کے مہرے جنہیں ہارون الرشید نے شہنشاہ شارلیمن کے پاس بطور ہدیہ بھیجے تھے۔ (نمبر ۱۹) ف۔

(۶) طشتری (مورخہ ۱۲۱۰ - ۶۰۷) اس پر خسرو شیریں کے غسل کا جو منظر ہے وہ نظامی کے بیان کردہ واقعات سے مختلف ہے۔ اس سے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ نظامی نے مروجہ قصہ میں بہت سی ترمیمات کی تھیں۔ نمبر (۱۵۹) کیو

(۷) عباسی علم (تیرھویں صدی عیسوی) اس پر پہلوی عبارت خاص ہیبت کنی ہے (نمبر ۹۱) جی

(۸) سلطان حسین مرزا ہراتی کا خاص جام شراب - نمبر (۱۹۳) زڈ

(۹) شاہنشاہ الجیاتو خدا بندہ (۱۳۰۴-۱۶) کا خاص گیند - نمبر (۲۲۹) کے

(۱۰) قالین ریشمی جسے شاہ عباس اول نے درگاہ مشہدی میں پیش کیا تھا۔ یہ قالین ہندوستان کا تیار کردہ تھا۔ نمبر (۲۵۲)

(۱۱) تصویر کی ارغنی ٹیل گیند پر سپر سفیل جبار درج تھی ہر قابل [illegible] عمل کترین سلطان ضیاء الدین محمد بن الالیسی بن فرخ التسعد [illegible] لاہور سنہ ۱۰۷۴ھ (۱۶۶۳ء)

(۱۲) [illegible] سلطان [illegible] شہنشاہ [illegible]

باغبان
ٹیگور کے ادبی پھول

(از جناب مولینا عبد المجید صاحب سالک۔ بی اے۔ مدیر انقلاب لاہور)

"اے نوجوان! ہمارے پاس آ۔ ہمیں سچ سچ بتا۔ تیری آنکھوں
میں اتنی دیوانگی کیوں ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔ میں نے جنگلی پوست کی کیسی تیز شراب پی ہے
کہ میری آنکھوں میں اتنی دیوانگی اور مستی ہے"۔

"او! شرم!"

"دیکھو بعض عقلمند ہیں۔ اور بعض بے وقوف۔ بعض ہشیار اور
چوکنے ہیں۔ اور بعض بے پروا۔ بعض آنکھیں مسکراتی ہیں۔ اور بعض آنکھیں
روتی ہیں ـــــ میری آنکھوں میں مستی ہے"

"اے نوجوان! تو درخت کی چھاؤں میں کیوں اس قدر ساکن و
خاموش کھڑا ہے؟"

"میرے پاؤں میرے دل کے بوجھ سے شست ہو رہے ہیں۔
اور میں چھاؤں میں ساکن کھڑا ہوں"

"او! شرم!"

"دیکھو بعض اپنے راستے پر چلے جاتے ہیں۔ اور بعض ٹھیرے رہتے
ہیں۔ بعض آزاد ہیں۔ اور بعض پابزنجیر ـــــ اور میرے پاؤں میرے
دل کے بوجھ سے شست ہو رہے ہیں"۔

(۲)

"جو کچھ تو مجھے اپنی مرضی سے عطا کر دیتی ہے لے لیتا ہوں۔ میں
زیادہ کچھ نہیں مانگتا"۔

"ہاں۔ ہاں۔ میں تجھے جانتی ہوں۔ شرمیلے بھکاری! تو جو کچھ
کسی کے پاس ہو۔ سب کچھ مانگ لیتا ہے"۔

"اگر مجھے ایک یونہی پڑا ہوا پھول بھی اُٹھا کے دیدیا جائے
اسے اپنے دل میں رکھ لوں گا"

"لیکن اگر کانٹے ہوں؟"

"میں انہیں جھیل لوں گا"

"ہاں۔ ہاں۔ میں تجھے جانتی ہوں۔ شرمیلے بھکاری،
جو کچھ کسی کے پاس ہو سب کچھ مانگ لیتا ہے"۔

"اگر صرف ایکبار تو محبت کی نگاہیں اُٹھا کر میرے منہ
تک لے۔ تو میری زندگی موت کے بعد تک خوشگوار ہو جائے"۔

"لیکن اگر صرف غصے کی بے رحم نگاہیں ہوں؟"

"میں انہیں اپنے دل میں چبھونے اور خلش کرنے کے لئے

ہاں۔ ہاں۔ میں تجھے جانتی ہوں۔ شرمیلے بھکاری
جو کچھ کسی کے پاس ہو۔ سب کچھ مانگ لیتا ہے"۔

(۳)

"محبت پر بھروسہ رکھو۔ اگرچہ وہ رنج و اندوہ ہی لا
اپنے دل کو بند نہ کرو"۔

"آہ۔ نہیں۔ میرے دوست! تمہارے لفظ تاریک
میں انہیں سمجھ نہیں سکتا"۔

"میرے پیارے۔ دل صرف اس لئے ہے۔ کہ ایک
اور ایک گیت کے ساتھ دیدیا جائے"۔

"آہ۔ نہیں۔ میرے دوست! تمہارے لفظ تاریک
میں انہیں سمجھ نہیں سکتا"۔

"خوشی ایک قطرۂ شبنم کی طرح کمزور ہے۔ یہ ہنستی ہوئی مرجاتی ہے۔ لیکن غم مضبوط اور پائدار ہے۔ غمناک محبت کو اپنی آنکھوں میں بیدار ہونے دو۔"

"آہ۔ نہیں۔ میرے دوست۔ تمہارے لفظ تاریک ہیں میں انہیں سمجھ نہیں سکتا۔"

(ٹیگور)

"کنول سورج کے سامنے کھلتا ہے۔
کھو دیتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا۔ کہ موسم سرما کی
میں کلی بن کے رہ جائے"

"آہ۔ نہیں میرے دوست۔ تمہارے لفظ تاریک
میں انہیں سمجھ نہیں سکتا۔"

(سالک)

غزل

(از جناب محمد اصطفا خاں مالک کارخانہ اصغر علی محمد علی لکھنؤ)

دوئی ہے کیا یہ عدیم المثال کیا جانے
زوال کیا ہے یہ وہ لازوال کیا جانے

تڑپ تڑپ کے گذرتے ہیں راتدن کیونکر
جو مطمئن ہو مرے دل کا حال کیا جانے

ہزار کرتے ہیں تیماردار دلسوزی
مریضِ غم کی کوئی دیکھ بھال کیا جانے

جو اپنے حسن میں اوجِ کمال پر پہونچے
وہ ہم سے خاک نشینوں کا حال کیا جانے

ہے شادکام تو اک کامیاب وصل ضرور
مگر وہ لذتِ شوقِ وصال کیا جانے

اسے کسی کے کرم پر بڑا بھروسہ ہے
گنہگار گنہ کا مآل کیا جانے

جو التفات کہ ہے باغباں کا پھولوں سے
بھلا وہ سبزہ کہ ہے پائمال کیا جانے

وہ محو اپنی تجلی کی برق پاشی میں
کسے ہے ہوش یہ سحرِ جمال کیا جانے

جو حکم دو بسر و چشم ہر طرح منظور
تمہارا بندہ کوئی قیل و قال کیا جانے

جسے نہ اپنی خبر بھی رہے تصور میں
خیالِ غیر وہ محوِ خیال کیا جانے

خدا کسی کو کبھی صاحبِ غرض نہ کرے
سخی ہے کون؟ یہ دستِ سوال کیا جانے

جھکی ہوئی یہ ہزاراں نیاز پیشانی
نتیجہ عرقِ انفعال کیا جانے

جو اصطفا سا کسی کا ہو باوفا عاشق
وہ ملے وہ

[illegible] خیال کی ایک غیر مطبوعہ تحریر:—

خالاؤں کا مارا آغا

[سید محمد باقر صاحب بی۔ اے۔ آنرز۔ جو ایم اے میں دو برس تک لکھنؤ یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر رہے۔ جہانتک ہمارا حافظہ کام کرتا ہے۔ آپ لکھنؤ یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ اور آپ کا ارادہ تھا کہ آپ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان کا سفر کریں۔

آپ کے پاس نواب نصیر حسین صاحب خیال کے مضامین پر مرحوم خیال صاحب کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے نوٹ ہیں۔ یہ نوٹ اس انداز میں لکھے گئے ہیں گو یا کوئی دوسرا شخص لکھ رہا ہے۔ لیکن ان میں جو معلومات اور حقائق ہیں وہ بے حد قیمتی اور قابلِ قدر ہیں۔

سید محمد باقر صاحب نے ایک نوٹ ہمیں دیکھنے کے لئے بھیجا تھا۔ جو درج ذیل ہے۔ اگر کوئی صاحب سید محمد باقر صاحب سے معاملہ کر سکیں یا انہیں آمادہ کر سکیں تو اردو ادب میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہو سکتا ہے۔] ادارہ

۱۹۱۲ء میں حسبِ معمول ایک اتوار کو جناب خیال کے یہاں (کلکتہ) اردو ادب و انشا کے شائقین کی صحبت گرم اور اس زبان کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ کہ ان میں سے ایک صاحب نے فرمایا کہ اردو نظم و نثر میں وِٹ (wit) یعنی سنجیدہ ظرافت کی بہت کمی ہے اور اس زبان پر نظر کر کے کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ایسی ایجاد اور اس طرز کا نباہ آسان نہیں۔ جناب خیال نے بھی اس کا اعتراف کیا۔ اور جب سے موصوف اس صنف کو بھی اردو نثر میں داخل کرنے کے خیال میں رہے۔

اس سال کی گرمیوں میں جناب خیال دارجلنگ (پہاڑ) گئے وہاں فرصت تھی اور تخلیہ۔ احبابِ وطن کی یاد آتے ہی اردو کے متعلق ان کا وہ قول بھی یاد آگیا۔ سوچتے رہے۔ ایکدن طبیعت لڑی اور [illegible] وہ دلچسپ قصہ شروع ہو گیا جسے اردو ادبی دنیا نے لاجواب اور اس زبان میں ایک نئی طرز کی ایجاد کو تسلیم کیا ہے!

یہ سرگذشت تمام ہوتے ہی الہ آباد کے رسالۂ ادیب کو [illegible] گئی کہ وہ پرچہ اس وقت ملک میں مشہور اور فرد مانا جاتا تھا۔ ستم رسیدہ آغا کی داستانِ باستان ۱۹۱۳ء کے ادیب کے کئی نمبروں میں شائع ہوئی۔ اس عجیب و غریب قصہ پر رسالہ کے خوش مذاق و فاضل مرتب (مولوی قاسم حسین بہاری) نے حسبِ ذیل نوٹ تحریر کیا۔

> جس طرح چاشنیِ کلام کے لئے مثل اور ذائقۂ زبان کیلئے نمک درکار ہے۔ اسی طرح تفریحِ دماغ کے لئے متانت آمیز ظرافت بھی چاہیئے۔ اس کی مثال ذیل کی داستان میں دکھائی گئی ہے۔ جو نواب سید نصیر حسین خانصاحب خیال کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ مضمون کی دلچسپی کو اندازِ بیان اور بڑھا دیتا ہے اور یہ حضرت خیال کا حصہ ہے!
>
> (ایڈیٹر رسالہ ادیب۔ جنوری ۱۹۱۳ء)

اس مضمون نے ملک میں ایک غلغلہ بلند کیا۔ [illegible] اس کا ذکر اور آغا کا قصہ چڑھا ہوا تھا۔ میں [illegible] اور انکی پیاری تیسی (دلّی) سے ہر ایک [illegible]

[illegible] کی ایک بولتی اور چلتی ہوئی تصویر ہے!! اس کا ابھی ایک ہی حصہ نکلا تھا۔ کہ اڈیٹر ادیب کے پاس اس کے متعلق مبارکباد و اظہار پسندیدگی کے خطوط آنا شروع ہوئے۔ فاضل [illegible] اس کا تیسرا نمبر (حصہ) شائع کرتے وقت بصد مسرت یہ نوٹ درج رسالہ کیا:-

اس مضمون کی جیسی حیرت انگیز عالمگیر پسندیدگی ہوئی ہے
اُس سے نقادانِ فن کی نکتہ سنجی اور زندہ دلانِ اردو کی
شگفتگی طبع و مذاقِ سلیم کا کافی ثبوت ملتا ہے سو
ہمیں بخوبی اس کا اندازہ ہو گیا کہ اردو کی دنیا کیرکٹر
(عادات وخصائل) نگاری کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہے
اس بنا پر ہمارا یہ کہنا فضول نہ ہوگا کہ اس طرزِ انشاپردازی
میں بھی ہماری زبان یورپ کی زبانوں سے پیچھے رہنا
نہیں چاہتی ....

بہرحال پسندیدگی کے جتنے حوصلہ افزا پیغامات
قدردانانِ ادب نے بھیجے تھے۔ نہایت شکریہ کے ساتھ
نوابِ خیال کے پاس بھیجدیئے گئے۔ اور واقعی ممدوح
ہر طرح مستحق داد ہیں! (اڈیٹر۔ رسالہ ادیب مارچ ۱۹۱۲ء)

یہ مضمون اپنے ادب وطرز میں یگانہ اور واقعی نرالا تھا۔ اور اس لئے اس کی جتنی واہ واہ نہوئی ہو اور نہ ہو وہ کم ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عام طور پر اس کا اصل منشا و مطلب نہیں سمجھا گیا۔ یہ داستان وہ بوستانِ خیال نہیں ہے جس کے چمن میں بظاہر خوشنما پھول تو نظر آئیں لیکن انہیں بو باس نہ ہو۔ بلکہ یہ وہ گلستاں ہے جس کے گل ہمیشہ خوشبودار اور سدا بہار رہیں گے۔

جنابِ خیال کی تحریروں سے واقف جانتے ہیں کہ ان کا کوئی [illegible]

[illegible] وہاں کی زمین اب بیکار [illegible] سائنٹفک دنیا کا اثر پڑے۔ اور وہ بھی [illegible] گھر میں اُس کی خو بگڑ چکی تھی۔ بنتی کیونکر؟ نظام [illegible] اسپر برہم ہو کر نصیحت کرتا ہے کہ

"بابا عجب ہیچ کارہ شدۂ۔ [illegible] آئی [illegible]
حساب و کتاب ہم تحصیل ساختی۔ تو کہ شاید دیوانہ [illegible]
شنیدم یک مثنوی لیلیٰ و مجنوں ترتیب دادۂ۔ [illegible]
می کنی۔ حیف۔ لاحول ولا! در این زمان [illegible]
نظم بازی و بیہودہ سری تو کہ حاصل نہ زبان [illegible]
گونہ دانش است۔ یا گرفتی و نہ از دیگر ہنرہائے دنیا
چیزے بہرہ حاصل کردی! فرزند من۔ افسوس [illegible]
تو ہم مثلِ مُلّا ہائے ایران ہنوز بر پشت [illegible]
ماہی ست۔ ظاہر بہ انداز این قصۂ پارینہ [illegible]
این دفتر بے معنی غرق مے ناب آوٗلے!"

مگر ہمارے شاعر آغا صاحب کھڑے سن [illegible] کوئی معقول جواب نہیں دیتے! پھر نظام الملک [illegible] بدولت جب ان کی حالت نازک ہو جاتی ہے [illegible] چچا کا دوست) ان پر رحم و کرم کرنا چاہتا ہے [illegible] کہ از ہنرہائے دنیا چہ یاد گرفتہ؟ تو آپ [illegible]

من۔ من شاعر ہستم۔ شاعر [illegible]
فصیح اللسان و [illegible]
[illegible]

حیاتین

(از جناب رئیس الاطبا حکیم محمد حسن صاحب قرشی پرنسپل طبیہ کالج لاہور)

۱۸۸۱ء میں بعض محققین نے متواتر تجربات کے ذریعے ثابت کر دیا تھا۔ کہ اگر حیوانوں کو مصنوعی طور پر تیار کی ہوئی ایسی غذا دیجائے جس میں صرف غذا کے کیمیاوی اجزا یعنی نائٹروجینی اجزا۔ مواد نشاستیہ ... نمکیات۔ چربیلے اجزا، اور پانی ہی شامل ہوں۔ تو ان کی صحت کا قائم رہنا محال ہے۔ لیکن اگر ان میں قدرے تازہ اور طبعی غذا مثلاً دودھ کی آمیزش بھی کر دی جائے تو صحت اعتدال پر رہتی ہے اور اس میں کسی طرح کا نقص پیدا نہیں ہوتا اس سے محقق ہاپکن نے نتیجہ نکالا کہ غذا میں علاوہ معلومہ کیمیاوی اجزا کے بعض ایسے نامعلوم اجزا بھی موجود ہوتے ہیں۔ جو زندگی اور صحت کے لئے لازمی ہیں ان کو اس نے غذا کے اجزا رخاص یا زائد کے نام سے نامزد کر دیا لیکن اس کے بعد پروفیسر فنک نے اپنی تحقیقات میں غذا کے ان اجزائے خاص کے لئے جو مرض بیری بیری کو روکتے ہیں۔ حیاتین (وٹامین) کی اصطلاح استعمال کی۔ جو اب عام طور پر استعمال کی جاتی ہے۔

حیاتین وہ خاص اجزا ہیں۔ جو انسانوں اور حیوانوں کی تمام طبعی اغذیہ میں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن تاحال ان کی کیمیاوی ترکیب معلوم نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی ان کو طبعی غذا سے الگ کر کے دکھایا جا سکا ہے۔ ان کی موجودگی کا ثبوت کیا گیا ہے۔ کہ حیوانات صرف ایسی غذا دینے سے مرجاتے۔ یا کسی خاص مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جن میں صرف خاص کیمیاوی اجزائے غذائیہ پائے جاتے ... حیاتین کے متعلق تفتیش جاری ہے۔ مگر ابھی تک یہ ثابت ... حیوانی اجسام کی ترکیب میں بھی پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ البتہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ حیوانات ان کو اپنی نباتی غذاؤں سے حاصل کر کے جسم میں جمع رکھتے ہیں۔ لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ یہ حیوانی اجسام کی ترکیب میں بھی شامل ہوں گے۔

یوں تو آج تک کے تجربات سے چھ سات قسم کی حیاتین معلوم ہو چکی ہیں۔ لیکن ان میں سے مندرجہ ذیل پانچ قسم کی حیاتین زیادہ اہم ہیں۔

حیاتین۔ (الف) حیاتین (ب) حیاتین۔ (ج) حیاتین (د) اور حیاتین (ذ) ان میں سے بھی اول الذکرتین ایسی ہیں۔ جو زندگی کے تحفظ اور صحت کے بقا میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

(یادداشت) چونکہ حیاتین کی کیمیاوی ترکیب ابھی تک معلوم نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی مختلف قسم کی حیاتین کا باہمی کیمیاوی فرق معلوم ہے صرف مختلف تجربات کے لحاظ سے ہی ان کے وجود کو اور ان کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی قسموں کے نام الف۔ ب ج۔ د۔ ذ۔ وغیرہ۔ حروف تہجی پر رکھدیئے گئے ہیں۔

حیاتین (الف) یہ حیوانوں کے نشو و نما کے لئے ضروری ہے اور یہ خیال کیا گیا ہے کہ بچوں کی خوراک میں اس کی غیر موجودگی ان کے نشو و نما کو روک دیتی اور ان میں مرض کساح کو پیدا کر دیتی ہے۔ جوانوں کے لئے یہ بہت زیادہ ضروری نہیں ہے۔ وہ بغیر اپنی صحت پر کسی خراب اثر کو محسوس کرنے کے کچھ عرصہ اس کے بغیر گذار سکتے ہیں۔ یہ حیاتین پانی میں حل نہیں ہوتی لیکن چربیوں میں حل ہو جاتی ہے۔ اور حرارت کے ذریعے بآسانی تباہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ کچھ دیر کے لئے ۲۱۲ درجے کی ... اور اسی ...

... تھی کہ وہ پرجو اس وقت تک ... مشہور

حرارت پر گرم کی جا سکتی ہے۔ البتہ چار گھنٹے تک اس درجے کی حرارت پر رکھے رہنے سے بتدریج ضائع ہونا شروع ہو جاتی ہے یہ طبعی طور پر نباتات کے سبز پتوں اور بعض قسم کے بیجوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن نباتی تیلوں میں نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ یہ بالعموم دودھ مکھن۔ بالائی۔ انڈے کی زردی۔ پنیر۔ سبز نبات بعض قسم کے غلوں۔ چربی دار گوشت۔ مچھلی اور دوا کے طور پر تیار کئے ہوئے مچھلی کے تیل (کاڈلیور آئل) میں پائی جاتی ہے۔ یہ گندم کی روٹی اور نباتی تیلوں مثلاً روغن زیتون وغیرہ میں نہیں پائی جاتی۔ البتہ ڈبوں کے خشک دودھ میں ہوتی ہے۔ جو ولایت سے بند ہو کر آتے ہیں۔

حیاتین (ب) یہ زندگی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ غذا میں اس کی غیر موجودگی سے بچوں کی پرورش میں فوری کمی رونما ہوتی ہے۔ اور ہر عمر کے انسانوں یا حیوانوں کے اعصاب میں ایک قسم کا التہاب پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک خاص قسم کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کو مرض بیری بیری کہتے ہیں۔ چنانچہ حیاتین کی تمام تر تحقیقات مرض بیری بیری کی تحقیقات ہی کی رہین منت ہے۔ کیونکہ بیری بیری کی تحقیقات کے سلسلے میں ہی حیاتین کی موجودگی کا علم ہوا ہے۔ اور سب سے پہلے حیاتین (ب) معلوم کی گئی تھی۔ یہ حیاتین پانی میں حل ہو جاتی ہے اور تیز حرارت پہنچنے پر زائل ہو جاتی ہے۔ یہ تازہ اور خشک انڈوں سبز ترکاریوں۔ آلوؤں۔ گوشت۔ اور دودھ میں بھی پائی جاتی ہے۔ مچھلی تمام قسم کی چربیوں۔ میدے ٹینوں کی خوراکی اشیاء جو ولایت سے بند ہو کر آتی ہیں۔ ان میں اور ولایتی یخنیوں میں یہ حیاتین بالکل نہیں پائی جاتی۔ مکی۔ چاولوں اور گندم وغیرہ کے چھلکے میں یہ ہوتی ہے۔

حیاتین (ج) غذا میں اس کی غیر موجودگی ایک خاص قسم کا مرض اسکربطی (سکروی لثہ دامیہ) پیدا کر دیتی ہے یہ تازہ سبزیوں اور ترکاریوں مثلاً۔ کاہو۔ گوبھی۔ کرم کلا۔ مولی شلغم [illegible] کسی قدر آلو۔ [illegible] مثلاً لیموں۔ نارنگی وغیرہ اور سان کے رسوں میں پائی جاتی [illegible] بعض قسم کے گوشتوں اور غلوں میں بھی پائی جاتی ہے۔

حیاتین (د) یہ بھی حیاتین الف کی مانند ہوتی ہے اور دودھ مکھن۔ گھی۔ روغن ماہی وغیرہ میں بکثرت پائی جاتی ہے۔ اس کی عدم موجودگی بھی جسم کے نشوونما پر اثر انداز ہوتی ہے۔

حیاتین (ذ) غذا میں اس کی عدم موجودگی قابلیت تولید کو زائل کر دیتی ہے۔ چنانچہ جن عورتوں یا مردوں کی غذا میں یہ بالکل شامل نہیں ہوتی۔ ان کے ہاں بچے پیدا نہیں ہو سکتے یہ زیادہ ترکاہو۔ چنے کی دال۔ گندم کے چھلکوں۔ انڈے کی تازہ زردی۔ گائے کی کلیجی۔ روغن زیتون اور مغز پنبہ دانہ میں پائی جاتی ہے۔ دودھ میں یہ بالکل نہیں پائی جاتی۔

چھٹی قسم کی حیاتین ابھی زیر تحقیق ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ مرض بلاجرا اور دیگر کئی ایک خاص خاص امراض جو جنگ عظیم کے دوران میں خصوصاً ان اشخاص میں رونما ہوئے ہیں۔ جن کو دوران جنگ میں محدود غذا ملتی رہی ہے۔ خاص حیاتین کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے مزید تحقیقات میں ابھی اور کئی قسم کی حیاتین کا انکشاف ہو۔

ذیل کے نقشہ میں مختلف قسم کی اغذیہ میں حیاتین الف ب۔ ج۔ کی مقدار کے تناسب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ چنانچہ نشان تین جمع (+++) سے مراد یہ ہے کہ اس میں بہت عمدہ مقدار حیاتین ہے دو جمع (++) کا مطلب ہے کہ اس میں صرف عمدہ مقدار حیاتین ہے اور صرف ایک جمع (+) کا نشان اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس میں اچھی خاصی مقدار حیاتین ہے۔ ایک خانے میں عمدہ اجزائے [illegible] درج کیا گیا ہے۔ جن کے بغیر غذا کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

حیاتین الف		حیاتین ب	
کاڈ مچھلی کے جگر کا تیل	+++	مختلف قسم کے غلے	[illegible]
مکھن	++	خشک [illegible]	[illegible]
انڈے کی زردی	++		

[illegible]

[illegible] میوہ جات اور سبزیاں +
مغزیات ++
خمیرہ +++

[illegible] +

[illegible] ++

[illegible] وٹامن "ج" | عمدہ اجزائے لحمیہ
[illegible] جات خصوصاً لیموں۔ نارنج | گوشت۔
[illegible] ٹماٹر +++ | انڈے۔
[illegible] سیاہ بیری ++ | دودھ اور پنیر
[illegible] شلغم۔ آلو بخارا ++ | مچھلی
[illegible] جات +
[illegible] سبزیاں +++
[illegible] سبزیاں +++
[illegible] تک پکائی جائیں تو۔

[illegible] نقشہ دیا جاتا ہے۔ جس میں عام غذاؤں میں مختلف
[illegible] کیا گیا ہے۔ اس نقشہ میں پہلے نقشے سے بعض جگہ

....

[illegible] پائی جاتی ہے

[illegible]

[illegible]				
روغن دار مچھلی	++	–	[illegible]	[illegible]
عام مچھلی	–	++	–	[illegible]
انڈے کی زردی	++	++	–	++
مکھن	++	–	–	+
دودھ	+	+	+	+
پنیر	+	++	–	+
دودھ پلانیوالے جانوروں کے جسم کی چربی	+	–	–	–
مچھلی کے جسم کی چربی	–	–	–	+
پتلا اور نرم گوشت	–	+++	–	–
دل	+	++	–	–
دماغ	–	++	–	–
تازہ سبزیاں				
تازہ سبزیاں (کچی)	++	–	+++	بہت کم
تازہ سبزیاں (بغیر نمک کے تھوڑی دیر تک پکی ہوئی)	–	–	+	–
وہ سبزیاں جن کی جڑیں کھائی جاتی ہیں	–	+	–	–
گاجریں	++	–	++	–
شلغم	–	–	++	–
آلو (کچے)	–	+	–	–
آلو (اُبلے ہوئے)	–	–	+	–
میوہ جات				
ٹماٹر	++	[illegible]	+++	بہت کم
سنگترے۔ لیموں۔ اور انگور	–	[illegible]	+++	[illegible]
[illegible] بیری۔ بلیک بیری۔ آڑو				
[illegible] انناس	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible] سیب۔ بہت [illegible]				

حیوانی اغذیہ	ا (A)	ب (B)	ج (C)	د (D)
جوہر خمیر (پیسٹ)	-	++++	-	-
جوہر گندم (بمکس کا تیار کیا ہوا ویٹ جرم)	-	++++	-	-
غلے				
مٹر۔ باقلا۔ دالیں اور مغزیات	-	+++	-	-

حیوانی اغذیہ	ا (A)	ب (B)	ج (C)	د (D)
گندم۔ رائی۔ مکی۔ جو۔ چاول۔	-	++	-	-
گندم کا آٹا	-	+	-	-

اس تمام بحث کا لب لباب یہ ہے۔ کہ غذا میں مختلف قسم کی حیاتین کا ہونا ضروری ہے اور محافظانِ صحت کو ایسی غذائیں استعمال کرتے رہنے چاہئیں۔ جن میں مختلف قسم کی حیاتین پائی جاتی ہیں۔

(حکیم محمد حسن قرشی)

(ملاحظہ ہو بقیہ صفحہ ۶)

۴۴۵ ایک مجلس میں کم از کم بیس بار پڑھوایا گیا تھا۔ محمد اصطفا خاں بے حد خلیق۔ مہمان نواز اور کاروباری آدمی ہیں۔ آپ نے اپنے کارخانہ کو اتنی ترقی دی ہے۔ کہ ہندوستان بھر میں یہ فرد ہے۔ بلکہ یورپ کے بڑے بڑے کارخانوں کے مقابلہ میں فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کارخانہ کے عطر لاجواب اور بے مثل ہیں۔ اور صنعتِ عطر سازی کی ترقی اور بقا جناب اصطفا خاں صاحب کی مساعی جمیلہ کی مرہونِ منت ہے۔"

کرنال شاپ لاہور بلکہ پنجاب میں بوٹ شوز کی سب سے بڑی دکان ہے۔ شیخ صاحب کے بزرگوں کی اور آپ کی مساعی حسنہ کا نتیجہ ہے کہ کرنال شاپ لاہور میں نمونہ کی واحد دکان ہے۔ شیخ عبد المالک ایک مرنجاں مرنج سعادتمند نوجوان ہیں جنہیں اپنے کاروبار کی ترقی کا بہت ہی خیال ہے۔ کرنال شاپ کی خصوصیت ہے کہ ہر ناپ کے درجنوں فیشن کے بوٹ وہ بیک وقت پیش کر سکتے ہیں۔ اور اُن کے دام مارکٹ میں سب سے کم لئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب و ملت کے آدمیوں کی ایک بھیڑ کرنال شاپ میں موجود رہتی ہے۔ شیخ عبد المالک صاحب کو لکھنے پڑھنے کا بھی شوق ہے۔ آپ کا ایک مختصر مضمون کسی دوسری جگہ درج ہے۔

شیخ عنایت اللہ صاحب منیجنگ ڈائریکٹر تاج کمپنی لمیٹیڈ پنجاب کے وہ جوان ہمت جواں سال سرگرم کارکن ہیں جنہوں نے تاج کمپنی لمٹیڈ کو کامیابی کی منزل تک پہونچایا ہے۔ شیخ صاحب صبح سے لے کر رات تک برابر محنت کرتے رہتے اور اپنی ان تھک کوششوں سے کمپنی کو ایک منافع کے کاروبار میں لے آئے ہیں۔ آپ منتظم ہونے کے ساتھ خلیق و متواضع بھی ہیں۔ تاج کمپنی کی مطبوعات خصوصاً حمائل شریف ملک میں اتنی مقبول ہوئی ہے کہ کمپنی مانگ کو پورا کرنے سے بھی قاصر ہے۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔

شیخ مبارک علی لاہور کے بہت بڑے ناشر و تاجر ہیں۔ جنہوں نے کتابوں کی تجارت میں بہت نام پیدا کیا ہے۔ علامہ سر اقبال کی بیشتر ابتدائی تصنیفات شیخ صاحب ہی کے اہتمام میں شائع ہو کر مقبول ہوئیں۔ شیخ صاحب معاملہ فہم۔ زیرک اور نبض شناس بزرگ ہیں۔ آپ کی کاروباری قابلیت کا دُور دُور شہرہ ہے۔ قیمتی اور اچھی کتابیں شائع کرنا آپ کا ذوق رہا ہے۔ اور آپ بڑی دلیری اور جرأت کے ساتھ ہزاروں روپے کتابوں کی نشر و اشاعت پر صرف کر دیتے ہیں۔ گو آپ اہل قلم نہیں لیکن اہلِ قلم کے مسودات کو کتابوں کی صورت میں بدل دینا آپ کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔

۱۵

زنِ گذران

(اثر- پروفیسر سید عابد علی صاحب عابد ایم اے- ایل ایل بی)

(الفرو ڈایٹ جوانگریزی کی ایک نادر تصنیف ہے او ... جسے اندھی جوانی سے تشبیہہ دیجا سکتی تھی- اس کا ترجمہ سید عابد صاحب نے نہایت عرق ریزی سے کیا ہے ایک باب مطالعہ کیجئے اور اس کی دلچسپیوں کا اندازہ لگائیے- باب کا نام داستان رکھا گیا ہے -)

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا
چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی- اس کا سر شانے پر ایک طرف جھکا ہوا تھا- چاندنی رات میں وہ سنسان مہتابی پر محوِ خرام تھی- ایک بیقرار سایہ اس کے پاؤں کے پاس لرزاں تھا۔

دیمیطریس اسے بڑھتے ہوئے دیکھتا رہا- باریک کتاں میں سے اس کے جسم کا جو ذرا سا حصہ نظر آتا تھا- اس پر آڑے ترچھے جھول نظر آتے تھے- اس کی ایک کہنی تنگ قبا میں سے صاف اُبھری ہوئی نظر آتی تھی- دوسرے ہاتھ میں وہ شال کا لمبا دامن اُٹھائے تھی کہ خاک آلودہ زمین سے مس نہ ہونے پائے۔

زیوروں سے اس نے پہچانا کہ کیسی تھی- اور وہ سڑک چھوڑ کر [illegible] گیا- کہ سلام و کلام کا سلسلہ نہ شروع ہو جائے- وہ اس کی طرف [illegible] چاہتا تھا- اس کا ذہن زاگریس کے عظیم الشان مجسمے کے [illegible] زنِ گذران کا تعاقب کر رہی تھیں-

اس نے دیکھا کہ وہ رکی نہیں- اسے گویا دیمیطریس کے وجود کا علم ہی نہ تھا- اس نے کسی طرح اپنی کسی حرکت سے جھوٹ موٹ یہ بھی ظاہر نہ کیا کہ میں تماشائے دریا میں محو ہوں- یا یہ کہ میں اپنے خیالات میں مگن ہوں-

مختصراً سادہ الفاظ میں وہ کیسی اکیلی سیر کر رہی تھی- ٹھنڈی ہوا- تنہائی- خلوت اور خاموشی کی ہلکی سی گونج کے سوا وہ اور کسی چیز کی خواہشمند نہ تھی-

دیمیطریس چپ چاپ کھڑا رہا- اس کی طرف دیکھتا رہا- وہ حیرت سے ششدر رہ گیا- یہ عورت اب دور نکل گئی تھی- ایک بے پرواہ سایہ زرد کی طرح اور اس کا اپنا سایہ اس کے اپنے آگے آگے لرزاں تھا- ہر قدم پر وہ شاہراہ کی خاک پر اس کی چپلیوں کی ہلکی ہلکی آواز سن رہا تھا- وہ منار نور کے جزیرے تک گئی اور پھر وہاں کے پتھروں پر چڑھ گئی-

ناگاہ- گویا دیر سے اس نامعلوم عورت سے عشق ہے- دیمیطریس نے اس کے پیچھے بھاگنا شروع کیا- پھر ٹھہر گیا- واپس آیا- کانپنے لگا- اپنے آپ کو برا بھلا کہا- مہتابی سے لوٹ جانا چاہا- لیکن اس لئے آج تک اپنی قوتِ ارادی کو صرف حصولِ مسرت میں استعمال کیا تھا- اور آج جو ناگاہ اسے بلندیٔ اخلاق اور اپنی زندگی کی نظم و ترتیب کی خاطر اس چیز کو استعمال کرنے کی ضرورت آن پڑی تو [illegible] وہ کچھ نہ کر سکا اور اس کے [illegible] میں جم گئے-

ہر آن اس زنِ گذران کا خیال اسے ستا رہا تھا۔ اس لئے وہ دل میں اس اضطرابِ شدید کے لئے عذر تلاش کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے کہتا تھا:-

"میری دلبستگی۔ میری تحسین کی وجہ قطعاً و یکسر جمالیاتی ہے (کہ مجھے ہر خوبصورت چیز سے عشق ہے) یہ عورت جو گذری ہے اس مجسمے کے لئے کیا خوب نمونہ بن سکتی ہے۔ جو میں بنانا چاہتا ہوں یعنی پنکھیا والی عورت کل ہی شروع بھی کر دوں گا کام"۔

پھر ناگاہ اس کے خیالات میں انتشار پیدا ہوگیا۔ اور زرد لباس والی عورت کے متعلق اس کے ذہن میں اضطراب انگیز سوالات کا ایک ہجوم پیدا ہوگیا۔ اسوقت رات کو وہ یہاں کیا کرنے آئی؟ اپنا گھر چھوڑ کر۔ وقت گئے وہ کس کے لئے آئی؟

اس نے مجھے سلام کیوں نہیں کیا۔ اس نے یقیناً مجھے دیکھا تھا جب میں سڑک چھوڑ کر ہٹا ہوں تو اس نے مجھے ضرور دیکھا ہوگا۔ بغیر .... کسی لفظ کے وہ خاموش کیوں چلی گئی تھی؟ یہ افواہ گرم تھی صبح سے کچھ پہلے تاروں کی چھاؤں میں ٹھنڈے ٹھنڈے ... لئے آتی ہیں۔

لیکن لوگ منارِ نور کے پاس نہانے کے لئے نہیں آتے۔ وہاں پانی بہت گہرا ہے۔ علاوہ ازیں زیور پہن کر کون عورت نہانے جائے گی۔ غلط! پھر کیا چیز تھی۔ جس کی کشش اسے ریگائش سے لے آئی تھی۔ کسی سے ملاقات کا وعدہ؟ کیا وہ کسی نوجوان سے ملنے آئی تھی۔ جو تنوع کا بھوکا تھا۔ جس نے ان پتھروں کو اپنا عارضی بسترِ عشرت بنانا پسند کیا تھا۔ جو لہروں کی مسلسل ضربوں سے چمکدار و صاف ہوگئے تھے۔

دیمیطریس اپنے شکوک کو یقین کے درجے پر پہونچانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ کم عمر عورت خود ہی واپس آ رہی تھی۔ اس طرح دبے پاؤں چلتی۔ پنکھے سے مہتابی کی مٹی اڑاتی آ رہی تھی اور چاند کی ہلکی ہلکی سفیدی میں اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

وہ اور میں

(از جناب شیخ عبدالمالک صاحب)

وہ مجھ سے دور ہے۔ بہت دور۔ میرے اور اس کے درمیان کتنے جنگل پہاڑ اور دریا حائل ہیں۔ میں اس تک نہیں پہنچ سکتا ہوں۔ سارے وسائل سفر دنیا میں موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں اس سے دور ہوں۔ کیا میرے دل میں اس کی محبت نہیں رہی۔ یا اس میں کچھ کمی ہو گئی ہے۔ [illegible] امتحان کرنا چاہے تو میں اپنا سر پیش کر دوں۔ آہا۔ وہ تو میرے خانۂ دل میں کھڑا مسکرا رہا ہے۔ میں نے سمجھا تھا کہ وہ مجھ سے جدا ہوگیا۔ نہیں وہ مجھ سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ وہ بے وفا نہیں۔ میں کس قدر احمق ہوں کہ اس کی [illegible] بھلا رہا ہوں۔ وہ شاید میری اسی حماقت [illegible]

لا علمی

(از جناب حامد اللہ صاحب افسر)

علم اور واقفیت ایک نعمت ہے۔ اس کے بغیر انسانیت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ لیکن اگر غور کرکے دیکھو تو لاعلمی اور عدم واقفیت اس سے بھی بڑی نعمت ہے اور اس کے بغیر زندگی کی تکمیل نہیں ہوتی۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں اور جن چیزوں سے ہمیں واقفیت ہے اس سے کہیں زیادہ اہمیت ان چیزوں کو حاصل ہے۔ جن کا ہمیں مطلق علم نہیں۔

زندگی صدہا رازوں کا مخزن ہے۔ خود زندگی ایک راز ہے جتنا علم بڑھتا جاتا ہے۔ واقفیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اتنا ہی زندگی کا لطف کم ہوتا جاتا ہے۔ عدم واقفیت اور لاعلمی زندگی کا سہارا ہے۔ جب ہمیں کسی چیز سے واقفیت ہو جاتی ہے تو اس چیز کے اندر پھر ہمارے لئے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ اپنے بچپن کا زمانہ یاد کرو۔ تمہیں بارہا ایسا اتفاق ہوا ہوگا۔ کہ رات کے وقت گھر واپس آتے ہوئے اندھیرے میں کچھ سفید سفید متحرک چیز نظر آ رہی ہے جبتک تمہیں یہ نہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ کیا چیز ہے۔ دل میں کیسے عجیب وغریب دھڑکے محسوس ہوئے ہوں گے۔ ممکن ہے کوئی بھوت ہو۔ ممکن ہے کوئی آدمی چھپا کھڑا ہو۔ لیکن جب تمہیں معلوم ہوگیا کہ درخت کی ایک نیچی شاخ پر کسی نے چادر سوکھنے کے لئے لٹکا دی ہے۔ جو ہوا سے ہل رہی ہے تو تمہاری ساری دلچسپی زائل ہو گئی۔

تم ایک شعبدہ باز کا تماشہ دیکھتے ہو۔ وہ ٹوکری میں کبوتر بند کر دیتا ہے اور جب ٹوکری اٹھاتا ہے تو کبوتر غائب ہوتا ہے۔ مٹھی میں تمہارے سامنے ایک روپیہ رکھتا ہے اور جب مٹھی کھولتا ہے روپیہ غائب ہوتا ہے۔ تمہیں ان حرکتوں میں صرف اسی لئے لطف آتا ہے کہ تم [illegible] ہے۔ [illegible] شعبدوں کی ترکیب معلوم ہو جائے۔ تو پھر کوئی دلچسپی باقی نہ رہے اور تم اس کے حیرت انگیز کارنامے دیکھنے کے لئے روپیہ صرف نہ کرو۔

زندگی کے ہر دور میں جن چیزوں سے ہم واقف نہیں ان کی اہمیت ان چیزوں سے کہیں زیادہ ہے۔ جن سے ہم واقف ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا واقعہ ہونیوالا ہے۔ کاروبار میں تجارت میں کسی بڑے سے بڑے ماہر کو بھی معلوم نہیں کہ کل بازار کا کیا رنگ ہوگا۔ کون جانتا ہے کہ موسم کی کیفیت اگلے دن کیا ہوگی۔ کسے معلوم ہے کہ آب وہوا کا کل کیا حال رہے گا۔ ہم دوست بناتے ہیں۔ لیکن نہیں جانتے کہ وہ کیسے ثابت ہوں گے۔ ہم ان سے نباہ بھی سکیں گے یا نہیں۔ ہم شادی کرتے ہیں۔ لیکن نہیں کہہ سکتے کہ وہ خانہ آبادی کا سبب ہوگی یا خانہ بربادی کا۔ زندگی کا اعتبار نہیں۔ موت کا راز کسی کو معلوم نہیں۔ موت کے بعد کون جانتا ہے کیا ہوگا بس ایک غیر محدود سلسلہ ان اشیاء کا ہمیشہ ہمیں گھیرے ہوئے ہے جن سے ہم بالکل واقف نہیں۔

نامعلوم اشیاء سے لوگ ڈرتے ہیں کہتے ہیں کہ پردۂ غیب سے خدا جانے کیا ظہور میں آئے۔ لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ خداوند کریم نے دنیا میں "معلوم" اشیا کی بہ نسبت "نامعلوم" اشیاء زیادہ پیدا کی ہیں۔ پس ہو نہیں سکتا کہ وہ انسان کی بہتری کے لئے نہ ہوں اگر ذرا غور کرو تو معلوم ہوگا کہ زندگی میں جسقدر بہتر اور راحت بخشنے والی چیزیں ہیں ان سب کی بنا عدم واقفیت پر ہے اور وہ سب پردۂ غیب سے ظہور میں آئی ہیں۔ صحیح معنوں میں عقلمند اور دانا وہی شخص ہے جو نامعلوم اشیاء کی اہمیت سے آگاہ ہے [illegible]

[illegible] علم اور واقفیت بڑھتا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب
انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنا علم نہیں ہے۔ جو کچھ ہم جانتے
ہیں وہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو ہم نہیں جانتے تو اس میں
عجز و انکسار پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہی علم اور عرفان کی طرف پہلا
قدم ہے۔

عدم واقفیت کا احساس عقل و دانائی کی ابتدا ہے۔ بالکل
ایسے ہی جیسے واقفیت پر غرور دماغی ترقی کے لئے آخری حد ہے
تم نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ سطحی ہوتے ہیں اور جن کا دماغی سرمایہ
جہالت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہی سب سے زیادہ اپنے علم و
عقل پر غرور کرتے ہیں۔ اور بانگ دہل اس کا اعلان اور جنہیں
خدا نے صحیح معنوں میں علم حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے اور
جو اس دولت سے مالا مال ہیں وہی سب سے پہلے اپنی تنگ سامانی
اپنی تہی دستی اور اپنی محدود واقفیت کو تسلیم کرنے کے لئے
آمادہ نظر آئیں گے۔

شاید دنیا میں سب سے بڑا عقلمند سقراط تھا۔ اور جانتے
ہو اس کا تکیہ کلام کیا تھا۔ "میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔"

کبھی تم نے کشش ثقل کے مسئلہ پر عالمانہ غرور سے جدا رہ کر
غور کیا ہے۔ مادہ کے ہر ذرہ میں کوئی ایسی چیز ہے جو مادہ کے ہر دوسرے
ذرہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہی چیز یہی قوت اجرام فلکی کو ایک
نظام میں وابستہ کئے ہوئے ہے۔ اور خدا کی زمین کے ہر جزو پر
اپنا تسلط اور قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ لیکن نیوٹن بھی جس نے ہمیں بتایا
کہ سیب زمین پر اس لئے گرتا ہے کہ ہر مادی چیز دوسری مادی چیز کو
اپنے حجم اپنے وزن اور فاصلے کی نسبت سے اپنی طرف کھینچتی ہے
اس امر سے واقف نہیں ہے کہ یہ قوت اصل میں ہے کیا؟ بالکل اسی
طرح جس طرح وہ بچہ اس قوت سے آگاہ نہیں جو کہتا ہے کہ سیب
اس لئے زمین پر گرتا ہے کہ وہ بھاری ہے۔ اور شاید اس کا بار
نہیں سنبھال سکتی۔
[illegible]

دوسری طرف [illegible]
میں میلوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ ایک تار [illegible]
فاصلے پر گھر بیٹھے بات چیت کرتے ہیں بلکہ [illegible]
بھی گفتگو کرتے ہیں۔ ہزار ہا کوس کے فاصلے پر بیٹھے [illegible]
سنتے ہیں۔ موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ [illegible]
جدید کی روح رواں ہے۔ لیکن کوئی نہیں جانتا کہ بجلی ہے کیا۔

زندگی ایک قوت ہے۔ ایک طاقت ہے [illegible]
ہے۔ جس سے زیادہ اور کوئی چیز ہم سے قریب نہیں۔ لیکن [illegible]
جانتا ہے۔ کہ زندگی ہے کیا چیز۔ وہ کہاں سے آتی ہے اور
کہاں کو چلی جاتی ہے۔ آج تک کوئی سائنسداں زندگی کو [illegible]
میں نہیں لا سکا۔ کسی نے ایک حقیر سے حقیر کیڑا بھی پیدا کر کے نہیں
دکھایا۔ اور نہ کبھی دکھا سکے گا۔

زندگی سربستہ رازوں والی قوت کا وہ سرچشمہ ہے [illegible]
عدم واقفیت اور لاعلمی کی نامعلوم وسعت سے ہم تک [illegible]
جب تک وہ ہمارے جسم میں ہے ہم بڑھتے رہتے ہیں۔ جب [illegible]
ہمارے جسم کو چھوڑ دیتی ہے وہ سڑ جاتا ہے۔ ہم اسے اپنے جسم سے
ایک چاقو یا زہر کے ذریعہ خارج کر سکتے ہیں۔ فرض کیجئے ہم [illegible]
بڑھا گھٹا بھی سکتے ہیں۔ لیکن ہم زندگی کو پیدا نہیں کر سکتے

بس یہ سب چیزیں جن پر دنیا کی مشین چل رہی ہے [illegible]
ثقل بجلی۔ زندگی ہمارے لئے ایک معمہ ہیں۔ ہم ان کی [illegible]
کچھ نہیں جانتے۔ لیکن اس کے باوجود یہی دنیا کی اہم ترین چیزیں
ہیں۔ انہیں پر نسل انسانی کا دارومدار ہے۔ جن چیزوں کا [illegible]
پورا علم ہے وہ نہایت غیر اہم معمولی اور سطحی ہیں۔ [illegible]
ہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اس کا جاننا [illegible]
ہے۔ اگر نہ جانیں تو بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ [illegible]
مضمون میں کل کتنے الفاظ ہیں لیکن کس کو [illegible]
باتوں کی طرف توجہ کیجئے اور [illegible]

…ملک ہے۔ جو خدا جانے کتنی مہمات کی سرمایہ دار ہے۔ …کولمبس کی طرح "آج" کے جہاز پر کھڑے ہیں۔ اور …نامعلوم اور تاریک سمندر کے سفر پر کمربستہ ہیں۔

جوانی میں کیف ہے۔ دلچسپی ہے۔ بڑھاپے میں کوئی لطف …کوئی دلچسپی نہیں صرف اس لئے کہ جوان کے سامنے مستقبل کی …نامعلوم وسعت ہے۔ اس لئے کہ بوڑھے آدمیوں کی معلومات …ہے۔ وہ بہت سی چیزوں سے واقف ہیں یا کم سے کم وہ …سمجھتے ہیں۔ اسی لئے وہ نامعلوم اشیاء میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں …اسی لئے زندگی کا سارا لطف غارت ہو جاتا ہے۔

موت بھی نامعلوم وسعتوں کا ایک دروازہ ہے۔

کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس دروازہ کے اس طرف کیا ہے۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ موت ہمارے متعلق ہمارے لئے تمام چیزوں کا خاتمہ ہے۔ یا فرض کرو ہمارے لئے ڈانٹے کا بہشت یا گوتم کا نروان ہے۔ تو موت کے سربستہ رازوں اور اس کی پوشیدہ قوتوں کا ہم پر کوئی اثر نہ رہے۔ اور ہم اسے ایک معمولی چیز سمجھنے لگیں۔ صرف اس لئے کہ ہم موت کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ اس سے بالکل واقف نہیں ہیں۔ صرف اس لئے کہ ہم موت کے دروازے سے نامعلوم وسعتوں کی سرزمین میں داخل ہوتے ہیں۔ ہمارے لئے وہ ایک زبردست معمہ ہے۔ کسی قدیم یونانی حکیم کا مقولہ ہے۔ "کسے معلوم ہے کہ یہ زندگی اصل میں موت ہی ہو اور جسے ہم موت کہتے ہیں وہ زندگی ہو۔"

(حامد اللہ افسر)

موسیقار

(ایک منثور نظم)

(از جناب غلام عباس صاحب۔ ایڈیٹر اخبار پھول لاہور)

جب موسیقار ہزار برس کا ہوگیا۔ اور اپنے آشیانے میں اپنے ہی گیتوں کی لگائی ہوئی آگ سے جل کر راکھ ہوگیا۔ تو جنگل کے سب چھوٹے بڑے پرند جو اس کی آواز پر فریفتہ تھے۔ اور ہر روز اُس کے عجیب وغریب نغمے سُنا کرتے تھے۔ اس کے آشیانے کے جواب ایک تودۂ خاک تھا۔ ارد گرد سرنگوں ہوکر بیٹھ گئے۔ اور اس کی خاکستر کو جو آتشِ نغمہ سے ابھی تک گرم تھی۔ اپنے آنسوؤں سے ٹھنڈا کرنے لگے۔

اتنے میں ہوا کا ایک سرمست جھونکا منڈلاتا ہوا اِدھر آنکلا۔ اور اس کی خاک کو دیوانہ وار اِدھر اُدھر بکھیرنے لگا۔

یہ دیکھ کر سب پرندوں نے باہم اپنے پروں کو پھیلا لیا۔ اور اُس کی خاک کو ان کے نیچے چھپا لیا۔ پھر وہ بڑی منت سماجت سے ہوا کے جھونکے سے کہنے لگے "کم از کم آج کے دن کے لئے تو اس مشتِ غبار کو ہمارے پاس رہنے دو۔ تم نہیں جانتے۔ نہیں جان سکتے۔ کہ وہ ہمیں کس قدر عزیز تھا۔"

ہوا کے جھونکے نے کہا "اچھا یونہی سہی۔ تمہاری بات مانے لیتا ہوں۔ لیکن تم اس کی موت پر اس قدر غمگین کیوں ہو؟"

....

....

عقاب بولا۔ "اس کے مدھ ماتے گیت مجھے اپنی تندی اور خونخواری بھلا دیتے تھے۔"

چڑیا نے کہا "جب وہ گاتا تھا۔ میں بھول جاتی تھی۔ کہ میں چڑیا ہوں۔ میرے خیالات عقاب کی طرح بلند پرواز ہو جاتے تھے۔"

جھونکے نے کہا۔ "یہ سچ ہے۔ کہ اس کے گیتوں سے تمہیں خوشی حاصل ہوتی تھی۔ لیکن وہ اپنے گیت تمہیں خوش کرنے کے لئے نہیں سناتا تھا۔ بلکہ ان کے پردے میں وہ اپنی شکم پری کیا کرتا تھا جب اس کے جادو بھرے گیت سُن کر تم پر بے خودی طاری ہو جاتی تھی۔ تو وہ چپکے سے تم میں سے ایک دو کو پکڑ کر نوالہ بنا لیتا تھا۔"

یہ سُن کر ایک ننھی سی شاما نے پوچھا "کیا وہ سچ مچ پرندوں کو کھا لیا کرتا تھا؟"

ہوا کے جھونکے نے کہا۔ "ہاں لیکن مدہوشی میں تمہیں خبر نہ ہونے پاتی تھی۔"

شاما نے ایک سرد آہ بھری اور کہا۔ "خوش نصیب تھے وہ پرند جنہیں موسیقار نوالہ بنا گیا۔ کیونکہ انہیں اس وقت اُس کی موت اور جدائی کا غم تو نہیں سہنا پڑا۔"

(طبعزاد)

چڑیا چڑے کی کہانی

(از جناب خواجہ حسن نظامی)

حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان جانوروں سے کچھ محبت ہوگی مجھے تو ان کی شرارتیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ جب دیکھو ایک نہ ایک سر پر موجود۔

سب سے زیادہ بد ذات یہ چڑا ہے۔ غسل خانہ میں گھونسلا بنایا کرتا تھا۔ اگلے میں نے کہا۔ میاں یہ موروثی جگہ نہیں ہے۔ اس دفعہ کہیں اور جاکر رہو۔ سنے کون عذر یہ کہ آدمی کی بولی نہیں سمجھتا سب کچھ سمجھتا ہے۔ اشارے تک جانتا ہے۔ مگر یہ خیال کرتا ہے کہ میاں ننھی ننھی جانوں کو مار کر کھا جانے والے مسلمان نہیں ہیں جتنا بھی سر چڑھوں کچھ نہ کر سکیں گے غسل خانہ کو ذرا دیکھو۔ تو طاق میں سے صابن پھینکا۔ کھلی پھینکی۔ ٹب میں بیٹ کی۔ لوٹے میں غوطے لگائے اور تولیہ کا تو دشمن ہے۔ سارے تلگے نکال ڈالے۔ اور اپنے موذی ابن موذی فرزند ارجمند کے نیچے لے جاکر بچھا دیئے۔

خیر میں نے صبر کر لیا۔ بچوں کا خیال کر کے چپ ہو گیا۔ وہ بڑے ہو کر اڑ گئے تو ان حضرات نے دوسری تیاری شروع کی۔

ارے بھائی کیوں دنیا کی آبادی بڑھاتا ہے۔ تجھے کیا ان چڑیا زادوں کو لڑائی پر بھیجنا ہے۔ نہیں مانتا۔ گھونسلے میں تنکے اور پر بھرے چلا جاتا ہے۔

آج آٹھ دن ہوئے میں نے غسل خانہ بند کر دیا۔ دروازہ بند کر کے یہ دونوں خصم جورو کچھ دیر تو چڑچڑاتے رہے۔ اور پھر [illegible] گئے۔ میں نے کہا چلو پاپ کٹا۔

[illegible] چڑے صاحب [illegible] ذات [illegible] (تو ہین) سمجھ کر اس نے ادھر کا رُخ نہ کیا۔ لیکن چڑا بے حیا مغرب تک غل مچاتا رہا۔ سورج چھپا تو چھت گیری میں جا گھسا۔ یہ خیال نہ کیا چڑیا رات کے وقت کہاں چلی گئی نازک زمانہ ہے۔ اکیلا چھوڑنا ٹھیک نہیں مگر اس کو ملک (گھر) کی پڑی ہوئی تھی۔ بیوی کی اس نے پروا بھی نہ کی۔ صبح ہوئی تو چڑیا ایک اور چڑے کے ساتھ آئی اور منڈیر پر بیٹھ کر چڑچوں چڑچوں چوں چوں کی آواز لگائی۔ یہ بے غیرت بلبلا کر دوڑا اور چڑیا کے برابر جا بیٹھا۔ یہ نہ پوچھا کہ کیوں ری ساتھ میں کون ہے اور رات تو نے کہاں گذاری مگر نہیں پھر وہی راز۔ وہی نیاز۔ رقیب چڑا اڑ گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد چڑیا بھی غائب ہو گئی۔ اب پھر میری شامت آئی۔ سامنے آن بیٹھا اور لگا طرح طرح کی آوازیں نکالنے۔ لڑتا ہے۔ گالیاں دیتا ہے کوستا ہے۔ آخر تو کیا کہتا ہے۔ میں غسل خانہ تو ہرگز نہ کھولونگا۔

میں نے بھی ایسا مستقل مزاج نہیں دیکھا۔ برابر آٹھ دن اس نے ایجی ٹیشن جاری رکھا۔ آخر آج بوقت عصر میں نے اپنی ضد کے ہتھیار چڑے کے سامنے ڈال دیئے اور غسل خانہ کھول کر اس کو گھر میں جانے کی اجازت دیدی۔

اب مس چڑیا کی کہانی سنئے

ایک چھوٹے چڑیا نے [illegible] کی ایک اونچی کوٹھی میں اپنا گھونسلا بنایا تھا۔ اس کوٹھی میں ایک مسلمان رہتے تھے جو ولایت سے بیرسٹری پاس کر کے اور ایک میم کو ساتھ لے کر آئے تھے۔ ان کی بیرسٹری کی [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] کی طرف سے بس بابا تھی۔

چڑے چڑیا نے کھپریل کے اندر ایک سوراخ میں گھر بنایا تنکوں اور سوت کا فرش بچھایا۔ یہ سوت پڑوس کی ایک بڑھیا کے گھر سے چڑیا لائی تھی۔ وہ بیچاری چرخا کاتا کرتی تھی۔ اُلجھا ہوا سوت پھینک دیتی تو چڑیا اٹھا لاتی۔ اور اپنے گھر میں اس کو بچھا دیتی۔

خدا کی قدرت ایک دن انڈا پھسل کر گر پڑا اور ٹوٹ گیا ایک ہی باقی رہا۔ چڑے چڑیا کو اس انڈے کا بڑا صدمہ ہوا۔ جس دن انڈا گرا ہے تو چڑیا گھونسلے میں تھی۔ چڑا باہر دانہ چُگنے گیا ہوا تھا۔ وہ گھر میں آیا تو چڑیا کو چُپ چُپ اور مغموم دیکھ کر سمجھا میرے دیر میں آنے کے سبب خفا ہو گئی ہے۔

لگا پُھدک کر چوں چوں۔ چیں۔ چڑچوں۔ چیں۔ چڑچوں۔ چوں۔ چڑاچوں۔ چڑچوں۔ چوں۔ کرنے کبھی چونچ مار کر گُدگُدی کرتا کبھی خود اپنے پروں کو پھلاتا۔ ناچتا۔ مٹکتا اور چڑیا کی چونچ پر اپنی چونچ محبت سے رکھتا۔ مگر چڑیا اسی طرح پھولی اُبھری خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے مردذات کی خوشامد کا کچھ بھی جواب نہ دیا۔ چڑا سمجھا بہت ہی خفگی ہے۔ مزاج حد سے زیادہ بگڑ گیا ہے خوشامد سے کام نہ چلے گا۔ مجھ مرد کی کتنی بڑی توہین ہے کہ اتنی دیر خوشامد درآمد کی۔ بیگم صاحبہ نے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ یہ خیال کر کے چڑا بھی مُنہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ اور چڑیا سے بے رُخ ہو کر نیچے برآمدہ جھانکنے لگا۔ جو اپنی لیڈی کے سامنے آرام کرسی پر لیٹے تھے۔ اور ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ چڑے نے خیال کیا یہ آدمی کیسے خوش نصیب ہیں [illegible] دونوں کا جوڑا خوش و بشاش زندگی کاٹ رہا ہے۔ ایک میں بدنصیب ہوں۔ سویرے کا گیا دانہ چُگ کر اب گھر میں گھسا ہوں۔ مگر [illegible] نہیں ہے۔ کاش میں [illegible]

[illegible] کر کے [illegible] گیا۔

انڈے کی خبر سے پہلے تو چڑے کو بڑا [illegible] صدمہ کو دبا کر کہا۔ تم کہاں چلی گئی تھیں۔ انڈا کیوں کر گر پڑا [illegible] کہا میں اُڑ کر ذرا چمن کی ہوا کھانے چلی گئی تھی۔ پیچھے سے [illegible] گیا۔ یہ بیان سُن کر چڑا آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کے [illegible] میں طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کڑک دار گرجتی ہوئی [illegible] چوں میں کہا۔ پھوڑ۔ بدسلیقہ۔ بے تمیز تو کیوں اڑی تھی۔ تجھ کو چمن کی ہوا کے بغیر کیا ہوا جاتا تھا۔ کیا تو بھی اس گوری [illegible] خصلت سیکھتی ہے جو گھر کا کام نوکروں پر چھوڑ کر ہوا خوری [illegible] پھرتی ہے۔ تو ایک چڑیا ہے تیرا کوئی حق نہیں ہے کہ بغیر میری [illegible] باہر نکلے۔ تجھ کو میرے ساتھ اُڑنے اور ہوا خوری کرنے کا حق [illegible] آج کل تو انڈوں کی نوکر تھی۔ تجھے یہاں سے ہٹنے کا اختیار [illegible] تو نے میرے ایک انڈے کا نقصان کر کے اتنا بڑا قصور کیا ہے کہ [illegible] بدلہ کچھ نہیں ہو سکتا تو نے میرے بچے کو جان بوجھ کر مار ڈالا۔ [illegible] خدا کی امانت کی قدر نہ کی جو اس نے ہم کو نسل بڑھانے کی [illegible] دی تھی۔ میں تو پہلے دن منع کرتا تھا کہ اری کمبخت اس کوٹھی [illegible] گھونسلا نہ بنا۔ ایسا نہ ہو۔ ان لوگوں کا اثر ہم پر بھی پڑ جائے [illegible] بیچارے پرانے زمانہ کے دیسی چڑے ہیں۔ خدا ہم کو [illegible] چڑیا چڑے سے بھی بچائے رکھے۔ کیونکہ پھر گھر کے رہتے ہیں [illegible] مگر تو نہ مانی۔ اور کوٹھی میں رہوں گی۔ کوٹھی میں گھر بناؤں گی [illegible] میرا ناک میں دم کر دیا۔ اب لا میرا بچہ لا۔ میں تجھ سے [illegible] مارے ٹھونگوں کے بھُلا بنا دوں گا۔ بڑی صاحب نکلیں [illegible] کھانے۔ اب بتاؤں تجھ کو ہوا کھانے کا مزہ۔ چڑیا [illegible] غم میں چُپ چاپ چڑے کی باتیں سنتی رہی۔ لیکن جب [illegible] بڑھا تو اس نے زبان کھولی اور کہا۔

بس بس تھم جا۔ بگڑ چکے۔ زبان کو [illegible]

[illegible]

...ے ۔ دو پہر میں گھر کے اندر گھسے ہیں اور آسے تو ... کے آ گئے ۔ انڈا اگر پڑا میرے پنجہ کی نوک سے ۔ میں کیا کروں ... انڈوں کی خاطر اپنی جوان جہان جان کو گھن لگا لوں ۔ دو ... گھری باہر کی ہوا بھی نہ کھاؤں ۔ صبح سے یہ وقت آیا ایک دانہ حلق سے نیچے نہیں گیا ۔ تم نے جھوٹے منہ سے یہ نہ پوچھا کہ تو نے کچھ تھوڑا کچھ ... کھایا مزاج ہی دکھانا آتا ہے ۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ اکیلی چڑیا پر سب بوجھ تھاما ہے۔ آزادی اور برابری کا وقت ہے ۔ آدھا کام تم کرو ۔ آدھا میں کروں ۔ دیکھتے نہیں میم صاحبہ کو وہ تو کچھ بھی کام نہیں کرتیں ۔ صاحب کو سارا کام کرنا پڑتا ہے ۔ اور بچہ کو آیا کھلاتی ہے ۔ تم نے ایک آیا رکھی ہوتی ۔ میں تمہارے انڈے بچوں کی آیا نہیں ہوں ۔

چڑیا کی اس تقریر سے چڑا سُن ہو گیا ۔ اور کچھ جواب نہ بن پڑا بیچارہ غصہ کو پی کر پھر خوشامد کرنے لگا ۔ اور اُس دن سے چڑیا کے ساتھ آدھی خدمت انڈے کی بانٹ کر اس نے اپنے ذمہ لے لی ۔

مس چڑیا کی پیدائش

ایک انڈا تو ٹوٹ چکا تھا دوسرے انڈے سے ایک بچہ نکلا جو مادہ یعنی چڑیا تھی ۔ جب یہ بچہ ذرا بڑا ہوا اور اس نے میم صاحبہ کے بچہ کو دیکھا کہ وہ کاٹ کے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے ۔ گھڑی گھڑی دودھ پیتا ہے ٹب میں بیٹھ کر نہاتا ہے ۔ نئے نئے خوبصورت کپڑے پہنتا ہے ۔ تو اس چڑیا زادی نے بھی باپ سے کہا ۔

چیں چیں ۔ چیں ۔ ابا مجھ کو بھی گھوڑا منگا دو ۔ ابا میں بھی ٹب میں نہاؤنگی ۔ ابا مجھ کو بھی ایسے رنگ برنگ کے کپڑے لا کر دو ۔ چڑے نے چڑیا سے کہا ۔ لے سُن ۔ دیکھا مزہ کوٹھی میں گھر بنانے کا ایسا اپنی لاڈلی کے واسطے گھوڑا ۔ ٹب منگا ۔ کپڑے بنا ۔

چڑیا نے کہا ۔ دیکھو پھر وہی لڑائی کی باتیں نکالیں ۔ ایک کی تو تمہاری اس کل کل سے جان گئی ۔ یہ نگوڑی بچی ہے ۔ تم اس کو بھی نہیں دیکھ سکتے ۔ بچہ ہے کہنے دو یہ کیا جانے ۔ ہم غریب ہیں ۔ اور یہ چیزیں نہیں لا سکتے ۔ بڑی ہو گی تو آپ سمجھ لے گی کہ چڑیوں کو آدمیوں کی ریس سے کیا سروکار ۔ مس چڑیا نے ماں کی بات سُن کر کہا ۔ واہ بی اماں واہ تم غریب تھیں ۔ تم چڑیا تھیں تو اس امیر کی کوٹھی میں آ کر کیوں رہی تھیں ۔ گاؤں کے چھپر میں گھر بنایا ہوتا ۔ میں تو ہرگز نہ مانونگی ۔ اور میم صاحبہ کے بچہ کی سی سب چیزیں منگا کر رہوں گی ۔ نہ لاؤ گی تو لو میں گرتی ہوں اور مرتی ہوں ۔ باپ کاٹے دیتی ہوں ۔ نہ زندہ رہوں گی نہ تم پر میرا بوجھ ہو گا ۔

چڑے چڑیا نے گھبرا کر کہا ۔ ہے ہے ۔ ایسا غضب نہ کیجیئو ۔ اچھا اچھا ہم سب کچھ منگا دیں گے ۔ یہ کہکر اور مس چڑیا کو دلاسہ دے کر دونوں نے چونچ سے چونچ ملائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا ۔ روتے تھے اور یہ کہتے تھے ۔ ہائے اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے ۔ اور بُروں کی صحبت بُرا کر دیتی ہے ۔ یہ بیرسٹر صاحب اچھے سہی مگر ان کی صحبت سے ہمارا تو ستیاناس ہو گیا ۔ ہائے ہماری لاڈلی ہاتھوں سے نکل گئی ۔ ہائے یہاں تو اور کوئی چڑیا بھی نہیں جو ہمارے دُکھ میں شریک ہو ۔ چڑے چڑیا روتے تھے ۔ اور مس چڑیا قہقہہ لگاتی تھی ۔ کہ نئے زمانہ کی اولاد ایسی ہی ہوتی ہے ۔

(حسن نظامی)

ایک اہم اعلان

دی گریٹ ایسٹرن موویٹون لمیٹڈ لاہور

وطن پرست مہاراجگان بڑے بڑے سرمایہ داروں۔ ماہرین اقتصادیات اور صنعت فلم سازی کے مشہور شہسواروں کی ...

کا فخر حاصل کر لیا ہے

منظور شدہ سرمایہ ۲۵ لاکھ روپیہ جو ایک لاکھ پچیس ہزار حصص پر بحساب بیس روپیہ فی حصہ منقسم ہے۔ جاری شدہ سرمایہ ۱۰ لاکھ روپیہ

ادائیگی:- پانچ روپیہ فی حصہ ہمراہ درخواست اور پانچ روپیہ فی حصہ بوقت الاٹمنٹ

چیرمین:- کپتان ہز ہائنس راجہ سر جوگندر سین بہادر۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ راجہ آف منڈی

وائس چیرمین:- ہز ہائنس مہاراجہ راجندر پرکاش بہادر آف سرمور

بورڈ آف ڈائرکٹران

(۱) آنریبل رائے بہادر لالہ رام سرنداس۔ سی۔ آئی۔ ای ممبر کونسل آف سٹیٹ لاہور

(۲) لفٹیننٹ کرنل سر ہنری گڈنی ناٹ ایم۔ ایل۔ اے آئی۔ ایم۔ ایس (ریٹائرڈ) کلکتہ

(۳) خانبہادر میاں احمد یار خاں چیف آف دولتانہ۔ ایم۔ ایل۔ سی

(۴) پنڈت کرشن بل بار ایٹ لا۔ چیرمین امرتسر ڈسٹلری کمپنی لمیٹڈ۔

چیرمین یونیورسل پکچرس لمیٹڈ و ریگل تھیٹر لمیٹڈ - لاہور

(۵) مسٹر دل سکھ ایم پنچولی منیجنگ پارٹنر۔ "امپائر ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز"

دی پلازا لاہور۔ اینڈ ایکز بیوٹر و ڈسٹری بیوٹرز و انڈین فلمز۔

(۶) مسٹر کے۔ ایس۔ ڈاور (ایسوسی ایٹڈ انجنیرز شیفلڈ) انگلینڈ

پروپرائٹر دی ریجنٹ پیلس گوجرانوالہ۔

(۷) کنور شوپال ہوم منسٹر منڈی سٹیٹ۔

حصہ داران میں سے

(۱) سر سی۔ پی۔ راماسوامی آئر۔ کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ سابقہ ممبر ...

ایگزیکٹو کونسل۔

(۲) سر جوزف بھورے۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ سی۔ بی ...

آئی۔ سی۔ ایس۔

(۳) راجہ سر دیاکشن کول۔ کے۔ بی۔ ای۔ سی۔ آئی۔ ای۔

(۴) نواب سر لیاقت حیات خاں۔ کے۔ ٹی۔ او۔ بی۔ ای

(۵) راول سنگرام سنگھ جاگیردار آف ساموو جے پور

(۶) سری کرشن دیوا مہارگوا آف اپر انڈیا شوگر ملز ...

(یو۔ پی)

(۷) مسٹر موہن چند تیواری ریج چیف کورٹ ...

بورڈ آف ڈائرکٹرز لاثانی ہے (سول اینڈ ملٹری گزٹ)

اس عظیم الشان کمپنی کا مستقبل شاندار ہے۔ (ٹریبون)

گریٹ ایسٹرن موویٹون لمیٹڈ ...

اس کمپنی کا ...

کمپنی کا سرمایہ تیزی سے بڑھ رہا ہے

محفوظ اور نفع بخش تجارت میں سرمایہ لگانے والے اصحاب پتہ ذیل پر خط و کتابت ...

رجسٹرڈ دفتر:- دی مال ...

ضیاپاش

(ازجناب صاحبزادہ محمد عمر صاحب بی اے جموں)

بمبئی میں دکانوں کی اور دکانوں میں مال و منال کی کثرت ایسی
ہے کہ خواہ کتنی فصاحت سے کام لیں مگر یہ بیان واقف کاروں کی
میں مبالغہ کی حد تک نہیں پہنچتا۔ پھر بھی دولھا بھائی فرامجی جوہری کی
ان ایسے نوادر روزگار کا مجموعہ ہے کہ اس کے ذکر خیر میں لاکھ سادگی
دیانت برتیں کہنے والے یہی کہیں گے کہ تصنع ہے۔ تکلف ہے۔
رانہ بلند پردازی ہے وغیرہ وغیرہ۔ آپ ہی بتائیے کہ جس دکان پر
ع سے غروب تک اور غروب سے طلوع تک نیلے پردے پڑے رہیں۔
دکان میں کوئی گاہک آتا جاتا نہ دکھائی دے۔ جو دکان اس ملبوا
ارت سے محروم ہو۔ جسے عرفِ عام میں "بورڈ" کہتے ہیں۔ اس کے
علق کون باور کرے گا کہ اگر یہ بمبئی کی سب سے بڑی دکان نہیں تو
ہے کم اس شہر کی ڈائرکٹری مکمل نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس پر اس
الک کا نام نہ چڑھے۔ کون مانے گا کہ اس کی ساکھ یورپ کی بڑی
ی منڈیوں تک ہے۔ اور ممالک عالم کے دارالخلافوں میں اس کی
ڈیاں پرمان ہوتی ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ بلاخوف حلف دروغی
بھی کر سکتے ہیں۔ کہ جواہرات کا جو منتخب اور سیر حاصل ذخیرہ اس
دکان میں ہے اس کا جواب دنیا کی بہت کم دکانیں پیش کر سکتی ہیں
یعنی یہ دکان بڑی ہے۔ اس کے حساب و کتاب کی کتابیں اتنی ہی
مختصر ہیں۔ بس یہ سمجھ لیجیے آپ اس کی پچپن سالہ کارگذاری کی روئداد
[illegible] اوپر کی جیب میں رکھ سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ سال دو سال
[illegible] خریدار نکلتے ہیں۔ اور اس سے انکم ٹیکس کے محکمہ [illegible]
[illegible] ہے۔ اس سے [illegible] غیر معمولی [illegible]
[illegible]

ہے۔ اس کمرے کو خلوت کی وہ معراج حاصل ہے جو کنج لحد کو بھی نصیب نہیں۔ وہاں باہر فاتحہ خوانوں کی خلفشار اور اندر منکر نکیر کی چھیڑ چھاڑ لگی رہتی ہے۔ لیکن یہاں کبھی دوسا بھائی آنکلے تو آنکلے ورنہ سوا ان کی بیٹی یاقوت کے کوئی سکندر نہ تھا۔ جو اس ظلمات میں جھانک بھی سکے یہ کمرہ جہانگیر کی دنیا تھا۔ جس سے وہ مارے باندھے نکلنے کا نام نہ لیتا تھا بس جواہرات سے کھیلنا اور انکی آب کو ایک سے ہزار کر دینا دوسا بھائی اس کے حسن صنعت کا معترف تھا۔ مگر دل میں! وہ ایسا سرمایہ دار نہ تھا جو مزدور کی محنت کی داد دے کر سوتی بھیڑ کو جگاتا۔ مگر جہانگیر تحسین انعام سے بے نیاز تھا۔ کہ یہ محنت اس کی تفریح میں داخل ہو چکی تھی۔

(۲)

ایک دن دونوں دن مل رہے تھے۔ کہ دوسا بھائی ہانپتا کانپتا جہانگیر کی "حراست خود اختیاری" میں آیا۔ پہلے ایک تبسم زیر لب نے اس کا استقبال کیا۔ لیکن اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر جہانگیر کی ٹھوڑی کا لہسہ اتر کر ٹائی کے سر ہو گئی۔ تھوڑی دیر ہوئی تھی۔ جب اس نے سنا تھا کہ یاقوت کی طبیعت کچھ بدمزہ سی ہے۔ آنِ واحد میں اس خیال نے دوسا بھائی کی گھبراہٹ سے مل کر تیمارداری کے جملہ لوازم اسکی آنکھوں کے سامنے جمع کر دیئے۔ اور شہر کے مشہور ڈاکٹروں کے مطب یاد آنے لگے۔ اوزار میز پر پھینک کر اور ٹوپی ہاتھ میں لے کر اس نے پوچھا۔ خیر تو ہے۔ دوسا بھائی نے کہا۔ کچھ نہیں۔ مجھے صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ کل جو [illegible] کچھ [illegible]
چنے [illegible] جاتا۔
[illegible] تھی۔ [illegible]